

ہمارے
عقائد
ہماری
تاریخ

علی حسین رضوی

26/05/02

سید سرفراز ناصر
Syed Sarfraz Nasir.
ہمارے عقائد

ہماری تاریخ

(صرف شیعوں کے لیے)



مؤلفہ
علی حسین رضوی



مطبوعہ

امامیہ اکیڈمی کراچی

جملہ حقوق محفوظ

ہمارے عقائد ہماری تاریخ

مصنف	:	علی حسین رضوی
اشاعت اول	:	اگست ۱۹۹۰ء
اشاعت دوم	:	نومبر ۲۰۰۱ء
تعداد	:	ایک ہزار
پر نٹر	:	افریسیا پرنٹنگ پریس
بالا ہتمام	:	سید اینڈ سید (پبلشرز) کراچی
قیمت	:	170/- روپے

ہمارے عقائد

ہماری تاریخ

ماضی میں ہم جن حالات سے بھی دوچار رہے ہوں لیکن علم ہمارا طرہ امتیاز تھا۔ بالخصوص اپنے عقائد اور اپنی تاریخ سے ہماری واقفیت نے جاہلانہ اور ظالمانہ ماحول میں بھی ہمیں زندہ رکھا۔ لیکن اب صورت حال بالکل مختلف ہے جن میں صرف مجالس سید الشہداء ہمارا واحد سہارا ہیں۔ پڑھنے کیلئے بکھرا ہوا مواد تو موجود ہے مگر نئی نسل کے پاس مطالعہ کے لیے اتنا وقت نہیں کہ اس میں سے وہ اپنی تاریخ کو اخذ کر سکے۔ بازار میں تاریخ اسلام کے نام سے جو کچھ ملتا ہے، اس میں بھاری تاریخ کا کوئی حصہ پایا نہیں جاتا لہذا ضرورت تھی کسی ایک کتاب کی جو ”آپ مہدیؑ کے طور پر چودہ سو سال کے واقعات کا احاطہ کر سکے۔

اس ضرورت کو بڑے مختصر پیرائے میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایک ہی کتاب میں اپنے عقائد و تاریخ کو یکجا کر دیا گیا ہے جس کا مطالعہ نوجوان قاری کے ذہن میں تصویر ماضی کے خدوخال کو روشن کر دے گا اور پھر اس کو اپنی حیثیت متعین کرنے میں کسی قیاس آرائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

سر دست اس کی اشاعت ایک محدود دائرے میں اور ایک محدود مہمان پرانی جارہی ہے۔ آپ سے بس اتنی ہی استدعا ہے کہ اپنی کاپی محفوظ کرالیں جو ہمارے منصوبہ اشاعت کا حصہ ہے۔

ترتیب مضامین

۶۳	حجہ اسود کی تنفیص	۱۹	ہمارے عقائد
۶۴	ولادت علیؑ	۲۳	افتتاحیہ
۶۷	غار حرا سے کعبہ تک	۲۶	اصول و فروعات
۷۳	ہجرت حبشہ	۳۲	توحید و قرآن
۷۴	پیدائش فاطمہ	۳۹	خلقتِ آدم
۷۴	شعب ابی طالب	۴۱	قرآن مجید
۷۷	جناب ابوطالبؑ در غدیجہ کی وفات	۴۵	عقیدے کی اساس
۷۷	جناب خدیجہؑ	۴۸	ہماری تاریخ
۷۸	حضرت ابوطالب	۴۸	رسالت کا پس منظر
۷۹	سفر طائف	۵۱	سلسلہ نسب
۸۰	حضرت عائشہؑ زودجر رسولؐ	۵۱	اسلاف
۸۲	شبِ معراج	۵۲	بنی امیہ
۸۴	بیعت عقبہ	۵۴	بنی ہاشم
۸۵	ہجرت مدینہ	۵۸	ریگزار عرب کا معاشرہ
۸۶	غار ثور	۵۱	گہوارۂ طفلی
۸۷	مدینہ آنحضرتؐ کا وطن	۵۱	عبدالطلب
۸۸	بھائی چارا	۵۲	دور رسالت
۸۹	عقد جناب فاطمہؑ	۵۲	ولادت باسعادت
۹۰	آغاز جہاد	۵۶	حضرت عبدالطلبؑ پر ایک نظر
۹۰	جنگ بدر	۵۹	آنحضرتؐ ابوطالبؑ کی سرپرستی میں
۹۱	جنگ احد	۶۲	جناب خدیجہؑ سے شادی

۱۲۳	دربار خلافت	۹۵	جنگ خندق
۱۲۹	حضرت فاطمہ زہراؑ	۹۸	صلح حدیبیہ
۱۵۵	جناب ام کلثومؑ	۱۰۰	جنگ خیبر
۱۵۷	دربار خلافت اور علیؑ	۱۰۴	ذکر
۱۵۹	خلافت اول کی تسخیری ہیمات	۱۰۴	جنگ موتہ
۱۶۶	خلافت دوم	۱۰۵	فتح مکہ
۱۷۱	خلافت سوم	۱۰۹	غزوہ حنین
۱۷۴	ابوذر غفاریؓ	۱۱۱	غزوہ تبوک
۱۷۶	عمار یاسرؓ	۱۱۲	عقبہ ذی فتن
۱۷۸	خلافت چہارم	۱۱۳	وادی الرمل
۱۷۹	سلمان فارسیؓ	۱۱۳	سورہ برات
۱۸۰	مقدادؓ	۱۱۴	حجۃ الوداع
۱۸۱	خالد بن سعیدؓ	۱۱۶	رائعہ مباہلہ
۱۸۱	ابی بن کعبؓ	۱۱۷	آخری لمحات
۱۸۲	بلال بن رباحؓ	۱۲۱	وفات
۱۸۳	حضرت معاویہ: حاکم شام	۱۲۱	تجہیز تکفین
۱۸۵	جنگ جبل	۱۲۳	تکفین نبوت
۱۸۹	جنگ صفین	۱۲۷	پس ماندگان
۱۹۵	عثمان یاسرؓ		سلسلہ امامت
۱۹۵	ہاشم بن عقبہؓ		پہلے امام: امیر المومنین حضرت علیؑ
۱۹۶	ادیس قرنیؓ	۱۲۸	سقیفہ بنی ساعدہ
۱۹۸	برید بن حصین سلمیؓ	۱۲۹	سقیفہ کے اسباب و علل
۱۹۸	مالک بن نضیمؓ	۱۳۶	ارباب سقیفہ

۲۲۹	حضرت معاویہ کی عہد شکنی	۱۹۸	حزیمہ بن ثابت
۲۳۰	امام حسنؑ کی شہادت	۱۹۹	حذیفہ یمانی
۲۳۲	ازواج و اولاد	۱۹۹	عبد اللہ بن بدیل
۲۳۲	سیرت	۱۹۹	عقیل بن مالک
	حضرت معاویہ کا شاطرانہ	۲۰۰	حارث بن مرہ
۲۳۳	دور حکومت	۲۰۰	نہردان کا پس منظر
۲۳۴	قیس بن سعد	۲۰۱	جنگ نہردان
۲۳۵	حدیث سازی	۲۰۴	نہردان کے بعد
۲۴۱	نظم کا طوفان	۲۰۵	دمشق کا اسلو خانہ
۲۴۱	ابو ہریرہؓ	۲۰۸	مصر: ایک مقبوضہ خلافت
۲۴۱	زیاد بن ابیہ	۲۰۹	مالک اشترؓ
۲۴۳	مجر بن عدیؓ	۲۱۳	محمد بن ابی بکرؓ
۲۴۵	رواج تبرا	۲۱۴	شام کی بلغار
	تیسرے امام: حضرت حسینؑ	۲۱۶	شہادت سے پہلے
۲۴۹	سبط اصغر	۲۲۰	امیر المومنینؑ کی شہادت
۲۵۰	نیرنگی زمانہ	۲۲۱	دارثان البعد
۲۵۱	وقت کا دھارا	۲۲۳	محمد حنفیہ
۲۵۱	وفات ام المومنین عائشہؓ	۲۲۳	علیؑ: ایک نشان جگلی
۲۵۲	حضرت معاویہ کا انتقال		دوسرے امام:
۲۵۴	یزید ابن معاویہ		حضرت حسنؑ
۲۵۶	بیعت کی سنی ناکام	۲۲۵	تعارف
۲۵۸	مدینہ کا مسافر	۲۲۶	زمانے کی بے وفائی
۲۵۸	کونے کا سفیر	۲۲۸	صلح حسنؑ

۲۹۲	شب عاشور	۲۶۰	سفاک ابن سفاک
۲۹۶	روز عاشور	۲۶۰	ہانی بن عروہ
۳۰۱	صحرائی بھیرٹریے اور مدینہ کے شیر	۲۶۳	یتیمان مسلم
۳۰۱	حسین بن زید الریاحی	۲۶۵	میدتم تھار
۳۰۱	ظہیر بن حسان ہمدانی	۲۶۶	رشید ہجری
۳۰۲	عبداللہ بن عمیر کلبی	۲۶۸	مدینے سے کر بلا کی طرف
۳۰۴	حملہ اول کے شہید	۲۷۰	امام کے قاصد
۳۰۵	بریر ابن خضیر ہمدانی	۲۷۲	قیس بن مہرید او
۳۰۶	مسلم بن عکرمہ	۲۷۲	سفر: ایک مسلک ہدایت
۳۰۷	جنگ مغلوبہ کے شہید	۲۷۲	زہیر ابن قین
۳۱۴	حبیب ابن مظاہر ہمدانی	۲۷۶	خیمہ گاہ کر بلا
۳۱۵	عاشور کی نماز	۲۷۸	مستب بن نجیہ
۳۱۵	نماز ظہر کے بعد	۲۷۹	شکر پرشکر
۳۱۶	زہیر ابن قین	۲۸۲	جناب شہر یافو
۳۱۶	جون بن حوی	۲۸۳	تشنگان فرات
۳۱۷	خطلہ ابن اسعد شامی	۲۸۵	کر بلا کا خاندان رسالت
۳۱۷	حجاج بن مسروق کوفی	۲۸۷	جناب زریب
۳۱۷	عابس بن ابی شیبہ شامی	۲۸۷	جناب ام کلثوم
۳۱۸	عبداللہ و عبدالرحمن	۲۸۸	حضرت عباس
۳۱۸	طرماح بن عدی	۲۸۹	جناب علی اکبر
۳۱۹	نافع بن ہلال	۲۸۹	جناب زین العابدین
۳۱۹	ہلال ابن نافع	۲۸۹	جناب نفعہ
۳۲۰	انس ابن حارث	۲۹۰	آغاز جنگ

۳۵۰	کر بلا کے اسیر کو نہیں	۳۲۱	بنی ہاشم رزم گاہ میں
۳۵۴	کوفے سے شام تک	۳۲۲	حضرت علی اکبر
۳۵۹	دشمن کا بازار	۳۲۴	عبداللہ بن مسلم
۳۶۰	دربار نرینہ	۳۲۵	جعفر بن عقیل
۳۶۶	زندان شام	۳۲۵	عبدالرحمن بن عقیل
۳۷۰	شام کے قیدی	۳۲۵	موسیٰ بن عقیل
۳۷۳	دیار مدینہ	۳۲۵	عون و محمد
۳۷۴	جناب زینب	۳۲۶	عبداللہ بن حسن
۳۷۷	واقعہ حرہ	۳۲۷	قاسم بن حسن
۳۷۹	عبداللہ ابن زبیر	۳۲۹	احمد بن حسن
۳۸۰	مرگ نرینہ	۳۳۰	حسن مثنیٰ
۳۸۰	عبدالملک بن مروان	۳۳۰	ابوبکر بن علی
۳۸۱	مختار بن ابوعبیدہ ثقفی	۳۳۰	عبداللہ بن علی
۳۸۳	مقتل خون حسین	۳۳۱	عثمان بن علی
۳۸۷	جنگ عین الورد	۳۳۱	جعفر بن علی
۳۸۸	انتقام کا دوسرا پیچہ	۳۳۲	عون بن علی
۳۹۰	محمد حنفیہ اور عبداللہ ابن زبیر	۳۳۳	عمر بن علی
۳۹۱	قاتلان حسین کا انجام	۳۳۳	ابوالفضل العباس
۳۹۹	مختار کی شہادت	۳۳۹	علیہ السلام کر بلا
۴۰۲	مصعب ابن زبیر کا اختتام	۳۴۴	عصر عاشور
۴۰۳	زبیری خلافت کا خاتمہ	۳۴۶	جناب شہربانو
۴۰۵	حجاج بن یوسف کو فہم	۳۴۶	جو کچھ امام: حضرت زین العابدین
۴۰۶	کبیل بن زیاد	۳۴۸	آغاز امامت

۴۲۷	مردان الحمار	۴۰۷	حضرت قنبر
۴۲۸	عباسی تحریک	۴۰۸	عبد الملک: ایک حکمران
۴۳۲	بنی امیہ کی آخری جنگ	۴۰۹	امام زین العابدینؑ کی وفات
۴۳۸	امام جعفر صادقؑ کے مشاغل		پانچویں امام: حضرت محمد باقرؑ
۴۳۹	امام جعفر صادقؑ: ایک کنز العلم	۴۱۱	مختصر لغات
۴۴۰	عباسی بساط سلطنت	۴۱۲	حجاج کی موت
۴۴۱	ابو جعفر منصور دوانیقی	۴۱۳	ولید اور بنی ہاشم
۴۴۲	ظلم و جور کا ایک نیا دور	۴۱۳	ولید کے اعمال و عقائد
۴۴۶	نفس ذکیہ	۴۱۴	ولید کی تخریبی مہمات
۴۴۷	ابراہیم بن عبد اللہ محض	۴۱۶	امام محمد باقرؑ: ایک سارۂ ہدایت
۴۴۸	لفظ امام	۴۱۷	سلیمان بن عبد الملک
۴۴۸	منصور کی ستم آفرینی	۴۱۷	عمر بن عبد العزیز
۴۵۱	امامؑ، ظالم کے دربار میں	۴۱۸	یزید بن عبد الملک
۴۵۳	امامؑ کی وفات	۴۱۸	ہشام بن عبد الملک
۴۵۳	بوہیر	۴۲۰	جناب زید شہیدؑ
	ساتویں امام: حضرت موسیٰ کاظمؑ	۴۲۱	جناب یحییٰ بن زید
۴۵۵	سند صبر و رضا	۴۲۲	موت و الاقبال
۴۵۶	ہمدی بن منصور	۴۲۳	امام محمد باقرؑ کی شہادت
۴۵۸	ہادی بن ہمدی		چھٹے امام: حضرت جعفر صادقؑ
۴۵۹	جنگ فنج	۴۲۴	ولادت مسعود
۴۶۰	بار و رشید ابن ہمدی	۴۲۵	ہشام کے کارنامے اور وفات
۴۶۱	فقہ حنفی	۴۲۵	کیست
۴۶۳	امام موسیٰ کاظمؑ کے شب و روز	۴۲۶	ولید بن یزید

۵۰۷	امام محمد تقیؑ کے معمولات	۴۶۵	باردن رشید کی سادات کشی
۵۰۹	معقلم باللہ	۴۶۶	صاحب ولیم
۵۱۰	امام کی گرفتاری اور شہادت	۴۶۷	امام موسیٰ کاظمؑ کا انتقال
	دسویں امام: حضرت علی نقیؑ	۴۶۸	اولاد اطہار
۵۱۲	مولد و مسکن		۳ مٹھوس امام: حضرت علی رضاؑ
۵۱۳	معقلم کا جنگی دور حکومت	۴۷۰	ابتدائی حالات
۵۱۴	والق باللہ	۴۷۰	فرقہ و اقصیہ
۵۱۴	متوکل بن معقلم	۴۷۲	باردن رشید کا عہد آخر
۵۱۵	امام علی نقیؑ: ایک مجتہد	۴۷۴	امین ابن باردن
۵۱۷	متوکل کے کارنامے	۴۷۴	ماسون رشید بن باردن
۵۱۹	متوکل کا اسلامی دربار	۴۷۵	امام رضاؑ کے دس سال
۵۲۸	نجف اشرف اور کربلا کی تباہی	۴۷۷	سادات علویہ
۵۳۶	منقصر باللہ	۴۷۹	ماسون کا انداز فکر
۵۳۶	مستحین باللہ	۴۸۳	امام رضا: ولی عہد
۵۳۷	معقلم باللہ	۴۸۶	راس المجلوت
۵۳۷	امام علی نقیؑ کی شہادت	۴۸۹	معصومہ قم
۵۳۸	اولاد اطہار	۴۹۰	امام رضاؑ کے بعد
	گیا بھویں امام: حضرت حسن عسکریؑ	۴۹۰	شاہ چراغ
۵۳۹	ولادت و طفولیت		نویں امام: حضرت محمد تقیؑ
۵۴۰	بہلول دانا	۴۹۲	ولادت و تربیت
۵۴۲	محاسن و کمالات	۴۹۳	امام محمد تقیؑ بندادیں
۵۴۴	ادوار خلافت	۴۹۵	خون سادات
۵۴۵	مہندی باللہ	۴۹۷	مشرق کا عظیم دربار

۵۵۶	پردش	۵۴۶	مقدمہ علی اللہ
۵۵۷	خونخوار بھیرے اور آہستے	۵۴۹	امامؑ کی وفات
	رسالت	۵۴۹	معصوم کا جنازہ
۵۵۷	مقتضیٰ باللہ		بارہویں امام؛
۵۵۸	حضرت محبتؑ کے نائب		حضرت ہمدی آخر الزمانؑ
۵۶۳	وقت ظہور	۵۵۱	حب و نسب
۵۶۴	مشانِ ظہور	۵۵۱	حضرت نوحؑ بن خاتون

ماخذ

افتتاح

زیر نظر کتاب در حقیقت تاریخ محمد و آل محمد ہے جس کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی تاریخ اسلام کہا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کے پورے تاریخی سرمائے پر ایک اچھتی نگاہ ڈالی جائے تو دمشق سے استقرار خلافت سے مستنصر باللہ کے عہد تک تقریباً چھ سو سال کا پورا دور حسن و شباب کی رنگینیوں میں ڈوبا نظر آتا ہے اور دربار شاہی میں مہوشان حشر رفتار کے ہاتھوں سے مگرنگ کے جام چھلکتے دکھائی دیتے ہیں

اس مدت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے چند مقدس سال مستثنیٰ کیے جاتے

ہیں حضرت معاویہ کا دور کسی طرح اس دائرے سے باہر نہیں نکلا کیونکہ اس میں جال و شراب کا زیادہ چرچا نہ تھا تو دارالامارہ و دمشق کے در و دیوار پر برگزیدہ اصحاب رسول اور بے گناہ سادات کے خون کے چھاپے لگائے جاتے تھے پھر اس پر مستزاد منبروں سے حضرت علیؑ اور اولاد علیؑ پر تبسوا ہے جس کا فتویٰ اسلام کے کسی مسلک فقہ سے نہیں مل سکتا۔ یہ غیر اسلامی اعمال خطائے اجتہادی کی تعریف میں بھی نہیں آسکتے۔ مسلمان کتنی ہی طرفداری کریں، فحاشی کے اس دور کا آغاز سنہ ۱ یا اس سے کچھ قبل ہی منصوبہ ہو گا۔

سونے پر ہماگ ہے معاویہ کی وہ روایت سازی جس نے سیرت بنی عمرؓ نمک کو داغدار کر کے رکھ دیا اور جس کا کم از کم نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل اس طرح مدغم ہو گئے کہ آج دونوں میں تمیز مشکل ہے۔ جھوٹ اتنی بار دہرایا گیا کہ بیچ اس کے سامنے مدغم ہو گئے۔ عوام کو دھوکا دینے کے لیے کوئی کچھ کہہ دے لیکن معاویہ کے دامن سے یہ داغ

دھوئے نہیں جاسکتے۔

رہ گئے عبداللہ ابن زبیر جن کی خلافت ایک مختصر مدت کے لیے، ایک محدود علاقے میں قائم ہوئی۔ انھوں نے بھی آل رسولؐ کے ساتھ جابرانہ اور ظالمانہ سلوک کیا، صرف بیعت لینے کے لیے اور ناجائز خلافت پر جائز ورنہ سے ہر تصدیق ثبت کرانے کی خاطر ان میں ذرا بھی دور بینی ہوتی تو مطالبہ بیعت کے سابقہ انجام کو نہ بھولتے۔

اس کے بعد مسلم سلاطین کا آج تک دور، جس میں نیرود اور چنگیز خاں کے کردار، چہروں پر اسلام کا نقاب ڈالے ہر موڑ پر پائے جاتے ہیں اور مسلمان مورخ جب ان کے کارناموں کو قلم بند کرتا ہے تو اس کا نام رکھتا ہے تاریخ اسلام — کیا یہی اسلام ہے جس کی سرگزشت ہم آج تک پڑھتے آئے ہیں؟

جامعین احادیث کچھ زیادہ مورد الزام نہیں ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اہل بیت اور حجاب علیؑ کی احادیث کو درخور اعتناء نہیں سمجھا، ہم ان سے کبھی شکایت نہیں کرتے، انھیں جو کچھ ملایا جو انھوں نے چاہا اس کو یکجا کر دیا لیکن ان سے جو تاریخ مرتب کی گئی اس میں قلم کاری کی خیانت قابل معافی نہیں ہے۔ قدیم مورخین میں جس کسی نے علیؑ اور فاطمہؑ کی اولاد کا تذکرہ کر دیا وہ خواہ اہل عثم کوئی جیسا کھر خنی ہی کیوں نہ ہو اس کو شیعہ کہہ دیا گیا۔

مورخین کی نظر میں شیعیت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ کوئی صوفی جذبہ ولا میں علیؑ کا پہلا نمبر "کا اوزارہ بلند کردے تو گردن زدنی، حالانکہ تصوف میں تو پہلا نمبر علیؑ کا ہے ہی مگر بانی تشیع کی طرف جلا جاتا ہے اور فوراً ذہن میں خلافت کا صحیح نمبر آ جاتا ہے تو برا معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ کے قدیم عہد کے بعد جب مورخین نے قلم اٹھایا تو خونخواروں کو فاح مالک لکھا لیکن قلوب کے اندھوں کو یہ دکھائی نہیں دیا کہ ان خونخواروں کی باجھوں سے سادات کا لبو بھی ٹپک رہا ہے۔

دمشق ہو یا بغداد کا قصر الکھراء، وہاں اگر ایک طرف بادۂ ناب سے بھرے ہوئے حوض نظر آئیں گے تو دوسری طرف سادات کے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہوں گے۔ حد ہے قسی اقلبی کی کہ مسلمان قلم کار اور اولاد فاطمہ کے قتل پر اس کی آنکھیں نمی بھی نہیں آتی اور سب کچھ دیکھنے کے باوجود وہ انجان بن کر گزر جاتا ہے۔ اور کوئی مورخ کسی واقعے یا کردار کا ذکر قلم کی روانی میں کر جاتا ہے تو ربط بیان میں اس کی اہمیت اور قیمت کو اتنا گرا دیتا ہے کہ اس سے قاری کے ذہن میں ایک بڑا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔

اس پر طرہ نسیم یہ ہے کہ کچھلی ربع صدی سے نا صبیت کھل کر سامنے آگئی ہے جس کو نہ علیؑ کو بُرا کہنے میں عار ہے اور نہ رسولؐ کی بیٹی کو۔ خود حضرت ختمی مرتبت کو زبان سے تو کچھ نہیں کہا جاتا لیکن اُم المؤمنین عائشہؓ پر آپؐ کی فریفتگی ثابت کرنے کے لیے ایسی مفروضہ احادیث بیان کر دی جاتی ہیں جو شان رسالت کو مخرج ہی نہیں کہتیں بلکہ آپؐ کا تقویٰ، عزت نفس اور عدل سب پر داغ لگ جاتا ہے۔ ہمارے رسول خلقت آدم سے چودہ ہزار سال پہلے بھی نبی تھے اور قیامت کے بعد تک نبی رہیں گے۔ خدا کی طرف سے آپؐ کے بعد بارہ امام منصوص بن اللہ تھے جو اپنے اپنے وقت معین پر تشریف لائے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ دنیا نے کس کو خلیفہ بنایا، کس کو شہنشاہ، ہم تو دین اسلام کے ان ہادیوں کے پابند رہے اور رہیں گے جنہیں رسول ہی کی طرح اللہ نے مامور کیا تھا۔

اُمتِ مسلمہ نے ان ہادیوں کے ساتھ جو سلوک کیا، مسلم مورخین نے اس کے بیان میں صرف بددیانتی ہی نہیں کی بلکہ انصاف کا خون بھی بہایا۔ لہذا ضرورت تھی مسلک اسلام پر ان کے گرد آلود نقوش پا کو اُبھارنے کی اور یہ بتانے کی کہ جابر و ظالم فرماں رواؤں کی تاریخ، تاریخ اسلام نہیں ہے۔ تاریخ اسلام تو نام ہے۔

مبلغین اسلام کی سرگزشت کا جسکا ایک مختصر سا خاکہ اس کتاب میں پیش کیا جاتا ہے جو خون اسلام اور خون سادات کے سرناموں کا تابع ہے۔

رسولؐ سے لے کر حضرت حجتؑ تک ہم پر کیا کیا بیتی پیغمبر اسلام کے نام لیواؤں نے کس کس طرح یوم ذیح منایا؟ اس کی ایک جھلک قارئین کرم کو اس میں دکھائی دے گی اور یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اسلام کے خلافت ساز کتنے رحم دل یا کتنے شقی القلب تھے کہ پائی کو انھوں نے خون کے مقابلے میں گرانقدر بنا دیا۔

مظلوموں کی داستان کے ایک دور کا احاطہ یقیناً کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے تاریخ شیعان علیؑ کی ضرورت بھی ہے جو دور غیبت سے شروع ہو کر دور حاضر تک پہنچے اور یہ بتا سکے کہ تقیہ میں زندہ رہنے والی قوم ہر حال میں زندہ رہتی ہے اور درخت کی پرانی شاخیں کٹ جاتی ہیں تو نئی شاخوں کی کونپلیں بھڑکتی ہیں۔

اس تاریخ کی غائت تحریر کسی تاریخی کردار پر کچھ ڈاڑھ اٹھا لیا ہرگز نہیں ہے جس کی تحقیق میں جو جیسا ہے، وہ اسکو اسی طرح قلوب و ذہن میں جگہ دے، ہم نے تو یہ مختصر ترین خاکہ تحریر اپنے بیٹوں کے لیے قلم بند کیا ہے تاکہ صرف ایک کتاب کے مطالعہ سے وہ اپنے عقائد اور اسلاف کے حالات کا احاطہ کر سکیں اور سطحی معلومات کیلئے انھیں دھڑ دھڑ بھٹکانا نہ پڑے۔

دوسرے حضرات اس کتاب کو ملاحظہ نہ فرمائیں کیونکہ تاریخ کے تلخ حقائق کو شاید وہ برداشت نہ کر سکیں لیکن اگر کوئی اپنے علم کے لیے پڑھنا چاہتا ہے تو میری استدعا ہوگی کہ وہ پوری کتاب ہی پڑھ ڈالے۔ ہر قابل اعتراض سوال موجب فکر ہوگا۔

مؤلف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہمارے عقائد

اصول و فروع دین

ہمارے عقیدے کی بنیاد اصول دین پر ہے جو گنتی میں پانچ ہیں
توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت
خدا کی ذات و صفات پر یقین دین و ایمان کی پہلی شرط ہے۔ یقین بھی
ان آداب و قیود کے ساتھ کہ وحدت پر حرف نہ آئے۔ خدا کی ذات کے سلسلے
میں چند باتوں پر اعتقاد لازم ہے۔
خدا ایک ہے اور صرف ایک۔ نہ اس کا کوئی شریک کبھی تھا، نہ ہے اور
نہ آئندہ ہوگا۔

وہ کسی چیز سے بن کر نہیں بنا۔ مادیت اور جسم سے پاک و صاف ہے۔
ہر جگہ حاضر ہے اور موجود ہے، کوئی زمانہ یا مقام نہیں رکھتا۔ ہر بات پر
قادر ہے، کہیں مجبور نہیں نہ کسی ذات میں حلول کر سکتا ہے، نہ کسی چیز میں سما سکتا
ہے اور نہ خیال کے گیرے میں آ سکتا ہے۔ تغیر سے بڑا ہے، جیسا تھا ویسا ہی ہے
اور ویسا ہی رہے گا۔

اس کو دیکھا نہیں جاسکتا، نہ دنیا میں اور نہ عقبی میں۔
اپنی ذات و صفات میں وہ کسی کا محتاج نہیں
اس کی صفات عین ذات ہیں۔ ان میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی

ان کے علاوہ چند مزید خصوصیات کا اطلاق بھی اس پر ہوتا ہے۔

وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

کوئی بات اس کے اختیار سے باہر نہیں۔ اس نے کائنات کو پیدا کیا ہے اور چاہے تو دوسری کائنات بھی پیدا کر دے۔

عالم ہے اور عین علم بھی۔ کوئی بات اس سے ڈھکی چھپی نہیں ہے اور نہ ہوگی۔
زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

جو کچھ ہوتا ہے، اس کے ارادے اور اختیار سے ہوتا ہے۔ کوئی ذرہ بغیر اس کی مرضی کے حرکت نہیں کر سکتا۔

آنکھ اور کان نہیں رکھتا مگر ظاہر اور باطن کا جاننے والا ہے۔

منہ اور زبان نہیں رکھتا مگر چاہے تو بات کر سکتا ہے، جیسے کہ طور پر حضرت موسیٰؑ سے بات کی تھی۔ صادق بھی ہے اور عین صدق بھی۔ اس کی ہر بات صحیح اور سچ ہوتی ہے۔

”عدل“ اصول دین میں دوسرے درجے پر ہے جس کے معنی میں کسی بات یا چیز کا موقع محل سے مناسبت، مصالحت اور حکمت سے رکھنا۔ یہ لفظ ظلم کی ضد ہے جو کئی بار یادنی تصرف بے جایا بے محل عمل کی تعریف میں آتا ہے۔ یہ دونوں لفظ بہت وسیع المنہی ہیں۔ درحقیقت عدل بھی خدا کی عین ذات ہے۔ اس کی کوئی جزا یا سزا بے جا اور بے موقع نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس کی ذات میں اس کو عادل سمجھنا عین ایمان ہے۔ واضح رہے کہ انسان مختار مجاز ہے۔ اس کے ہر عمل کا نتیجہ عدل کے مطابق ہی نکلتا ہے۔ آخرت کا ثواب و عذاب بھی اسی تعریف میں ہے۔

دین کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں اصول میں نبوت، امامت اور قیامت ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ سارے نبی اور ان پر نازل ہونے والی کتب میں برحق

ہیں۔ انبیاء اور کتب سب اللہ کی طرف سے بھیجی گئی ہیں۔ ہر نبی معصوم ہوتا ہے اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ ہر نبی کے معجزات صحیح اور درست ہوتے ہیں۔ وہ سہو یا نسیان سے مبتلا ہوتا ہے، اندھا، بہرا، گونگا اور دوسرے جسمانی عیوب سے پاک ہوتا ہے۔ کوئی متعدی یا کراہت کے لائق بیماری اس میں پائی نہیں جاتی۔ حضرت الیوبؑ اس سے متعلق تھے کیونکہ کوڑھ ان کے لئے بیماری نہ تھی بلکہ ضبط و صبر کی آزمائش تھی۔ نبی کوئی گرا ہوا پیشہ اختیار نہیں کرتا۔ محنت مزدوری یا باعزت روزگاریں اُسے عار نہیں ہوتا۔

انبیاء میں صاحبانِ کتاب و شریعت رسول کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد جو نبی آئے انہوں نے سابق رسول کی شریعت پر عمل کرایا۔ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰؐ کے آنے کے بعد کچھ بچی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں، صرف اسلام قیامت تک کے لئے باقی رہ گیا۔ چونکہ اب سلسلہ نبوت خدا کی طرف سے ختم ہو گیا تھا لہذا احقر تک اسلام کے عملدرآمد اور دین کی بقا کے لئے مشیت نے سلسلہ امامت جاری کیا، امام بھی اللہ کا مامور ہوتا ہے۔ وہ نبی تو نہیں ہوتا مگر نبی کی بیشتر خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں اور وہ تحفظ و بقا کے شریعت میں پیغمبر کی نیابت کرتا ہے۔

حضرت علیؑ سے لے کر امام مہدیؑ تک ہمارے بارہ امام ہیں، چونکہ گیارہ امام دشمنوں کے ہاتھوں تلوار و زہر سے شہید ہو گئے اور امامت کو قیامت تک جانا ہے اس لئے بارہویں امام خدا کے حکم سے کسی مقام پر روپوش ہیں۔ خدا نے انہیں طویل عمر عطا فرمائی ہے، شاید آدم و نوح سے بھی زیادہ۔ آپ قرب قیامت میں ظاہر ہوں گے اور دنیا کو عدل سے بھر دیں گے۔

اصول دین کا پانچواں عقیدہ قیامت کا ہے جس کو مسلمانوں کا ہر مکملہ فکر مانتا ہے۔ روایاتِ معتبرہ کی رو سے اس دن اسرافیل کے پہلے صور پر تمام

مردے زندہ ہو کر قبروں سے نکل آئیں گے۔ دوسرے صور پر عجب جاندار
مر جائیں گے، تیسرے پر پھر زندہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہر ایک کے
اعمال کا حساب ہو گا۔ بہشت اور دوزخ کے دروازے کھولے جائیں گے
اور انسانوں کو ان کے کئے کی جزا و سزا ملے گی۔

فروعاً دین ایک طرح کا لائحہ عمل ہیں جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ
خمیس، حج اور جہاد کے ضابطے مقرر کئے گئے ہیں اور ان کو ہر مرد و عورت
پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ اصل کے معنی جڑ اور فروغ کے معنی شاخ۔ جڑوں
اور شاخوں سے پل کو شجر مکمل ہوتا ہے۔ جس کو شجرہ دین کہا جاتا ہے۔

اصول و فروع کی یہ ترتیب و تفصیل ہمارے لئے مختص ہے، ویسے
مسلمانوں کا ہر ملکیتہ فکر قدرے ترمیم و ترمیم سے ان کو ملتا ہے اور ہر ایک
اپنے عقیدے کو برحق سمجھتا ہے۔

اصول میں سب سے زیادہ اہمیت توحید کو ہے لیکن خدا شناسی کے لئے
خود شناسی شرطِ اولین ہے۔ انسان جب تک اپنے آپ کو نہ سمجھے، اس وقت
تک پیدا کرتے والے کی صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور اگر خدا ہی سمجھ میں
نہ آیا اور وحدانیت میں شرک کا شائبہ بھی پیدا ہو گیا تو اصول و فروعاً کیا،
دین ہی اسے چلا جائے گا۔

اس لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے غایتِ تخلیق پر ایک نظر ڈالی
جائے اور مشیتِ الہی کا جائزہ لیا جائے تو فکر و نظر کے دروازے خود بخود
دھکے دیے جائیں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ انسان کی حقیقت و حیثیت
متعین ہو جائے گی اور خالق کی قدرتِ کاملہ کو سمجھنے کے لئے ذہن میں ایک
روشنی پیدا ہو جائے گی۔

توحید و قرآن

خلقتِ آدمؑ

”میں ایک مخفی خزانہ تھا جب میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے، اے محمدؐ، آپ کو خلق کیا۔“ (۱)

یہ حدیث قدسی تمام مسلمانوں میں معتبر مانی جاتی ہے اور تسلیم کیا جاتا ہے کہ خالقِ مطلق نے سب سے پہلے حضورؐ کے نور کو پیدا کیا۔ اس کی توثیق حضورؐ بھی فرماتے ہیں۔

”خدا نے سب سے پہلے میرے نور کو خلق کیا۔“ (۲)

اس طرح آپؐ اُس اولین انسان کی توفیق میں ہیں جو خدا کی معرفت کے لئے وجود میں آیا۔ اس حقیقت کا انکشاف بعض دوسرے مواقع پر بھی آپؐ نے فرمایا۔

”میں اُس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ مٹی اور پانی کے درمیان تھے۔“ (۳)

یعنی جس خمیر سے آدمؑ کا پتلا تیار کیا گیا، وہ خمیر ابھی تیار ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ بات بروایت حضرت علیؑ خلقتِ آدمؑ سے چودہ ہزار سال قبل کی ہے۔ بعض دوسرے لوگ سات ہزار سال قبل بتاتے ہیں۔

اس طرح حضورؐ خدا کے نور سے پیدا ہوئے اور آپؐ کے نور سے تمام انبیاء علیہم السلام کے انوار نکالے گئے۔ (۴) جو آپؐ کی نبوت پر ایمان لائے۔

اس سے ہر مکنتہ فکر کے علماء نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ تمام مخلوقات میں اول و افضل ہیں۔ پھر حضور فرماتے ہیں کہ ”میں اور علی ایک ہی نور سے ہیں“ (۵) مفہوم کے اعتبار سے یہ حدیث کئی دوسرے مقامات پر بھی ملتی ہے جس کا ماحصل یہی اور صرف یہی ہے کہ علی ذات محمدی میں جز و لا ینفک ہیں اور صرف علی ہی نہیں، علی کے ساتھ جناب فاطمہ حسن اور حسین بھی شامل ہیں جن کے بارے میں رسول کریم کے ارشادات کسی استدلال کے محتاج نہیں اور جو نیچے تن کے مقدس اسمیہ سے بہر طور سمرنامہ موجودات ٹھہرتے ہیں۔

ایک نور کے دو حصے جو محمد اور علی کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں، بلاشبہ حاصل تخلیقات ہیں لیکن منصب پیغمبری میں اگر فاطمہ کو شریک نہ کیا جاتا تو کائنات کی تشکیل کے بعد انبائے آدم کو تو ہدایت کے دو بلکہ تیرہ نمونے مل جاتے لیکن حوا کی بیٹیاں فریاد کرتیں کہ ہمارے لئے کس کی نظیر ہے لہذا مشیت نے فاطمہ کو فاطمہ زہرا بنا کر اپنے محبوب کے صلب میں مقدر کر دیا تاکہ عدل پر کوئی حرف نہ آئے اور آپ کی خلقت سے سیرت محمدی کی تفسیر مزید کے دو نمونے اور مل جاتیں جن کے نام حسن اور حسین ہیں۔

”منقول ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خاص قسم کی لغزش واقع ہوئی تو انہوں نے مناجات کی۔“ اے رب! بواسطہ محمد، میری اس لغزش کو معاف فرما دے۔“ (۶) شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ربط بیان میں صراحت فرمائی ہے کہ آدم نے کلمہ طیبہ میں محمد کا نام عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا۔ ہمارا موقف اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے، ہماری تحقیق میں آنحضرت کے ساتھ چار نام اور لکھے ہوئے تھے، جن کا واسطہ آدم نے دیا تھا اور ان کی توبہ قبول ہوئی تھی۔

عقیدے کے بعید ترین پس منظر پر نگاہ ڈالی جائے تو بلا قید مان و مکان پہلے صرف خدا تھا، خدا ہی خدا، پھر محمدؐ کا نور، اور محمدؐ کے ساتھ چار نور اور جو محمدؐ سے مشتق تھے۔ عرش و کرسی اور ملائکہ کی تخلیق اس کے ساتھ یا بعد کی باتیں ہیں لیکن چونکہ اسرارِ مشیت میں نور محمدؐ کی تخلیق کا ایک خاص مقصد تھا۔ لہذا ”کن فیکون“ سے کائنات کی خلقت ہوئی اور ”تمام مکنونات علوی اور سفلی آپ ہی کے نور سے، آپ ہی کے جوہر پاک سے ارواح، شبیہات، عرش، کرسی، لوح، قلم، جنت و دوزخ، ملک، فلک، انسان و جنات، آسمان و زمین، بحار، جبال اور تمام مخلوقات عالم ظہور میں آئی۔“ (۷) پھر آدمؑ کی تخلیق مٹی اور پانی سے کی گئی حضرت امیر المومنینؑ کا ارشادِ گرامی ہے کہ ”میں چالیس سال تک مٹی کے اُس خمیر کو گوندھتا رہا جس سے آدمؑ کا پتلا تیار ہوا۔“ پھر اُس میں نفخِ روح کی گئی اور نور محمدؐ کو پشت پر ثبت کیا گیا جو آپ کی پیشانی پر نمودار ہوا۔ فرشتوں کو اسی نور کے سامنے سجدہ تعظیمی بجالانے کا حکم دیا گیا تھا۔ خدا کے وجود کی مدت تو ہمیشگی ہے لیکن اگر کائنات کی تخلیق، ہندو جگوں کے حساب سے تسلیم کر لی جائے تو کئی لاکھ سال قبل ٹھہرے گی۔ خلقتِ انوارِ مقدسہ اس سے بہت پہلے کی بات ہے۔ رہ گئی حضرت آدمؑ کی تخلیق تو وہ ہزاروں سال پہلے ضرور ہوئی، مگر ایک جھجک تین تین چار چار لاکھ برس کا ہے لہذا آدمؑ کا روئے زمین پر آنا بھی لاکھوں برس پہلے ماننا پڑے گا۔ پھر ایک لاکھ چوبیس ہزار بادلوں کی تعداد اسی مدت میں پوری ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مسلم ہے کہ اللہ کے پیغمبر مشرق و مغرب شمال اور جنوب ہر طرف نازل ہوئے اور ان سب کا زمانہ حضرت آدمؑ کے بعد کا ہے حضرت خواکی خلقت، آدمؑ کی جنت کی زندگی اور ترکِ اولیٰ معروف واقعات ہیں لیکن آدمؑ اور گناہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے اگر اس کو مان لیا جائے تو

عصمت پیغمبری کا دامن تارتا رہا ہوتا ہے۔ اس عقیدے کے قابل تو وہ لوگ ہیں جو حضور کی سیرت کو بھی داغدار ثابت کرنے کا شرف رکھتے ہیں ہمارا عقیدہ تو ”لا تقربا ہذا الشجر“ پر عمل نہ کرنے کو لغزش بھی قرار نہیں دیتا بلکہ اسے ترکِ اولیٰ کہتا ہے۔ یعنی جس کا ترک کرنا مستحب اور ترک نہ کرنا گناہ نہیں۔ اس کی یاد اش اس سے زائد نہ ہو سکتی کہ آدم و حوا جنت سے باہر لے آئے گئے اور پھر ذواتِ مقدسہ کا واسطہ دینے پر معاف کر دیئے گئے ترکِ اولیٰ کے سلسلے میں ہمارے دو علماء سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور آپ کے بھائی سید رضی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ نمازِ جماعت کی امامت کے سلسلے میں زیرِ بحث تھا کہ نماز کون پڑھائے؟ آپ کی والدہ گرامی نے فیصلہ کیا کہ وہ پڑھائے جس نے ترکِ اولیٰ نہ کیا ہو۔ چنانچہ سید مرتضیٰ پیچھے ہٹ گئے اور سید رضی نے امامتِ نماز کے فرائض انجام دیئے۔

بنی آدم کی تاریخِ بادی النظر میں یہیں سے شروع ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس کا مدارِ اولیٰ آنحضرت کا نورِ مقدس ہے جو انبیاء کا سرچشمہ بھی ہے اور باقی تمام مخلوقات کا منبعِ ہدایت بھی۔ بالفاظِ دیگر جس کو خلاقِ مطلق نے کائنات سے پہلے پیدا کیا تھا اور ایک دستورِ حیات بھی دیا تھا جس کو قرآن کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید

لغت کے اعتبار سے قرآن پڑھی یا پڑھائی جانے والی چیز کو کہتے ہیں لیکن اصطلاحاً وہ مکتوبِ ہدیٰ ہے جو نورِ محمد کی تخلیق کے ساتھ علمِ باری سے لوحِ محفوظ میں منتقل ہوا اور پھر ہمیشہ کے لئے اس نور میں پیوست ہو گیا۔ پیغمبر کی مادی زندگی میں اس کا نزول اقساط میں بتدریج ہوتا رہا، لہذا شانِ نزول سے مختلف مفہیم لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوئے اور آج تک اس کی علیحدہ علیحدہ تاویلیں کی جاتی ہیں پھر بھی اس حد تک تو

سب ہی مانتے ہیں کہ

”پہلے آسمان پر، جو دنیا کا آسمان ہے، دفعۃً رمضان کی شب قدر میں نازل ہو گیا تھا پھر آسمان دنیا سے دنیا میں بیچ

کئی سال میں نازل ہوا۔“ (۸)

”اصل قرآن قبل تنزیل حضرت کے قلب پر انوار ہو چکا تھا مگر اس کی تبلیغ کا حکم نہ تھا بلکہ تبلیغ کے لئے جو نازل ہوا ہے وہ رفتہ رفتہ ضرورت کے اعتبار سے ہوا۔“

”پہلے خدا کی ذات سے لوح محفوظ میں دفعۃً نازل کیا گیا

پھر جبریل کی ذات میں رفتہ رفتہ نازل ہوا۔“ (۹)

یہ تو ہیں اُن علماء کے نظریات جو تحقیقی قیاسات سے کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور اپنے استنباط کو قطعی قرار دیتے ہیں۔ ہم قرآن کو پیغمبر اسلام کی ذات گرامی سے علیحدہ کر کے سوچنا بھی ایمان کی نقیض سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک تو حضورؐ کے لئے نہ قرآن اجنبی تھا اور نہ جبریلؑ۔ قرآن کا ایک ایک لفظ آنحضرتؐ کے علم و یقین میں تھا اور جبریلؑ تو وہ تھے جنہوں نے خود محمدؐ کو در کنار محمدؐ کے نور کو جبین آدمؑ پر چمکتے دیکھ کر سجدۂ تعظیم کیا تھا۔ پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جن والنس اور ملائکہ سب سرکارِ دو جہاں کے حلقہ بگوش اور اُمتی تھے اور ان کا درجہ بارگاہِ خداوندی میں حضورؐ کے مقابلے میں اتنا کم تھا کہ شبِ معراج ایک منزل پر پہنچ کر جبریلؑ نے کہا تھا، اب آگے جاؤں گا تو میرے پر چل جائیں گے۔

غائرِ حوائس وحی کا پہلا نزول جس طرح بیان کیا جاتا ہے، وہ نہ صرف نیرت خیر ہے بلکہ تعجب انگیز بھی۔ ہر مودخ یا تذکرہ نگار واقعہ کو ایک ہی طرح لکھتا ہے۔ تین یا آٹھ ربیع الاول، سن ام عام الفیل بروزِ دو شنبہ ملک نمودار ہو کر اپنا تعارف کراتا ہے۔ میں جبریل ہوں۔ خدا نے آپ کو

رسالت کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ جن واس کو دعوت توحید دیجئے، پھر جبریلؑ سورہ اقرار پڑھنے کو کہتے ہیں۔ آپؐ جواب دیتے ہیں کہ میں پڑھنا نہیں جانتا جبریلؑ آپؐ کو سینے سے لگا کر بھینچ لیتے ہیں اور تین مرتبہ اس عمل کو دہراتے ہیں آپؐ پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں اور تب جا کر سورہ اقرار کی تلاوت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

بات بالکل واضح ہے کہ آپؐ جبریلؑ کو پہنچاتے نہ تھے اور نہ کبھی ان سے واسطہ پڑا تھا۔ جبریلؑ نے رسولؐ بنائے جانے کا جو مشورہ سنایا، اس کا بھی حضورؐ کو کوئی علم نہ تھا اور پڑھنے کا جہاں تک تعلق ہے، جبریلؑ کسی رسم الخط میں شاید کوئی نوشتہ لائے تھے ورنہ بات اگر زبانی ہوتی تو اس موقع پر اُمت کا اظہار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر جب جبریلؑ نے اپنے بازوؤں میں لے کر زور سے بھینچا اور پسینے میں شرابور کر دیا تو آپؐ میں صلاحیت پیدا ہو گئی۔ کتنی بوالعجبی ہے!

ادراس کے بعد جو واقعات لکھے جاتے ہیں، انہیں دیکھ کر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آپؐ ہانپتے کانپتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں۔ خدیجہ الکبریٰؓ آپؐ کو ڈرا سہما پا کر تسکین دیتی ہیں پھر ورنہ بن نوفل کے ذریعہ دلجوئی کرتی ہیں آنحضرتؐ کے سلسلے میں ہماری تحقیق اور ہمارا عقیدہ جامعہ بشری اختیار کرنے تک تو متناجلا ہے مگر ولادت کے بعد سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر نبی اور امام تلمیذ الرحمن ہوتا ہے اور دنیا کی ہر مروج زبان سے واقف۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے گہوارے میں اعلان کیا تھا کہ میں عبد اللہ ہوں، خدا نے مجھے کتاب دی ہے۔ حضورؐ چونکہ ختم المرسلین تھے اس لئے دنیا میں آنے سے قبل بھی نبی تھے اور جانے کے بعد بھی قیامت تک نبی رہیں گے۔ اس لئے ہم آج بھی یا رسول اللہؐ کہہ کر سلام کرتے ہیں آپؐ جب دنیا میں تشریف لائے تو نبی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جب تک اہل مکہ

کے ذہنوں کو اپنا پیغام سننے کے قابل نہیں بنالیا، اور صادق و امین ہونے کا لقب حاصل نہیں کر لیا، اس وقت تک اپنے مشن کا آغاز نہیں کیا۔

قرآن حضور کے خمیر میں رچا بسا تھا اور فرشتگان رحمت تابع فرمان پھر بھی پیکر انسانی میں جبریل سے آپ کی ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی لہذا ایک لحظے کے لئے اجنبیت کا اظہار ناممکن نہیں ہے اور قرآن کے بارے میں تو یہ مسلم ہے کہ پہاڑ پر نازل ہونا تو یزہ یزہ ہو جاتا، اس لئے حضور کے مادی جسم پر بھی کچھ اثر پڑ سکتا تھا، نہ کہ وہ کیفیت جو بیان کی جاتی ہے تاہم جناب خدیجہ کے سامنے صورت حال کا اظہار بر بنائے مصلحت بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ پہلی خاتون تھیں جنہیں دائرۂ اسلام میں داخل ہونا تھا مقصود اس رائے زنی کا صرف اتنا ہے کہ نزول وحی سے جو سراسیمگی اور بدحواسی عموماً بیان کی جاتی ہے وہ کسی نئے آدمی میں تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس رسول میں ہرگز نہیں جو قبل تخلیق آدم بھی نبی تھا اور عرش و فرش سب جس کی آنکھوں کے سامنے پیدا ہوئے تھے البتہ جسم انسانی کسی حد تک متاثر ہو سکتا تھا تو وہ ہوا۔ گھر پہنچتے ہی آپ نے جناب خدیجہ سے چادر طلب کی اور قدرے خستگی کے عالم میں چادر اوڑھ کر لیٹ رہے۔ ایک غیر مسلم مصنف کے محسوسات ملاحظہ ہوں۔

”ذاتِ باری تعالیٰ کی نسبت حضرت محمدؐ کے وسیع تر تصور کو اس زمانے کی ذہنی فضا سے جو تعلق قدرتی طور پر تھا، صرف اس سے اس امر کی کچھ توجہ نہیں ہوتی ہے کہ آپ کو جو مہتمم بالشان الہیات ہوئے، ان کے باوجود آپ نے اپنی سلامتی طبع اور ضبط نفس کو قائم رکھا۔“ (۱۰)

اس کے بعد جناب خدیجہ کا در قد بن نوفل کے پاس آنحضرتؐ کو لے جانا دل میں چھپی ہوئی دہشت کو دور کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ ایک طرح

سکا اعلان رسالت تھا جو آنحضرت و رقبین فو قل کی زبان سے کرانا چاہتے تھے تاکہ کچھ لوگ اس پیغام سے آشنا ہو جائیں جو آگے چل کر آپ کو دعوتِ ذی العشرہ میں دینا تھا۔

ورقبین فو قل ایک کہن سال بزرگ تھے، انجیل و زبور اور ادیانِ مابقی کے عالم، جن کی ساری زندگی، حق کی جستجو میں، غور و فکر کرتے گذر گئی تھی۔ انہوں نے آپ سے سارے واقعات سنتے ہی کہہ دیا۔

”میں اُس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جس کے قبضے میں ورقہ کی جان ہے، کہ خدا نے تمہیں اس قوم کا نبی منتخب کیا ہے۔ تم پر ناموس اکبر نازل ہوا ہے۔ لوگ تمہیں جھوٹا کہیں گے، تمہیں ایذا پہنچائیں گے، تمہیں جلا وطن کریں گے اور تمہارے ساتھ جنگ کریں گے۔ کاش میں اُس دن تک زندہ رہتا تو یقیناً تمہارے لئے جنگ کرتا!“ (۱۱)

پھر نزلِ وحی کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور یکے میں صادق و امین کے متعلق چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ کوئی کہتا وہ جھوٹ تو نہیں بول سکتا، کوئی آپ کو فاجر العقل قرار دیتا۔ حتیٰ کہ وہ ساعت آگئی جو قادرِ مطلق کی طرف سے اعلانِ نبوت کے لئے متعین ہوتی تھی۔

تنزیلِ قرآن کا دورانیہ تیس سال ہے اور یہی مدت تبلیغِ رسالت کی کہی جاسکتی ہے۔ اس عرصے میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے، جن بد لے، سرکشوں کے سرخم ہوئے اور وہ لوگ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے جن کے دل و دماغ اسلام کی حقانیت قبول کرنے کے اہل نہ تھے پھر حجتۃ الوداع میں تکمیلِ دین کے بعد سرورِ کائنات کی حیاتِ مادی بھی ختم ہو گئی۔

اب عام مسلمانوں نے قرآن اور سنتِ رسول کو مشعلِ راہ بنایا۔ پیغمبر

کی عمل زندگی کے دیکھنے والے موجود تھے جو حضور کو انہی اور ابدی رسول مانتے تھے اور وہ لوگ بھی جو آپ کو اپنا سائبشر سمجھتے تھے۔ اقوال رسول ان سب کے حافظے میں تھے اور ہر ایک نے اپنی فہم کے مطابق ان کے معنی نکالے تھے۔ احادیث کا تسلسل تقریباً ڈیڑھ سو سال جاری رہا، اور ان میں مصلحت آمیز سیاسی اقوال بھی شامل ہوتے رہے۔ آیات قرآنی چونکہ تنزیل کے بعد ہی لکھی جاتی تھیں لہذا ان میں کوئی رد و بدل نہ ہو سکا۔

کاغذ چین میں بن چکا تھا لیکن عموماً عرب میں دستیاب نہ تھا لہذا جو کچھ لکھا جاتا، وہ پتھر پر، لکڑی پر، ہڈی پر، چمڑے پر یا چمڑی پر۔ آیات قرآنی بھی اسی طرح قلم بند کی گئیں اور موقع سے انہیں سوروں کی شکل میں تشکیل دیا جاتا رہا۔ نتیجے میں ترتیب نزول باقی نہ رہ سکی۔

کہا جاتا ہے کہ دور جاہلیت عربی زبان کا فصیح ترین دور تھا اور عربوں کو اس پر اتنا غرور تھا کہ وہ غیر عرب کو عجبی کہتے تھے اس لئے ایران کا نام انہوں نے عجم رکھ دیا تھا۔ قرآن اسی دور میں نازل ہوا مگر اس کی فصاحت نے عربوں کو دنگ کر دیا اور جب انہیں اس سبب سے تعلقات کے مقابلے پر لایا گیا تو عربوں کو کہنا پڑا۔ ماہذا کلام البشتر

لکھنے کی حد تک اس زمانے میں عربی کے سات قسم کے حروف رائج تھے لہذا تنزیل آیات کے وقت جو کاتب موجود ہوا اس نے ان حروف میں تحریر کیا، جو اس کو معلوم تھے۔ اس طرح مختلف آیات مختلف حروف میں قلم بند ہو گئیں۔ تدوین قرآن کے موقع پر یہ دشواری پیش آئی کہ ایک قرآن کو سات قسم کے حروف میں کیونکر لکھا جائے؟ اس لئے حروف کی ایک قسم منتخب کی گئی اور اس میں قرآن کو لکھوایا گیا۔

”حضرت عثمان نے قرآن جمع شدہ کو نقلیں کرا کے ممالک میں بھیجا اور اس امر کا التزام کیا کہ وہ حروف سبعہ، جن پر قرآن

نازل ہوا، ان میں سے ایک حرف فصیح کو تمام ممالک اسلامیہ میں رواج دیا جائے اور دیگر حروف رائج نہ کئے جائیں تاکہ اختلاف نہ ہو اسکے التزام کے باعث اور اس خدمت کے سبب جو نقول کر کے ممالک میں قرآن ارسال کئے گئے، حضرت عثمان جامع قرآن مشہور ہوئے، ورنہ قرآن عہد نبوی میں مرتب ہو چکا تھا اور عہد صدیقی میں اس کی نقل کی گئی تھی البتہ اس میں مختلف حروف تھے اور وہ سب عہد عثمانی میں دُور کر دیئے گئے، ایک حرف شافی رہ گیا جس میں نہ تبدیلی ہوئی نہ تخصیص، نہ زیادتی نہ کمی۔ (۱۲)

اس تحقیق میں یہ اضافہ بے محل نہ ہو گا کہ حروف کی قرأت میں بھی فرق تھا جس کی تصحیح اپنے نقطہ نظر سے کی گئی۔

مولانا عبد الباقی ایک دوسرے مقام پر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس کی تصدیق علامہ عبد الحق محدث دہلوی کی مدارج النبوت سے ہوتی ہے ”مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع قرآن ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان جامع سور ہیں۔“

یہی قرآن فی زمانہ مروج ہے۔ حضرت علی نے بعد وفات سرکارِ عالمین جو قرآن بترتیب نزول مرتب فرمایا تھا اس کے بعض حصوں کی نقول یوں کے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اصل قرآن حضرت حجت اپنے ساتھ لے کر آئیں گے۔ ترتیب نزول نہ ہونے کے باوجود موجودہ قرآن ہمارے لئے مکمل مرکز ایمان ہے۔

عقیدے کی اساس

یہی قرآن مجید وہ اساسی دستاویز ہے جس میں توحید و رسالت اور امامت کے مضمرات و براہین پائے جاتے ہیں اور ایک عقیدے کے لوگ اس کو اپنی رہنمائی کے لئے کافی قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس فیصلے سے

اختلاف نہ کیا جاتا بشرطیکہ عام اذہان میں درک معنی کی صلاحیت ہوتی۔
 بات بالکل سامنے کی ہے کہ قرآن کلام الہی ہے جو محکمات اور متشابہات
 پر مشتمل ہے اور جس میں حروفِ مقطعات میں بعض اشارے بھی ملتے ہیں
 مسئلہ صرف زبان دانی کا نہیں ہے بلکہ اسرارِ علوم کا ہے جن کو صرف معلمِ حقیقی
 جانتا ہے یا اس کو معلوم ہے جسے معلم نے بتایا ہو۔ ہمارے عقیدے میں نبی
 اور امام تلمذہ الرحمن ہوتے ہیں۔ کلامِ رحمن کو بجا طور پر وہی سمجھ سکتے ہیں
 آیات کا سیاق و سباق جس کے علم میں نہ ہو وہ مفہم کو کما حقہ سمجھ ہی نہیں
 سکتا۔ اس لئے قرآنی الفاظ کی خاموشی سے صوتی و تصویری آہنگ کو سمجھ
 بغیر جو اٹھتا ہے وہ ایک نیا افسانہ بنا لیتا ہے۔ ان افسانوں کے سامنے
 اگر قصہ واقعی بیان کیا جائے تو اس کو چھوٹا سمجھایا جاتا ہے۔ لہذا ہم نے
 اپنے عقائد میں ایسے وارثانِ قرآن کو جگہ دی ہے جو منصوص من اللہ ہوں
 اور نسیان و خطا سے مبرا ہوں۔

اس طرح توحید و قرآن پر ہمارا مسلک تقریباً وہی ہے جو مسلمانوں
 کے دیگر مکاتبِ فکر کا ہے۔ ذاتِ رسالت بھی کچھ زیادہ مختلف فیہ نہیں ہے
 لیکن رسالت کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ ہمارا رسول عالمِ نور میں بھی
 خاتم النبیین تھا اور حیاتِ انسانی کے بعد بھی تا ابد خاتم رہے گا۔ مادی
 زندگی میں جسمانی لحاظ سے تو وہ ہمارا جیسا تھا لیکن بات بغیر وحی ہرگز نہ
 کرتا۔ اس کی نشست و برخاست، نقل و حرکت، لین دین، اخوت و
 موافقت سب مشیت کے تابع۔ زندگی انسانی تھی مگر ہر عمل پابندِ الہی
 بشر تھا مگر بشری زندگی کی ہر سانس خدا کے لئے سوتے جاگتے، حضر و سفر
 گھر باہر، ہر جگہ پیغمبر۔ جس طرح رزاقِ حقیقی کافرو مومن ہر ایک کو رزق
 دیتا ہے، اسی طرح ہمارے نبی نے مومن و منافق سب کو اپنی بزم میں جگہ
 دی تھی کہ شاید کوئی کمی وقت نہ دھر جائے۔ رحمت لالہ العالین کی شان

بھی یہی تھی کہ اعلان کفر کئے بغیر کسی کو کافر قرار نہ دیا جائے اور خود اپنی طرف سے اعلان کفر کرنے کا موقع فراہم نہ کیا جائے۔

خلاق عالم نے بلاشبہ کسی عورت کو پیغمبری کا منصب عطا نہیں کیا لیکن بیشتر انبیاء کے ساتھ خواتین کے لئے ایک نمونہ تقلید ضرور پیدا کیا جو حضرت حوا سے شروع ہوتا ہے اور ہاجرہ، سارا، آسیہ اور مریم سے ہوتا ہوا جناب فاطمہ زہرا تک پہنچتا ہے۔ عورت کے لئے اگرچہ خطا سے مبرا ہونا ضروری نہیں ہے مگر یہ شرف صرف جناب فاطمہ زہرا کا ہے کہ پیغمبر نے اپنے کے باوجود آپ کو صاحبِ تطہیر ٹھہرایا گیا۔ خود رسولِ اکرم کی نگاہ میں اتنا محترم قرار دیا گیا کہ آپ کا لقب معصومہ پڑ گیا۔

فاطمہ بلاشبہ شریک رسالت نہ تھیں مگر شریکِ کار رسالت ضرور تھیں

توحید و رسالت کے اس عقیدے کے بعد امامت کی منزل ہے جو ہمارے لئے حکمِ رسول کی تابع ہے بلکہ حکمِ الہی کا درجہ رکھتی ہے۔ شاید اسی لئے خداوند عالم نے رسالت کے ساتھ ہی اس کا التزام بھی کیا تھا نبوتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ختم ہوئے الٰہی سچے اور اس نے اسلام قرآن کے تحفظ کا وعدہ کیا ہے وہ خود جسم و جسمانیات سے مبرا ہے کسی مقصد کے لئے اسبابِ فراہم کرتا ہے۔ خود کبھی نہیں آتا، لہذا اس نے اپنے محبوب کے ساتھ تیرہ نور اور خلق فرمادیئے جو قیامت تک اس کے دین کے محافظ رہیں اور جو روئے زمین پر اس کی حجت قائم کریں۔

ہمارے اماموں کا سلسلہ انبیاء کی طرح اللہ کی طرف سے قائم ہوا تھا۔ ان میں سے کوئی نبی یا رسول نہ تھا مگر ہر ایک صاحبِ عصمت۔ ان کا کام تو یکے بعد دیگرے شریعتِ محمدی کو بچانا تھا اور فرض تھا کہ دنیا جب دین کی صورت بگاڑنے کی کوشش کرے تو وہ دین کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں ان کی زندگیاں اپنی زندگیاں نہیں تھیں وہ تو جیتے تھے تو خدا کے لئے اور

مرے تو خدا کے لئے جس طرح پیغمبر کوئی لاؤ لشکر لے کر نہیں آتا۔ ہمارے امام بھی اسی طرح تنہا منصبِ دین لے کر آتے رہے اور پیغمبر کی متعینہ حدود میں صراطِ مستقیم پر قدم آگے بڑھاتے چلے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام ہمارے عقیدے میں پہلے امام ہیں جنہیں نائبِ رسول یا خلیفہ نبی جو بھی نام دیا جائے مگر وہ نام ہو گا اللہ ہی کی طرف سے، اور ان کے جانشین حسنؑ، حسینؑ، سید شجاعؑ، باقرؑ، جعفر صادقؑ، موسیٰ کاظمؑ، علی رضاؑ، محمد تقیؑ، علی نقیؑ، حسن عسکریؑ، مہدیؑ آخر زمان تمام کے تمام اسی منصب پر فائز ہیں۔ ہمارے عقیدے میں سب امام ہیں اور خلاقِ عالم نے انہیں آنحضرتؐ کی جانشینی کے لئے پیدا کیا ہے۔

یہ ائمہ منصوص اللہ ہیں۔ ان کا کسی سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ دنیا کسی کو خلیفہ بنائے یا کوئی اپنی طاقت سے کسی ملک پر قبضہ کر لے، ائمہ کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا۔ انہیں تو تحفظِ دین کرنا تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کرتے رہے اور اتنے گہرے نقوش قدم چھوڑ گئے جو قیامت تک ہمارے لئے مشعل رہیں گے۔

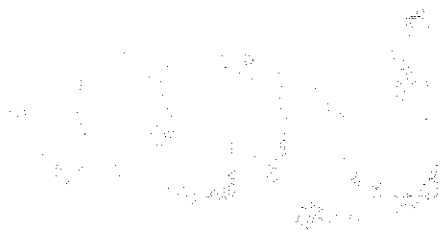
ان عقائد کا یقیناً مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے اختلاف ہے۔ وہ ختمی مرتبت کے بعد کسی کو منصوص من اللہ نہیں مانتے لیکن دینی قیادت کیلئے امام کی ضرورت کا احساس اول دن سے پیدا ہو گیا تھا جو فی النور شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن تقریباً پونے دو سو سال بعد خود ساختہ امام وجود میں آ گئے۔

خلافت سازی کو وقت کا تقاضا کہا جاتا ہے اور امامت دین کی ضرورت اب یہ اپنے اپنے فہم کی بات ہے کہ خدا کے دین کے لئے خدا کے بھیجے ہوئے اماموں کو نہ مانا جائے بلکہ خود اپنے امام بنا لئے جائیں۔ دین اگر انسان ساز ہوتا تو انسان ساز امام کا جواز پیدا ہو جاتا مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دین خدا کا اور امام انسان کا۔ پیغمبر خدا کا اور خلیفہ انسان کا!

نتیجہ جو نکلتا چاہیئے تھا، وہی نکلا کہ انسان کی بنائی ہوئی خلافت آخری منزلوں میں ٹھوکریں کھا کر ختم ہو گئی اور انسان ساختہ امامت چھوٹی بڑی مساجد میں پڑھے لکھے یا جاہل امام صاحب کی ذات پر ختم ہو گئی۔

خدا سزا امامتِ امام آخر کے وجود سے باقی ہے — اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ”امام مہدی“ پیدا ہوں گے۔ وہ اسفیں آخری خلیفہ اور آخری امام تو مانتے ہی ہیں۔ ہمارا ایک مودیانہ سوال ہے کہ آخری خلیفہ اور آخری امام تو خدا کی طرف سے آئے گا۔ پہلا امام اور پہلا خلیفہ آپ کی طرف سے کیوں؟ مقصود محض اعتراض نہیں ہے بلکہ بات افہام و تفہیم کی ہے۔ آپ نہ سمجھیں تب بھی ”اسلام کی رسی“ ہمارا آپس کا مضبوط رشتہ ہے۔

ہماری تاریخ



رسالت کا پس منظر

یوں تو ہماری تاریخ اس مبارک لمحے سے شروع ہوتی ہے جس میں خالق مطلق نے نور محمدی کو خلق کیا لیکن بات چونکہ حدود زمان و مکان سے باہر تھی۔ اس لئے صحیح معنی میں خلقتِ آدم کو نقطہ آغاز بنانا بے محل نہ ہوگا بلکہ وہ دن ہماری تاریخ کا پہلا دن تھا جب آدم زمین پر اتارے گئے اور بطنِ تو اسے ابنائے آدم کا سلسلہ شروع ہوا۔

نسلِ انسانی کا دورانیہ، آدم و خاتم کے مابین اتنا طولانی ہے کہ اس میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گزر جاتے ہیں۔ یہ پیغمبر کثرۃ ارض کے ہر حصے میں نازل ہوئے۔ خدا نے کسی خطے کو محروم نہیں رکھا۔ قرآن مجید نے ایشیا کے نصف مغربی حصے سے لے کر وادیِ نیل تک کے بعض انبیاء کے نام محفوظ کر دیئے ہیں۔ دنیا کے باقی حصوں کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ چین، ایران، ہندوستان اور مشرقِ بعید میں جو برگزیدہ ہستیاں گزری ہیں اور جن کے حالات ہزاروں سال کی گودیں اٹے ہوئے ہیں وہ یقیناً خدا کے فرستادہ ہادی ہوں گے۔ یقیناً شمس، سائرس، زرتشت رام چندر، کرشن اور گوتم جیسی اُن گنت شخصیتیں ہیں جنہوں نے بنی آدم کی ہدایت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ وقت کے طویل فصل سے ان کی تعلیمات صحیح ہو گئیں اور آج جو مسالک اور مذاہب ان سے موسوم ہیں ان میں توحیدِ شرک کی بھول بھلیوں میں ضم ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ تباہی اس لئے بھی قابل قبول ہے کہ حضرت عیسیٰ اور خاتم المرسلین جو ماضی کے قریب ترین پیغمبر تھے اور جن کو ابھی دو ہزار سال بھی پورے نہیں ہوئے، ان کی تعلیمات اور حالات روایتوں کے انبار میں اس طرح خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں کہ بعض وقت کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بات ہے عام لوگوں کی ورنہ ہماری حد تک تو ایک سیدھا سا دھارا راستہ ہے کہ ہم اس روایت کا یقین کرتے ہیں جو ہمارے آئمہ ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام دونوں کے بارے میں ہمارا موقف یہی ہے اور ان دونوں کے متعلق ہم نے جو کچھ سمجھا ہے اور جس پر یقین رکھتے ہیں وہ اسی روشنی میں، جو سرور کائنات سے حضرت علیؑ تک حضرت علیؑ سے امام حسنؑ تک، امام حسنؑ سے امام حسینؑ تک پہنچی اور پھر سلسلہ آئمہ میں آگے بڑھتی رہی۔ دوسروں کے اقوال بھی یقیناً درخور اعتناء ہیں لیکن صرف اس صورت میں، جب وہ اقوال آئمہ سے متصادم نہ ہوں چنانچہ ہمارے اسلام کی نوعیت وہی ہے جو ہمیں ہمارے آئمہ نے بتائی ہے پیغمبر کی ذاتِ گرامی کی عظمت ہماری نظر میں خدا کے بعد ہے جس کی تعلیم ہمیں دی گئی ہے اور آپ کی مادی زندگی کی عملی تصویر، جو ہمارے سامنے ہے ہم اس کو انہیں اولوں سے دیکھتے ہیں جو ہمارے جذبہ ایمان سے تشکیل پائے ہیں۔

کوئی انہیں انسانوں کے درمیان رہتے بٹتے دیکھ کر اور جامہ بشری میں پا کر اپنا سا بشر قرار دے دے لیکن ہمارے لئے آپ پیکرِ بشریت کا ایک شالیہ تھے، سراپا عصمت، مجسم صدق و صفا، جن کی ہر بات قابلِ تقلید اور ہر عمل دلیلِ ایمان تھا۔

سلسلہ نسب

آپ کا نور پشتِ الباشر سے جنابِ شیدت میں منتقل ہوا اور حضرت آدمؑ نے اپنے بیٹے شیدت سے آخری وقت میں وصیت فرمائی۔

”اس نورِ مبارک کو پاک بیبیوں میں منتقل کرنا بعد میں حضرت شیدت نے اپنے فرزند، جن کا نام انوش تھا، بھی وصیت کی اس طرح اس وصیت کا سلسلہ ایک قرن سے دوسرے قرن تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ نورِ مبارک حضرت عبدالمطلبؑ کے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہما تک آیا۔“ (۱۳)

محدث دہلوی نے آگے چل کر وضاحت فرمائی ہے اور سنن بیہقی کے حوالے سے آنحضرت کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ میں جاہلیت کی کسی برائی سے متولد نہیں ہوا حتیٰ کہ ہمیشہ اسلامی نکاح ہی سے پیدا ہوا۔

آپ کا شجرۂ نسب حضرت آدمؑ سے چلتا ہے تو شیدت، انوش، قاتن، مہلائیل، یرو، ادریس، متوشلح، ملک، نوح، سام، ارغخشہ، شالغ، عا میر، فالغ، ارغو، شاروخ، ناخو، تارخ اور ابراہیم سے ہو کر اسمعیل تک پہنچتا ہے جن میں بعض اتنے ادولوا العزم پیغمبر گزرے ہیں کہ محتاجِ تعارف نہیں حضرت سام کے نانا تو بے بیٹے تھے جن میں ارشد پہلے اور ارغخشہ دوسرے تھے۔ حضرت ہود، صالح اور ابراہیم انہی کی نسل سے ہیں اور عرب کے بیشتر قبیلوں کا سلسلہ نسب انہی سے جا کر ملتا ہے۔

حضرت اسمعیل سے حضرت عبدالمطلب تک جن بزرگوں کے نام آتے ہیں وہ عرب کی تاریخ میں وحدانیت کا علامہ ہیں۔

اسمعیل، قیدار، حمل، بنت، سلیمان، صبیح، یسع، ادو، آد، عدنان، معد، نزار، مضر، الیاس، مدرکہ، خزیمہ، کنانہ، نضر، مالک، فہر، غالب، لوی، کعب، مرہ، کلاب، قصی، عبد مناف، ہاشم، عبدالمطلب۔

آبار و اجداد کا یہ سلسلہ یقین کے ساتھ مکمل سلسلہ انبیاء تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ان میں کی ہر فرد سیرت و کردار میں ممتاز اور خدا سے واحد کی قائل تھی حسب نسب میں پاک و پاکیزہ تھی اور صلب طاہر سے پیدا ہوئی تھی حیرت عائنہ سے روایت ہے۔

رسول خدا نے جبریل سے نقل کیا کہ میں نے زمین کے مغرب
مشارق کو دیکھا ہے مگر کسی شخص کو محمد مصطفیٰ سے افضل نہیں
دیکھا اور کسی کی اولاد کو میں نے نہیں دیکھا جو بنی ہاشم سے
افضل ہو۔ (۱۴)

نسب کی اس فیضیت کے بعد حضور کے اسلاف میں کسی کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا خواہ وہ عبد المطلب ہوں، عبد اللہ ہوں یا الیو طالب۔
ماؤتی زندگی اور بعثت کے لحاظ سے حضرت آدم اول البینین اور آخرت
ختم المرسلین تھے۔ دیگر انبیاء اور رسل کے زمانے ان دونوں کے مابین ہیں جن
کے ادوار کا تعین قدرے مشکل ہے تاہم ابن خلدون نے فکر و تحقیق سے سنن
کا حساب لگانے کی کوشش کی ہے جس کو حتمی تو نہیں کہا جاسکتا مگر از روئے
قیاس زمانے اور علاقے کے متعلق ایک اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت آدم زمانہ نامعلوم، مقام غیر معین۔ ہندوستان نے جگوں کی تقسیم
کی ہے اس سے دنیا کی ابتدا لاکھوں سال قبل ہوئی تھی اور
انسانی عمر کا تخمینہ دس ہزار سال ہے۔ مورخ فرشتہ نے آدم
کا تعین سات ہزار سال ق کیا ہے اور شروع کے انسانوں
کی عمر ہزار بارہ سو سال بتائی ہے۔

حضرت شیث زمانہ نامعلوم، مقام غیر معین۔ ہندوستان میں اجداد کے
دیرانے میں ایک بہت ہی لمبی چوڑی قبر بنی ہوئی ہے جس کے
بارے میں مشہور ہے کہ حضرت شیث کی قبر ہے۔

حضرت ادریسؑ ۳۳۸۲ ق م تا ۳۰۱۷ ق م مقام عراق
 حضرت نوحؑ ۳۹۴۰ ق م تا ۱۹۹۸ ق م مقام عراق کہا جاسکتا ہے مگر
 طوفان کے بعد کی جگہ کا تعین نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابرہیمؑ ۲۱۶۱ ق م تا ۱۹۹۶ ق م عراق و شام و عرب
 حضرت اسمعیلؑ ۲۰۷۰ ق م تا ۱۸۷۷ ق م عراق و شام و عرب
 حضرت اسحاقؑ ۲۰۶۰ ق م تا ۱۸۸۰ ق م عراق و شام
 حضرت لوطؑ اردن

حضرت یعقوبؑ ۲۰۰۰ ق م تا ۱۸۵۳ ق م فلسطین و مصر
 حضرت یوسفؑ ۱۹۱۰ ق م تا ۱۸۰۰ ق م فلسطین و مصر

حضرت ہودؑ ۲۲۰۰ ق م حضرموت (عرب) قوم عاد
 حضرت صالحؑ ۱۷۹۷ ق م شمالی مغربی عرب و شام قوم ثمود
 حکیم قحطان ۱۶۰۰ ق م

حضرت الیاسؑ ۱۹۰۰ ق م

حضرت شعیبؑ ۱۵۵۰ ق م مدائن

حضرت موسیٰؑ ۱۵۳۰ ق م تا ۱۴۰۰ ق م مصر و علاقہ سینا

حضرت ہارونؑ ۱۵۲۳ ق م تا ۱۴۰۰ ق م ایدوم

حضرت داؤدؑ ۱۰۲۴ ق م تا ۹۶۲ ق م انجیل

حضرت سلیمانؑ ۹۹۰ ق م تا ۹۲۳ ق م حکومت شام و فلسطین و مصر

حضرت ایساؑ ۸۷۰ ق م تا ۸۴۰ ق م فلسطین و شام

حضرت یونسؑ ۸۱۷ ق م تا ۷۷۷ ق م تینوا و موصل

حضرت عزریہؑ ۵۸۵ ق م فلسطین و عراق

حضرت ذوالکفلؑ ۵۹۲ ق م عراق

حضرت عیسیٰؑ ۴ ق م

اس فہرست میں قدیم تہذیبوں کے مشاہیر کو شامل کر لیا جائے تو دس ہین ناموں کا اضافہ ہو جائے گا، مگر چین، ہندوستان، یونان اور ایران وغیرہ میں جو پیغمبر بھی مبعوث ہوئے ہیں، ان سے متعلق پورے یقین کے ساتھ کوئی معلومات فراہم کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے اتنے ہی پراکتھا کرنا پڑے گی اور اس عظیم انسان کا نام بکھنا پڑے گا جو ایک لاکھ چوبیس ہزار کا آخری ہندسہ ہے۔ خدا نے جس کو پہلے ہندسے سے قبل نور کا ایک مرکزی نقطہ بنا کر خلق کیا تھا اور آج بھی جس کے نام کی بزرگی خود بخود گردنوں کو خم کر دیتی ہے۔

حضور کے نور رسالت کا سفر کائنات کی زندگی سے طویل تر ہے۔ آدم سے عیسیٰ تک جتنے بھی پیغمبر گزرے، آپ کا سایہ رحمت ہر ایک پر سایہ فگن رہا۔ ایک دوسرے کو نوید سنا تا چلا گیا اور عیسیٰ چونکہ آخری پیش رو تھے لہذا عیسیٰ نے حیات چند روزہ میں اور صلیب کی بلندی پر بھی آپ کو یاد کیا۔ قوم کو اپنے پلٹ کر آنے کا مژدہ بھی دیا اور ناز فلیط کی آمد کی خبر بھی سنائی۔

کائنات ہزاروں سال سے منتظر تھی، خلائے آسمانی کے سیارے متعین راہوں پر چلتے چلتے تھک چکے تھے کہ اچانک عرش سے فرشتہ تک ایک نئی زندگی کے اہنار نمودار ہوئے۔ مومنین نے اپنے اپنے انداز پر ان تغیرات کا ذکر کیا ہے جو ارض و سما میں پیدا ہوئے مگر یہ محسوسات کی باتیں ہیں جن کو جامع الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ نظام فطرت میں جو انجانی لہریں اٹھی ہوں، وہ یقیناً اٹھی ہوں گی لیکن مشاہدے میں یہ ضرور آیا کہ ہر قفل کے محل کا ایک کنگرہ زمیں بوس ہو گیا اور ایران میں ڈھائی ہزار سال سے جلتا ہوا درخت کا آتش کہہ اچانک بجھ گیا جو مستقبل کی تاریخ کے لئے ایک اشارہ تھا۔

حضرت عیسیٰ کو گزرے ہوئے ۵۷۰ سال گزر چکے تھے۔ ابراہیم کے واقعہ کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ رئیس مکہ عبدالمطلب کی غم زدہ اور بیوہ بہو کے بطن سے ایک بچے کی ولادت ہوئی۔ دادا نے اس کا نام محمد رکھا۔

عرب کے ستارہ شناسوں نے جس طرح ایک نئے ستارے کو طالع ہوتا دیکھ کر پیدائش عیسیٰ کی پیشین گوئی کی تھی، اسی طرح فضاؤں کی فرحت خیز رنگینیوں پر اور کائنات کی ان دیکھی نشانیوں کا مشاہدہ کر کے آخری نجات دہندہ کے آنے کی خوش خبری بھی سنائی۔ عام الفیل کے پہلے سال ربیع الاول کی بارہویں یا سترہویں تاریخ تھی، دو شنبہ کو صبح صادق کا وقت تھا کہ تخلیق کائنات کا مقصد پورا ہوا۔ آسمان پر طلوع آفتاب سے قبل عبدالمطلب کے گھر سے ایک سوچ کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔

خود عبدالمطلب کو سوچتے جاگتے نو مولود کے لئے فطرت کے اشارے ملتے رہے تھے۔ آپ کا دل یاغ باغ ہو گیا اور آپ نے عبد اللہ کے درہم کے لئے اپنی آغوش کھول دی، جو غیر معمولی بشر ہونے کی ایک علامت سمجھا لایا تھا۔ اور ماں کے پیٹ سے حقنہ شدہ اور ناف بریدہ پیدا ہوا تھا۔

اسلاف

آپ کا نور بطون پاکیزہ اور اصلا ب مصلحہ سے گذرنا ہوا حضرت عبد اللہ تک پہنچا تھا۔ حضرت اسمعیلؑ سے حضرت عبدالمطلبؑ تک انیتس نشین گزر چکی تھیں۔ سلسلہ در سلسلہ اسلاف کے عقائد پر پوری روشنی ڈالنا تو ممکن نہیں لیکن اتنا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ سب کے سب مسکب ابراہیمی پر قائم اور یقیناً توحید پر دائم تھے۔

یوں تو حضرت اسمعیلؑ کے بعد جو بھی سردار قبیلہ ہوا وہ عزت و ناموری میں نمایاں رہا لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں جب عدنان نے بنی جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کی تو اطراف بنی مہمر اور ممتاز ہو گئے، ان کے بیٹے معد حجاز و نجد میں آباد بنی اسمعیلؑ کے مورث اعلیٰ بنے۔ پھر تیسری صدی عیسوی میں فہران کے جانشین ہوئے جن کا لقب قریش تھا اور وہی اس قبیلہ کے بانی ہیں۔ فہر کے بیٹے غالب بھی ایک مقبول سردار قبیلہ تھے پھر آنحضرت کے نسب

سلسلہ میں چار بزرگوں نے قیادت کا منصب سنبھالا اور پانچویں صدی عیسوی میں قصی بن کلاب کا دور آگیا۔ قصی ایک بلند حوصلہ، باہمت اور مدبر بزرگ تھے۔ اطراف و جوانب کے قبائل میں ان کی دھاک بٹھتی ہوئی تھی۔ شریک النفس شائستہ اور مہذب انسان تھے، انہوں نے خانہ کعبہ کی تولیت ہی نزاع سے حاصل کی۔ رفاہ عام کے لیے شمار کام کئے۔ شہداء میں قصی کے انتقال پر سب سے بڑے بیٹے عبدالدار ان کے جانشین ہوئے لیکن عملی طور پر اقتدار عبدالمناف کے ہاتھ رہا، چونکہ صرف انتظامی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ متقی اور مخیر بھی تھے ان کے دو بھائی عبد اور عبد العزیٰ بھی تھے۔ جناب خدیجہ عبدالعزیٰ کی تیسری پشت میں تھیں۔

عبدمناف کے انتقال پر آپ کی اولاد سے عبدالدار کی اولاد کا تنازعہ ہوا اور طے یہ پایا کہ رفاہ ستقایہ کی قیادت بنی عبدمناف کے پاس حجابیت اور لویا درمی کا منصب عبدالدار کی اولاد کا ہوگا اور دارالندوہ کی صدارت مشترک رہے گی۔

عبدمناف کے چار بیٹے تھے، نوفل، مطلب اور دو جڑواں بیٹے عمر و اعدا المعروف بنہ ہاشم اور عبد الشمس۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں اس طرح پیدا ہوئے تھے کہ ہاشم کے پاؤں کا پیچہ عبد الشمس کی پیشانی پر چپکا ہوا تھا جس کو تلوار سے الگ کیا گیا اور جو عرب کے شکون میں خوزیری سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

ہاشم صحیح معنی میں قصی کے جانشین تھے۔ اچھے نظم و نسق کے باعث آپ کی اقتصادی حالت بھی بہت اچھی تھی، آپ نے اُسے فراخ دلی سے خرچ بھی کیا۔ ایک شدید قحط کے موقع پر ایک خرید کر تقسیم کئے اور لوگوں سے کہا کہ اسے توڑ کر شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھاؤ، توڑنے کا عربی لفظ ہاشم ہے اس لئے آپ ہاشم مشہور ہو گئے اور قریش میں آپ کا خاندان بنی ہاشم کے نام سے موسوم ہو گیا۔

بنی امیہ

ہاشم کے شخصی جبروت اور خاندانی اثرات کے سبب عبد شمس و انقی ہاشم سے جلتا تھا۔ یہ رشک و حسد عبد شمس کے بعد اس کے بیٹے امیہ کے دور میں کھل کر سامنے آگیا جب بنی امیہ نے بنی ہاشم کے تریف قبائل بنی عدی اور بنی تیم سے رفاقت کا معاہدہ کر لیا۔ حضرت عمر عدی کی اولاد میں ہیں اور حضرت ابو بکر تم کی نسل سے۔ عبد شمس کی ہاشم کے مقابلے میں کوئی وجاہت اور قیمت نہ تھی لیکن امیہ نے اپنی ریشہ دوانیوں سے خاندان کا وقار قدرے بلند کیا اور بعض قبائل سے رسم و راہ پیدا کر کے بنی امیہ کو گناہ نہ رہنے دیا۔

ہاشم اور امیہ اگرچہ چچا بھتیجے تھے لیکن امیہ ہجرت ہاشم کو نچا دکھانے کی تدبیریں کیا کرتا۔ ایک بار اس نے دولت کے زعم میں ہاشم کو کچڑ اچھالی اور اپنے تفاخر کا اعلان کیا بالآخر طے پایا کہ خزاعی کا بن کو حکم بنایا جائے اور لوگوں کی موجودگی میں دونوں اپنے اپنے خاندانی فضائل بیان کریں۔ سماعت کے بعد کا بن جس کے حق میں فیصلہ دے، اس کو فریقِ مخالف کی طرف سے سیاہ آنکھوں والی پچاس اونٹیاں دی جائیں اور شکست خوردہ فریق دس سال کے لئے مکہ چھوڑ دے، نتیجے میں فیصلہ ہاشم کے حق میں ہوا، امیہ شام میں ہمدان ہو گیا اور ہاشم نے اونٹیاں ذبح کر کے اہل مکہ کو کھلا دیں۔

امیہ کے چار بیٹے تھے۔ ہشام، حرب، عاص اور سفیان۔ سفیان کے نواسے سعد بن ابی وقاص تھے، جن کا بیٹا عمر سعد کہلا گیا اور اوج شام کا سپہ سالار ہوا۔ عاص کے چار بیٹے، حکم، عمر، عثمان اور عثمان میں سے، عفان کے بیٹے عثمان تیسرے خلیفہ تھے اور حکم کا بیٹا مردان تھا۔ تاریخ کا مشہور کردار صحرا المعروف بہ ابوسفیان، حرب کا بیٹا اور امیہ کا پوتا تھا۔

ابوسفیان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، یزید، عتیبہ، معاویہ، رملہ اور میمونہ۔ میمونہ کی بیٹی حضرت ام لیلیٰ مادر حضرت علی اکبر تھیں رملہ سے طلحہ بن عبد اللہ ہوئے رملہ ہی ام المومنین ام حبیبہ تھیں۔

معاویہ خلیفہ تھا تعارف نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک خوش باب تحریر کیا۔

بنی ہاشم

قصی کے پدربزرگ کلاب کی ایک بیٹی تھیں زہرہ۔ جن کے بیٹے کا نام بھی عبدمناف تھا۔ ان کے بیٹے کا نام وہب تھا وہب کی بیٹی تھیں حضرت آمنہ جو حضور کی والدہ گرامی تھیں ہاشم عبدمناف کی تاریخ ساز اولاد میں تھے۔ فضلہ، الوصفی، اسد اور شیبہ یعنی عبدالمطلب۔ اسد کی بیٹی فاطمہ حضرت علی کی عالی مرتبت ماں تھیں جنھیں رسول اکرم بھی ماں کا درجہ دیتے تھے۔

عبدالمطلب کے بارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ دو بیٹیوں کے نام ہیں قثم اور جحل لیکن انہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، دس کے نام ہیں۔ حارث، الولہب، ابوطالب، زبیر، عبد اللہ، ہزار، عباس، مقوّم، الخندق اور حمزہ۔ بیٹیوں میں عائکہ، امیمہ، اردی، برہ، ام حکیم (البیضا) اور صفیہ۔ صفیہ کے یمن سے زبیر پیدا ہوئے جو جنگ جمل کے ہیرو تھے۔ حارث کی بیٹی کا نام بھی اردی تھا۔ الولہب نے تین بیٹے چھوڑے۔ معقب، عتیبہ اور عتبہ۔ حضرت ابوطالب کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ طالب، جعفر، عقیل، علی، امّ ہانی اور جمانہ۔ حضرت عبد اللہ نے محمد نام کا وہ درشاہوار چھوڑا، وقت کے محور جس کا نام ہمیشہ درخشاں رہے گا۔

ریحہ اور عرب کا معاشرہ

بطایموس نے شہر کو "مکورا" کا نام دیا تھا جو سبائی لفظ "مکربنی" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں معبد۔ اور معبد بلاشبہ خانہ کعبہ کی نسبت ہی سے کہا جاسکتا ہے۔ یہ شہر ایشیا کی یورپ سے ملانے والی "مصلح کی شاہراہ" پر بڑی اہمیت کا حامل تھا اور مآرب اور غزہ کے وسط کی منزل بھی تھا لہذا مشرق سے مغرب جانے والے اور مغرب سے مشرق کو آنے والے قافلوں کا مستقر بن گیا اور تجارتی لین دین کے سبب یہاں کے لوگوں کا مزاج کاروباری بن گیا۔ اس سے تجارت پیشہ طبقہ کسی حد تک نڈھمت ہو گیا تھا۔

آب و ہوا کے لحاظ سے مکہ، مدینہ اور طائف کو چھڑ کر پورے علاقے کا موسم بہت سخت ہوتا ہے اور گرمیوں میں درجہ حرارت تو اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ طنجہ کا مشہور سیاح ابن بطوطہ پایادہ طوافِ کعبہ کرنا چاہتا تھا مگر نہ سکا، کیونکہ پتھروں سے ایسی آگ نکل رہی تھی کہ پاؤں اس کی تاب لاسکتے۔

یوں تو پورے جزیرہ نما میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے لیکن بہت قدیم باشندے حامی نسل کے اور اس کے بعد آنے والے سامی تھے جو اسمعیل قبائل کہلاتے تھے۔

عرب دنیا کے بعض دوسرے حصوں سے زائد تو ہم پرست تھے پھر بھی ان کا ایک خاص قومی مزاج تھا۔ قبیلے سے محبت، عجیب و غریب خاندانی محبت، جذبہ انتقام بے رحمانہ سفلیں، طبیعت کی ادیج، جذبہ حریت اور اسی کے دوش بدوش روحانی بلندی پر دازی — اس کو جاہلانہ غیرت کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کسی نوجوان کا خسر بننے کے بجائے عرب اپنی بچیوں کو پیدا ہونے ہی مار دیتے تھے۔

روم، ایران اور ہندوستان کی طرح عرب کا معاشرہ بھی بہت گھناؤنا تھا۔ بلکہ دوسرے خطوں میں تو ڈھونڈھنے سے کچھ اخلاقی اقدار مل بھی جاتیں لیکن عرب میں ناپید تھیں۔ شراب گھسی میں پڑی ہوئی تھی، بدمستی میں ہر گناہ ثواب تھا عصمت بے قیمت تھی۔ ذمی عزت خاندانوں کی عورتیں نفس پروری کے لئے اپنا جامہ نسایت خود اتار پھینکتی تھیں، نظریں اس کی بھی مل جاتیں مگر کسی شہسوار کا نسلہ حاصل کرنے کے لئے دولت مند عورت خود اس کے پاس چلی جاتی، محرمات تک موقع محل سے جائز ہو جاتیں۔ عسکاظ کے میلے میں فاحشہ عورتوں کے کیمپ اور علت قوم لوط کا مظاہرہ کرنے والے عام تھے۔

ان دنوں کی اگر کوئی بات اچھی کہی جاسکتی تو وہ فنون کے مظاہرے تھے بالخصوص شاعری کے اعلیٰ نمونے جو فصحاء عرب پیش کرتے اور ایکٹ مرے پر بازی لے جاتے۔ عربی کے سات مایہ ناز قصیدے جو سعادت معلقات کہے جاتے ہیں، ایسے ہی مواقع پر منتخب ہوتے تھے اور خانہ کعبہ میں لٹکے ہوئے

تھے جو گویا دعوتِ مبارزت تھی طباعِ شعراء کے لئے۔

عقیدہ بھی بد اخلاقی سے مستثنیٰ نہ تھا۔ شرکِ توحید کا جزدین گیا تھا۔ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں، اجنہ کو الوہیت کے ہم پلہ، بتوں کو منظرِ خدا قرار دیا جاتا۔ بتوں کی پرستش عام تھی۔ لات، منات، ہبل اور عزرائیل بڑے با عظمت بت تھے اور ہبل تو خانہ کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔ ان کے علاوہ مصالحے اور لکڑی کے بنے ہوئے گھروں کی بت بھی تھے۔ مشہور بتوں کے ناموں پر سانڈ چھوڑے جاتے اور ان کے لئے انسانوں کی قربانیاں بھی ہوتی تھیں۔

یہ باتیں اس خطے کی ہیں جہاں حضرت ابراہیمؑ نے توحید کے چراغ جلائے تھے اور ماضی کے دھندلے میں جن کی روشنی دُور سے اب بھی دکھائی دیتی تھی۔ عیسائی اور یہودی قبائل میں عقائد کے مدھم نقوش پائے جاتے مگر ان کی اکثریت بھی صنم پرستی کی لت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ پھر بھی یہ نہیں جاسکتا کہ خدائے واحد کا تصور موجود ہی نہیں تھا۔ یقیناً ایسے لوگ بھی تھے جو حق کی جستجو میں جنگوں اور پہاڑوں میں کھل جاتے اور تزکیہٴ روح کے لئے جسمانی اذیتیں بھی برداشت کرتے ایک طبقہ وہ بھی تھا جو مسلکِ اسلامی پر سداً بعدِ نسل قائم چلا آ رہا تھا مگر ان خرافات کی مخالفت کرنے کی بہت اس میں نہ تھی یا شاید اُسے معلوم ہو کہ خدائے اس کام کے لئے جس کو متعین کیا ہے، وہ آنے ہی والا ہے۔

ایسے میں آخر وہ دن بھی آ ہی گیا کہ سلسلہٴ انبیاء اپنے اختتام پر پہنچا اور اسلام اپنی مکمل شکل میں کائنات کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

خدا نے انسان کو اپنی شناخت کے لئے پیدا کیا تھا اور اسلام کا مقصد بھی خدا شناسی ہے لیکن خود اپنے کو پہچانے بغیر خدا کو پہچانا نہیں جاسکتا۔ اس لئے آدمؑ سے عیسیٰؑ تک جو رسول بھی اپنی شریعت لے کر آیا، اس میں خدا اور انسان کی معرفت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ جس طرح ہر نبی سرور کائنات کا پیش رو تھا، اسی طرح ہر شریعتِ اسلام کا پیش خیمہ یہ تو وقت و وقت کی بات

ہے کہ ہر شریعت کے اصول میں زمانے کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا اور شریعت کے اساسی اصول کے ساتھ بعض وہ باتیں بھی شامل رہیں جن کی اُس دور کی ضرورت تھی، پھر ایک کے بعد دوسرا مسلسل ایک ترمیمی شریعت لے کر آگیا اور یہ تسلسل اس وقت تک باقی رہا جب تک خدا کا آخری پیغمبر اسلام کے نام سے مکمل پیغام الہی لے کر نہیں آگیا۔

واضح الفاظ میں حضور کی ذات گرامی تمام انبیاء و مرسلین ماضی کی سیرتوں کا مجموعہ ہے۔ قرآن اپنے دامن میں تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحف سماوی کو لئے ہوئے ہے اور اسلام خدا کا وہ دین ہے جو جزو پچھلے ہر دین میں شامل رہا اور بالکل آخر میں خاتم الادیان بن کر دُنیا کے سامنے آگیا۔

آنحضرت نے اس کی صراحت مختلف موقعوں پر کی ہے مگر خود اپنے بارے میں آپ کیا فرماتے، علیؑ کے لئے کہہ دیا۔ میں تو میں ہوں، ”اگر تم آدم کو ان کے علم میں، نوح کو ان کے تقویٰ میں، ابراہیم کو ان کی خلت میں، موسیٰ کو ان کی ہدایت میں اور عیسیٰ کو ان کی عبادت میں دیکھنا چاہو تو میرے بھائی علی بن ابی طالب کو دیکھ لو“

نہوارہ طفلی

خود حضورؐ نے اپنے سلسلہ نسب کے ظاہر ہونے کی تصدیق فرمائی ہے اس لئے عبدالمطلب یا عبد اللہ کے متعلق کسی بدگمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب آدم سے لے کر جناب عبد اللہ تک نکاح سے اصحاب کا آگے بڑھنا مسلم ہے پھر عبدالمطلب کے وحدانیت پر ایمان کا ثبوت واقعہ ابراہم سے ملتا ہے اور سورہ ”السمتراء کیف“ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

عبدالمطلب کا اصل نام شیبہ تھا۔ ۱۵ھ میں ہاشم کے وفات پانے پر آپ اپنے چچا مطلب کی تولیت میں آئے جو ہاشم کے بعد زفادہ اور نقایہ کے منظم تھے اور قدر و منزلت میں ”القیض“ کے لقب سے مشہور تھے، اہل مکہ نے غلطی سے

شہید کو مطلب کا غلام سمجھ لیا اور انہیں عبدالمطلب کہہ کر پکارنے لگے جو آگے چل کر ان کا نام ہی پڑ گیا۔

عبدالمطلب نے ۵۲ ع میں مکے کے سربراہ ہوتے اور بڑی خوش اسلوبی سے شہر اور نواح شہر کا انتظام دس آدمیوں کے سپرد کر دیا مگر قوم کی سیادت درحقیقت انہیں کے ہاتھ میں رہی۔ ایک عرصے کے بعد حبش کا نائب السلطنت ہاتھتوں کی ایک فوج لے کر مکے پر حملہ آور ہوا، اور نجد کے قبائل میں ایک دہشت پھیل گئی عبدالمطلب بڑے صبر و سکون سے حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ ایک دن انہوں نے ابرہہ سے ملنے کی خواہش کی اور ملاقات ہونے پر ابرہہ سے کہا: ”آپ کی فوج کے لوگ میری بیٹھڑیں ہنکا لائے ہیں، انہیں واپس کر دیں“ ابرہہ حیرت سے منہ دیکھنے لگا اور بولا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ آپ کیسے کو منہدم نہ کرنے کی بات کریں گے“ اس کا جواب عبدالمطلب نے بڑی تمنا سے دیا۔ ”میں اپنی چیز لینے آیا ہوں۔ کعبہ خدا کا گھر ہے، گھر والا خود اس کی حفاظت کرے گا“

اور ہوا دی کہ پہاڑیوں سے اباہیلوں کا ایک غول نکل کر ہوا میں بلند ہوا جن کے پنجوں میں کسکریاں دبی ہوئی تھیں۔ یہ کسکریاں اباہیلوں نے ہاتھتوں پر پھینکیں اور ہر کسکری ہاتھی کے جسم کو توڑ کر دوسری طرف بھل گئی۔ جس سے ہاتھت بھٹنے لگے۔ ابرہہ زخموں سے چور چور صنعا کی طرف بھاگ گیا اور وہاں جا کر مر گیا۔

ولادت یا سعادت

ایران میں نوشیرواں عادل کی حکومت کا بیالیسواں سال تھا حضرت عیسیٰ کو گزرے ہوئے پانچ سو ستر سال گزر چکے تھے۔ واقعہ فیل کا پہلا سال تھا کہ جمعہ صبح صادق کے وقت شعب ابی طالب میں نور ہدایت کا وہ آفتاب طلوع ہوا جو ازل سے روشن تھا اور جس کی روشنی ابد تک پھیلتی رہے گی۔

عبدالمطلب خدا پر الیقان کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ صبیح یقیناً اسی مسک پر عامل رہے ہوں گے۔ جناب عبد اللہ کی شادی آمنہ بنت وہب

سے ہوئی تھی۔ وہ فرماتی ہیں کہ ایک رات زمیں و آسمان مجھے منور و معطر نظر آنے لگے اور بعض انجانی آوازیں سنائی دینے لگیں کہ مجھے کرامت و شرف اور سعادت کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ یہ میرے لئے ایک مرشدہ جانفرا تھا، جس سے رگ رگ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن اس خوشی کو دیر پائی میسر نہیں آئی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد یرشپ کے سفر میں جناب عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت آمنہ کے شہرہ آفاق بیٹے کی ولادت کائنات کا ایک عظیم واقعہ ہے باپ کا سایہ اگرچہ سر پر نہیں تھا مگر دادا نے اس کی کو محسوس نہ ہونے دیا اور اتنی ستر کا اظہار کیا جیسے انہیں اپنے عبداللہ سے گراں قدر کوئی گوہر ہے بہا مل گیا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ شوہر کی وفات کا حضرت آمنہ پر اتنا اثر تھا کہ آپ کا دودھ خشک ہو گیا لہذا اتنا کی دستیابی تک ابو لہب کی کینز ثویبہ نے تین چار مہینے دودھ پلایا پھر ایک بدوی خاتون حلیہ سعدیہ عرب کے رواج کے مطابق اپنے قبیلے میں لے گئیں۔ یہ واقعہ بھی بہت سی دوسری باتوں کی طرح ہمارے پیغمبر کے لئے ہتک آمیز ہے۔ دُنیا کے کسی نبی نے اپنی ماں کے علاوہ غیر عورت کا دودھ نہیں پیا۔ پتا تو صرف ختم المرسلین نے، جن کی بعثت کے لئے خدائے قادر نے کائنات کو خلق کیا تھا اور پیش روی میں اتنے نبی بھیجے تھے۔ بطون اصلا ب کو پاک کھنے کے لئے اتنی احتیاط اور رگوں میں خون پیدا کرنے کے لئے ایک بدوی عورت کا انتخاب؟ جو موصد بھی نہیں کا فرہ تھی۔ مشیت کیا اس پر قدرت نہ رکھتی کہ آپ کے انگوٹھے سے دودھ کا کوئی فوارہ جاری کر دیتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دُنیا آپ کو ایک عام آدمی ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی لہذا اپنے مقصد کے لئے ایسی روایتیں گھڑیں جن کو ایک دوسرے سے نقل کرتا چلا آیا اور جھوٹ اتنی با بولا گیا کہ وہ آج سچ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے پر کتنی ہی معقول دلیل دی جائے کوئی اس کو ماننے پر تیار نہیں کیونکہ اس سے مقصد پر حرف آتا ہے۔

اسی طرح کی بعض دوسری روایتیں بھی اسلام کی تاریخ میں داخل کر دی

گئی ہیں، صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آپ ہمارے ہی جیسے ایک بشر تھے لیکن جادو سرچڑھ کر بولتا ہے، جھوٹ اور سچ کی آمیزش میں مورخین یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ آپ کی قوتِ نمونجیر العقول تھی، تین ماہ میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ سات ماہ کی عمر میں چلنے لگے، آٹھویں مہینے بولنے کے قابل ہو گئے اور نویں مہینے اچھی طرح بات چیت کرنے لگے کہ دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔

ماں کے دودھ کی کرامت دُنیا میں ضرب المثل ہے۔ بددی عورت کے دودھ میں یہ اعجاز تھا کہ اس نے رسول کا کام چند روز میں کر دکھایا۔ ابراہیم و موسیٰ کے لئے کسی دوسری عورت کا دودھ حرام تھا، جائز تھا تو صرف محمد مصطفیٰ کے لئے، لہذا کوئی کچھ لکھ عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی کہ بیشتر انبیاء تو ماں کی آغوش سے ہی ہوں اور خاتم الانبیاء پہلے تو صحرائی ماحول میں ایک غیر مسلم عورت کا دودھ پئیں پھر الگ تھلگ ویرانے میں چار پانچ سال گزاریں اور اسی زمانے میں شق الصد بھی کیا جائے۔ محدث دہلوی قلم بند فرماتے ہیں کہ

”آپ بکریاں چرانے کے لئے اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ گئے ہوئے تھے کہ تین خرنشے نمودار ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں برف سے بھرا ہوا طلائی ٹلٹ تھا، دوسرے کے ہاتھ میں زمر کی نگن میں برف تھی۔ ایک نے زمین پر لٹایا، سینے کو ناف تک چیرا، آنتوں کو نکال کر برف سے دھویا، پھر دل برآمد کر کے سیاہ نکتہ کو نکال پھینکا، ایک نوری انگشتری سے دل پر مہر لگائی، پھر ساری چیزیں اپنی اپنی جگہوں پر رکھ کر ننگات کو جوڑ دیا۔“ (۱۵)

گویا اس طرح آپ کے جسم کی تطہیر کی گئی۔ اتنے چھوٹے سے سن میں کوئی نام بچہ بھی گناہ سے آلودہ نہیں ہوتا تو اشرف الانبیاء کے متعلق تو ایسا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ عیسیٰ نے گوارے میں کہا تھا کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ مجھے کتاب دی گئی ہے۔ اُن کے سینے کو چاک کر کے کس نے طہارت کی تھی یا حضرت موسیٰ اور دوسرے

انبیاء کو کس تے پاک کیا تھا؟ بات صرف اپنا سبب ثابت کرنے کی ہے جس کے لئے روایتوں کا یہ التزام کیا گیا ہے۔

ہمارا عقیدہ ان خرافات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یقیناً ثوبہ اور حلیمہ کو آپ کی دیکھ بھال کے لئے رکھا گیا ہو گا لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ آپ نے جناب آمنہ کے علاوہ کسی کا دودھ پیا ہو۔ پھر یہ حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے کہ واقعہ شق الصدر سے خوف زدہ ہو کر حلیمہ سعدیہ آپ کو لے کر آگئیں لیکن جناب آمنہ نے پھر آپ کو قبیلہ بنی سعد میں واپس بھیج دیا، جہاں آپ نے مزید دو تین سال قیام فرمایا۔

ہم اپنی حد تک تو خواب میں بھی شق الصدر کو آپ سے منسوب نہیں کرتے۔ رہ گئی بات حلیمہ سعدیہ کے دودھ پلانے کی تو اس کو اپنے پیٹ پر ہتھان قرار دیتے ہیں ہمارے عقیدے میں دودھ صرف جناب آمنہ نے پلایا اور اس وقت تک ثوبہ آپ کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ پھر کچھ دنوں کے لئے حلیمہ سعدیہ کے پاس بھیج دیئے گئے۔ حلیمہ سعدیہ کے بعد ام ایمن آپ کی نگراں ہوئیں۔

آپ کی عمر ابھی بمشکل چھ سال کی ہوگی کہ سایہ مادری سے محروم ہو گئے اور حضرت ابوطالب کی رقیقہ حیات فاطمہ بنت اسد نے ماں کی جگہ لے لی۔ جناب فاطمہ نے اس دلجوئی سے آپ کی تربیت کی کہ آپ انہیں اپنی سگی ماں سمجھتے رہے

”مسلمہ میں ان کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کفن میں اپنی قمیص مبارک پہنائی اور قبر میں لیٹ کر اس کو ممبرک

کیا۔ لوگوں نے اس عنایت کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ ابوطالب

کے بعد سب سے زیادہ اسی نیک سیرت خاتون کا ممنون احسان

ہوں۔“ (۱۶)

جناب آمنہ کی وفات کے سلسلے میں ایک روایت ابو نعیم نہ ہری کی سند سے اسماء بنت جبریم سے منقول ہے کہ

”اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ سال کے بچے تھے

اور اپنی والدہ کے سر ہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضور کی تربیت و کفالت حضور کے دادا حضرت عبدالمطلب نے کی۔ حضرت عبدالمطلب آپ کو اپنے تمام فرزندوں سے زیادہ محبوب جانتے تھے اور کبھی آپ کے بغیر دسترخوان نہ بچھاتے جلوس و خلوت کے تمام اوقات میں حضرت عبدالمطلب کے پاس ان کی مسند پر جلوہ فرما رہتے تھے۔“ (۱۷)

آپ کی عمر ابھی اسی اسی سال کی تھی کہ دادا کی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ عبدالمطلب ۱۲۰ سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور عظیم المرتبت چچا ابوطالب ان کی کمی کو پورا کرنے لگے۔ ابوطالب کی سرپرستی آپ کے تربیتی دَور کا سنہرا باب ہے۔ آپ کے مالی حالات جناب عبدالمطلب کے مقابلے میں بہت کمزور تھے مگر آپ نے خانہ کعبہ کی تولیت اس رُعب و دبیدہ سے کی کہ اس شان کا کوئی غریب سردار آپ سے پہلے اور آپ کے بعد نہیں ملا۔ عبدالمطلب نے مرتے دم وصیت کی تھی:-

”ابوطالب! یہ تیرے حقیقی چچائی کا بیٹا ہے، اس کی حفاظت کرنا، اسے نورِ نظر اور لختِ جگر سمجھنا، اس کی خبر گیری میں کوتاہی نہ کرنا جان و مال سے اس کی اعانت کرنا اور دست و بازو سے تحفظ کرتے رہنا۔“

ابوطالب نے باپ کی وصیت کا جتنا پاس و لحاظ کیا، اس کی شہادت دینے پر دوست و دشمن سب مجبور ہیں اور جی نہ چاہنے کے باوجود بعض مورخین کو کھنکھنا پڑا کہ خدا کے بعد ابوطالب کی پناہ نہ ملتی تو حالات کے دھارے کا رخ کچھ اور ہوتا!

حضرت عبدالمطلب پر ایک نظر

اپنے اسلاف کی طرح آپ کا عقیدہ بھی دینِ ابراہیمی پر تھا۔ عرب کے اس

تاریک ددر میں اصنام پرستی کو روکنا آپ کے امکان میں نہیں تھا مگر آپ خود کبھی ان افعالِ شنیعہ کے مرتکب نہیں ہوئے جو اس زمانے میں عام تھے۔ ہاشم کے بعد آپ کبھے کے متولی ہوئے لہذا خانہ خلد میں بت پرستی کو روکنا آپ کی ذمہ داری ہو سکتی تھی لیکن ایسے کسی اقدام کے تو بھیانک نتائج ہو سکتے تھے، وہ ڈھکے چھپے نہ تھے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بعثتِ محمدی روایتاً آپ کے علم میں رہی ہو اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے، جیسا کہ سنتِ آدمؑ کے طور پر ایک نبی دوسرے نبی سے کہتا آیا تھا۔ کبھے کی اساسی حیثیت بھی حضرت عبدالمطلب کو معلوم تھی، وہ جانتے تھے کہ سنگِ اسود حضرت آدمؑ جنت سے لائے تھے اور اسی مقام پر نصب کیا تھا جہاں کبھے کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ پھر اس کا طواف سنتِ نبوی میں داخل ہو گیا۔

کبھے کا طواف اب بھی کیا جاتا مگر اس کی تاریخِ ادبام پرستی کی دھند میں غلط ملط ہو گئی تھی۔ اسمعیل کے بعد ثابت بن اسمعیل اس کے متولی ہوئے لیکن ان کی بیوی قبیلہ بنی جرہم کی تھی۔ کسی بات پر اولادِ اسمعیل کا بنی جرہم سے جھگڑا ہو گیا اور وہ مکہ سے نکل کر اطرافِ اکناف میں جا بسی۔ ایک مدت کے بعد گرد و نواح کے قبائل نے عمرو بن حارث سردار بنی جرہم کو مار بھگایا۔ اس نے چلتے وقت حجرِ اسود کو اکھاڑ کر چاہِ زم زم میں ڈال دیا اور اس کو پاٹ کر برابر کر دیا۔

عمرو نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ حجرِ اسود کی جگہ ہرن کی دو طلائی مورتیاں نصب کر دیں جو اسفندیار نے ایران سے اس کو بھیجی تھیں یہ مورتیاں غزال کی قلعہ کہلاتی ہیں۔

مکہ کے نخلستان میں چاہِ زم زم کو بڑی اہمیت تھی مگر اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ یہ چاہ حضرت اسمعیل کی یادگار تھی۔ مذہب کی روایتی تاریخ شاہد ہے کہ خلیل اللہ کی ایک بیوی جناب سارہ اس وقت لادہ تھیں۔ جناب ہاجرہ کے بطن سے جب جناب اسمعیل کی ولادت ہوئی تو وہ دونوں سے جلنے لگیں اور انہوں نے ان کو جلا وطن کرنے کی ضد کی۔ مشیتِ خداوندی دیکھ کر جناب ابراہیم جناب

سارہ کی دلجوئی پر مجبور ہو گئے اور جناب ہاجرہ اور حضرت اسمعیلؑ کو اس مقام پر لاکر چھوڑ گئے جہاں آگے چل کر آپ نے خود خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ حضرت ابراہیمؑ کچھ کھجوریں اور پانی ان دونوں کے لئے رکھ گئے تھے جب تک وہ چلا، اس وقت تک جناب ہاجرہ حضرت اسماعیلؑ کو دودھ پلاتی رہیں پھر دودھ خشک ہو گیا اور حضرت اسماعیلؑ پیاس میں تڑپنے لگے تو جناب ہاجرہ بے قرار ہو کر اٹھیں اور پانی کے لئے ایک طرف دوڑ پڑیں۔ کوہ صفا پر پہنچیں پھر اتر کر کوہ مروہ پر آئیں۔ اس طرح سات مرتبہ دوڑیں — حج میں اسی کی تاسی کی جاتی ہے۔

آخر پانی نہ ملا تو جناب ہاجرہ محبتِ مادری میں پلٹ پڑیں، اگر دیکھا تو جناب اسمعیلؑ جاں بلب تھے، جناب ہاجرہ پھر مضطرب ہو کر مروہ پر چڑھ گئیں اور فریاد کرنے لگیں تو ایک آواز کان میں آئی۔ جناب ہاجرہ نے گردن کھٹا کر نظر ڈالی تو اس مقام پر پانی کے آثار پائے جہاں جناب اسمعیلؑ پڑے ہوئے تھے — کہا جاتا ہے کہ حضرت جبریلؑ نے اپنا بازو زمین پر مارا تھا جس سے چشمہ آب جاری ہوا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت اسمعیلؑ نے شدتِ تشنگی میں ایڑیاں زمین پر رگڑیں تو پانی نکل آیا۔ جناب ہاجرہ نے بڑھ کر پانی کے گرد باڑھ باندھ دی تاکہ وہ بہہ کر ضائع نہ ہونے پائے۔ اس طرح چاہ زم زم وجود میں آیا۔ اب جس کا کوئی پتہ نہ تھا اور کئے والوں کو پانی کی بڑی قلت محسوس ہو رہی تھی۔

عمر بن حارث نے مکہ چھوڑتے وقت درہت بھی چاہ زم زم پر نصب کر دیئے تھے جن سے چاہ چھپی ہوئی تھی۔ حضرت عبدالمطلب نے نزاکتِ وقت محسوس کر کے ایک مقام کو نشان زد کیا اور اپنے بیٹے حارث کی مدد سے وہاں کھدائی شروع کی تو چاہ کے آثار نمودار ہو گئے اور پانی نکل آیا۔

اس موقع پر حضرت عبدالمطلب نے ربِ کعبہ سے دُعا مانگی کہ اگر انھیں دس بیٹے عطا ہوئے تو وہ ان میں سے ایک کو خدا کی راہ میں قربان کریں گے وقت

کے فصل سے پروردگار نے دس کے بجائے بارہ بیٹے دیئے مگر انہوں نے منت پوری نہ کی، حالانکہ بیٹے سب کے سب باپ کی منت پوری ہونے کے لئے اپنے کو پیش کرتے مگر عبدالمطلب فیصلہ نہ کر پاتے تھے۔ آخر ایک رات انھیں خواب میں بشارت ہوئی اور وہ اپنی وعدہ فراموشی پر لرز اُٹھے۔ آخر سوچ سمجھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ قرعہ ڈال کر طے کریں کہ کس کو راہِ خدا میں قربان کیا جائے؟ لیکن قرعے میں نام عبد اللہ کا نکلا جو انہیں سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اس محبوبیت میں عبد اللہ کے ذاتی محاسن بھی تھے اور اس نور کی آب و تاب بھی جو عبد اللہ کی پیشانی پر تابندہ تھا۔

عبدالمطلب اب وجد کی عظیم سیرت کے وارث تھے وہ دل پر پتھر رکھ حضرت عبد اللہ کو قربان گاہ میں لے آئے مگر عبد اللہ کے قبولِ عام نے ارادے پر عمل نہ کرنے دیا۔ نبی ہاشم کے عمارین سامنے آگئے مگر عبد اللہ کے بجائے روایت کے مطابق دس اونٹوں کی قربانی دی جائے لیکن قرعہ جیب اونٹوں کے مقابلے پر ڈالا گیا تو عبد اللہ ہی کے نام نکلا۔ دوبارہ بیس اونٹوں پر قرعہ اندازی کی گئی مگر مقصد پورا نہ ہوا، پھر تیس اونٹوں پر۔ اس طرح اونٹوں کی تعداد بڑھائی جاتی رہی، آخر سو اونٹوں پر قرعہ نکل آیا۔ حضرت عبدالمطلب نے اتمامِ حجت کے لئے دوبارہ قرعہ ڈلویا تو اونٹوں ہی کے حق میں نکلا اور سواونٹ قربان کر دیئے گئے۔ اس طرح ایک آدمی کی دیت دس کے بجائے سواونٹ مقرر ہو گئی جو اسلام میں بھی رائج رہی۔ حضرت اسمعیلؑ کے بعد حضرت عبد اللہ کی قربانی دوسری قربانی تھی جو دینے اور اونٹوں نے اپنے سر لی لیکن اس کا اصل بدل کر بلا میں ہوا۔ امام حسینؑ نے حضرت اسمعیلؑ کی جگہ لی اور حضرت علی اکبرؑ حضرت عبد اللہ کے بجائے قربان ہوئے جو محمدؐ کی طرح پدر محمدؐ سے بھی مشابہت رکھتے تھے۔

آنحضرت ابو طالب کی سرپرستی میں

کہنے کو تو آنحضرتؐ نے صرف دو سال عبدالمطلب کے زیر سایہ گزارے تھے لیکن حقیقتاً

پیدائش کے بعد سے اٹھ سال کی عمر تک عبدالمطلب ہی آپ کے نگران رہے تھے اور ان کے بعد آپ ابو طالب سے مانوس تھے جنہوں نے صحیح معنی میں حق شفقت و بزرگی ادا کر دیا اور یتیم بچے کو وہ پیار دیا کہ آنحضرت کو ان کی شخصیت پر ناز ہوئے گا۔ عبدالمطلب کے بعد چاہے زم زم عباس کو ملا تھا اور کعبہ کا کلیدی عہدہ ابو طالب کو۔ وہ اپنے مالی حالات درست کرنے کے لئے کبھی کبھی تجارتی قافلوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد ابو طالب شام کے سفر کے لئے نیا ہوئے، وہ حضور کو ساتھ لے جانا نہ چاہتے تھے مگر آپ کے اصرار پر انکار نہ کر سکے اور ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ بصرہ کے قریب قریہ کفر میں تجارتی منڈی تھی۔ وہاں ابو طالب نے فسطوری راہبوں کے معبد میں قیام کیا۔ جرجیس عرف بحیرا وہاں ایک راہب تھا جو توریت داخیل کا عالم تھا۔ وہ آنحضرت کے جمال و جلال کو دیکھ کر دنگ رہ گیا، پھر اس نے ایک ابر کو سر پر سایہ نکلن دیکھا۔ تمام کتب آسمانی اس کے مطالعہ سے گزر چکی تھیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیش گوئی اس کے ذہن میں تھی۔ کسی خیال پر اس نے حضور کی پشت مبارک کھول کر دیکھی اور حضرت کو چوم کر ابو طالب سے کہا کہ یہ خدا کے آخری پیغمبر ہیں، ان کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرنا، پھر اس نے اپنے علم کے مطابق ابو طالب سے مستقبل کی بہت سی باتیں کہیں۔ ابو طالب جو مال لے کر چلے تھے وہ سب حضور کی برکت سے اسی منڈی میں فروخت ہو گیا اور ابو طالب اسی مقام سے آنحضرت کے بارے میں دل و دماغ کی ایک روشنی لے کر واپس ہو گئے۔

آنحضرت نے ابھی زندگی کے دس بارہ سال گزارے تھے مگر آپ کا اٹھان تحیر خیز تھا۔ غور و خوض کی عادت تو آپ کو بچپن ہی سے تھی۔ کبھی بکریوں کے ریوڑ لے کر چرانے کے لئے چلتے اور نگاہ فضائے بیسط کی طرف اٹھتی تو کائنات کی چشمک سے ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی۔ عالم نور میں جو کچھ دیکھا تھا اس میں سے کچھ بھولا نہ تھا مگر ایک خواب کی سی کیفیت میں کوہ سینا پر چمکنے والا نور

آپ کے سامنے تھا اور وہ نور بھی، جس نے گیلی کے کسانوں اور ماہی گیروں کی زندگیوں کو روشن کر دیا تھا یہ نور دور دور اور بہت دور سے اپنی طرف بڑھتے نظر آتا اور آپ کی نظر فاران کی چوٹی کی طرف اٹھ جاتی، پھر آپ سر جھکا کر ایک فکر میں ڈوب جاتے کیونکہ اس کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ ابھی دماغوں اور دلوں کو اس سطح پر لا کر ہموار کرنا تھا جہاں وہ آپ کا پیغام سن سکتے اور کوئی اثر قبول کرتے جس کی مصاعی آپ نے شروع کر دی تھیں اور اپنی صداقت سے لوگوں میں سچ بولنے کی اہمیت واضح کرتے جا رہے تھے۔

اب آپ جوانی کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے اور آپ کی عملی زندگی شروع ہو گئی تھی۔ اہل مکہ پر آپ کے اخلاقی اثرات بڑھتے جا رہے تھے اور آپ آہستہ آہستہ بگڑے ہوئے معاشرے کو سدھارنے کی کوشش کر رہے تھے، چچا کی مالی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے کچھ کاروبار بھی کر لیتے لیکن چونکہ سرمائے کی کمی تھی لہذا عموماً سرمایہ دوسروں کا ہوتا اور محنت آپ کی، جس سے آپ کی دیانت کا سکے والوں کے دلوں پر بیٹھ گیا اور آپ متدین صادق اور امین مشہور ہو گئے نتیجے میں ہزار ہا آپ کے شریک تجارت ہونے کا مستحق تھے۔ ان میں مکے کی ایک خاتون خدیجہ بھی تھیں۔ ان کا کاروبار آتا بڑا تھا کہ علیکہ العرب کہی جاتی تھیں۔ انہوں نے آپ کی شہرت سن کر درخواست کی اور آپ ان کا مال لے کر شام کی طرف روانہ ہو گئے۔

آپ کی اصلاحی اور رہنمائی زندگی ہوش سنبھالنے کے بعد سے شروع ہو گئی تھی، جس میں عمر کی تدریجی ترقی کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ قریش اور بنی قیس میں جنگ ہوئی تو آپ نے قریش کا ساتھ دیا، لیکن تلوار نہیں اٹھائی کیونکہ آپ شجاعت و شرافت کے ورثہ دار نہ ہونے کے باوجود طبعتاً صلح پسند اور ہادی ہی تھے لہذا قبائلی جنگ کے بھیانک نتائج کا احساس کر کے، جب آپ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے بنی زہرہ اور بنی تمیم میں معاہدہ کرانے کی سعی کی تو آپ

نے اس میں عملی حصہ لیا۔ یہ معاہدہ مسافروں کی حفاظت، غریبوں اور مظلوموں کی حمایت اور امن و امان کے قیام کے لئے تھا اور فضل، فضائل، فضیل اور مفضل ناموں کے لوگ اس میں شریک تھے، لہذا تاریخ میں حلف الفضول کہلاتا ہے۔

آپ کی رہائی زندگی کا اہم ترین واقعہ یونانیوں کی سازش سے کبچے کا تحفظ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عثمان بن حریث نامی عرب نے زرد مال کے لالچ میں دین عیسوی قبول کر لیا تھا۔ مکے کی تجارتی اہمیت کو دیکھتے ہوئے قسطنطنینہ کی نظر مدتوں سے اس پر لگی ہوئی تھی۔ قیصر نے عثمان بن حریث کے ذریعہ اس کو فتح کرنے کی سازش کی اور عثمان کے پیسچ کر اندر ہی اندر لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے لگا۔ آنحضرتؐ کو اس کی خبر لگ گئی اور آپ نے اس کا سبھاٹا پھوڑ کر مکے کو تباہی سے بچا لیا۔

ان مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ آپ کب معاش کی طرف سے بھی عاقل نہ تھے اور مال تجارت کے منافع سے چپاکی مالی اعانت کرنے کی کوشش کرتے رہتے جناب خدیجہ کا مال بصرہ لے جانا اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ یہ کاروباری سفر بہت کامیاب رہا۔ خدیجہ پہلے ہی حضورؐ سے کچھ کم متاثر نہ تھیں اور دل ہی دل میں آپ کی شخصیت پر فریقہ ہوتی جا رہی تھیں۔ سفر سے واپسی پر جب ان کے غلام میسر نے حضورؐ کے طور طریقے اور عادات و اطوار کا نقشہ کھینچا تو آپ نے فیصلہ کر لیا اور شادی کے لئے سلسلہ جنابی شروع کر دی۔

جناب خدیجہ سے شادی

حضورؐ کو یہ رشتہ منظور تھا مگر آپ نے اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک حضرت ابوطالب نے ہاں نہیں کر دی۔ آخر ۵۹۵ء میں ایک طرف سے حضرت ابوطالب اور دوسری طرف سے درقہ بن نوفل نے نکاح پڑھا۔ ورقہ کے ساتھ جناب خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد بھی شامل تھے۔ جناب ابوطالب کا خطبہ نکاح ان کے اندر چھپے ہوئے انسانی عقائد کا ترجمان ہے۔ "تمام تعریفیں اس خدا نے واحد

کے لئے ہیں جس نے ہمیں سل ابراہیم اور ذریت اسمعیل سے قرار دیا۔۔۔۔۔
مہربانہ اونس سوتا اور پچیس اونٹ مقرر ہوا تھا جو حضرت ابوطالب نے اسی
وقت ادا کر دیا۔

آنحضرت کی عمر اس وقت پچیس سال اور جناب خدیجہ کی چالیس سال تھی، موزین
کو ایک تواتر سے اصرار ہے کہ اس سے قبل خدیجہ کی دوست دیاں ہو چکی تھیں اور ان
کی دو بیٹیاں بھی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ”مناقب ابن شہر آشوب“ کا بیان صحیح
ہے۔ خدیجہ بنت خویلد خدا کی طرف سے محمد کی امانت تھیں اور اب تک کنواری رہی
تھیں۔ دونوں بیٹیاں ان کی بہن ”ہالہ“ کی تھیں، جن کو جناب خدیجہ نے بیٹیوں کی
طرح پالا تھا اور آنحضرت کی زندگی میں داخل ہونے سے قبل دونوں کی شادیاں
کافروں سے ہو چکی تھیں۔

محدث دہلوی کے الفاظ میں ”سیدہ خدیجہ عقل و فراست میں کامل اور قریش
کی عورتوں میں افضل و انسب تھیں۔“ دولت کی اتنی بہتات تھی کہ پورے جانیں
کوئی ان کے ہم پلہ سٹھرایا نہ جاسکتا۔ ازواجی زندگی میں وہ اتنی اچھی بیوی ثابت
ہوئیں اور آپ نے حضور کو اپنی جانب اس قدر ملتفت کر لیا کہ حضور نے ان
کے سین حیات کسی دوسری عورت سے عقد کا تصور بھی نہیں کیا اور ان
کی وفات کے بعد بھی کبھی انہیں فراموش نہ کر سکے۔

حجر اسود کی تنصیب

آپ کی اصلاحی زندگی ایک دھارے پر بہہ رہی تھی، شب و روز در انسان
کے احساس اور حد سے زائد بگڑے ہوئے معاشرے کے سدھار میں گزر رہے
تھے۔ کتنے ہی قلوب اور اذہان کو آپ نے منقلب کر دیا تھا۔ کعبے کی نئی تعمیر
کے بعد حجر اسود کی تنصیب نو کا قضیہ پیدا ہو گیا۔ ہر سردار قبیلہ اس شرف کو حاصل
کرنا چاہتا تھا۔ بحث و تخیل کے بعد طے پایا کہ اگلے صبح کو جو سب سے پہلے
داخل حرم ہوا اسے حکم بنا دیا جائے۔

صبح ہوئی تو سب سے پہلے حضور نے حرم میں قدم رکھا۔ آپ نے ایک مضبوط چادر بچھائی، حجر اسود کو اس میں رکھا، تمام سرداروں کو اس کے کونے پکڑا دیئے سردار اس کو اٹھا کر لائے اور آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا اس طرح آپ نے ایک بڑے تنازعے کو طے کر دیا۔

بعثت سے قبل ہی آپ کی زندگی تھی اور آپ مسلسل انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے میں لگے رہتے تھے جس کو آپ کی بے نام پیغمبری سے تعبیر

کیا جاسکتا ہے۔
ولادت علیؑ

خلاق کائنات نے آخری نبی کے لئے جو التزامات کئے تھے۔ ان میں سرفہرست حضرت ابوطالب تھے پھر جناب خدیجہ مگر ابھی ایک تیسرے کا انتظار تھا۔ خود سرور کائنات بھی جس کے منتظر تھے۔ اعلان نبوت کے لئے زمین اگرچہ پوری طرح ہموار نہ تھی مگر شخصی کردار کا لوہا اہل مکہ میں مانا جا چکا تھا اور آپ کو یقین تھا کہ اگر آپ کوئی سچی بات کہیں گے تو وہ کبھی ہی تلخ کیوں نہ ہو، بے لگام اور سنہ زور عربی کو سن ضرور دیں گے اس لئے آپ اپنے قوت بازو کے لئے چشم بواہ تھے آخر وہ ساعت آہنچی جس میں لوازمات مشیت کا تمکد ہونے والا تھا۔

حضرت ابوطالب کی شریک زندگی فاطمہ بنت اسد خانہ کعبہ کے طواف کے لئے آئی تھیں کہ دردِ زہ کے آثار محسوس ہوئے۔ آپ کعبے کی دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک معتبر روایت یہ بھی ہے کہ دردِ زہ گہری پر شروع ہو گیا تھا اور آنحضرت کے کہنے کے مطابق فاطمہ کعبے کی طرف آئی تھیں، قریب پہنچتے ہی درد نے شدت اختیار کر لی۔ آپ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئیں اور خدا سے مشکل آسان کرنے کی دعا کرنے لگیں۔

عین اسی وقت دیوار میں ایک شکاف پیدا ہوا اور فاطمہ بنت اسد اندر داخل ہو گئیں۔

بچے کی ولادت تاریخ کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے مگر اس بند مکان میں جو تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا، تن تنہا فاطمہ بنت اسد کا رہنا انھیں کے دل گردے کا کام تھا یا ہو سکتا ہے کہ اعتقاد نے سہارا دیا ہو جو ان کے دل میں کوئی خوف یا اشتیاق پیدا نہیں ہوئی۔

اسلام کی تاریخ ایک ایک واقعہ پر کئی روایتیں بیان کرتی ہے۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی ہے کہ ابوطالب کا بیٹا ماں کی گود میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا جو ابوطالب نے گود میں لیا تو ان کے منہ کو نوچ لیا۔ ماں نے اس کا نام اسد رکھا۔ محمد نے علی رکھ دیا۔ بچے نے آنکھیں اس وقت کھولیں جب آنحضرت تشریف لائے اور اس کو خنطاب کیا۔ بچے نے پہلی بار جو صورت دیکھی وہ پیغمبر کی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے حضور نے گود میں لے کر اپنی زبان اس کے منہ میں دے دی جس کو وہ اس طرح چوسنے لگا جیسے یہی اس کی غذا ہو۔

۱۳ رجب سنہ عام الفیل اس واقعہ کی یادگار ہے جس کے بعد یہ بچہ نکتے کے صادق و امین کی گود میں پرورش پاتا رہا۔ مریخین نے اس کو ابوطالب کی اعانت قرار دیا ہے کہ جعفر کی کفالت عباس نے اور علی کی آنحضرت نے اپنے ذمہ لے لی۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ پیدائش کے بعد علی حضور ہی کے زیر تربیت رہے کیونکہ مشیت نے آپ کو پیدا ہی حضور کے لئے کیا تھا۔

عادات و اطوار کی طرح علی کا منہ بھی غیر معمولی تھا۔ آپ نے گہوارہ طفلی میں کلمہ اتر دیا کہ اس کے منہ میں انگلیاں ڈال کر چھوڑ ڈالا جو قریش کے بعض دشمنوں نے چھوڑا تھا، ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ کعبے میں ایک بہت پرانا سانپ پلا ہوا تھا۔ نوزائیدہ بچے کو کعبے میں رکھ دیا جاتا۔ وہ صحیح النسب بچے کے گرد سنا چکر لگا کر چلا جاتا تھا اور اس کی تصدیق کو قریش مان لیتے تھے۔

توہم پرستی کے اس ماحول میں جہاں بتوں کے ساتھ سورج اور ستاروں کی پرستش بھی ہوتی تھی، یہ عجیب و غریب سم تعجب خیز نہیں، مگر ابوطالب کا بیٹا تو

ایسا نہ تھا جس کو کبیر در کعبہ پر رکھوا دیا جاتا لہذا بعض دشمنوں نے سانپ کو کبے سے لاکر گھر میں چھوڑ دیا۔ سانپ جیسے ہی گہوارے میں منہ علی کے اوپر لے گیا آپ نے ایک انگڑائی لے کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس کے منہ میں ڈال دیں اور سانپ کے منہ کو دھکڑے کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ وہم پرست قریشیوں کو اژدر کے مرنے کا بڑا صدمہ تھا کسی نے کہا۔ اب بچوں کے نسب کی تحقیق کیونکر کی جائے گی؟ تو غیب سے جواب ملا علی کی دوستی اور دشمنی سے شناخت کر لینا۔

علی اپنی تیز اٹھان کے ساتھ عقل و دانش میں بھی عام بچوں کی طرح نہ تھے پہلے تو آنحضرت ان کو گود میں کھلایا کرتے تھے، اب انگلی پکڑ کر چلانے لگے۔ حلف الفضول تو علی کے سامنے کا واقعہ نہ تھا لیکن جب حضورؐ نے رومیوں سے مکہ کو پھارنا تو علی کو اچھی طرح یاد تھا کہ آپ جنابِ خدیجہؓ سے ذکر کیا کرتے تھے، اور علی تا میری نگاہ سے اپنے مربی و مرشد کو دیکھتے رہتے تھے۔

وقت کی تدبیر کی ترقی کے ساتھ علیؑ سے حضورؐ کا خلا ملا بڑھتا رہا اور حضورؐ کی عزت گزینی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اب آپ کوہِ حرا کی طرف نکل جاتے اور اس کے ایک غار میں مصروفِ عبادت ہو جاتے۔

ملکۃ العرب، رفیقہ حیات نے خزانوں کا منہ آپ کے رفاہی کاموں کے لئے کھول دیا تھا۔ عبادت کی طرف آپ کا حد سے زیادہ رجحان اس کو گراں گزرتا چاہیئے تھا مگر کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ خدیجہ نے آپ کے کسی عمل میں کوئی خلل کیا ہو بلکہ وہ گھر سے چلتے وقت ضروریات کی چیزیں ساتھ کر دیتیں اور جب آپ کو کئی شبانہ روز گزر جاتے تو خود کھانے پینے کا سامان پہنچا کر آتیں۔ ممکن ہے کہ علیؑ بھی ان مواقع پر حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہوتے ہوں۔ وہ تو کس تھے۔ پاس ادب زبان کھولنے کی بھی اجازت نہ دیتا لیکن خدیجہؓ کو تو حق تھا۔ محمدؐ ان کے محبوب تھے۔ محمدؐ کے لئے انہوں نے اپنے کو مٹا دیا تھا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ خدیجہؓ نے

کبھی ناک بھوں بھی چڑھائی ہو بلکہ اس کے برعکس حضور جب گھبراتے تو بڑی خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے استقبال کرتیں اور جب خود غارِ حرا کی طرف جاتیں تو کشادہ دلی اور ایک نیرب لب لبم کے ساتھ تمام چیزیں رکھ کر اُلٹے قدم واپس ہو جاتیں۔ شاید حضور نے رازِ مشیت میں انہیں شریک کر لیا تھا یا خدیجہ کے باطن نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہو، تب ہی تو انہوں نے کبھی اپنے شریکِ حیات سے کچھ پوچھا نہیں، ہر صورت اور ہر کیفیت میں بس تعاون ہی کرتی رہیں۔ اسی لئے ہمیں یہ روایت صحیح ترین معلوم ہوتی ہے کہ آپ خدا کی طرف سے خلیلہ کے گھر میں محمد کی امانت تھیں۔ دنیا ہماری روحانیت کے لئے دارالاسباب ہے۔ دین کو ہم مادیت کی شاہراہ قرار نہیں دیتے ہماری آنکھ مادی جامے میں روحانی اقدار کی شناخت رکھتی ہے، خبابِ خدیجہ ہمارے نزدیک پیغمبر نہیں تھیں بلکہ پیغمبر کی ایسی رفیقہٴ حیات تھیں، اسی طرح پھر کو جن کی ضرورت تھی اور جن کے انتقال کے بعد کتنی ہی بیویاں حیاتِ پیغمبر میں داخل ہوئیں مگر کوئی ان کی جگہ نہ لے سکا اور حضور انہیں زندگی کی ہر موڑ پر یاد کرتے رہے۔

غارِ حرا سے کعبے تک

حضور جانتے تھے کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب انہیں پیغمبرِ اسلام ہونے کا دعویٰ کرنا ہے۔ چالیس سال تک آپ نے تجربات، مشاہدات اور محسوسات سے اپنے مادی جسم کو اس بارگراؤں کے اٹھانے کے قابل بنالیا تھا جسے آپ لمحِ محفوظ میں چھوڑ آئے تھے۔ بچپن سے آج تک آپ نے عرب کے قابل کو باہم دست و گریباں دیکھا تھا، ریت کے ذروں کو خون سے رنگین پایا تھا۔ بے آئین اور سفاک صحرائوں میں فحش رسوم اور باطل عقائد کی وہ بہتات تھی کہ ان کے دل و دماغ مسخ ہو کر رہ گئے تھے، لہذا پہلے آپ نے ان سے ملنا جلتا انسان بن کر ان کے اندر چھپے ہوئے انسانوں کو پرکھا پھر ان میں اتنی تبدیلی پیدا کی کہ وہ آپ پر اقتدار کر سکیں۔

یہی آپ کا مقصدِ اولیں تھا اور عرب کی تقدیر میں مشیت کے قلم نے بھی یہی لکھ دیا تھا، لہذا عمر کے چالیس سال پورے ہونے کے بعد ایک دن جب آپ غارِ حرا

میں داخل ہوئے اور اپنے کو فکرِ الہی میں مستغرق کیا تو ایک آواز سائی دی، آپ نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک نورانی چہرہ سامنے تھا، یہ جبریل تھے۔ انہوں نے کہا: "اُتراء باہمسم دیک"۔ ایک لمحے تک آپ جبریل کو دیکھتے رہے پھر آپ نے پڑھا شروع کر دیا۔ ظہر کا وقت تھا۔ آپ نے نماز پڑھی اور باہر نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

یقیناً آپ پر ایک بوجھ تھا جس سے آپ کے پاؤں ٹوٹ گئے تھے۔ آپ تھکے تھکے سے تھے۔ گھر پہنچ کر آپ نے جنابِ خدیجہ اور حضرت علی کو بتا دیا کہ آج سے دو روز رسالت کا آغاز ہو گیا۔ پھر آپ جنابِ خدیجہ سے چادر لے کر اور اس کو اڈرہ کر لیٹ گئے اور تھوڑی دیر تک سکون حاصل کرتے رہے۔ ورنہ بن نوفل کے کہے ان موحدین میں تھے جو خالقِ حقیقی کے بارے میں غور و فکر بھی کرتے، اُنے والے رسول کی حقیقت سے بھی باخبر تھے۔ لہذا جنابِ خدیجہ نے ورنہ بن نوفل کو یہ مرثدہ سنایا تو انہوں نے فوراً اس کی تصدیق کر دی، جس کے نتیجے میں کچھ لوگ اس خبر سے آمنہ ہونے لگے۔

۲۷ رجب السنۃ عام الفیل کی سہ پہر کو کائنات نے ایک منظر دیکھا۔ ایک شخص بیت المقدس کی طرف رخ کئے گھر اٹھا۔ اس کے پیچھے ایک ادھیر عورت اور ایک نو سال کا بچہ صافستہ تھا۔ یہ پہلی نماز تھی جو خانہِ خدیجہ میں ادا کی گئی۔

اس کے بعد یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ جنابِ خدیجہ، آغازِ اعجاز کا ہمراز رسالت تھیں اور علی اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے امام اور آغوشِ رسالت کے پیروار۔ خانہ کعبہ میں جب پہلے پہل رسول کی گود میں آئے تھے تو تلاوتِ کلامِ پاک سے اپنا تعارف کرایا تھا اور حضرت عیسیٰ کی طرح اپنے امام ہونے کا اعلان کیا تھا۔ پھر اسی کعبہ میں جنابِ خدیجہ کے ساتھ رسولِ اکرم کے پیچھے مسلسل نماز پڑھ کر اپنے پیدائشی مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔

غایہ حرام میں افتتاح رسالت کے بعد سے پنج وقتہ نماز آنحضرت اور ان دونوں متبعین کا معمول بن گیا تھا لیکن سرعام اس دین تازہ کی کوئی بات کسی سے کہی نہیں گئی۔ یہ اور بات ہے کہ ورقہ بن نوفل سے ان کے حلقے میں توحید کا ڈھکا چھپا پیغام پہنچ گیا یا خود پیغمبر کی ذات گرامی نے بغیر زبان کھولے اپنے قریبی حلقے میں رکھی سے کچھ کہہ دیا ہو مگر براہ راست کوئی اعلان کیا نہیں گیا۔ اعلان کرنا بھی کون؟ خاب خدیجہ عورت تھیں، خود پیغمبر کی مصلحت ابھی اس کی اجازت نہ دیتی تھی اور حضرت علیؓ تو حضور کے اس طرح پیرو تھے، جیسے بکری کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے۔

وحی ربانی کچھ دنوں ملتوی رہ کر پھر جاری ہو گئی تھی۔ نزول وحی کے لئے کسی مقام یا وقت کا تعین نہ تھا۔ حضرت جبریلؑ جب بھی کوئی آیت لے کر آتے حضورؐ پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور آپؐ اسے محفوظ فرما لیتے۔ اس طرح تین سال گزر گئے۔ آخر آپؐ کو کھلے عام اعلان رسالت کی ہدایت صادر ہو گئی، اور ایک دن آپؐ نے کوہ صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر آواز دی بالکل اسی طرح جس طرح کبھی بلند کوہ سے ان کے بزرگ ”آل غالب“ کو پکارا کرتے تھے۔

”یا معشر قریش“

آپؐ کی آواز پر لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے ان سے سوال کیا۔
 ”میں اگر یہ کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے کوئی لشکر آ رہا ہے تو تم بغیر دیکھے یقین کر لو گے؟“

سب یک زبان ہو کر بولے۔

”ہم نے تم کو ہمیشہ سچ بولتے ہی پایا ہے۔“

تب آپؐ نے فرمایا۔

”تو میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ایک ہے۔ اس پر ایمان نہ لاؤ گے تو عذاب میں مبتلا ہو گے۔“

بعض لوگوں کے کان میں اس عقیدے کی سُن گن پڑ چکی تھی جسُور کی زبان سے سن کر وہ برہم ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا، جب کتے میں آپ کے خلاف بذطنی کا اظہار ہو رہا تھا۔ سارا مجمع ناراضگی کے عالم میں منتشر ہو گیا۔ پھر آپ بھی وہاں سے چلے آئے۔

روایاتِ معتبرہ کی رو سے آپؐ مسکے بعثت میں بنی ہاشم کو دعوت دی اور علی سے کہا کہ ایک پیما نہ طعام، ایک دان بکری کی اور ایک کاسہ دودھ کا تیار کریں اور عبدالمطلب کی اولاد کو بلاوا دیدیں علیؑ نے حسبِ ارشاد تعمیل کی، جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے کھانا پیش کیا، ایک کم چالیں آدمی تھے مگر سب نے اتنے ہی کھاتے میں پیٹ بھر کر کھالیا۔ حضرت ابوطالب، جناب حمزہ، جناب عباس اور ابولہب ہر ایک موجود تھا۔ اس معجزے پر ابولہب بول اُٹھا: "اتنے سے کھانے میں محمدؐ نے جادو کر دیا" آنحضرتؐ کچھ کھنا چاہتے تھے مگر سب موقع دیئے بغیر چلے گئے۔

اگلے دن پھر اسی طرح سب گجیا کئے گئے اور اتنے ہی کھانے میں سب نے کھالیا۔ آج جسُور نے کھانا ختم ہوتے ہی کہنا شروع کر دیا: "نصیب والے ہیں آپؐ کہ میں آپؐ کے لئے دُنیا اور آخرت کا تحفہ لایا ہوں" تسلسل میں آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچایا اور کہا: "جو شخص اس میں پہل کرے گا وہ میرا سبھائی، وصی اور خلیفہ ہوگا۔"

مجمع ایک خاموشی میں حیرت اور غصے کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ دس سال کا ایک بچہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یا رسول اللہ! میں آپؐ کے دشمنوں کو نیزہ ماروں گا، ان کی آنکھیں پھوڑ دوں گا، پیٹ چیر دوں گا، ٹانگیں کاٹ دوں گا اور آپؐ کا ذریعہ ہوں گا۔"

جسُور نے علیؑ کی پشت گردن پر ہاتھ رکھ کر ایک طمانیت کا اظہار کیا اور کہا "یہ میرا سبھائی، میرا وصی اور خلیفہ ہے، اس کی سنو اور اطاعت قبول کرو۔"

اس پر لوگ تسخیر کرتے ہوئے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ابوطالب سے کہنے لگے "تمہیں حکم ہوا ہے کہ بیٹے کی بات سنو اور اطاعت کرو۔"

ہر مورخ نے اس کی تفصیل اسی طرح لکھی ہے کہ آل عبدالمطلب کوئی اثر قبول
کئے بغیر چل گئی۔

اس کے بعد آنحضرتؐ سے دشمنی اور توہین کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بوطاہ
کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔

مورخین نے ایمان ابوطالب کے متعلق جو بھی لکھا ہو لیکن اس کی شہادت ضرور
دی کہ بھتیجے کی حفاظت میں انہوں نے کبھی اپنے بیٹوں کی بھی پرواہ نہیں کی نہ بچپن
میں جہاں جاتے، انگلی پکڑ کر ساتھ لے جاتے، رات بستر پر اپنے پاس لٹاتے اور
حتی الامکان آپ کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب انجانے دشمنوں کا خطرہ تھا لیکن اب تو
دشمن بھی کھل کر سامنے آ گئے تھے لہذا ابوطالب زیادہ محتاط ہو گئے اور یہ احتیاط
اس لئے بھی بڑھ گئی کہ آنحضرتؐ کی تبلیغی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں پھر بھی قریش
کی ہر مخالفت کا جواب آپ بڑی استقامت اور تحمل سے دیتے۔ یہ مساعی عام
سطح پر تو اب تک کامیاب نہ تھیں مگر قریب کچھ لوگوں نے اثر ضرور قبول کیا تھا۔

”رسول عربی کی داستانِ حیات کا یہ ایک وصفِ جمیل ہے جو آپ کے صدق
خلوص، آپ کی تعلیمات کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ پر آپ کے راسخ یقین و ایمان پر
پُر زور دلالت کرتا ہے کہ آپ کے سب سے قریب رشتہ دار یعنی آپ کی بیوی اور
چچرے بھائی اور آپ کے گھرے دوست آپ کی رسالت کی سچائی اور آپ کے
مبعوث من اللہ ہونے پر یقین لائے۔“

”اگر ان لوگوں کو، جو شریف النفس اور عقل مند تھے اور کلیلی

کے ماہی گیروں سے کسی صورت کم تعلیم یافتہ نہ تھے، معلم اسلام میں دنیا
پرستی، فریب کاری یا ضعفِ ایمان کا شائبہ تک نظر آتا تو اخلاقی اور
معاشرتی اصلاح کے بارے میں آپ کی تمام امیدیں ایک لمحے کے


بہر طور اب اسلام کا مرکزی نقطہ پھیل کر دائرے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا اور اس میں بہت سے لوگ داخل ہو گئے تھے۔ درقہ بن نوفل کا اسلام ثبوت کا محتاج ہے۔ علی اللہ کی طرف سے امامت کے لئے منصوب تھے۔ پہلی خاتون، جنہوں نے اسلام قبول کیا، جناب خدیجہ تھیں۔ اس کے بعد زید بن حارثہ، عبداللہ بن ابوقحافہ المعروف بہ ابو بکر وغیرہ مشرف یہ اسلام ہوئے پھر یہ تعداد چالیس تک پہنچ گئی جن میں سلمان، ابوذر، مقداد، جناب، جابر، ابوسعید خدری، زید بن ارقم، عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، فاطمہ بنت خطاب، عثمان بن مظعون، عبداللہ بن مسعود، سعید بن زید وغیرہ شامل تھے۔ آخر ایک روز قریش وفد کی شکل میں ابوطالب کے پاس آئے اور ابوطالب نے بھتیجے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ چچا پر اتنا بار نہ ڈالو جس کو وہ اٹھانہ سکے۔ اس پر آپ اُبدیدہ ہو گئے اور ابوطالب نے سامی نسل کی مردانہ شان سے کہہ دیا کہ وہ ہر صورت میں اپنے بھتیجے کے ساتھ ہیں۔

قریش کا دوسرا حربہ مال و دولت، عزت و جاہت کی پیش کش تھی جس کا جواب حضور کی طرف سے یہ دیا گیا کہ ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ دیا جائے تب بھی وہ اپنے فریضے سے دست کش نہیں ہو سکتے۔ ابوطالب کا آدل دن سے ایک فیصلہ تھا۔ انہیں محمد بن عبداللہ کی سپرین کر رہنا تھا مگر قریش سے رابطہ رہنے کے سبب وہ براہ راست حملے کو روکنے کی خاطر درمیانی رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور مصلحتِ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا۔

لوگ راستے میں کانٹے بچھا دیتے، نماز پڑھتے وقت پشت پر کوڑا پھینک دیتے مگر فوراً موقع سے ٹل جاتے کہ کہیں ابوطالب نہ آجائیں۔ ایک دن عقبہ بن معیط نے نماز پڑھتے وقت گردن میں چادر ڈال کر گھسیٹا تو آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ اس طرح نت نئے مظالم ڈھائے جاتے رہے پھر بھی معلمِ اسلام لوگوں کو توحید کی طرف بلاتا ہی رہا اور اپنا مقصد تخلیق پورا کرتا رہا۔ ہر ذرہ سرائی کرنا

اور بے ہودگی سے پیش آنا تو کفار کا معمول بن گیا تھا لیکن ایک طرف وہ اپنے مسلک کی سختی سے سخت تر ہوتے جا رہے تھے، دوسری طرف پیغمبر کی صداقت اور حقانیت تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی جس میں آخر عمر ابن خطاب بھی شامل ہو گئے۔

پھر قریش کے بعض لوگ محمد دشمنی میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے خون خرابے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان میں ابوسفیان، ابولہب وغیرہ پیش پیش تھے ایک بار کوہ صفا پر ابو جہل نے حضور کو بہت سخت دھست کہا۔ حمزہ کو خبر ہوئی تو طیش میں اس کو ڈھونڈھنے کیلئے نکلے نواح کعبہ میں وہ ہاتھ اٹا کر حمزہ نے کمان اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ ابو جہل کا سر پھٹ گیا۔ اس کے بعد ہی وہ حضور کی خدمت میں آکر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

قریش کی ریشہ دوانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ان کے جواب میں مسلمان بھی دین حق کے لئے جانوں کی بازی لگانے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک دن حضور نے نماز کے بعد حرم میں تبلیغ شروع کی تو کفار آپ پر ٹوٹ پڑے مسلمانوں نے آپ کو بچانے کی کوشش کی تو حارث بن ابی ہالہ اتنے زخمی ہوئے کہ درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔  خدا کی راہ میں مسلمانوں کی یہ پہلی قربانی تھی۔

ہجرت حبشہ

اس تشدد کے باوجود مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی مگر مکہ اب ان کے لئے محفوظ نہ رہا تھا اس لئے آنحضرت کی مرضی سے مسلمانوں کا ایک قافلہ حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا جس کے سربراہ جعفر طیار تھے۔ قریش بھی غافل نہ تھے۔ ۱۰ انہوں نے عمر بن العاص اور عبداللہ بن ربیع کو تحائف لے کر شاہ نجاشی کے پاس بھیج دیا۔ حبشہ کے دربار میں جعفر طیار سے ان کا مناظرہ ہوا، اور جناب جعفر طیار نے رسول اسلام کا تعارف ایسے الفاظ میں کرایا کہ نجاشی بہت متاثر ہوا۔ قریش کے سفیروں کو منہ کی کھانا پڑی اور مسلمان کئی سال حبشہ میں رہ کر واپس ہوئے تو

جنگِ خیبر سر ہو چکی تھی۔

جنابِ خدیجہ بھی تبلیغِ اسلام میں اپنے عظیم المرتبت شوہر سے پیچھے نہ تھیں وہ عورتوں سے اسلام کی حقانیت بیان کرتیں اور کسی حد تک انہیں متاثر کرتیں۔ اب تک آپ کے دو بیٹے قاسم اور عبد اللہ پیدا ہوئے تھے مگر دونوں انتقال کر گئے تھے ابراہیم بعد میں ماریہ قبطیہ سے پیدا ہوئے مگر وہ بھی وفات پا گئے، لہذا قریش حضور کو اتر کہتے تھے، آخر خدا نے کفار کا منہ بند کر دیا اور ۲۰ جمادی الثانی ۱۰ھ بعثت کو چاند سی بیٹی عطا کی جس کا نام فاطمہ رکھا گیا۔ حضور کی مسرت بیان کی محتاج نہیں مگر وہ اس کا لطف نہ اٹھا سکتے۔ ہر طرف سے بے رحم دشمنوں کا نرغہ سوتے جا گئے جان کا خطرہ، لہذا کچھ دنوں بعد آپ بھی اپنے باقی اصحاب کو لے کر کوہِ صفا پر ارقم بن ابی ارقم کے مکان میں منتقل ہو گئے اور وہاں سے اپنا پیغام کوگوں تک پہنچاتے رہے۔

شعب ابی طالب

بت پرست قریش بھی اپنے عقیدے میں اتنے راسخ تھے کہ حضور سے عدالت کو اپنا ایمان بنالیا تھا۔ انہوں نے ایک جماعت کے ساتھ پھر ابو طالب کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ان سے کہا کہ وہ محمد کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ ان کا مقاطعہ کر دیا جائے گا۔ کہنے والوں میں مکے کے عمائدین بھی شامل تھے۔ ابو جہل، شبیبہ، عتبہ نصر، عاص اور عقیقہ بن ابی معیط۔ ابو طالب کوئی سخت جواب دینا چاہتے تھے تاہم انہوں نے مصلحتاً بڑی نرمی سے ٹال دیا مگر چند روز کے وقفے سے وہ پھر آنحضرت کے قتل پر تیار ہو کر آگئے اور ابو طالب نے کہہ دیا کہ اگر ان کی طرف سے محمد کو ایک کانٹا بھی چبھ گیا تو وہ ان سب کو ہلاک کر دیں گے۔ اس پر ہر ایک غضبنا ہو گیا، سب نے مل کر بنی مطلب کے مقاطعہ کے لئے ایک عہد نامہ مرتب کیا اور اس کو یکے میں لٹکا دیا۔ ابو طالب آنحضرت کی حفاظت کے لئے تقریباً چالیس افرادِ خاندان کو لے کر محرم ۱۰ھ بعثت میں شعب کے اندر چلے گئے، جس پر

حملہ کرنا اگرچہ آسان نہ تھا پھر بھی قریش نے قدرے فاصلہ سے اس کو گھیر کر میں لے لیا۔

کفار قریش کو جانی دشمنی تو ان لوگوں سے تھی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا مسلمانوں کے دوستوں سے انہیں کوئی عداوت نہ تھی، ان کو تو وہ بخش دینے پر تیار تھے۔ ابوطالب بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے لیکن ابوطالب خود اس پر تیار ہوتے تو پہلے ہی دن بھتیجے کی روشنی سے دستبرداری کا اعلان کر دیتے اور بیٹے کو بھی محمد کی تاسی سے روک دیتے مگر ابوطالب نے کبھی مخالفت میں زبان کو جھنجھٹا نہ کیا نہی دمی اور اپنی شریک زندگی فاطمہ بنت اسد کو بھی ٹوکا نہ کہ انہیں جو محمد کے گرد پروانہ دار گھومتی رہتی تھیں بلکہ اس کے برعکس اپنے ہونٹوں پر مصلحت کا قفل ڈال کر بغیر استحسان بیٹے اور بیوی کے عمل کو دیکھتے رہے۔

شعب میں ان کے ساتھ جو چالیس افراد نظر بند تھے، ان کے کھانے پینے کے ذمہ دار ابوطالب تھے۔ انہوں نے ایک مدت تک گزر بسر کا انتظام کر لیا تھا مگر نظر بندی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی اور نوبت فاتوں کی آگئی۔ ابوطالب باہر نکلے تو قریش سے تصادم کا خطرہ تھا پھر وہ کوئی شے باہر سے اندر لانے بھی نہ پاتے کیونکہ محاصرہ سخت تھا۔ شعب کے اندر بنی عبدالمطلب شنب و روز ہوشیار رہتے اور شعب کے باہر قریش پہرہ دیتے، تاہم رشتے اور کنبے کے لوگ کچھ نہ کچھ سامان کسی نہ کسی طرح پہنچا ضرور دیتے تھے۔ ان ایام میں کسی دوست کی طرف سے مدد کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

شعب کی یہ آزمائش کہنے کو تو آنحضرت کی تھی لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو آزمائش اس کی تھی جس نے آنحضرت کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ابوطالب اتنے محتاط تھے کہ علیؑ اور محمدؐ کے لیٹنے کی جگہ روز رات کو بدل دیتے اور عموماً محمدؐ کے بستر پر علیؑ کو لٹا دیا کرتے تھے تاکہ قریش حملہ آور ہوں تو محمدؐ کے بجائے علیؑ کو پائی علیؑ کو کچھ ہو جاتا تو ابوطالب کو زیادہ پرواہ نہ ہوتی۔ ان کا نصب العین تو محمدؐ کو

جناب ابوطالبؑ اور خدیجہ کی وفات

اعلانِ نبوت کے بعد سے سرورِ کائنات بڑے بڑے مصائب سے گزر چکے تھے مگر ابھی ان کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ شعب سے نکلنے کے ساڑھے آٹھ ماہ بعد ۶ سال کی عمر میں حضرت ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔ یہ آنحضرتؐ کے لئے اتنا عظیم سانحہ تھا کہ اس کا برداشت کرنا مشکل ہو گیا، اس پر غصہ یہ ہوا کہ تین دن بعد جناب خدیجہؓ الکبریٰ بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

خدیجہ الکبریٰ صرف آنحضرتؐ کی وفادار رفیقہٴ حیات ہی نہ تھیں بلکہ محبوبہ بھی تھیں۔ عمر میں پندرہ سال بڑی ہونے کے باوجود حضورؐ کو اتنی عزیز تھیں کہ مدینہ کی اطمینانی زندگی میں دوسری بیویوں کو دیکھ کر آنحضرتؐ قدم قدم پر خدیجہؓ کو یاد کرتے اور آپؐ پر ایک غم کی سی کیفیت طاری ہو جاتی جس سے بعض بیویوں کو خدیجہؓ کے نام سے جلن پیدا ہو گئی تھی اور انہوں نے ماں کی قائم مقام بیٹی کے خلاف ایک محاذ بنالیا تھا۔

خدیجہؓ کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ایک وقت وہ دکھائی دیتا ہے، جب خدیجہؓ کا نشان محلِ لونڈیوں اور غلاموں سے بھرا ہوا تھا۔ آپؐ کی ایک آواز پر دو دو چار چار کنیزیں دوڑ پڑتی تھیں۔ دولت اتنی تھی کہ ملکہ العرب کہلاتی تھیں پھر انہوں نے خود اپنے کو حضورؐ کی کنیزی میں دے دیا۔ اب دوسروں کو اپنی چشم و آبرو کا منظر رکھنے کے بجائے آپؐ خود حضورؐ کے چہرے کی طرف دیکھتی تھیں کہ وہ کسی بات کا اشارہ کریں تو خدیجہؓ اس کی تعمیل کر کے سعادتِ دین حاصل کر لیں۔ خدیجہؓ کے مقابلے پر ناقابلِ ذکر دولت مند اور تھوڑی سی فراخ دلی دکھانے والے تاریخِ اسلام میں غنی کہلاتے ہیں مگر مورخ خدیجہؓ کا سرسری ذکر کر کے دوسری بیویوں کے جمال و شباب کا بیان کرنے لگتا ہے۔ سچہ دل جلانے کے لئے خدیجہؓ کے بیوہ ہونے کا قصہ لے کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسری بیویوں کے کنوارے پتے کا

تفاخرِ خزانے لگتا ہے وہ خدیجہ کے اس شرف کو بھول جاتا ہے کہ رسول جب خدیجہ کو ملے تھے تو کنوارے تھے، دوسروں کو دوباؤ شوہر ملے۔ جہاں تک دولت اور اثاثہ کا تعلق ہے، اس کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ مکے نے کبھی خدیجہ کو سلیکٹہ العرب کے روپ میں دیکھا تھا پھر وہ وقت بھی آیا کہ خدیجہ ایک غریب پیغمبر کی ادنیٰ کمینہ کی شکل میں نظر آئیں۔ ان کی بے شمار دولت کا آخری سکہ بھی تبلیغ اسلام کے لئے خرچ ہو گیا تاہم خدیجہ مطمئن تھیں کہ وہ اور ان کا سب کچھ پیغمبر اور دین پیغمبر کے کام آگیا۔ دنیا بلکہ کائنات کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور اسلام خدیجہ کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

اسلام کے دوسرے عظیم محسن حضرت ابوطالب ہیں۔ اکثر صحابہ کے آباء و کفر کی موت مرے تھے لہذا علی کی فضیلت کو کم کرنے کے لئے یہ افسانہ تراش لیا گیا کہ ابوطالب نے آخر وقت تک کلمہ نہیں پڑھا۔ انصاف اگر دُنیا سے بلیڈ نہیں ہو گیا ہے تو سوچا جاسکتا ہے کہ ایک شخص جس نے دکھانے کو اسلام قبول کر لیا لیکن اندر ہی اندر دین کی جڑیں کاٹتا رہا، دوسرا وہ جس نے صرف رسول کو بچانے کی خاطر کفار سے رابطہ رکھا اور بتقاضاے مصلحت اپنے ایمان کا کھٹلا ہوا اعلان نہیں کیا، ان دونوں میں سے کون بہتر ہے، کس نے مہتمم بالشان خدمات انجام دیں؟ علی کے غامدیں اگر ابوطالب کا کسی سے مقابلہ کیا جائے تو سرکار کی پہلی قصیدہ خوان کا شرف کسی طرح ان سے چھینا نہیں جاسکتا، وہ رہتی دنیا تک پہلے نعمت خواں کہلائیے گئے۔

اس موقع پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اگر حضرت ابوطالب صرف زبان سے اعلان کر دیتے کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں تو کیا مظاہرہ ایمان کے بعد عملی طور پر وہ ایسا کردار ادا کر سکتے جس کی بدولت انہوں نے جیتے جی بانی اسلام پر آپج نہیں آنے دی؟ مستم طر فنی تو یہ ہے کہ عبد اللہ ابن عباس اگر یہ کہتے ہیں کہ نزع کے عالم میں ابوطالب کلمہ پڑھ رہے تھے تو انہیں جھوٹا ٹھہرایا جاتا ہے کہ ان کی عمر

۱۳، ۱۴ سال تھی، وہ بالغ نہیں ہوئے تھے لہذا تصدیق معتبر نہیں۔ ابوطالب کو غیر مسلم ثابت کرنے کے لئے آخر اتنا اصرار کیوں ہے؟

وہ ابوطالب، اسلام کی رگ رگ میں جس کا خون دوڑ رہا ہے، جس کی اولاد دین حق کے لئے ہر دور میں سردوں کی بازی لگاتی رہی، اگر اس کو عمل سے مسلمان اور قول سے موحد ہی ثابت کر دیا جائے تو ان احسانات میں کوئی کمی تو نہیں ہو جائے گی جو ابوطالب اور ان کی اولاد نے دین حق پر کئے ہیں۔ ~~ہمارا مسلک اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ ہم تو ابوطالب کو اسلام کا محسن اور مسلمان سمجھتے ہیں جن کے دین کی قسم کھائی جاسکتی ہے اور ہم جن کو صحیح معنی میں مومن قریش سمجھتے ہیں۔ ان کی مصلحت کو تفتیح کی ایک شکل بھی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ خود انہیں نہیں تو ان کے بھتیجے کو جان کے خطرات لاحق تھے۔~~

خود رسول اکرم بھی ابوطالب سے اس قدر مانوس تھے کہ ان کی وفات پر اندوہ کی تصویر بن گئے اور پھر تین روز بعد جب خدیجہ کا انتقال ہوا تو آپ کی حالت دیکھ دیکھ نہ جاتی تھی۔ آپ نے گھر سے نکلا چھوڑ دیا، اور منسلک بعثت کو عام الحزن کا نام دے دیا۔

سفر طائف

خدیجہ اور ابوطالب کے بعد آنحضرت مادی طور پر بے سہارا ہو گئے تھے کچھ دنوں تک آپ نے گوشہ نشینی کو طول دیا پھر طائف کے عام ہوئے کیونکہ مکہ میں کفار قریش کا غلبہ بڑھ گیا تھا اور ابوطالب کی رکاوٹ سامنے سے ہٹتے ہی وہ بے دھڑک حملے کرنے پر اتر آئے تھے۔ یہ سفر آپ نے نہایت موثری سے کیا اور صرف اپنے آزاد غلام زید بن حارثہ کو ساتھ لیا لیکن بنی ثقیف نے مکہ والوں سے زیادہ بدسلوکی کی، آپ پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ لہو لہان ہو گئے اور پاؤں بھی دوڑتے دوڑتے زخمی ہو گئے۔ — چھ سات سو سال پہلے میڈونے حضرت عیسیٰ کا جو حال کیا تھا، طائف میں اسی منظر کو دہرایا گیا اور آپ نے یکے

کے قریب بطنِ نخلہ پہنچ کر قرار لیا۔

زید بن حارثہ خفیہ طور پر مکہ پہنچے اور جب مطعم بن عدی نے حمایت کا وعدہ کر لیا تو زید واپس آ کر آپ کو مکہ لے گئے۔
حضرت عائشہ زوجہ رسول

اللہ کے بھیجے ہوئے سفیروں کو اکثر ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ آنحضرت بھی انہیں آزمائشوں سے گزر رہے تھے مگر انہیں بہر طور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنا تھا اور خدا شناسی کے لئے ہر وہ راستہ اختیار کرنا تھا جس سے وہ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا سکتے۔ اس لئے آپ نے مختلف قبیلوں سے رابطہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا، طے کیا کہ بیشتر قبائل کی لڑکیوں کو اپنے حرم میں داخل کریں گے اور ایک رشتہ پیدا ہونے پر اہل قبیلہ کی اکثریت تک پہنچ کر انہیں متاثر کرینگے۔
 سترہ بعثت میں سب سے پہلا عقد آپ نے ”سودہ بنت زمعہ“ سے کیا پھر ابو بکر کی خواہش پر عائشہ داخلِ حرم ہوئیں۔ جن کی عمر اس وقت چھ سال تھی تین سال بعد آپ بالغ ہوئیں اور بیوی کا کردار ادا کر سکیں۔

آنحضرت کی نظر میں بیویوں کے لئے صورت و شکل اور سن و سال کی کوئی قید نہ تھی۔ وہ ہر بے سہارا کا سہارا بننے کو تیار تھے اور ہر اس عورت کو زوجہ کی حیثیت سے قبول کرنا چاہتے تھے جس کے ذریعہ وہ اس کے رشتہ داروں تک پہنچ سکتے اور حلقہٴ اسلام کو وسعت دے سکتے۔

آپ کا یہ نظریہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا اور پیغمبر اسلام کی ہم رشتگی سے خود اسلام کا رشتہ وسیع ہونے لگا لیکن دوسری طرف اُم المؤمنین عائشہ کی برتری ثابت کرنے کے لئے ایسی ایسی حدیثیں گھڑ لی گئیں جن سے آنحضرت کے وقارِ نبوت پر ایسی ضرب پڑی کہ آپ کی سیرت ہی بدل کر رہ گئی۔ قدرت نے تو دنیا میں اہلابِ طاہرہ کا التزام کیا تھا مگر امت نے ایک خاص مقصد کی خاطر آپ کی وصیت پیش کی ہے جس سے ایک العزم پیغمبرِ نبوت باللہ جنسی مریض معلوم ہوتا ہے۔

”تاریخ احمدی نے بحوالہ ابوالغدا جناب عائشہ سے ایک روایت نقل کی ہے
 ”ایک دن جناب رسالت مآب میرے یہاں تشریف لائے۔ میں دروڑ
 کی شدت میں دارا سا کہہ کر گراہ رہی تھی۔ آنحضرتؐ نے میری حالت دیکھ کر فرمایا
 اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ، تو تم کو کیا ضرر ہے، تمہاری تجہیز و تکفین کا کیفل ہوں گا
 کفن دے کر اور نماز پڑھ کر تم کو دفن کر دوں گا۔ یہ سن کر میں نے کہا: واللہ میرا کفن
 تو یہ ہے کہ میری تجہیز و تکفین سے فارغ ہوتے ہی، آپ میرے گھر میں کسی دوسری
 بیوی سے ہم صحبت ہوں گے۔“

جنیات کے سلسلے میں ام المؤمنین سے یہ روایت بھی ہے کہ ”میری ماں
 مجھے لکڑی کھلاتی تھیں تاکہ میں زنا کے قابل ہو جاؤں۔“

خدا کا محبوب ترین رسول جس کی خلقت صرف عرفانِ باری کے لئے ہوئی تھی
 اس کے اسلوب زندگی کے محاسن کو سمجھتے ہوئے بھی مسلمان راوی اس کے بعض مشاغل
 اور بتاتے ہیں۔

سبحرین بعد سے روایت ہے کہ ”عرب کی ایک عورت رسول اللہ کے
 لئے لائی گئی جو سر سے چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ آنحضرتؐ اس سے جوع کیا تو

اس نے کہا: میں اللہ کے نام پر تم سے پناہ مانگتی ہوں“ اپنے اسکو چھوڑ دیا۔ (۲۰)

ابو اسیب سے روایت ہے کہ ایک دن میں رسول اللہ

کے ساتھ ایک جگہ گیا۔ ایک عورت جوینہ کو کچھ لوگ لائے

آپ نے اس کی طرف سبقت کی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ

گئی اور جب آپ نے اُس سے اپنے کو قبول کرنے کی بات کی تو

اس نے اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ کہا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ (۲۱)

یہ روایات محدثین ائمہ اربعہ کی منتخب روایتوں میں ہیں۔ اس طرح کی
 کتنی ہی روایتیں بخاری، مسلم اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں، جن سے
 رسول اللہ کا ایک خاص کردار واضح ہوتا ہے اور وہ جذبہ بشری سے مغلوب ایک

ایسے انسان دکھائی دیتے ہیں جن کی روحانیت مشتبہ نظر آتی ہے۔

نتیجہ دہی نکلتا ہے جو وضع احادیث کا حاصل ہے کہ چونکہ آپ طبعاً ایسی عورتوں کے شائق تھے لہذا سب سے زیادہ جوان عورت کی طرف آپ کا التفات زیادہ تھا اور کوئی دوسری بیوی آپ کو حضرت عائشہ سے زیادہ پسند نہ تھی یہی وہ روایتیں ہیں جن کو بنیاد بنا کر کسی نے رنگیلا رسول لکھ دیا اور کسی نے صاحبِ عصمت پیغمبر پر نفس پروری کے الزامات تراش لئے۔ آنحضرت کی ذات گرامی ہمارا مرکز عقیدت ہے ہم ان روایتوں کے تاریک پس منظر انداز کر جائیں گے لیکن جو لوگ حضور کو ایک عام آدمی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ روایتیں صرف ایک عورت کی برتری ثابت کرنے کے لئے گھڑی گئی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے پیغمبر میں خواہشات نفسانی کا شائبہ تک نہ تھا، وہ تو ایک پاک صاف بشر کی نظیر تھا جو اُسٹھٹے بیٹھتے سوتے جاگتے، ہر حالت میں قابلِ تقلید تھا جس کا ایک رُخ عیسیٰ ابن مریم اپنی طاہر و مطہر زندگی سے پیش کر چکے تھے۔

کے کے حالات اب کسی حد تک معتدل تھے۔ مطعم بن عدی نے اعلان کیا تھا کہ محمد اس کی پناہ میں ہیں لہذا قریش کے تشدد کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی تھی جس سے اشاعت اسلام کو فائدہ ہوا اور ایک کثیر تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

شب معراج

انسانی جسم کا سفر آسمانی حیرت انگیز ہے لیکن صرف ان لوگوں کے لئے جو حضور کو اپنے مادی تصور میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا نبی تو ایک پیکرِ نور تھا جس نے ہمیں اپنے سے مانوس کرنے کے لئے جسم کا بادہ اوڑھ لیا تھا اور اسی لئے آپ کے جسم میں سایہ بھی نہ تھا۔ سورج کی شعاعیں غالبِ نورانی کو پار کر کے دوسری طرف گزر جاتیں۔ درمیان میں کوئی رکاوٹ تھی ہی نہیں تو پرتو کس چیز کا پڑتا۔ اس وصف کے ساتھ ساتھ پاؤں میں ایسی آہٹ بھی نہ تھی جو عام آدمیوں کے پاؤں میں ہوتی ہے پھر بھی آپ ہم ہی جیسے تھے، صرف دیکھنے میں لہذا لوگوں کو بے تکلفی سے آپ

کی باتوں پر دھیان دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی۔ حضرت جبریل خالق حقیقی کی طرف سے اب بھی ہدایات لے کر آرہے تھے۔ آپ ان تمام آیات اور ان کے مفہایم کو نزدیک و دور کے اہل اسلام تک پہنچا رہے تھے۔ ۷۲ ہجری جب سلاطین کی شب جبریل آئے تو فوراً ایک گھوڑا ان کے ساتھ تھا۔ جبریل نے فرمایا کہ خداوندِ قدوس نے یاد فرمایا ہے۔ آنحضرتؐ بلا کسی جھجک کے گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ اصطلاحاً حاجس کو براق کہا جاتا ہے۔

جبریل براق کی لگام تھامے ہوئے تھے اور براق فضائے بسیط پر پرواز کر رہا تھا۔ گھوڑا بیت المقدس پہنچ کر ٹھہرا اور پھر منازلِ آسمانی طے کرنے لگا۔ ایک مقام پر پہنچ کر براق ٹوک گیا اور جبریل نے کہا کہ اب اگر وہ آگے جائیں گے تو ان کے پر جل جائیں گے۔ یہاں سے آپ ایک نوری تخت پر بیٹھے۔ آگے نہ پھیلی ہوئی نضا تھی اور نہ زمین و آسمان کا کوئی پستہ نشان، صرف ایک نور کا عالم تھا اور اس میں رفعت نام کا تخت نور بہتا چلا جا رہا تھا۔ منزلِ قایبِ قوسین پر پہنچ کر آپ تخت سے اترے اور پاپوش اتار کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا مگر آپ کو ہدایت ہوئی کہ اسی طرح آگے بڑھیں۔ آپ بڑھتے چلے گئے۔ سامنے ایک پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پیچھے سے آواز آرہی تھی۔ یہ آواز اس بچے سے ملتی تھی جس نے دعوتِ ذی الشہرہ میں آپ کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ پھر ایک ہاتھ برآمد ہوا جو آپ کی گور کے پالے علی ابن ابی طالب کے ہاتھ جیسا تھا، اسی لئے علی کو ولید اللہ بھی کہا جاتا ہے۔

معراج میں کیا باتیں ہوئیں؟ یہ تو ختم المرسلین جانتے ہوں گے یا خود باری تعالیٰ۔ ”کیا کس نے کہا، کیا کس نے سنا، یہ بات زمانہ کیا جانے“ ہم کو تو بس یہی معلوم ہے کہ حضور پانچ وقت کی نمازوں کا تحفہ لے کر فرش پر واپس آئے۔ اس مقام پر یہ نکتہ فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ جو لوگ معراجِ جہانی کے قائل نہیں ہیں۔ حضور صرف انہیں کے لئے براق پر سوار ہو کر گئے تھے اور تختِ رفعت

قادر مطلق نے محض اس لئے بھیجا تھا کہ وہ ہر طرح کے جسم کو لے کر اڑ سکتا تھا۔ در نہ خود جسم نوری میں ہول کے درد پر پرواز کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور خلّاق کائنات بھی چاہتا تو فضا بے بیط کو سمٹنے کا حکم دے دیتا اور حضور اُنّا فانا پیدا کرنے والے کے حضور پہنچ جاتے۔ براق و ذرف کا التزام ایک تو حضور کی منزلت دکھانے کے لئے کیا گیا تھا، دوسرے اس لئے بھی کہ آنحضرت کو اپنا سا بشر سمجھنے والے بھی قائل ہو جائیں کہ آپ ایسی سواری پر گئے تھے جو آسمان پر پرواز کر سکتی تھی۔

ہماری تحقیق میں یہ سفر اُتم بانی کے گھر سے ہوا تھا اور اس میں اتنی دیر لگی کہ گئے تھے تو دروازے کی زنجیر ملنا شروع ہوئی تھی اور واپس آئے تو زنجیر کا ہلنا بند ہو رہا تھا۔ اسی لئے بعض لوگ معراج روحانی کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

بیعت عقبہ

یہ وہ زمانہ تھا جب تبلیغ دین اپنے عروج پر تھی مگر قریش ابھی اپنا کام کر رہے تھے، آنحضرت جہاں بھی جاتے، الجہل پیچھے پیچھے لگا رہتا اور راہ پر آتے ہوئے لوگوں کو بھڑکاتا رہتا کہ حضور کا دماغ چل گیا ہے۔ پچھلے برس مدینے کے چھ آدمی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور دین کی دولت لے کر واپس گئے تھے انہوں نے مزید کچھ آدمیوں کو ہمار کیا۔ ان کو لے کر وہ اسی مقام پر آکر ملے جہاں حضور نے ان کو ایمان کی روشنی دکھائی تھی۔ یہ پہلی بیعت عقبہ تھی جس کے بعد آنحضرت نے مصعب ابن عمیر کو ان کے ساتھ کیا۔ ان سب نے مل کر مدینے میں اشاعت دین کے لئے بڑی سرگرمی دکھائی اور کافی آدمیوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا

”دو سال بعد کوئی پچھتر افراد کے ایک وفد نے آپ کو دعوت

دی کہ میثرب کو اپنا وطن بنالیں۔ انہیں اُمید تھی کہ آپ کا دہاں آنا اور

خروج کے باہمی مجاہدے کو صلح سے بدل دے گا۔ میثرب میں یہودی

بھی آنے والے سیماکے منتظر تھے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے

بت پرست ہم وطنوں کو پیغمبر خدا جیسے کسی نبی کے استقبال پر تیار

کر چکے تھے۔“ (۲۱)

تاریخ نے اس معاہدے کو دوسری بیعت عقبہ کا نام دیا ہے جس کے بعد آنحضرت کے منتخب بارہ نقیبوں نے مدینہ واپس آکر زمین ہموار کرنا شروع کر دی۔

ہجرت مدینہ

کے میں اب پہلے جیسے خطرات نہ رہے تھے مگر مدینہ زیادہ محفوظ تھا اور وہاں سے اشاعت اسلام کے لئے نئے حلقے ملنے کا بھی امکان تھا، لہذا آنحضرت نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا اور مسلمان آہستہ آہستہ کسی کو تباہے بغیر کے سے مدینہ منتقل ہو گئے۔ خود آنحضرت بھی ایک منصوبہ بنا چکے تھے جس کا کسی کو علم نہ تھا مگر قریش کو نہ جانے کیسے خبر لگ گئی۔ وہ ”دارالندۃ“ میں جمع ہوئے، ہر قبیلہ کے چیدہ چیدہ آدمیوں کو لیا گیا اور سب نے مل کر حضور کے مکان کو گھیر لیا۔

”یہی وہ رات تھی جب آنحضرت وطن عزیز کو خیر باد کہنے والے

تھے۔ رات کی تاریکی پھیلتے ہی تلواروں کی جھنکار کالوں میں پڑنے

لگی اور آنحضرت صورت حال سے آگاہ ہو گئے۔ حضرت علی کو آپ

نے پہلے سے بلارکھا تھا۔ قاتلوں کی توجہ بستر پر مرکوز رکھنے کی خاطر

آپ نے اپنی سبز چادر حضرت علی کو اوڑھا دی، انہیں اپنے بستر پر

لٹا دیا اور خود حضرت داؤد کی طرح کھڑکی میں سے باہر نکل گئے۔“ (۲۲)

”اصل سبب حضرت علی کو چھوڑنے کا یہ تھا کہ کفار قریش کی چند

امانتیں حضور کے پاس رکھی ہوئی تھیں چونکہ وہ باعتماد دیانت اور

بمشاہدہ امانت حضور کے پاس امانتیں رکھا کرتے تھے اور وہ حضور

کو ”امین وصادق“ کہا کرتے تھے اس بنا پر حضور نے حضرت علی مرتضیٰ

کو اپنے بستر استراحت پر لٹایا اور اپنی خاص چادر مبارک اڑھا کر

انہیں سلا یا لہذا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ وہ پہلے شخص ہیں

جنہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں

اپنی جان کو ذرا کیا۔“ (۲۳)

یہ تو بے محدث دہلوی کی رائے، ہمارے عقیدہ میں رسول کے بستر پر صرف امام لیٹ سکتا تھا اور اسی میں رسول کی مشابہت پیدا ہو سکتی تھی لہذا حضورؐ نے پہلے ہی علی سے کہہ دیا تھا کہ رات وہ وہیں آکر گزاریں چنانچہ حضرت علیؑ اپنا نفس اللہ کے ہاتھ بیچ کر اس کے نبیؐ کے بستر پر اس شان سے سوئے کہ ایسی میند زندگی بھر کبھی نہ آئی تھی۔ ادھر قریش رات بھر جھانک جھانک کر دیکھتے رہے اور سوتے ہوئے علیؑ کو رسول ہی سمجھتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضورؐ ایک مٹھی خاک لے کر باہر نکلے تھے۔ وہ انہوں نے قریش کی طرف اڑا دی گویا ان کی آنکھوں میں جھونک دی اور صاف نکلے چلے گئے۔ تھوڑی دُور چلے ہوں گے کہ پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ آپؐ نے گھوم کر دیکھا تو حضرت ابوبکرؓ تھے، آپؓ ٹھہر گئے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے گھر کی طرف گئے۔ وہاں حضورؐ نے ایک ادبئی حضرت ابوبکرؓ سے خرید کی۔ اُس پر سوار ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ خود اپنی اونٹنی پر بیٹھے اور دونوں نہایت خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

صبح ہوتے کفار قریش نے گھر میں داخل ہو کر چادر ہٹائی تو رسولؐ کے بجائے علیؑ کو پایا اور سوال کیا کہ محمدؐ کہاں ہیں؟ علیؑ نے بڑی متانت سے جواب دے دیا ”تم لوگ تو اس طرح پوچھ رہے ہو، جیسے انہیں میرے حوالے کر گئے تھے۔“ اس پر دشمن بہت غضبناک ہوئے، مگر علیؑ کا ہاتھ قبضہ شمشیر کی طرف بڑھتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ کیونکہ انہیں فوراً حضورؐ کے تعاقب میں جانا تھا۔

غاری ثور

کفار قریش کو آنحضرتؐ کے پیچ نکلنے پر بہت غصہ تھا۔ انہوں نے زندہ یا مرڈ پکڑ لانے والے کے لئے سوا دنوں کا اعلان کر دیا اور کئی آدمی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ آنحضرتؐ، حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مکے سے ڈھائی تین میل گئے ہوں گے کہ انہیں غاری ثور نظر آیا۔ دونوں تعاقب میں آنے والوں سے بچنے کے لئے اس میں

داخل ہو گئے اور ان کے داخلے کے بعد ہی مکڑی نے اپنا جال غار کے دانے پر مینا دہانے سے ہٹا ہوا ایک بول کا درخت تھا۔ اس پر مکڑی نے انڈے دے دیئے جس سے یہ شبہ ختم ہو گیا کہ اندر کوئی داخل ہوا ہے۔ اس اثنا میں دشمن تلاش کرتے ہوئے دہانے تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر ان کی آہٹ پا کر رونے لگے۔ آپ نے سبب پوچھا تو کہا کہ دشمن اس تعداد میں ہیں اور ہم دو ہی۔ آنحضرت نے تسکین دی کہ نہیں، ہم تین ہیں، دو ہم ایک خدا، اس پر حضرت ابوبکر کو کچھ تسلی ہوئی۔ بڑا خطرناک کام کیا تھا حضرت ابوبکر نے۔ رونے کی آواز کوئی سن لیتا تو دونوں پکڑ لئے جاتے!

۲ ربیع الاول سالہ بعثت کو یہ لوگ غار میں پہنچے تھے، ۵ ربیع الاول کو برآمد ہوئے۔ تین روز تک ایک روایت کے مطابق عبداللہ بن ابی بکر شیب میں کھانا پہنچاتے رہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت علیؑ لوگوں کی نظروں سے بچ کر کھانا لے جاتے رہے۔ غرض کہ ۵ ربیع الاول کو یہ لوگ باہر نکلے اور مدینہ کی طرف چلے ہی والے تھے کہ سراقہ بن جعشم نے انہیں دیکھ لیا مگر قریب پہنچتے ہی اس کا گھڑا زمین میں دھنس گیا تو وہ گڑ گڑانے لگا۔ آنحضرت نے اس کو معاف کر دیا۔ سراقہ واپس ہو گیا اور حضور مدینے کی طرف چل پڑے۔ اس عرصے میں عبداللہ بن اریقط اور عامر بن فہیرہ بھی ان سے آئے اور چاروں ایک ساتھ مدینے کے رہی ہو گئے۔

مدینہ: آنحضرت کا وطن

اہل مدینہ ستر یا اخیر مقدم بنے ہوئے حضورؐ کے منتظر تھے۔ شہر سے دو میل پر ۱۲ ربیع الاول دشمنہ کو قبا کے مقام پر آپ کا اونٹ چلتے چلتے رک گیا اور آپ اسی کو مشیت ایزدی سمجھ کر اتر پڑے۔ مدینے کے مسلمانوں نے تکیہ کے نعرے بلند کئے اور مدینے کی تاریخ کا ایک نیا باب داہو گیا۔ یہاں آپؐ نے اسلام کی پہلی مسجد، مسجد قبا کی بنیاد ڈالی۔ حضرت علیؑ کے

دالوں کی امانتیں واپس کر کے اسی مقام پر حضورؐ سے آکر ملے۔ آپؐ خواتین اور بچوں کو ناقوں پر لے کر پاپیادہ آئے تھے۔ پیروں کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا جس کو دیکھ کر آنحضرتؐ روتے لگے اور اپنے منہ کا لعاب لگا کر زخموں کو اچھا کیا۔

اس مقام پر چار روز قیام کر کے آپؐ عازمِ مدینہ ہوئے۔ خواہش تو ہر ایک کی یہی تھی کہ حضورؐ اس کے مہمان بنیں مگر یہ شرف ابو الیوبؓ انصاری کو حاصل ہوا ۱۶ ربیع الاول جمعہ کو آپؐ نے محمد بنِ سالم میں پہلی نمازِ جمعہ پڑھائی۔ آگے چل کر اسی جگہ مسجد بنوئی تعمیر ہوئی۔ اس میں حجروں کے ساتھ ساتھ ایک مسقف چوترہ بھی بنایا گیا جو صفہ کہلایا، جہاں نو مسلم قیام کرتے تھے اور صدقے اور خیرات کی قوام سے ان کی پرورش ہوتی تھی تعمیر مسجد مکمل ہونے پر اذقاتِ نماز اور ان کی کوئی کا تعین ہوا جو مجموعی طور پر مشترکہ قرار پائیں۔

ہماری تحقیق میں سنِ ہجری حضرت علیؓ کی تحریک پر جاری ہوا اور حکم رسولؐ سے حضرت علیؓ نے حضرت بلالؓ کو اذان کی تعلیم دی اور وہ اسلام کے پہلے مؤذن مقرر ہوئے۔

بھائی چارہ

مدینے کے حامیان و ماضیانِ اسلام رہتی دنیا تک ضربِ المثل رہیں گے کہ انہوں نے خدا کے آخری ہادی کو اس وقت پناہ دی جب اسلاف کے وطن میں اُن پر عرصہٴ حیات تنگ تھا۔۔۔۔۔ مہاجرین اہلِ مدینہ کے لئے اجنبی نہیں تو نئے ضرور تھے لہذا حضورؐ نے تجویز فرمایا کہ ایک کو دوسرے کا بھائی بنا دیا جائے چنانچہ ابوبکر کو عمر کا، طلحہ کو زبیر کا، عثمان کو عید الرحمن کا۔ حمزہ کو ابنِ حارثہ کا اور علی کو خود اپنا بھائی بنایا۔ اس اخوت کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس میں مذاقِ طبیعت، انسانی فطرت اور اندازِ فکر کی بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا۔

”تم دنیا و آخرت دونوں میں میرے بھائی ہو۔“

عقد جناب فاطمہ

مدینے میں حضور کو جب قدرے اطمینانی زندگی میسر آئی تو آپ نے حدیجہ بکری کی واحد یادگار جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی شادی پر توجہ کی۔ آپ کی ولادت ۳۵۰ بعثت میں ہوئی تھی، ۳۵۵ میں آپ دس سال کی حدوں کو پار کر رہی تھیں ایمار پاتے ہی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں نے درخواست کر دی مگر حضور اکرم نے اس کو مسترد فرمادیا اور کہہ دیا کہ فاطمہ کا نکاح وحی کے مطابق ہوگا۔

ہمیں حضرت ابوبکر کی نیت پر کوئی شک نہیں ہوتا۔ آپ ہر حقیت پر حضور سے اتنا قریبی رشتہ استوار کرتا چاہتے تھے جس کے مقابلے پر کوئی ٹھہر ہی نہ سکے۔ اسی لئے چھ سال کی نابالغ بیٹی حضور کی زوجیت کے لئے پیش کر دی تھی جواب عملی طور پر محترم زوجہ رسول تھیں۔ اب جناب فاطمہؑ کو اپنی زوجہ بنانے کے لئے دامانِ آرزو پھیلا دیا تھا اور خود اپنے داماد کا داماد بن جانے کی تمنا کی تھی تب بھی اسی جذبے میں کہ رسول کی واحد وارث کی شوہریت کا شرف حاصل ہو جائے۔ جلدی میں وہ اس بات کو بھول گئے کہ فاطمہ زہرا خود ان کی بیٹی حضرت عائشہؓ کی بیٹی ہیں۔ سوتیلی ہی سہی مگر عرب میں تو منہ بولی بیٹی کو سبھی بیٹی ہی مانا جاتا تھا، جس طرح حضرت عثمان آنحضرت کے داماد تھے، اسی طرح فاطمہؑ حضرت ابوبکر کی نواسی جس سے شرع اسلام میں بھی عقد ناجائز یا مکروہ تھا۔

بروایت کنز العمال اس پر آنحضرت نے ناگواری کا اظہار فرمایا تھا جس کے پس پردہ یہی ممنوعات تھے، جن پر یقیناً بعد میں حضرت ابوبکر نے غور فرمایا ہوگا فاطمہ کی حیثیت ہماری نظر میں تو شریکِ کارِ نبوت کی ہے اور علیؑ، بعد پیغمبر ہونے والے امام، اس لئے ہمارے نزدیک تو فاطمہؑ کا نکاح علیؑ کے علاوہ کسی اور سے ہو ہی نہ سکتا اور خالقِ مطلق کی مرضی بھی یہی تھی۔ اسی لئے علیؑ کی طرف سے کوئی تحریک ہونے کے بجائے خود آنحضرت نے علیؑ کی مرضی یافتگی اور رضامندی کا اظہار ہونے پر ۱۵ رجب ۳۵۵ کو فاطمہ زہراؑ حضرت علیؑ کے

رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں اور ۱۹ ذی الحجہ کو رخصتی عمل میں آئی تو حضرت علیؑ نے زہرہ بیچ کر دعوتِ ولیمہ کی۔

باند کی ایک چارپائی، چمڑے کا ایک گدا، ایک مشک، دو چکیاں، دو مٹی کے گھڑے، جہیز کے نمایاں سامان میں تھے، ماضی میں جن لوگوں نے ملکہ العرب کی شان و شوکت دیکھی تھی، اس کی اکلوتی بیٹی کی شادی پر ان کی آنکھیں کھل کی کھل رہ گئی ہوں گی جب کہ دخترِ خدیجہؑ خود بھی سیدہ عالیان تھی اور شہنشاہِ کون و مکان کی خصوصی ورثہ دار بھی۔

اسی سال نماز پڑھتے وقت حکمِ الہی پر آنحضرتؐ نے اپنا رخ بیت المقدس سے کیعے کی طرف موڑ لیا۔ حضرت علیؑ نے فوراً آپؐ کا اتباع کیا، دوسروں کو اس کی خبر بعد میں ہوئی۔

آغازِ جہاد

کفارِ مکہ کو سردارِ کائنات کے پنج نکلنے کا دکھ تو تھا ہی اور جب مدینے میں اسلام پھیلنے کی خبریں ملیں تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگے، انہوں نے مدینے کے یہودیوں سے سازشیں شروع کر دیں، حضور امن کے پیغمبر تھے، انہیں جنگِ جہل سے کیا سرد کار لیکن سر پر کوئی بلا آجائے تو دفاع بھی ضروری تھا لہذا آپؐ کو بار بار دفاعی جنگیں کرنا پڑیں جو غزوات کہلاتی ہیں اور جن کی تعداد ۲۶ ہے۔ چھوٹی لڑائیوں یعنی سرایط میں آپؐ نے دوسروں کو سردار بنا کر بھیج دیا جو گنتی میں ۳۶ ہیں۔

جنگِ بدر

کفارِ قریش میں ابوجہل اور ابوسیفیان عداوت میں ہمیشہ سرفہرست رہے تھے ان کے ساتھیوں سے کئی مرتبہ مسلمانوں کی جھڑپیں ہوئیں۔ خود مدینے کے اندر بھی کین پیدا ہو رہے تھے لہذا حضورؐ نے یہودیوں سے ایک معاہدہ کیا جس میں دیگر شرائط کے ساتھ ایک شرط یہ بھی تھی کہ دونوں میں سے کسی کی جنگ تیسرے فریق سے ہوگی تو وہ جنگ دونوں کی متصور ہوگی۔ اس معاہدے کے باوجود یہودی سازش سے باز

نہیں آرہے تھے۔ اس دوران قریش کے مدینے پر حملہ کرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو کسی فوجی انداز سے منظم نہیں کیا تھا لہذا قدرے پریشانی لاحق ہوئی۔ اس موقع پر رئیس انصار سعد بن عبادہ اور حضرت مقدادؓ نے پورے تعاون کا یقین دلایا اور آنحضرتؐ تین سو تیرہ مسلمانوں کو لے کر شہر سے باہر آ گئے۔

کفار کا لشکر عقبہ بن ربیعہ کی قیادت میں مدینے کے قریب پہنچ چکا تھا جو تقریباً پچاس سواروں اور نو سو پچاس پیادوں پر مشتمل تھا۔ چاہ بدر سے آگے بڑھ کر نو لشکر دوں کا مقابلہ ہوا۔ عقبہ، شیبہ اور ولید سے حمزہؓ، عبیدہؓ اور علیؓ کا سامنا ہوا۔ حمزہؓ نے عقبہ کو اور علیؓ نے ولید کو قتل کر دیا۔ شیبہ عبیدہ کے ہاتھ سے زخمی ہوا تھا۔ علیؓ نے بیک ضرب شمشیر اس کا کام تمام کر دیا۔ علیؓ کی یہ پہلی باقاعدہ جنگ تھی، پھر بھی ان کے ہاتھ سے ۳ آدمی قتل ہوئے، ایک بڑی تعداد کو حضرت حمزہؓ نے جہنم واصل کیا۔ مجموعی طور پر مسلمانوں نے ایسی تلوار چلائی کہ ابو جہل اور اس کا بھائی عاص بھی مارا گیا۔ کل شہر کا فرقت ہوئے، جن میں امیہ بن خلف بھی شامل تھا عبد الرحمن بن عوف نے اپنے سابقہ عہد و پیمان کے سبب اس کو بچانے کی کوشش کی مگر انصار نے ان کی نہ مافی اور امیہ کو ٹھکائے نگا دیا۔ ابوسفیان بچے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اسیروں میں نصر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط قتل کر دیئے گئے، باقیوں کو ذریعہ لے کر شرائط کے ساتھ چھوڑ دیا گیا۔

یہ جنگ رمضان ۳ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی روز فرض کئے گئے اور عید الفطر کے احکام صادر ہوئے۔ اسی سال کے آخر میں عید الاضحیٰ کا حکم آیا اور خمس واجب ہوا۔

جنگ احد

بدر کی شکست نے قریش کے غیظ و غضب کو اور بھڑکا دیا تھا۔ ابوسفیان بن حرب نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے عہد کیا کہ جب تک اہل اسلام کو مزہ نہ

چکھائے گا، اپنے سر میں تیل نہ ڈالے گا۔ اسی طیش میں اس نے دوسو سواروں کو
 کوئے کو عریص پر حملہ کر دیا۔ ایک انصاری کو قتل کر دیا۔ مکانات اور گھاس کے ذخیرے
 میں آگ لگا دی اور مسلمانوں کے تیار ہو کر آنے سے قبل فرار ہو گیا۔

آہستہ آہستہ اس نے ایک بڑا لشکر جمع کر لیا اور کوئی تین ہزار سپاہ لے کر
 مدینے پر چڑھائی کر دی جس میں سات سو زرہ پوش، تین ہزار اونٹ اور سو گھوڑے
 شامل تھے۔ حضور اس کے مقابلے پر ایک ہزار سے بھی کچھ کم آدمی لاسکے، مدینے
 سے چھ میل کے فاصلے پر بمقام اُحد لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ لشکر اسلام میں تین علم
 تھے، جن کو سعد بن عبادہ، جناب منذر اور علی ابن ابی طالب لئے ہوئے تھے۔
 ابوسفیان نے خالد بن ولید، عکرمہ بن ابی جہل اور عبداللہ ابن ربیعہ کو اضر بنایا تھا
 اور فوج کا علم طلحہ ابن ابی طلحہ کو دیا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی طلحہ نے میدان
 میں مقابل طلب کیا اور حضرت علی نے سامنے پہنچ کر پہلی ہی ضرب میں اس کی
 ٹانگ کاٹ دی اور آدھ ٹوٹا چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ پھر دونوں لشکر ایک
 دوسرے سے متصادم ہو گئے۔ مسلمانوں نے ستھراؤ کر دیا اور کفار بھاگنے لگے۔

حضور نے پشت کی گھاٹی میں عبداللہ ابن جبیر کو تیر اندازوں کے ایک دستے
 کے ساتھ تعینات کیا تھا اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے کی تاکید کی تھی۔ یہ دستہ دشمن کے
 پیچا ہوتے ہی ٹوٹ مار میں لگ گیا۔ خالد بن ولید اپنی فوج کے ساتھ گھات میں
 لگا ہوا تھا وہ مسلمانوں کو انتشار میں دیکھ کر ٹوٹ پڑا اور اہل اسلام کی فتح شکست
 میں بدل گئی۔

اس موقع پر چودہ آدمی آنحضرت کو گھیرے ہوئے تھے، تھوڑی دیر میں چوہ
 کے اٹھ رہ گئے۔ ان میں حضرت ابوذر جانہ اور حضرت حمزہ مدافعا نہ جنگ میں آگے
 بڑھ گئے اور دشمنوں میں گھر گئے۔ جناب حمزہ کو معاویہ کی ماں ہندہ کے غلام حنی
 نے نیزہ پھینک کر مارا، جس سے وہ شہید ہو گئے۔ ابوذر جانہ زخموں کی کثرت سے
 جنت کو سدھار گئے۔ آپ کی لاش جب حضور کے سامنے لائی گئی تو وہ گوشت کا

ایک لوتھڑا تھی حضرت علیؑ اب بھی دو آدمیوں کے ساتھ حضورؐ کی حفاظت فرما رہے تھے۔ تلوار چلتے چلتے کند ہو گئی تھی۔ لہذا حضورؐ نے تلوار مرحمت فرمائی جو ذوالفقار تھی۔ بعض روایات کے مطابق ذوالفقار حضرت علیؑ کے لئے عرش سے اُتری تھی۔

”ارباب سیرمیان کرتے ہیں کہ اس وقت صحابہ چار قسموں میں بٹ گئے تھے۔ صحابہ کی ایک قسم جنگ میں مصروف تھی اور وہ شہید ہو رہی تھی، دوسرا گروہ بھاگ رہا تھا اور پہاڑ کی گھاٹیوں اور کوئلوں میں چھپ رہا تھا اور بعض شہر میں جا کر ٹھہر گئے تھے، ان میں حضرت عثمان بن عفان بھی تھے جو جنگ کی آگ ٹھنڈی ہونے پر حضورؐ کی

کی خدمت میں حاضر ہوئے“ (۲۴)

بھاگنے والوں میں کچھ نمایاں لوگ اور بھی تھے۔ ”انس بن نصر بھاگے مگر پھر لپٹ پڑے کہ جب رسول اللہؐ ہی نہیں تو زندہ رہ کر کیا کریں گے اور وہ لڑتے لڑتے مر گئے“

”حضرت عمرو طلحہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ انکے ساتھ نہیں بیٹھے“

”حضرت عمران لوگوں میں تھے جو بھاگ گئے تھے لیکن خدا نے ان کو معاف کر دیا“ (۲۵)

”لیکن ذوالفقار حیدری اس وقت بھی بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے دل شکستہ ہو کر تلوار پھینک دی کہ اب لڑنے سے کیا حاصل!“ (۲۶)

ایک دوسری روایت تفسیر درمنثور، سیوطی اور تفسیر ابن جریر میں خود حضرت عمرؓ کی زبان سے ملتی ہے کہ ”جب جنگ اُحد میں کافروں نے مسلمانوں کو شکست دی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اس وقت میری یہ حالت تھی کہ پہاڑی بکرے کی طرح کوئتا پھرتا تھا“، امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں اس کی صراحت کرتے ہیں کہ بھاگنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی تھے مگر وہ ابتدا میں نہیں بھاگے اور دُور نہیں گئے بلکہ

بھاگ کر پہاڑی پر بکے رہے۔ حضرت ابوبکر علیہ السلام بھاگے تھے لیکن وہ جلد ہی واپس آگئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ابوعبیدہ بن الجراح تھے۔

اس خونریز جنگ کا عالم چشم ملک نے کبھی نہیں دیکھا کہ اسلام کا پیغمبر زخموں سے چور چور خون میں نہایا کھڑا تھا اور صرف ایک تھکا ہوا ہاتھ اس کی حفاظت کر رہا تھا جس میں تلوار چلانے کی سکت نہ رہی تھی۔ یہ ہاتھ علی ابن ابی طالب کا تھا جن کے جسم پر سولہ زخم آئے تھے۔ وہ ناتوانی میں نڈھال ہو کر گر پڑتے تھے لیکن کوئی طاقت اور کوئی جذبہ پھر انہیں اٹھا کر کھڑا کر دیتا تھا۔ وہ رسول کی طرف بڑھتے ہوئے دشمنوں کو کھیرے لگوڑی کی طرح کاٹ رہے تھے مگر دشمن تھے کہ پلے پڑ رہے تھے۔ آخر اس جیلے سرفروش نے کفار کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ میں مسلمان مارے گئے اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ کافروں کے مقتولین کی تعداد صرف تیس تھی۔ جن میں سے بارہ علی نے قتل کئے تھے۔

اب مفرورین اسلام واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ سرور کائنات نے علی سے کہا ”علی۔ تم بھی بھاگ کیوں نہیں گئے؟“

”کیا ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو جاتا۔۔۔۔۔“ علی کا جواب ایک مفیاتیہ حکم لگاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھاگنے والے ایمان کی منزل سے ڈگمگا گئے تھے۔ لیکن اللہ نے وحی لا لعالمین کا کرم کہ آپ نے سب کو معاف کر دیا۔ قریش کے لئے یہ دن بڑی خوشی کا تھا۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے مقتولین کی ناک، کان کاٹ کر ان کا بار بنایا۔ گلے میں پہنا، حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکلوا کر چھایا اور ناجاتی گائی کے واپس چلی گئی۔

اُحد سے واپسی پر مدینے میں اک کبرام جمع کیا۔ ہر گھر میں عورتیں رو رہی تھیں مگر حمزہؓ کی بہن صفیہ کے علاوہ حمزہؓ کا کوئی رونے والا نہ تھا لہذا حضورؐ کی خوشنودی کی خاطر قریش کی عورتیں حضرت حمزہؓ کے گھر گئیں اور ان پر نوحہ کیا۔

اسی سال حضرت فاطمہ زہراؓ کے بطن سے بڑے بیٹے امام حسنؑ کی ولادت ہوئی۔

حضرت عمر کی دختر حضرت حفصہ حضور کی زوجیت میں آئیں۔ ابوسفیان احد سے پلٹتے وقت کہہ گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو حین سے بیٹھنے دے گا، چنانچہ اس نے مختلف قبائل کو بھڑکایا اور مسلمانوں کو ان سے جنگ کرنا پڑی۔ واقعہ بیر معونہ پیش آیا، غزوہ بنی نضیر اور دوسرے غزوات واقع ہوئے۔ ماہ شعبان ۶۰۰ھ میں ولادتِ امام حسین ہوئی۔ حضرت اُم سلمہ کا عقد آنحضرت کے ساتھ ہوا، اور جناب فاطمہ بنت اسد نے وفات پائی جو حضرت علیؑ کی والدہ گرامی تھیں لیکن درحقیقت وہ علی سے زائد حضور کی ماں تھیں۔

جنگ خندق

مدینہ کے یہودی، قیام مدینہ کے دو سال تک تو مسلمانوں کے دوست رہے پھر انہوں نے بھی اسلام کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں اور مسلمانوں سے ان کی جنگیں ہو چکی تھیں۔ بہت سے یہودی جلا وطن ہو گئے تھے لہذا یہودی بھی قریش ہی کی طرح اسلام دشمن بن گئے تھے۔ خیبر میں بھی بنی نضیر کی آبادی تھی۔ اس کے بعض سربراہ اور وہ لوگوں نے مکہ پہنچ کر ابوسفیان سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے ابوسفیان چار ہزار کا لشکر لے کر مکہ سے نکلا۔ یہودی قبیلے چھ ہزار فوج لے کر ان سے آئے اور دس ہزار کی جمیعت مدینے پر حملہ کرنے کیلئے بڑھنے لگی۔ آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے تین ہزار کا لشکر تیار کیا اور مدینے سے نکل کر کوہ سلج کے دامن میں آکر ٹھہر گئے۔

ابوسفیان اور یہودی بڑی تیاریوں سے آئے تھے۔ ان کے ساتھ عرب کا مایا پہلوان عمر ابن عبدود بھی تھا جو تنہا ایک ہزار پر بھاری سمجھا جاتا تھا اور تنہا بہادر تھا کہ لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ مسلمان دشمن کے مقابلے میں بظاہر بہت کمزور تھے، اس پر عمر ابن عبدود کی دھاک، لہذا حضورؐ نے سلمان فارسی کی رائے سے ایرانی طریقہ جنگ پر اپنی فوج کے چاروں طرف خندق کھدوا دی۔ دشمن سامنے پہنچ کر پتھر پھینک کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہونے لگے پھر بھی پیش

روز تک اکاد کا جھڑپوں میں مسلمانوں نے مقابلہ کیا، پھر ایک دن عمر بن عبدود گھوڑے کو خندق پھندا کر رسول کے خیمے تک آگیا اور اس نے مد مقابل طلب کیا۔ آنحضرت نے اصحاب کی طرف دیکھا جو سروں کو جھکاتے ہوئے تھے۔ حضرت عمر نے کہا: "اس نے قزاقوں کے مقابلے میں ایک اونٹنی کے بچے کو پسر کے طور پر ہاتھ میں لے لیا تھا۔" اس بیان سے اور سراسیمگی پھیل گئی۔ عمران عبدود نے پھر حبشہ پڑھا اور حضور نے پھر اصحاب کو مخاطب کیا مگر پہلی دفعہ کی طرح اس بار بھی وہی طفلِ نوخیز اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، جس نے دعوتِ ذیٰ اعشیرہ میں حضور کو لبیک کہا تھا لیکن اب وہ ایک جوان رعنا بن چکا تھا۔ پیغمبر اسلام نے پھر علی کو بٹھا دیا تیسری تیسری بار عمر ابن عبدود نے بڑا سخت طنز کیا۔

”کیا تم میں کوئی مرد نہیں ہے؟“

شکر اسلام کا سنا بے ستور قائم تھا۔ اس مرتبہ بھی علی ہی اُٹھ کر کھڑے ہوئے۔
 میں ————— یا رسول اللہ؟

اب کی حضور نے علی کو بٹھایا نہیں کیونکہ اب اگر کوئی مقابلے پر نہ جاتا تو ابنِ عبدود خود حملہ کر دیتا اور اہل اسلام کی عزت خاک میں مل جاتی ————— آنحضرت نے سر سے پائیک علی کو دیکھا اور ہاتھ بارگاہِ باری تعالیٰ میں اُٹھا دیئے۔

”تو نے عبیدہ کو بدر میں، حمزہ کو اُحد میں اُٹھالیا۔ اب یہ علی ہی رہ گیا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا؟“

علی کے چہرے پر ایک اطمینان تھا۔ آپ اجازت پا کر آہستہ آہستہ دم اُٹھاتے ابنِ عبدود کی طرف بڑھے اور حضور نے اعلان کیا۔

”آج کل ایمان کلِ مشرک کے مقابلے پر جا رہا ہے۔“ (۲۷)

الیوم یزوالایمان کلہ لاشرک کلہ

علی جب عمرو کے مقابلے پر پہنچے تو اس نے کہا۔

”تم کو لڑنے کے لئے بھیجا ہے۔ جانتے ہو میرا نام ابنِ عبدود ہے؟“

”میرا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے“ علیؑ نے بے ساختہ جواب دیا، پھر دونوں کے درمیان کئی مکالمے ہوئے اور آخر لڑائی شروع ہو گئی۔ طرفین سے سترکے ضربوں کے تبادلے ہوئے اور آخر عمر کی تلوار علیؑ کی سپر کو کاٹتی ہوئی ستر تک پہنچی علیؑ نے بھی بھل کر ہاتھ مارا تو عمر و زمین پر گر پڑا اور علیؑ نے اس کا سترق سے جدا کر لیا جنگ کے دوران اس قدر گرد اڑی تھی کہ دونوں میں سے کوئی نظر نہ آتا تھا لیکن جب علیؑ نے نعرہٴ تکبیر بلند کیا تو حضورؐ خوش ہو کر اچھل پڑے اور آپؐ کے منہ سے نکل گیا۔

”خندق کے دن علیؑ کی ایک ضرب کونین کی عبادت سے بہتر ہے“

شاہ عبدالحق محدث دہلوی ایک دوسری روایت بیان فرماتے

ہیں کہ ”حضرت علیؑ مرتضیٰ کا یومِ خندق مقابلہ کرنا قیامت تک میری

اُمت کے اعمال سے افضل ہے“ (۲۸)

لمبارزة علی ابن ابی طالب یوم الخندق افضل من اعمال

اُمّتی الی یوم القیامة

جبریلؑ نے اس خوشی میں ایک رومال لا کر دیا جس پر علیؑ ولی اللہ لکھا تھا۔ مسلمانوں

میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں نے علیؑ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ عمرو

ابن عبدودؓ کی بہن جب بھائی کی لاش پر پہنچی تو خود زہرہ کو جسم پر پا کر بولی۔

”اگر تجھے اس قاتل کے علاوہ کوئی اور قتل کرتا تو میں ساری عمر تجھ پر دتی

رہتی لیکن تیرا قاتل تو وہ ہے جس کے نسب میں کوئی عیب نہیں اور جس کو ہمیشہ سے

شہر کا سردار کہا گیا ہے“

عمرو کے قتل کے بعد عام جنگ شروع ہو گئی۔ اسی دوران زبردست طوفان

آیا اور ابوسفیانؓ رات ہی رات سامانِ رسد ختم ہو جانے کا بہانہ کر کے وہاں سے

کو چھ کر گیا۔

اس جنگ کو جب عام مسلمان مورخین لکھتے ہیں تو بس اتنا ہی کہ تین آدمیوں کا

مقابلہ فلاں مفلان تین آدمیوں نے کیا اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر طوفانِ برق و باران کے سبب شکرِ کفار واپس ہو گیا۔ علی کی شجاعت ان کی نگاہ میں قابلِ ذکر قرار نہیں پاتی

شعبان ۳۵ھ میں بنی مصطلق سے جنگ ہوئی۔ واپسی پر حضرت عائشہ جنگل میں رہ گئیں جو بعد میں پہنچیں۔ یہ واقعہ افک کہلاتا ہے اسی ۳۵ھ میں غزوہ بنی قریظہ، سر یہ سیف البحر، غزوہ بنی عیان و قرعہ میں آئے۔ تیمم کا حکم صادر ہوا۔ آنحضرتؐ نے اذان میں حتیٰ علی

خیر العمل کا اضافہ کیا۔ (۲۹)
صلح حدیبیہ

ذیقعد ۳۵ھ میں آنحضرتؐ نے حج کا ارادہ کیا۔ مدینے کے قریب پہنچ کر چاہ حدیبیہ پر مقام کیا۔ قریش کی مزاحمت کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، لہذا آپؐ نے صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی جو بیعتِ رضوان کہی جاتی ہے۔

کسی مختص آدمی کا نام لئے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ مخبر صادق کو وفاداریوں پر شک تھا ورنہ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں سے تجدیدِ بیعت کی ضرورت کیا تھی۔

اس دوران قریش کے ایچی عروہ نے مشورہ دیا کہ آپؐ کے ساتھی جنگ میں فراہ ہو جائیں گے، اس سال حج نہ کریں۔

حضرت ابوبکرؓ نے اس پر عروہ کو گال دی (لات کی شرمگاہ چاٹ) حضورؐ کو یہ بات ناگوار ہوئی، آپؐ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ وہ سفیر نہ کہ جاس ہیں اور قریش سے بات چیت کریں۔ انہوں نے مصلحتاً عذر کیا اور حضرت عثمان کو تجویز کرنا حضرت عثمانؓ بھیجے گئے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، پھر ہبیل بن عمرو قریش کی طرف سے آیا اور بڑی رد و قدح کے بعد ایک معاہدہ ہوا۔ جس کو حضرت علیؓ نے تحریر کیا۔

۱۔ مسلمان اس سال عمرہ کے بغیر لوٹ جائیں گے۔

۲۔ اگلے سال بھی تین روز سے زیادہ نہ ٹھہریں گے۔

- ۳۔ ہتھیاروں میں صرف تلواریں ہوں گی، وہ بھی نیام میں۔
 ۴۔ مکے میں جو مسلمان ہیں، انہیں آنحضرتؐ اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے اور مدینے سے آیا ہوا کوئی مسلمان مکے میں رہنا چاہے گا تو اُسے روکیں گے نہیں۔
 ۵۔ مکے کا کوئی آدمی مدینے جائے گا تو مسلمان اُسے واپس کو دیں گے۔ مدینے کا کوئی مسلمان مکے آئے گا تو واپس نہ کیا جائے گا۔
 ۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں جس سے چاہیں صلح کریں۔

یہ معاہدہ اگرچہ بہت دب کر کیا گیا تھا، پھر بھی سہیل نے اعتراض کیا کہ فریقین کے نام میں حضرت علیؑ نے محمد رسول اللہؐ لکھا ہے۔ ہم رسول اللہؐ نہیں مانتے، محمد بن عبداللہؑ لکھا جائے۔ حضرت علیؑ اس پر تیار نہیں ہوئے۔ آخر حضورؐ نے کاغذ اور قلم لے کر رسول اللہؐ کاٹ دیا اور اس کی جگہ ابن عبداللہؑ لکھ دیا۔ اس حدیث کو سب مانتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے خود قلم زد کرنے اور لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی سے لکھوا دیا گیا۔ اُن پر ثبات کرنے کی اتنی ہی ضد ہے تو کیا کہا جاسکتا ہے!

شرائط صلح ظاہری طور پر مسلمانوں کے حق میں نہیں تھیں، مگر حضورؐ ضامن ہو گئے، لہذا علیؑ نے بے چون و چرا لکھ دیا۔ دوسرے مسلمانوں کے تاثرات کیا تھے اس کا پتہ نہیں چلتا البتہ حسرتِ عمر کے منہ سے نکل گیا۔
 ”محمد کی نبوت میں، جیسا مجھے آج شک ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔“ (۳۰)

بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے کئی صحابی صلح پر راضی نہ تھے مگر حضورؐ کا فیصلہ اُٹل تھا، جس کی تصدیق خدا کی طرف سے آیہ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ بِهٖج کر کی گئی، پھر اس صلح کے جو نتائج برآمد ہوئے، ان سے حضورؐ کی دوبارہ نبی کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے بعد حضورؐ نے حبشہ، روم، فارس، اسکندریہ، شام اور یمامہ کے حکمرانوں کو خطوط ارسال کئے اور انہیں دعوتِ اسلام دی۔ کہا جاتا ہے کہ نجاشی

شاہ حبش نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ شاہ ایران نے حضور کا مکتوب پھاڑ ڈالا اور آپ نے اس کو حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی بشارت دی تھی۔ قیصر روم نے آپ کے خط کو عزت و احترام سے سنا۔ گورنر مصر نے تحفے بھیجے۔ ان تحفوں میں دو کینز یا جلیں اور ان کی بہن شیریں بھی تھیں۔ تحائف میں دُلہا نامی گھوڑا اور دو غلام بھی شامل تھے۔

جنگ خیبر

جنگ خندق میں ابوسفیان کی پشت پر خیبر کے یہودیوں کا بھی ہاتھ تھا مگر مکمل شکست کے باوجود ان کے حوصلے پست نہ ہوئے تھے۔ وہ جلد ہی بنی اسد اور بنی عطفان سے معاہدہ کر کے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے اور انہوں نے مدینے پر حملے کا منصوبہ بھی بنالیا، حضور کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے حملے سے بچنے کے لئے خود آگے بڑھنے کا عزم کیا۔ ۱۲ صفر ۶ کو آپ چودہ سو پیدل اور دو سو سوار لے کر مدینے سے نکلے اور خیبر پہنچ کر مورچہ بنالیا۔

خیبر میں یہودیوں کے چھ قلعے تھے، جن میں بیس ہزار آزمودہ کار سپاہ موجود رہتی تھی۔ جنگ کی تیاری میں سپاہیوں کی تعداد کچھ بڑھ گئی تھی۔ مرحب عرب کا شہرہ آفاق پہلوان تھا۔ اس کے علاوہ غنم و حارث تھے جن کا مثل دُور دُور نہ ملتا تھا۔

آنحضرتؐ نے پہلے دن حضرت عمرؓ کو علم دیا۔ انہوں نے جنگ کی اوپے نیل مرام واپس آئے۔ دوسرے روز حضرت ابوبکرؓ گئے۔ انہیں بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ تیسرے دن پھر حضرت عمرؓ کو شرف بخشا گیا لیکن آج کی واپسی میں سپاہی اور سپاہی ایک دوسرے کی کوتاہی کو شکست کا ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ حضورؐ نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر فرمایا:۔

”کل میں علم اس کو دوں گا۔۔۔ جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند فرماتا ہے۔۔۔ ایسا مرد جو کراہ اور غیر فرما رہے۔“

”تمام صحابہ راہ میں دیدہ اُمید اور چشم انتظار لئے قبولِ رُخا“

پر بیٹھ گئے۔ حضرت سعد بن وقاص فرماتے ہیں کہ میں حضورؐ کی چشم حق میں کے سامنے گیا اور سلام عرض کر کے دو زانو ہو کے بیٹھ گیا۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں نے بجز اس روز کے امارت کو کبھی پسند نہیں کیا اور نہ کبھی خواہش کی۔ (۳۱)

ہر صحابی کے دل میں ایک ہی خواہش تھی۔ اس میں کوئی چھوٹا بڑا مستثنیٰ نہ تھا کیونکہ حضورؐ کے قول کے مطابق فتح یقینی تھی۔ کون ہو گا جس کو ایسا شرف حاصل کرنے کی آرزو نہ ہو۔ حضرت علیؓ کی طرف کسی کا خیال بھی نہ جاتا کیونکہ وہ مدینے میں صاحب فراش تھے اور آشوب چشم میں مبتلا تھے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت نے ناد علیاً قطہا العجائب اس موقع پر پہلی مرتبہ تلامذت کی اور ادھر علیؓ مدینے سے چل دیئے۔ تھوڑے وقفے سے حضورؐ نے پوچھا۔

”کہاں ہیں علیؓ ابن ابی طالب؟“

کسی نے دیکھا کہ علیؓ پہنچ گئے ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔

”وہ یہیں ہیں لیکن ان کی آنکھ اتنی درد کرتی ہے کہ وہ اپنے پاؤں تک کو نہیں دیکھ سکتے۔“

فرمایا۔ ”ان کو میرے پاس لاؤ۔“

مسلم بن الکوع گئے اور ان کو ہاتھ سے پکڑ کر حضورؐ کے سامنے لائے۔

حضورؐ نے ان کے سر کو اپنی مبارک ران پر رکھا اور اپنا لعابِ دہن ان کی چشم مبارک میں لگا دیا اور دُعا مانگی۔ اسی وقت آنکھ سے درد جاتا رہا۔

حضورؐ نے اپنی خاص زہرہ انہیں پہنائی، ذوالفقار ان کی میان میں باندھی فرمایا جاؤ۔ ”پدے کرنا، جب تک کہ حق تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر قلعہ فتح نہ فرما دے“ عرض کیا۔

”یا رسول اللہ۔ کہاں تک ان سے قتال کروں؟“

پیوست کر دیں اور اللہ اکبر کا فلک شکاف نعرہ لگا کر جھٹکا دیا تو دروازہ اچکے
 ہاتھ میں تھا۔ اس کو سر سے بلند کر کے آپ نے قلعہ کی خندق پر رکھ دیا جس نے
 لشکرِ اسلامی کے لئے پل کا کام کیا اور مجاہد اس سے گزر کر قلعہ میں در آئے فرشتے
 آسمان سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جبریل نے جوشِ مسرت سے نعرہ لگایا۔
 ”علیؑ کے سوا کوئی مرد نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں

لا فتی الاعلیٰ لا سیف الادّ والمفقار

یہ ہے معجزہ قوتِ ایمانی اور تابندہ ربانی کا، دنیا جس کی مختلف تادلیں
 کرتی ہے اور علیؑ کا شرف کم کرنے کے لئے حوالے کے طور پر وضعی روایتیں پیش
 کر دیتی ہے کہ علیؑ نے بقوتِ رحمانی بابِ خیبر اُکھاڑا تھا۔ میں ان کو جھٹلاتا نہیں
 کیونکہ علیؑ میں جو قوت تھی وہ ان کی تھی ہی کب، ساری قوتِ رحمانی ہی تھی
 جو شروع سے آخر تک علیؑ کے ساتھ رہی اور آج بھی یہ اسی کا اعجاز ہے
 کہ جب بھی علیؑ کو پکار دو چشمِ زدن میں جواب آتا ہے اور یہ آپ کا شرف ہے کہ
 خدائے بخشندہ نے ان کے نام کو بھی معجزہ بنادیا ہے۔

کہتے ہیں کہ علیؑ نے جب بابِ خیبر اُکھاڑا تھا تو پورے قلعے میں ایک زلزلہ
 اُگیا تھا اور صفیہ بنتِ حمزہؓ زمین پر گر پڑی تھیں جو انجام کار اسیر ہو کر حضورؐ
 کے جالہ عقد میں آئیں۔ اسی دن حضور کو ایک اور خوشی ہوئی، وہ یہ کہ حضرت
 جعفر طیار حبش سے واپس آئے۔

فتح کے بعد قیامِ خیبر ہی میں زینب بنتِ حارثہؓ مجھے ہوئے گوشت میں نہر ملا
 دیا تھا جو حضورؐ نے نوش فرمایا۔ اس کا اثر اُہستہ اُہستہ ہوا، اور اسی کے
 نتیجے میں آنحضرتؐ کی جسمانی موت واقع ہوئی۔

چند روزہ قیام کے بعد حضورؐ مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو صہبا کے مقام
 پر اقامت پذیر ہوئے، عصر کے وقت حضورؐ کا سر علیؑ کے زانو پر تھا اور آپؐ شہرِ نبویؐ
 فرما رہے تھے کہ وحی کا نازل ہوا حضرت علیؑ اسی طرح ساکت دھامت بیٹھے رہے۔

حتیٰ کہ حضور بیدار ہوئے تو علیؑ سے دریافت کیا کہ عصر کی نماز پڑھ لی۔ علیؑ نے کہا کہ بیدار کیسے کرتا ہوں سورج ڈوب چکا تھا۔ آپؐ نے علیؑ سے فرمایا۔ ”اس کو پٹا لو“ علیؑ نے انگلی سے اشارہ کیا۔ سورج بلند ہونے لگا۔ علیؑ نے نماز ادا کر لی تب غروب ہوا۔ شمس کی یہ رجعت اکثر لوگوں کے لئے قابلِ یقین تھیں بے مگر ہمارا عقیدہ ہے علامہ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اور علامہ اقبالؒ نے ایک شعر میں اس کو تسلیم کیا ہے۔

اُن کہ در آفتق گرد و بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

فدک

فتح خیبر کے بعد اس زرخیز علاقے کو دعوتِ اسلام دی گئی اور فدک کے یہودی نصف زمین ذاتی طور پر آنحضرتؐ کو پیش کر کے آپؐ کی امان میں آ گئے حضورؐ نے یہ علاقہ بحکمِ خدا طمہ نہرا کو بطور عطیہ دے دیا اور اس کی سند لکھ دی۔ (۳۳)

اسی سال مشہور و معروف راوی حدیث ابو ہریرہ مسلمان ہوئے، انہوں نے ساڑھے تین سال حضورؐ کا زمانہ دیکھا اور اس میں بھی دو سال بحرین میں رہے مگر ۴-۵۳ھ احادیث کے راوی ہیں۔ فاعقبہ و یا ادلی البصار

جنگِ موتہ

حضورؐ نے دیگر سلاطین کے ساتھ والی شام شرجیل عمر و غسانی کو بھی دعوتِ اسلام دی تھی مگر اس نے آپؐ کے قاصدِ حادث ابنِ عمیرہ کو قتل کر دیا تھا لہذا حضورؐ نے زیدؓ کو تین ہزار کاشت کر دے کر رہا کیا۔ جس نے جمادی الاول ۶ھ میں موتہ کے مقام پر ایک لاکھ فوج کا مقابلہ کیا۔ زیدؓ کے شہید ہوئے پر حضرت جعفر طیارؓ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی درجہ شہادت پر فائز ہوئے پھر عبداللہ بن رواحہؓ نے علم سنبھالا اور وہ بھی راہِ خدا میں شہید ہو گئے۔ ان کی جگہ کسی بہادر مسلمان نے لی اور جنگ

جبار رکھی۔

لڑائی میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی مگر کافی تعداد میں لوگ زخمی تھے لہذا مسلمان مدینے کی طرف واپس ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ خدا نے جعفرؓ کو زمرہ کے دو پر عطا کئے ہیں۔ اسی لئے انہیں جعفر طیار کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد سریر ذات السلاسل واقع ہوا۔ اسی سال عائشہ انصاریہ نے حضورؐ کے لئے تین درجے کا ایک منبر بنا کر پیش کیا۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ کی رو سے دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تھا لیکن قریش کے حلیف قبیلہ بنی بکر نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور بنی خزاعہ نے حضورؐ سے مدد مانگی۔ قریش بنی بکر کے مددگار تھے لہذا حضورؐ دس ہزار فوج لے کر مکہ کے عازم ہو گئے۔

الوسیفان اپنی کمزوریوں کے سبب جنگ پر تیار نہ تھا اس لئے اس نے صلح کا ہر ذریعہ استعمال کیا اور آخر مسجد میں جنگ نہ کرنے کا اعلان کر کے چلا گیا۔ حضورؐ اس کی چالوں سے واقف تھے۔ آپؐ اس کے دھوکے میں نہیں آئے اور تیاری کر کے اچانک غیر معروف راستے سے مکہ جا پہنچے۔ مکہ سے ۴ فرسخ پر ۱۰ رمضان ۶؎ کو سرانظران کے مقام پر آپؐ نے پڑاؤ ڈالا۔ مجبور ہو کر الوسیفان قبولیت اسلام پر آمادہ ہو گیا۔

”اس وقت الوسیفان کے تمام پچھلے اعمال سامنے آتے تھے

اسلام کی عداوت، مدینے پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتغال آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی سازش، ان میں سے ہر عمل اس کے خون کا دعویٰ کرتا تھا لیکن رحمتہ للعالمین کی شان اس سے بالا تر تھی۔ اس کے تمام گناہوں پر خطِ عفو پھیر دیا، پھر بھی الوسیفان کفر و ضلالت پر قائم رہا لیکن آخر میں حضرت عباسؓ کے ڈرانے سے کلمہ توحید پڑھ لیا اور پھر سر نو پروردگار جو خدا کے سامنے بھی نہ جھکتا تھا، آستانِ نبویؐ پر

ختم ہو گیا۔“ (۳۴)

ابوسفیان جیسا سرکش اور دشمن اسلام آسانی سے اس مقام پر نہ آیا تھا۔ اس میں حضرت عباسؓ کی کوشش کو بڑا دخل تھا۔ آپ نے ابوسفیان کو سطوت و شکوہ اسلام دکھا کر مغرب کیا تھا اور ابوسفیان نے لشکر اسلام دیکھ کر کہا تھا۔
 ”جاس! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بہت قوی و عظیم ہو گئی ہے۔“
 عباسؓ نے ایک مسلمان کے لب و لہجہ میں جواب دیا تھا۔
 ”افسوس تجھ پر اے ابوسفیان! یہ رسالت و نبوت ہے“

بادشاہت نہیں ہے۔“ (۳۵)

ابوسفیان کا یہ ذہن ترجان ہے اس حقیقت کا کہ اس نے اسلام کی خفایت کے بجائے حضورؐ کے جاہ و حشمت کے سامنے سر جھکایا تھا جس میں حصہ دار بننے کی آرزو اس کے دل میں چھپی ہوئی تھی۔ تاریخ بعید رسولؐ شاہد ہے کہ اس نے تنظیم اسلام کو شہنشاہیت کے قالب میں ڈھال دیا اور تسخیر ممالک کی حرص کو جذبہ دینی سے تعبیر کیا۔

حضورؐ کے داخلہ مکہ میں اگرچہ زیادہ دشواریاں پیش نہ آئیں پھر بھی مزاحمت ہوئی اور حضورؐ نے اعلان کر دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا، وہ محفوظ مامون ہوگا۔ اس موقع پر حضورؐ نے اپنی چادر ابوسفیان کے کاندھے پر ڈال دی جو اس کو پناہ دینے کی نشانی تھی۔ حضورؐ کا یہ عمل پیغمبرانہ بصیرت کا ترجمان ہے کہ ایمان قابل یقین نہ ہو تب بھی ظاہری قبولیت کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ کسی وقت بھی خدا صدقِ دل کی توفیق دے سکتا ہے اور وہ نہیں تو اس کی نسل میں کوئی معاویہ بن یزید پیدا کر سکتا ہے۔

آج آپؐ نے سات مرتبہ طوافِ کعبہ کیا، پھر حرم میں داخل ہوئے۔ بت جو نیچے رکھے ہوئے تھے، انہیں اپنے ہاتھ سے توڑا۔ اس کے بعد علیؓ کو اپنے کاندھے پر چڑھایا اور علیؓ نے اونچے بتوں کو اتار اتار کر زمین پر پھینکا جو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

بُت شکنی کی یہ داستان عقیدت کی آنکھ سے پڑھی جائے تو علیؑ کے مناقب فرشتوں کی زبان سے سُنے جاسکتے ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ علیؑ شخصیتِ واحد ہیں جنہوں نے رسولؐ کے ساتھ کبھی میں توحید کا علم نصب کیا اور ہماری نظر میں یہی علیؑ کی صحیح منزل ہے۔

سہ ماہِ عام الفیل میں علیؑ نے آنکھ کھول کر روئے رسولؐ کے بعد پتھر کے ان بتوں کو دیکھا تھا تو سوچا ہوگا کہ کیا یہ صنم کدہ ہی میری پیدائش کے لئے رہ گیا تھا؟ اب سہ ماہ میں تقریباً تیس سال کی عمر میں انہوں نے خالقِ مطلق کا شکر ادا کیا کہ ان کا مولد خدا کا گھر کہے جانے کے لائق ہو گیا۔ دوشِ رسولؐ پر بُت شکنی کے بعد ان کی نگاہ اُدپر کی طرف ضرور اٹھی ہوگی اور فرشتگانِ رحمت اور ہادیانِ برحق کی ارواحِ مقدسہ نے انہیں ہمارا کما ددی ہوگی تب ہی جب وہ دوشِ رسولؐ سے نیچے اترے تو انہیں محسوس ہوا کہ عرش سے فرش پر آگئے ہیں۔ فسطاطِ مسرت سے ان کا چہرہ کھلا جا رہا تھا اور ہونٹوں پر ایک ملکوتی تسکین کھیل رہا تھا۔ گویا انہیں وہ سب کچھ مل گیا ہو جس کو خدا نے انسان کے لئے مقدر کیا تھا۔

محدثِ دہلوی اس کی منظر کشی میں تحریر فرماتے ہیں۔

چند بڑے بُت اُدچی جگہوں پر نصب تھے، جن تک ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ان میں سب سے اُدچا اور بڑا بُت وہ تھا، جسے ہبل کہتے تھے۔ علیؑ مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ! اپنے قدم میرے کا ندھوں پر رکھئے اور ان بتوں کو گرا دیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا

اے علیؑ۔ تم میں باریتوت اٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔ تم میرے گزروں پر آؤ اور ان بتوں کو گراؤ۔

انشاء اللہ! رسول اللہؐ کے دوشِ مبارک پر آئے اور ان کو گرایا۔ اس حالت میں حضورؐ نے علیؑ مرتضیٰ سے پوچھا۔

”خود کو کیا دیکھتے ہو“

عرض کیا۔

”یا رسول اللہ! میں ایسا دیکھتا ہوں کہ گویا تمام حجابات اٹھ گئے ہیں۔ میرا سر ساق عرش سے جاملابے۔ جدھر میں ہاتھ پھیلاؤں وہ چیز میرے ہاتھ آجاتی ہے“ حضور نے فرمایا۔

”اے علی! تمہارا کتنا اچھا یہ وقت ہے کہ تم کا رِحق ادا کر رہے ہو اور میرا حال کتنا مبارک ہے کہ میں بارِحق اٹھائے ہوئے ہوں“

محدث دہلوی نے ہمارے عقائد کی ترجمانی کی ہے لیکن دنیا اگر علی کی اس منزلت کی قائل ہوتی تو مسلمانوں کی تاریخ کا دھارا اس رُخ پر نہ بہتا جس پر حضور اور ابوسفیان دونوں کے نظریات اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ مستقبل کے آئینے میں انہیں پہچانا مشکل ہو گیا اور پھر حق پسند آنکھ بھی ان دونوں میں امتیاز نہ کر سکی۔

قیام مکہ میں حضور نے لوگوں کو بھیج کر کئی تبلیغی مہمات انجام دیں۔ ان میں سے خالد بن ولید کو بھی جذبہ کی طرف روانہ کیا۔

اس قبیلے سے خالد کی پرانی دشمنی تھی، لہذا وہ لوگ ہتھیار باندھ کر آئے۔ خالد حضور کے نمائندے تھے۔ اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خالد نے ان کے ہتھیار رکھوا لئے، پھر ان کے سوا آدمی قتل کر ڈالے۔ اس کی شکایت اہل قبیلہ نے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کی۔ آپ نے تحقیق کی تو واقعہ سچا نکلا۔ حضور غضب میں آئے اور دو تین مرتبہ فرمایا۔

”اے خدا! میں تیرے حضور برأت کا اظہار کرتا ہوں جو

خالد نے کیا۔“ (۳۶)

یہ واقعہ اس ذہن کا ترجمان ہے جو نو واردانِ بساط اسلام میں کارفرما تھا انہوں نے دین کے دامن میں پناہ تو لے لی تھی لیکن عرب کی صحرائی کینہ پوری

کو ساتھ لے کر گئے تھے۔ مسلمان انہیں علی کی شجاعت کا مد مقابل بنا کر سیف اللہ کا لقب دے دیں لیکن وہ غیر اسلامی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہی رہے۔ حتیٰ کہ مالک بن نویر کی حسین یزیدی سے زنا کیا۔ حضرت عمرؓ نے حد جاری کرنے کا اصرار کیا لیکن حضرت ابو بکرؓ نے درگزر سے کام لیا۔ ان کے دور کی تاریخ جس کی شہادت دیتی ہے۔

غزوہ خنین

وادی خنین کے سینہ میں نواح طائف میں واقع ہے۔ فتح مکہ کی خبر سے وہاں کے قبائل میں کھلبلی پڑ گئی۔ بنی ہوازن، بنی ثقیف، بنی حنظلہ اور بنی سعد نے مالک ابن عوف کی سرکردگی میں مسلمانوں کے خلاف ایک اتحاد کیا اور ۱۲ سال کے تجربہ کار سپاہی دریدان سمیہ کے مشورے پر بمقام ”ادھاس“ پانچ ہزار کاشکر لے کر جمع ہو گئے۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی تو شوال سنہ ۶ کو ۱۲ ہزار مسلمانوں کو لے کر چل پڑے جن میں مکے کے دو ہزار تو مسلم بھی تھے۔ شاہ معین الدین ندوی کے بقول کسی نے کہا۔

”آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے!“

حضرت علیؓ معمول کے مطابق علمدار شکر تھے ابھی میدان میں صفیں باندھی نہ گئی تھیں کہ پہاڑیوں میں چھٹے ہوئے دشمن کے تیر انداز حملہ آور ہو گئے۔ حبیب البیر اور روضہ الاجاب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے خالد بن ولیدؓ نے میدان چھوڑا پھر نو مسلم قریش بھاگنے لگے۔ پھر بھڑوں کے گٹھے کی طرح دوسرے مسلمان۔ رسولؐ پکا رہے تھے۔

”بیعت رضوان والو۔ کہاں جا رہے ہو؟“

لیکن کسی نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ حضرت برابر بن عابد کی روایت ہے ”ہم نے ہوازن پر حملہ کیا تو متفرق و منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد ہم غنائم پر متوجہ ہوئے تو انہوں نے جمع ہو کر تیروں کے نرغے میں لے لیا۔ یہ جو فرار و پریشانی کی آزمائش ہم پر مسلط ہوئی یہ ہماری ہی غلطی کی بنا پر تھی کہ ہم دنیاوی مال و متاع کی طرف متوجہ اور اس

کے ساتھ متعلق ہو گئے۔ غزوہ اُحد میں بھی ایسا ہی واقعہ ہوا تھا۔ (۳۷)
 جنگ اُحد کے بعد ہزیمت یاب مسلمانوں کی یہ دوسری جھگڑ تھی
 ”جس میں حضرت علیؑ، حضرت عباسؑ، ابن حارثؑ اور ابن مسعودؓ کے

علاوہ سب بھاگ گئے تھے۔“ (۳۸)

لیکن بھاگنے والے زیادہ دُور نہیں گئے تھے لہذا جب حضرت عباسؑ نے پکارا
 تو ٹھہر گئے اور اُہستہ اُہستہ واپس ہونے لگے۔ اس دوران کفار نے حضورؐ پر حملہ کر دیا
 مگر جانثار سینہ سپر ہو گئے۔ حضرت علیؑ نے پڑھ کر علم بردار شکر ابو جردل کو قتل کر
 دیا اور شدید لڑائی کے بعد کافروں کو شکست ہو گئی۔ صرف چار مسلمان درجہ شہادت
 پر فائز ہوئے، مگر کافراں سے گئے، جن میں سے چالیس کو حضرت علیؑ نے قتل کیا۔
 یہ تھا جنین کا معرکہ، اس کے بعد او طاس میں جنگ ہوئی، جس میں مسلمان کامیاب
 رہے۔ جنگ حنین کے مفردین کا ایک گروہ ابھی طائف میں موجود تھا لہذا حضورؐ نے
 ان کا محاصرہ کر لیا لیکن یہ محاصرہ طول پکڑ گیا اور پندرہ دن گزر گئے
 ایک دن علیؑ ہوازن و ثقیف کے بتوں کو توڑ کر نواح طائف سے پلٹے تو حضورؐ
 آپ کو تنہائی میں لے گئے اور باتیں کرنے لگے۔

”جب اس خلوت و تنہائی کا زمانہ طویل ہو گیا ————— تو صحابہ کہنے
 لگے کہ عجب ہے، دُور دراز کی باتیں چپا کے فرزند سے کرتے ہیں اور دوسروں سے
 نہیں کہتے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ میں ان کے ساتھ راز کی باتیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ
 ان کے ساتھ راز کی باتیں کرتا ہے۔“

ربیع الاول ۹ھ میں حضرت علیؑ نے شہرہ آفاق حاتم طائیؓ کے قبیلہ طے
 کا محاصرہ کیا۔ عدی بن حاتم فرار ہو گیا۔ اس کی بہن سنانہ گرفتار ہوئی۔ حضرت علیؑ
 نے نہایت احترام کے ساتھ اس کو حضورؐ کی خدمت میں بھیجا اور حضورؐ نے اس
 کو آزاد کر کے عدی کے پاس واپس بھیج دیا۔ اس حسن اخلاق کے نتیجے میں سنانہ میں
 وہ خود اکر مسلمان ہوا۔

طائف کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ حضور نے محاصرہ اٹھا لینے کی ہدایت فرمائی یہ بات صحابہ کو ناگوار گزری۔ انہوں نے کہا۔

”تعب ہے کہ ہم کوچ کر جائیں اور ہم پر طائف مفتوح نہ ہو۔ یہ کیا صورت ہوئی؟“
اس پر حضور نے ان کی توبیخ و سرزنش کے لئے فرمایا۔
”تم چاہتے ہو تو جنگ کر کے دیکھ لو۔“

دوسرے دن انہوں نے جنگ کی اور بہت زیادہ زخمی ہوئے اور پشیمان و شرمندہ بھی، پھر کوچ کا حکم بجالانے پر آمادہ ہو گئے۔ اور سوار یوں پر سامان لادنے لگے۔ اس پر حضور نے فرمایا۔

”جب میں نے کوچ کا حکم دیا تو ٹھہر گئے اور توقف کیا، اب خود اس کے خواہاں ہو کھینے لگے“

”یا رسول اللہ! ثقیف کے تیروں نے ہمیں چھلنی کر دیا۔ ان پر دعائے بدیائے“
حضور اکرم نے فرمایا

”اے خدا! ان کو ہدایت دے اور انہیں اسلام پر میرے قریب“ (۳۹)
غزوہ تبوک

اس زمانے میں یہ خبر پھیلی کہ ہرقل روم نے مسیحائی عربوں کی مدد کے لئے چالیس ہزار فوج بھیجی ہے جو شام پہنچ چکی ہے، آپ نے حفظ ماتقدم کے تحت میں ہزار لشکر لے کر پیش قدمی کی اور حضرت علیؓ کو مدینے میں قائم مقام بنا کر چھوڑا۔ اس پر علیؓ نے عرض کیا۔

”یا رسول اللہ! میں کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا۔ کیا وجہ ہے کہ اس مرتبہ مجھے چھوڑے جا رہے ہیں؟“

فرمایا۔

”اے علیؓ! کیا تم اس سے راضی نہیں کہ بمنزلہ ہارون جو موسیٰ علیہ السلام سے نسبت ہے، مجھ سے تمہاری نسبت ہو لیکن فرق یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام نبی تھے

اور میرے بوسیدی کو نبوت نہ ہوگی۔“

پھر آپ نے مقام حرب باد میں اس کی صراحت فرمائی۔ جب علی نے جاکر کہا: لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے ناراضگی کے سبب چھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا: ”لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ میں نے تمہیں اس لئے چھوڑا ہے کہ

تم میرے اہل بیت میں میرے خلیفہ ہو اور ان کی دیکھ بھال کرو“ (۴۰) ابو العزا نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ جاذب میری خلافت کرتے ہو۔

حضرت علی کی واپسی کے بعد حضور آگے بڑھے اور منزل تبوک پر پہنچے لیکن عیسائی اس لشکر کو دیکھ کر مغرب ہو گئے۔ کوئی قتلے پر نہ آیا۔ پھر بھی اس کے نتائج بہت اچھے نکلے۔ ایلہ کے سردار یوحنا نے حاضر ہو کر جزیہ دینا قبول کیا اور ایک شجر پیش کیا۔ آپ نے اس کو ایک ردا مرحمت فرمائی۔ جریا اور اذرح کے عیسائیوں نے جزیہ منظور کیا۔ دومتہ الجندل کے حاکم کے لئے خالد بن ولید کو بھیجا پڑا۔ اس نے خود مدینے آکر اطاعت قبول کی۔

واپسی پر عقبہ ذی فتن نام کی ایک گھاٹی پڑتی تھی جو سواری کے لئے خطرناک تھی۔ اس لئے حذیفہ نے ناقے کی مہار تھامی، اور عمار اس کو ہنکاتے ہوئے چلے۔ ناگاہ سبکی کی چمک میں تھوڑے فاصلے سے چند نقاب پوش سوار نظر پڑے جنہوں نے حذیفہ سے فرمایا کہ یہ منافق ہیں، مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر آپ نے ان کے نام بھی بتا دیئے، اور کہا کہ اس راز کو ظاہر کرو گے تو وہ لوگ کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ — بات پھر دی مصلحت پیغمبری کی تھی کہ یہ لوگ ابھی اسلام کا نام تو لیتے ہیں!

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر نے کئی مرتبہ حضرت حذیفہ سے ان لوگوں کے نام پوچھے مگر حذیفہ نے بتائے نہیں۔ حضرت عمر کو بے چینی تھی کہ نہ معلوم کس کس کے نام بتائے ہوں!

دادئی الرمل

تبوک میں علیؑ کو ساتھ نہ جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مدینے سے پانچ منزل پر دادئی الرمل میں کچھ کا زعر ب جمع ہو گئے تھے جن کی طرف سے شب خون کا خطرہ تھا لہذا حضورؐ نے حضرت علیؑ کو مدینے ہی میں چھوڑا تھا کہ بعد رسولؐ ہو کر کوئی اہل بیت اور مسلمانوں کی حفاظت کر سکتا تھا تو صرف علیؑ۔

واپس آتے ہی آپؐ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کو بھیجا، وہ شکست کھا کر واپس آئے پھر آپؐ نے حضرت عمرؓ کو بھیجا، انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر عمرؓ عاصؓ کو روانہ کیا۔ ان کا انجام بھی پہلوں جیسا ہوا۔ آخر میں حضرت علیؑ کو علم دے کر روانہ کیا۔ جنگ مزدوش تھی۔ حضرت علیؑ نے عام راتہ چھوڑ کر صرف رات میں سفر کیا اور نہایت خاموشی سے دشمن کے سر پر جا پہنچے۔ وہ فوج جو ابتدائے تین بہادروں کو بھاگنے پر مجبور کر چکی، وہ خود میدان سے مٹے موڑنے پر مجبور ہو گئی اور علیؑ مظفر و منصور واپس ہوئے۔

صاحب معارج النبوةؒ نے لکھا ہے کہ جاتے وقت بھی حضورؐ نے خود کھڑے ہو کر علیؑ کو رخصت کیا تھا، واپسی پر بھی استقبال کیا اور خوشنودی کی سند عطا کی۔

سورہ برات

۹ھ میں حضورؐ تین سو آدمیوں کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کو حج کے لئے سورہ برات دے کر روانہ کیا مگر تھوڑی دُور جاتے ہی واپس بلایا، اور حضرت علیؑ کو ان کے بجائے متعین فرمایا۔ آپؐ کے پہنچ کر خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اعلان فرمایا۔ آج کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ برہمن ہو کر طواف کرے گا جس شخص سے رسول اللہؐ نے کوئی عہد و پیمان کیا ہے وہ عہد اس وقت تک نافذ قائم رہے گا، جب تک اس کی میعاد ختم نہ ہو جائے۔ باقی لوگوں میں سے ہر ایک کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی کا کوئی حق رسولؐ پر باقی نہیں رہے گا۔

اسی طرح دس آیتیں آپ نے پڑھ کر سنائیں، پھر قربانی کر کے اور دوسرے واجبات انجام دے کر واپس ہو گئے۔

حضرت ابوبکر نے حضور سے اپنے واپس بلانے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ اس فرض کو میں خود انجام دیتا یا وہ جو میرے

اہل میں ہوتا! (۴۱)

آنحضرت کا یہ فیصلہ اُمور دینی میں مستقبل کے ہر مسئلہ نیابت کو حل کرتا ہے اس سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ میرے اہل میں حضرت ابوبکر یا ان جیسی کوئی شخصیت نہیں آتی، اس تعریف میں تو علیؑ اور صرف علیؑ آتے ہیں۔

”میرے اہل“ کے معنی کو اگر محدود کر دیا جائے تب بھی اس حقیقت میں شک نہیں رہتا کہ جہات اسلامی کی انجام دہی خود رسالت مآب فرماتے یا جو اس کا اہل ہوتا۔ اور حضرت ابوبکر اہل نہ تھے۔

یہ تھی صرف ایک سورۃ کے اعلان کی بات، اس کے مقابلے پر اُس منصب کو پرکھا جائے جس سے پورے قرآن اور پورے اسلام کے استقرار کا مرحلہ وابستہ تھا تو کیا سورۃ برأت کا نا اہل اُس منصب کا اہل قرار پا جائے گا؟

یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ ہم منطقی طور پر سوچیں اور کوئی تاویل نہ کر سکیں تو ابوعبیدہ بن الجراح کے لب و لہجہ میں یہ کہہ دیں کہ اب تو جو ہوتا تھا، وہ ہو گیا اور ایک صریحی ظلم میں عدل کے پہلو پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں۔

بعض دوسرے مواقع کی طرح آنحضرت نے اس موقع پر بھی صاف کر دیا تھا کہ آپ کی نیابت اگر کوئی کر سکتا ہے تو علیؑ ہی۔ حضرت ابوبکر یا کسی اور کو ہرگز اس کا حق نہیں پہنچتا، لیکن اقتدار کی ہوس نے رسولؐ کے ہر قول اور ہر امید کو پامال کر دیا جس کے نتیجے میں تاریخ اسلام کا دامن اولاد رسولؐ کے خون سے رنگین ہوتا رہا اس حق تلفی کے ذمہ دار بہر طور جس کے جواب دہ ہیں۔

اس سال عرب کے مختلف حصوں سے دُخود آئے اور شربت بہ اسلام ہوتے

حضرت علیؑ نے عدی بن حاتم اور مالک بن نویرہ سے خود جا کر زکوٰۃ اور صدقہ کی رقوم وصول کیں اور یمن میں قبیلہ ہمدان کو مسلمان کیا اور ان سے خمس وصول کیا۔ اس خمس میں چند کینزیں بھی تھیں۔ حضرت علیؑ نے ان میں سے ایک کینز اپنے لئے منتخب کر لی جس کی شکایت بریدہ اسلمی نے حضورؐ سے کی اور حضورؐ نے بسند مدارج النبوة، فرمایا۔

”علیؑ کی شان میں بدگمانی نہ کرو کیونکہ وہ مجھ سے ہیں اور میں ان ہوں۔“
انہیں دنوں حضورؐ نے کسار میں فاطمہؑ، ان کے شوہر اور بیٹوں کو لے کر اپنے اہل بیت ہونے کا اعلان کیا۔ آیۃ تطہیر نازل ہوئی، پھر حضورؐ کچھ وقفے سے حجتہ الوداع کے لئے روانہ ہوئے۔

حجتہ الوداع

اس سفر کا التزام حضورؐ نے خاص طور پر کیا تھا۔ جناب یدہ اور تمام اہل المؤمنین ہمراہ تھے۔ اصحاب کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ مکے تک مسلسل رشد و ہدایت کے دریا بہاتے رہے، قربانی اور مناسک حج ادا فرمائے اور اتنے گراں قدر خطبات دیئے جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے مشعلِ راہ ہیں گے ۴۲ ذی الحج کو مکے سے چل کر ۸ ذی الحج کو خیم غدیر میں آقامت پذیر ہوئے جہاں آیۃ بلع کا نزول ہوا۔ حضورؐ نے بالان کشتہ سے ایک منبر بنوایا اور حضرت بلالؓ سے کہا کہ اصحاب کو جمع کریں۔ حضرت بلالؓ نے آواز لگائی۔

”حی علیٰ خیر العمل ———!“

ایک لاکھ چوبیس ہزار اصحاب دیکھتے ہی دیکھتے جمع ہو گئے۔ آپؐ نے سر منبر پر بیٹھ کر حضرت علیؑ کو اپنے برابر کھڑا کیا اور خطبہ دینا شروع کر دیا۔ فصاحت و بلاغت کے چشمے اُبل رہے تھے اور وصیت کے طور پر آپؐ مسلمانوں سے فرما رہے تھے۔

”میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جو ایک دوسرے سے بزرگ نہیں۔ ایک ہے قرآن کریم، دوسرے میرے اہل بیت۔“

”پیغمبر! ان سے کہو کہ اپنے نفسوں کو، اپنی عورتوں کو اور اپنے بیٹوں کو لا کر
مباہلہ کریں۔“

عاقب نے منظور کر لیا اور ۴۴ ذی الحجہ ۱۰ سالہ کو اپنا ذند لے کر آیا۔ آنحضرت
اپنے اثاثہ بنوت کو ساتھ لے کر برآمد ہوئے۔ آپ کے داہنی طرف فاطمہ زہرا بائیں
طرف حسنین اور پشت پر غل دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ نصارائے بخران نے
ان پر نظر ڈالی تو سکتے میں رہ گئے۔ چہروں کے تقدس، انداز کی پاکیزگی اور بشریوں
کی نورانیت نے ان کو ہکا بکا کر دیا۔ اپنے اندر سے انہیں ایک آواز سنائی دی۔
”انہوں نے اگر ہم پر لعنت کی اور بددعا کر دی تو ہم ہرگز نہ بچیں گے۔“
چند لمحات تک ایک تحیر اور سرسیمکی کا عالم رہا پھر مقدس رامب ایک فیصلہ
کے آگے بڑھا

”ہم آپ سے مباہلہ نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔؟“
حضور نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس نے آپ کی سرپرستی
میں رہنا قبول کیا اور خراج و جزیہ دینے کا وعدہ کر لیا۔

اس واقعہ کو ہر مؤرخ نے لکھا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ مباہلے میں یہی افراد گئے تھے۔
خدا کے نزدیک پیغمبر اسلام کے متعلقین میں کوئی سچہ، کوئی مرد
یا کوئی عورت ہوتی تو آپ اس کو ضرور شامل کرتے یعنی صرف اتنے
ہی افراد پر مشتمل آپ کا پورا گھر تھا۔ اس کھلے اعلان کے بعد جو بھی
اہل بیت میں شمولیت کا دعویٰ کرے وہ باطل ہوگا (۴۳)

آخری لمحات

حجۃ الوداع سے واپسی پر سرور کائنات کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔
یہودی عورت نے خیبر میں جو زہر دیا تھا۔ اس کے اثرات اب نمایاں ہو رہے تھے
آہستہ آہستہ آپ کی بیماری کی خبر عام ہو گئی، نتیجتاً عرب کے مختلف حصوں میں عیار
بنوت بھی پیدا ہو گئے اور قبیلہ روم کی طرف سے حملے کا خطرہ بھی بڑھ گیا۔ لہذا آنحضرت

نے اُسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجے گا فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ علی کے علاوہ انصار و مہاجرین میں سے ہر شخص اُسامہ کے ساتھ جائے گا۔ جو اس جنگ میں نہ جائے گا، اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے اُسامہ کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے روانہ کیا اور اُسامہ مدینے سے تین میل فاصلے پر بمقام حرت مجاہدین کو جمع کرنے لگے۔ بڑی کثرت سے لوگ جمع ہو گئے لیکن حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہم میں سے کوئی نہیں آیا۔ اُسامہ نے ان کا انتظار کیا اور آخر آگے کی طرف چل پڑے مگر وہ بہت دُور نہیں گئے تھے کہ حضورؐ کا وقتِ آخر ہونے کی خبر سنی لہذا اسی مقام پر رک گئے۔ (۴۴)

محدث دہلوی نے اس نافرمانی کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس کا سبب یہ لکھا ہے کہ اُسامہ کم سن تھے اور یہ لوگ جہاندیدہ اور جنگ آزمودہ، پھر ایک غلام زادے کی امارت پر بھی انھیں اعتراض تھا، جس کی تلافی بعد میں کر دی گئی۔ عذر گناہ بدتر از گناہ محدث دہلوی تہتہ تک نہیں پہنچ سکے۔ اصل اعتراض علیؑ کے روک لینے پر تھا اور وہ حالات پیش نظر تھے کہ حضورؐ کا رشتہ حیاتِ کسی وقت بھی منقطع ہو سکتا ہے اگر ان سب کی عدم موجودگی میں ایسا ہوتا تو جو منصوبہ ذہنوں میں ترتیب پا رہا تھا، اس پر عمل نہ ہو سکتا لہذا ایک منظم کردہ کی کوئی فرد جانے پر تیار نہیں ہوئی۔

اس خیال کو مستقبل کے واقعات پر منطبق کیا جائے تو صداقت کی تصدیق ہو جائے گی اور نیتوں کا وہ ثبوت مل جائے گا جس کو صرف عقلی قیاس اور ماضی کی روش سے سمجھا جاسکتا ہے۔

بلاشبہ حضورؐ کی جو حالت تھی، اس سے ہر دیکھنے والا سمجھ لیتا کہ وقتِ آخر آہنچا ہے۔ آپؐ کبھی جنت البقیع جاتے کبھی شہدائے بدر و احد کے لئے دُعائے مغفرت کرتے اور موقعِ موقع سے لوگوں کو تلقین کرتے کہ راہ سے بے راہ نہ ہوتا۔

مرض نے جب تک چلنے پھرنے کی اجازت دی، اُس وقت تک آپ ازدواج کی یاریوں پر ان کے گھروں میں استراحت فرماتے رہے، پھر ایک روز تمام ازدواج کو جمع کر کے فرمایا۔ اب وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ہر ایک کے گھر پہنچ سکیں، کسی ایک جگہ ہی رہ سکتے ہیں۔ جہاں بھی وہ قیام کریں، ساری ازدواج وہیں جمع ہو جائیں اس پر سب نے متفقہ طور پر جناب عائشہ کا گھر تجویز کر دیا۔ بیشتر مورخین نے اسی کو ایک دوسرے سے نقل کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ہماری روایات معتبرہ اس کی نفیض کرتی ہیں۔ اس روایت کے پس پردہ اسی جذبے کی کار فرمائی ہے کہ اُم المؤمنین عائشہ کا شرف بڑھایا جائے اور پیغمبر کی جو اس سال اور خوبصورت بیوی پرفتن کی کو دکھا کر ثابت کیا جائے کہ دم بھی انہیں کی آغوش میں نکلا۔ اس طرح آپ کی دہتر سامنے آتی ہے جس میں جنیسات کا غلبہ بھی ہے اور نفسانیت کا پرتو بھی اور وہ باتیں بھی جن سے دُور کے آدمی کو وہ خدا کے فرستادہ سفیر کے بجائے ایک صاحبِ ذوق شہنشاہ نظر آتے ہیں۔

ہم تک ہمارے ائمہ کی جو روایت سینہ در سینہ پہنچی ہے، وہ مختلف ہے جتنی خدیجۃ الکبریٰ آپ کی واحد شریکِ حیات تھیں، لہذا آپ نے پہلی باری ان کی بستی فاطمہؓ دُہرا کو دی تھی اس کے بعد جو بیویاں رفیقہٗ حیات بنیں، ان میں آنحضرتؐ نے عدل برقرار رکھا۔ شریک اور رفیق کے فرق سے ان کے درجات کا تعین کیا جاسکتا ہے ہماری روایات کی رُو سے آپ نے آخری لمحات چہیتی بیٹی کے گھر میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور ہر بیوی نے اس پر تسلیم ختم کر دیا۔ حضرت عائشہ کو کچھ قابلِ محفّا مگر بولیں کچھ نہیں۔

روایتی تاریخ کے معروضات پر اگر ہمارے اس علم کی تردید کی جائے تو اصلی اور وضعی روایات کی حقیقت بھی موقع محل سے گوش گزار کی جائے گی اور اس نتیجے پر پہنچنے کا پس منظر اور پیش منظر تحریر کیا جائے گا جو ہمارے علماء کی موقر تالیفات میں موجود ہے۔

بہر حال حضور جس عالم میں بھی تھے اس میں بڑی تیزی سے اپنی منصبی ذمہ داریاں پوری کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ کو معلوم تھا کہ آپ کا وقت پورا ہو چکا ہے لہذا زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑنا چاہتے مسلمانوں کو بار بار مستقبل کا لائحہ عمل دے چکے تھے جو کچھ کہنا تھا، واضح الفاظ میں کہہ چکے تھے، ہر ایک کی نیت سے بھی واقف تھے۔ لیکن بہکنے والے کو آخری سانس تک سنبھلنے کا موقع دینا آپ کا فریضہ نبوت تھا نتیجتاً کے کہتے ہی شاگردِ ولیمہ الرحمن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر چکے تھے اور مدعی اسلام تھے مگر آپ ان میں سے کسی کو جھٹلانا نہ چاہتے کیونکہ نہ آپ توفیقاتِ الہی سے یابوس تھے اور نہ ان کو کرنا چاہتے تھے تاہم اسی حالت میں آپ نے اتمامِ حجت کی کوشش کی۔ عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے۔

”جب رسول اللہؐ کے مرض الموت میں زیادتی ہوئی تو فرمایا کہ مجھے دوات اور کاغذ دے تاکہ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھ دوں جس کی وجہ سے تم میرے بعد گمراہ نہ ہو۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ پیغمبرؐ صاحبِ قلبہ مرض کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں۔ ہمارے لئے کتابِ خدا کافی ہے۔ چنانچہ جب اس بات پر شور و غل ہوا تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ تم لوگوں کو لازم نہیں کہ میرے حضور میں تنازع اور اختلاف کرو۔“

”اسی پر عبداللہ ابن عباس فرمایا کرتے تھے کہ مصیبت اور عظیم مصیبت تھا وہ اختلاف جو ہمارے اور کتابتِ آنحضرتؐ کے

درمیان حائل ہوا۔“ (۲۵)

شہاب الدین خواجه کتابِ نسیم الریاض شرح شفا فی قاضی عیاض میں اس کی صراحت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضورؐ پر ہدیان بکنے کی تہمت رکھی تھی۔ مسند احمد ابن حنبل اور صحیح مسلم نے بھی سعید ابن جبیرؓ کے حوالے سے لفظ ہدیان استعمال کرنے کی تصدیق کی ہے۔ امام غزالی نے اپنی کتاب سیر العالمین میں حضرت عمرؓ کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ ”چھوڑو اس مرد کو، یہ ہدیان بک رہا ہے۔“ حتیٰ کہ صحیح بخاری

میں دو مقامات پر اس کا تذکرہ ہے۔ البتہ محدث دہلوی اور مولانا شبلی وغیرہ نے الفاظ کا گورکھ دھندلایا کہ حضرت عمر کی گستاخی کو دائرہ تہذیب میں لانے کی سعی کی ہے مگر حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ حضور کو قلم دوات دیا نہیں گیا اور آپ نے بہم ہو کر سب کو باہر نکال دیا۔

پھر آپ نے بروایت روضۃ الاجاب حضرت فاطمہ سے کہہ کر پہلے حسین کو کہلوایا۔ انہیں پیار کیا، پھر علیؑ سے کچھ راز و نیاز کہے، کچھ وصیتیں کیں اور دیر تک آپ کے کان میں کچھ فرماتے رہے۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ اس دوران باہر کھڑے ہوئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے ملاقات کی خواہش کی مگر آپ نے منع کر دیا۔

وفات

حضرت عائشہ بار بار فرماتی ہیں کہ رسول کا سر میرے زانو پر تھا مگر یہ اچھے دنوں کی بات ہے۔ بیماری میں تو جب آپ اٹھ کر بیٹھے، سر اقدس علی ہی کے سینے پر ٹکا رہا اور لیٹے تو کبھی زانوئے علی پر اور کبھی زانوئے خباب سیدہ پر رکھا۔ شہزادی کوئیں فرماتی ہیں کہ بابا کا سر میرے زانو پر تھا کبھی بستر سے اذین حضور ہی چاہا میں نے منع کر دیا، پھر اس نے آواز دی تو میں نے کہا۔ واپس جا۔ تیسری بار اس کی بھانک آواز آئی تو بابا نے غفلت سے چونک کر فرمایا۔

”بیٹو! یہ ملک الموت ہے۔ تیرے در کا اعزاز ہے کہ بغیر اجازت اندر نہیں آسکتا۔ اجازت دے دو اسے“

میں نے مجبوراً اندر آنے کو کہہ دیا اور چند لمحے بعد بابا نے آنکھیں

بند کر لیں (۴۶)

اور خلقت کائنات سے پہلے پیدا ہوئی والا نور اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

تجہیز و تکفین

۲۸ صفر ۱۱ھ، دو شنبے کے دن دوپہر کو خانہ سیدہ میں برپا ہونے والا کبرا

اتفاقاً قیامت خیز تھا کہ اس نے مکانِ عرش میں ایک لرزہ پیدا کر دیا۔ گھر کے باہر کھڑے ہوئے مہاجر و انصار کس حد تک اس دلدوز سانچے سے متاثر تھے، اس کا صحیح انداز تو نہ ہو سکا البتہ حضرت عمرؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ کوئی حضورؐ کو مڑہ کہے گا تو وہ ہنٹر سے اس کی کھال اڑا دیں گے۔ ایسا ہی مظاہرہ وہ مسجد میں جا کر بھی کرتے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ موجود نہ تھے وہ اپنے دیہات کے مکان گئے ہوئے تھے جو شہر سے دو ڈھائی میل واقع تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ آگئے اور حضرت عمرؓ کو انہوں نے سینے سے لگا کر تسلی دی، تو حضرت عمرؓ کی وہ کیفیت دُور ہو گئی۔ پھر نزلِ سیقیفہ بنی ساعدہ کی طرف چیلے۔ گئے۔ تمہیز و تکفین کے لئے صرف بنی ہاشم اور تھوڑے سے صاحبانِ ایمان رہ گئے جنہوں نے اس غم میں بنی ہاشم کا ساتھ دیا۔ اب مہاجرین و انصار میں صرف گنتی کے لوگ تھے۔ ابوعبیدہ بن الجراح سعد بن ابی وقاص اور ایسے تمام لوگ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ جا چکے تھے۔ مولانا روم کے الفاظ میں جب دنیا دار صحابہ دُنیا کی محبت میں مبتلا ہوئے تو مُصْطَفٰے کو بے کفن چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ ان میں بیشتر تو اپنے منصوبے کے تحت گئے تھے اور مومنین کا ہل اپنی قوتِ فیصلہ سے کام لے کر ادران کی تیتوں کو بھاپ کر پیچھے ہو لئے تھے کہ دیکھیں، یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟

مدینہ کی عورتوں میں شورِ ماتم برپا تھا۔ درودِ بار سے اُداسی برس رہی تھی آسمان کا وہ عالم تھا کہ جیسے ٹوٹ کر زمین پر آ رہے گا۔ فاطمہؓ زہراؓ اور عاتکہؓ امّیں و فور غم میں نڈھال ہو رہی تھیں۔ ایمان والے پچھاڑیں کھا رہے تھے، پھر بھی حضرت علیؓ اور دوسرے ہاشمی فرض سے غافل نہیں ہوئے۔ ابوطالبؓ نے قبر کھودی، علیؓ نے غسل دیا۔ جس میں عباسؓ اور قثمؓ نے مدد دی۔ اُسامہؓ اور شقرانؓ نے پانی ڈالا۔ غسل و کفن کے بعد حضرت علیؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ لاشِ قبر میں اتاری۔ پھر علیؓ قبر سے باہر نکل آئے اور مکے کے پڑوسی کو ارضِ مدینہ کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

ان سب کو سقیفہ بنی ساعدہ کی سازش کی خبر ہو چکی تھی اور علی کو بہر طور اتمامِ حجت کرنا تھا لہذا آپ حضور کی یہ آخری خدمت انجام دے کر سیدھے سقیفہ آئے جہاں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، ابوعبیدہ اور چند دوسرے لوگ رہ گئے تھے باقی لوگ اپنی دنیا سدا ہار کر گھروں کو جا چکے تھے۔ علیؑ نے خلافتِ الیہ کے منصب پر کھڑے ہو کر انہیں اپنی غلطیوں پر انبیاء دیا اور اُلٹے قدم واپس ہر گئے۔ سقیفہ کا انتخاب مسلمانوں کی تاریخ کا ایک المیہ ہے لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ علیؑ کو اس کا صدمہ ہوا۔ علیؑ نے یا فاطمہؑ زہراؑ سے اس کے بعد جو کچھ کیا، وہ صرف دنیا والوں کی تسکین کے لئے اور اپنا دنیاوی حق جتانے کے لئے، ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ رسول کے بعد وہ مخلص من اللہ امام تھے اور اب تحفظ و بقائے شریعت کی ذمہ داری ان کی تھی نظم و نسق کی باگ ڈور کوئی بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا، انہیں اس کی پرواہ نہ تھی۔ ہاں اگر رسول کی طرح یہ منصب بھی انہیں مل جاتا تو اچھا تھا۔ تبلیغ و شاعتِ اسلام اسی انداز پر ہوتی رہتی جس کی نظیر حضورؐ نے پیش کی تھی۔ دنیا والوں نے جاہ و منصب کے لئے اپنا راستہ الگ بنالیا تو انہیں اس کے لئے مسلمانوں کو کبھی خلفشار میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لہذا آپ اُلٹے قدم واپس پلٹ پڑے اور اہل سقیفہ اپنی کامیابیوں سے سرشار اسلام کی ایک نئی راہ متعین کرنے میں لگ گئے۔

تکمیلِ نبوت

کائنات کا سب سے پہلا انسان نبی تھا: اللہ کی طرف سے برگزیدہ اور خالص مشیت نے جب اسے بنانا چاہا تو کسی نے اب و گیل سے اس کا خمیر تیار کیا، کبھی پتلا بنایا اور منشاۓ الہی نے اس میں روح پھونک دی۔ پھر اس کا نام آدمؑ رکھا گیا جو آدمی کا نقشِ اول ہے۔ اس میں شعور پیدا کیا گیا۔ شعورِ آدمیت اور شعورِ نبوت اور اس کا لقب صفی اللہ قرار دیا گیا۔

شعور میں خود شناسی اور خدا شناسی دونوں شامل تھے۔ یہ کہنا عقلِ سلیم

کے خلاف ہو گا کہ علم سے بہرہ ور نہیں کیا گیا۔ اس سے عین علم کے عدل پر حرف آتا ہے کیونکہ وہ نمونہ نبوت بھی تھا اور تمثیل آدمیت بھی۔ علیم نے علم دیا تھا تو اپنے ہی علم کا کوئی جزو یقیناً دیا ہو گا اور علیم کا علم ہر زمان و مکان سے ماوراء ہے لہذا مامتا پڑے گا کہ آدم پڑھے پڑھائے، نکھرے نکھرائے عرش سے زمین پر اتارے گئے۔

ملا مکہ نے اپنے رب سے کہا تھا کہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے آدم اشرف المخلوقات تھے، ان کا علم یقیناً ملا مکہ سے زائد ہو گا۔ اس علم کی حدود متعین نہیں کی جاسکتیں مگر وہ خدا کے علم سے مشتق و مستعار تھا اس لئے اتنا ضرور ہو گا کہ فرشتوں کی زبان سمجھ سکے اور دنیا کے کسی لب و لہجہ سے نا بلد نہ ہو۔

آدم کی نظیر کا اطلاق ہر نبی پر ہوتا ہے اور محمد مصطفیٰ تو خاتم النبیین اور آخر المرسلین تھے اور مسلمانوں کی عام اصطلاح میں محبوب ربانی بھی۔ ان کے لئے خالق مطلق نے کیا کسراٹھا رکھی ہو گی۔ آپ کا علم ماضی، حال اور مستقبل سب پر محیط تھا۔ پھر بھی نبوت کی حدود و قیود میں آپ کو اپنے دین کی اشاعت کرنا تھی اور بگڑے ہوئے انسان کو سدھارنے کے لئے اس کی سطح کو ملحوظ رکھنا تھا۔ اس کے لئے کسی ایک زندگی کی قید نہ تھی۔ اصلاح کا سلسلہ ایک نسل سے دوسری نسل میں بھی جاسکتا، مُسلَخ بھی ایک پشت سے دوسری پشت میں پیدا ہو سکتا تھا اور اپنے پیش رو کے ادھورے کام کو پورا کر سکتا تھا۔ سلسلہ انبیاء جن کی بین دلیل ہے۔

نبوت آنحضرت کی ذات پر ختم ہو گئی تھی۔ لہذا خلاق عالم نے دعائے البرکات کو قبول فرما کر امامت کا ایک سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ جس کی ذمہ داری حضور کے اجمالی کام کی صراحت تھی اور جن کا کام ان انبیاء جیسا تھا جو ہر مرسل کے بعد ایک تواتر سے آتے رہے تھے اور اپنے پیش رو کی شریعت کا نفاذ جن کا منصب تھا۔ حضور کے بعد اس کام کے لئے بارہ امام مختص کئے گئے تھے جن کا کام حضور کی بنائی ہوئی ڈگر پر چلنا اور اُمت کو چلانا تھا۔ اس ڈگر پر ایک اُچھٹی ہوئی نظر

ڈالی جائے تو ایک ذقت وہ نظر آتا ہے، جب آپ ایک عورت کا ہاتھ تھامے اور ایک بچے کی انگلی پکڑے ایسا وہ دکھائی دیتے۔ پشت پر نسل سام کا ایک بوڑھا انسان قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھے نظر آتا ہے جس کے چہرے پر یادت کا جلال اور بشریے پر استقامت کا کمال ہے اور جس کے تیور عرب کے صنم پرست ماحول کو لٹکا رہے ہیں کو اس سے نوجوان پر کوئی انگلی بھی اٹھائے گا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

پھر یہ نوجوان آگے بڑھتا ہے، لوگ آتے بہتے ہیں اور کارواں بنتا جاتا ہے ایک دن یہ کارواں بے سردار ہو جاتا ہے تو اسی بوڑھے سامی کا چھوٹا بیٹا باپ کے مشن کو پورا کرتا ہے جس کو خدا ازل سے یہ منصب سونپ چکا تھا۔

حضرت مہنہ زور باغی، اور جاہل عربوں کو انسانیت کے غالب میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی مگر وہ محسوس کرتے کہ ان وحشیوں کی رحیمیں اس پاک و پاکیزہ جگہ میں گھبراہی ہیں اور وہ بار بار اس کو اتار پھینکنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن حضور ان کو اس کا موقع نہ دینا چاہتے کیونکہ بظاہر انہوں نے سر تسلیم تو خم کر دیا تھا اور زبان پر کلمہ لا الہ بھی جاری کر لیا تھا تاہم آپ دیکھ رہے تھے کہ بار بار ان کی نظریں ماضی کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

فطرتِ انسانی یہ ہے کہ نئے ماحول کا اثر قبول کرنے میں ذقت لگتا ہے جنگلی پودا متمدن آب و ہوا میں لا کر لگایا جائے تو جڑ پکڑنے میں دیر لگتی ہے، کوئی پودا بہت جلد شاداب ہونے لگتا ہے، کوئی ذقت لیتا ہے اور کوئی سوکھنے لگتا ہے۔ حضور خدا کے بھیجے ہوئے ایسے باغبان تھے جو ہر قسم کے پودے کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وہ سوکھنے والے پودے سے بھی مایوس نہ تھے۔

یہی سبب تھا کہ عبداللہ بن ابی کے سے منافقوں کو بھی آپ نے دائرہ اسلام سے نہیں نکالا اور فتح مکہ کے دن جب ابوسفیان نے مہنہ پر مصلحت اسلام کا نفاذ ڈال لیا تو بھی آپ نے اپنی رداً اتار کر اس کو دے دی کہ شاید اس کرم فرمائی سے سر کے ساتھ دل بھی جھک جائے اور وہ جو مقرب بارگاہ تھے، ان کے دلوں کے

کھوٹ جب چہروں سے آشکار ہوئے، تب بھی آپ نے چشم پوشی سے کام لیا اور برابر اصلاح کے مواقع دیتے رہے، کیونکہ چور کو چوری کرتے وقت پکڑ لیا جائے تو وہ حملہ کر دیتا ہے۔ آپ نے نام نہاد مسلمانوں کو بغاوت کرنے کا موقع نہیں دیا اور بھوٹوں کو سچا کہتے رہے کہ شاید کبھی شرعاً کپڑے بول دیں۔

یہی سنت آپ مسک ہدایت میں علی اور ان کے جانشینوں کے لئے چھوڑ گئے علیؑ اپنے منصب سے آشنا تھے۔ حضورؐ کا صراطِ مستقیم آپ کے سامنے تھا۔ لہذا مسلمانوں نے جو کچھ کیا، آپ نے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا، کیونکہ آپ کو تو ہر سطح پر ان کی اصلاح کرنا تھی، خواہ سوتی مدینہ میں ہوتے یا سخت خلافت پر، علی امام تھے اور وہ ماموم۔ یہ توازن کی سمجھ کی بات تھی کہ انہوں نے حکومت کو جزوِ رسالت سمجھ لیا تھا۔ علیؑ کو تو انہیں بتانا تھا کہ نبی حضرت ابوبکرؓ بھی تھے اور نبی خبابؓ بھی خاتم النبیین سب کے وارث اور مجموعہٴ سنن انبیاء تھے۔ ان کی زندگی میں ہر نبی کی سیرت دیکھی جاسکتی تھی۔

اسی مسلک پر تمام آئمہ کو چنا تھا جس کی ابتداء علیؑ سے ہوئی۔ حضورؐ کی تیسٹھ سال کی زندگی اتنی مختصر تھی کہ وہ ہر گوشہٴ حیات کا احاطہ نہ کر سکتی، لہذا ایک طرف آپؐ نے اپنی برگزیدہ بیٹی کو نسائیت کا مثالیہ بنایا، دوسری طرف علیؑ کو ساتھ لے کر حالات کے اعتبار سے ایسی نظریں پیش کیں کہ مسلمان ان سے سب کچھ سیکھ سکیں۔ اب یہ اپنی اپنی صلاحیت کی بات ہے کہ بہت تھوڑے سے لوگ سلمانؓ، ابوذرؓ، بلالؓ، مقدادؓ، حذیفہؓ یامانیؓ اور عمارؓ جیسے بن سکے اور باقی عرب جاہلیت اور اسلام سے مرکب ہو گئے۔

حضورؐ کے باقی کاموں کی تشریح علیؑ کا مقصد حیات تھا۔ ابوطالبؓ نے پیغمبر اسلامؐ کی حفاظت کی تھی، علیؑ اور اولادِ علیؑ کو اسلام کے لئے سینہ سپر ہونا تھا۔ اسی کے ازوئے ضرور کائنات اور علیؑ میں ہوا کرتے تھے جس پر لوگ کہتے: آپ اپنے حمیرے بھائی سے تنہائی میں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہتے ہیں۔ دلوں کے چوراہے متوحش رکھنے تھے

مگر حضورؐ نے ہمیشہ انہیں باور کرایا کہ وہ چور نہیں شاہ ہیں۔ — اور پھر جب آنحضرتؐ کا وقتِ آخر آیا تو آپؐ رہ رہ کر منہ علیؑ کے کان کے قریب لے جاتے اور اسرارِ شہادت اور رموزِ امامت کی تعلیم دیتے رہتے۔

انہیں مشاغل میں رسالت کا آخری باب بند ہو گیا اور امامت کا وہ آفتاب طلوع ہوا جو قیامت سے پہلے غروب نہ ہو گا۔

پس ماندگان

آنحضرتؐ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی تو بہت سے تھے معروف نام محمد مصطفیٰ ہے۔ آپ کے والد محترم عبداللہ بن عبدالمطلب اور والدہ گرامی آمنہ بنت وہب تھیں۔ ۷ ربیع الاول ۱ عام الفیل مطابق ۲۸ اپریل ۵۷۰ء ع پیدا ہوئے اور ۲۸ صفر ۱۱ھ کو شہادت پائی۔ اسی حجرے کے باہر دفن ہوئے جس میں علالت کا زمانہ گزارا تھا۔

آپ کی تیرہ بیویاں تھیں۔ خدیجہؓ، سودہؓ، عائشہؓ، حفصہؓ، زینب بنت حزمہؓ، زینب بنت جحشؓ، بویرہؓ، امّ حبیبہؓ، صفیہؓ، میمونہؓ، ماریہؓ، ریحانہؓ، امّ سلمہؓ۔ چند کمیزیں ان پر ستراد تھیں۔ خدیجہ اور زینب بنت حزمہ پہلے ہی وفات پا چکی تھیں گیارہ انتقال کے وقت زندہ تھیں۔

اولاد میں ابراہیم بطن ماریہؓ سے اور قاسم و عبداللہ اور جناب فاطمہؓ زہراؓ بطن خدیجہؓ الکبریٰ سے تھے۔ تینوں بچے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ جناب فاطمہؓ زندہ تھیں۔ انہیں سے آنحضرتؐ کی نسل چلی اور حسنینؑ نے حضورؐ اور حضورؐ کے دین پر اپنی مہریں ثبت کیں۔

آپ کے داماد اور چچیرے بھائی علیؑ ابن ابی طالب نے آپ کے بعد دینی منصب کو سنبھالا اور نیابت کا پورا حق ادا کیا۔ علیؑ کی اولاد قیامت تک اپنے دادا کی سیرت کو زندہ رکھے گی۔

سلسلہ امامت

پہلے امام
امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام
ؑ تا ۴۰ھ

سیقیفہ بنی ساعدہ

تغویٰ معنی کے اعتبار سے ”وہ جھوٹ جس سے کوئی شکوہ چھوٹے۔ اصطلاحاً ایک ایوان خفیہ جس میں عرب مشورہ باطل کے لئے جمع ہوتے تھے“ (۴۰) اس مقام پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے پہنچنے سے قبل انصار و مہاجرین جمع ہو چکے تھے اور انصار کی اکثریت اعلان کر رہی تھی کہ اس کے حقدار علی ابن ابی طالب ہیں جن کے بارے میں حضورؐ نے بار بار اپنی منشا کا اظہار کیا ہے۔ مہاجرین کی ایک تعداد مخالفت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ منصب کسی کی میراث نہیں حضورؐ نے تو بعض دوسرے لوگوں کے لئے بھی اظہارِ خوشنودی کیا ہے۔ ہم میں سے کسی کو آپ کا خلیفہ نہ چاہیے اس پر انصار نے اپنی مہمان نوازی کے حوالے سے تغویٰ کا اظہار کیا۔ مہاجرین نے اپنی فداکاری پر افضلیت ظاہر کی۔ جس میں حضرت ابوبکر کی ساتھیوں کی حمایت سے کافی شدت پیدا ہو گئی اور سیقیفہ بنی ساعدہ ایک طرح کی سبز مٹی بن گیا۔ انصار و مہاجرین میں ناشائستہ الفاظ کا تبادلہ ہوا، پھر نوبت ہاتھ پائی کی آگئی۔

ایسے میں بلند آواز ”حضرت عمر نے چلا کر حضرت ابوبکر کو مخاطب کیا اور کہا۔

”آپ سب میں سے رسیدہ اور بزرگ تہیں، میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔“

حضرت ابوبکر نے ہاتھ بڑھا دیئے اور حضرت عمر نے بیعت کر لی، پھر ابوعبیدہ الجراح، عثمان بن عفان، سعد بن ابی وقاص اور دوسرے لوگ بڑی تیزی سے بیعت کرنے لگے۔ انصار چیتے رہے کہ انہیں یہ فیصلہ منظور نہیں، مگر کوئی رکا نہیں مہاجرین کا ایک گروہ بیعت کرتا ہی رہا، جو شاید بنا بنایا منصوبہ تھا۔

رئیس انصار سعد بن عبادہ عتقے میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکل گئے، پھر بھی مدینے میں اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کو خلیفہ رسول منتخب کر لیا ہے۔ — یہ وہ وقت تھا جب حضرت علیؓ عرب کے نجات دہندہ کو غسل کفن دے کر نماز میت پڑھا رہے تھے۔ نماز کا منظر فرشتوں نے آسمان سے دیکھا نہیں دیکھا تو اس احسان فراموش قوم نے، جس کو ہادی برحق نے صحرائی درندے سے انسان بنایا تھا۔ آنحضرتؐ کے مردہ جسم خاکی کو قبر میں اتارا گیا اور بنی ہاشم نے اُسے مونٹوں کے نیچے چھپا دیا مگر ان میں سے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ وہ تو ہوس دُنیا کے شور و غل میں فرشتوں کی آواز بھی سُن نہیں رہے تھے جو ان کے عمل پر انہیں قہر خداوندی سے ڈرا رہے تھے۔

بعض راویوں کا بیان ہے کہ تین چار روز بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ گئے تھے کہ رسول کو دوسری قبر میں دفن کریں مگر ذوالفقار کو نیام میں کرٹیں بدلتے دیکھ کر کسی کی ہمت نہیں پڑی اور وہ لوگ نماز پڑھ کر واپس ہو گئے۔

سقیفہ کے اسباب و علل

اس کی کھل اور سرسجی وجہ علیؓ دشمنی تھی، جس کا بنیادی پتھر حرم نبویؐ میں کھایا گیا تھا۔ اُم المومنین عائشہؓ اپنے داماد کی مخالف کیوں تھیں۔ موزہ بن اس کا سبب واقعہ انک کو بتاتے ہیں جب حضرت عائشہؓ غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر جنگل میں تہارہ گئیں اور بعد میں ایک غیر مرد و صفوان ابن معطل کے ساتھ واپس

آئیں تو آنحضرت آپ سے بہت دنوں تک ناراض رہے۔ عائشہ کا خیال تھا کہ علی نے حضور کو بھڑکایا ہے یہ وجہ حقیقتاً کوئی وجہ نہیں تھی، بلکہ عائشہ کا بنیادی غم و جناب فاطمہ سے تھا بعض مسلمہ روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔

”رسول اللہ کی کسی بیوی پر مجھے اتنا رشک نہیں ہوا۔ میں نے ان کو دیکھا نہیں مگر رسول اللہ جب ان کا نام لیتے تو بڑی چاہ سے، کوئی بکری ذبح ہوتی تو گوشت کے ٹکڑے خدیجہ کی سہیلیوں کو بھیجتے میں پوچھتی کہ کیا خدیجہ کے سوا دنیا میں کوئی عورت ہے ہی نہیں؟ تو جواب دیتے: بیشک وہ ایسی ہی تھیں۔“ (۴۸)

”ایک روز آپ خدیجہ کی مدح کر رہے تھے، میں نے کہا: کیا ایک پوہلی بڑھیا کا ذکر کرتے ہیں، اللہ نے آپ کو اس سے بہتر بیوی دی ہے۔ اس پر آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا: قسم ہے خدا کی، مجھے خدیجہ سے بہتر کوئی بیوی نہیں ملی۔ وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب لوگ میری تکذیب کرتے تھے۔ اللہ نے انھیں سے مجھ کو ولاد عطا کی“ (۴۹)

روایات کی کچھان بین میں ایسی بہت سی روایتیں ملتی ہیں جن سے اس حقیقت میں شک نہیں رہتا کہ حضرت عائشہ کا عورت پن، سیرت خدیجہ کا آنحضرت کے ذہن پر چھایا رہنا، برداشت نہ کرنا، آنحضرت عائشہ کو سرزنش کرتے مگر وہ باز نہ آئیں سہو پر سہاگ خدیجہ کی یادگار جناب فاطمہ زہرا کی طرف حضور کا التفات تھا۔

”آنحضرت جب کسی سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد نبوی میں تشریف لے جا کر دو رکعت نماز ادا کرتے، پھر فاطمہ کے گھر جا کر ان کا حال پوچھتے، اس کے بعد ازواج کے حجروں کی طرف جاتے۔ یہی صورت سفر پر جاتے وقت بھی ہوتی۔ جناب فاطمہ کے گھر سے روانہ ہوتے۔ سفر آخرت پر بھی جناب فاطمہ کے حجرے سے روانہ ہوئے جو روایت و روایت دونوں لحاظ سے صحیح ہے۔

”حضرت عائشہؓ اور جناب فاطمہؓ کے حجروں کے درمیان ایک دیوار

سہتی۔ اس میں ایک دریچہ بنا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ جب عائشہؓ کے گھر سے
تو اکثر خباب فاطمہؓ سے اس دریچہ کے نزدیک کھڑے ہو کر بات کر لیتے
ایک مرتبہ نصف شب کے بعد عائشہؓ اس دریچے میں آئیں تو خبابؓ
سے کسی بات پر ناخوشگوار بات ہو گئی۔ حضورؐ کو جب اس کی اطلاع ہوئی
تو آپؐ نے خباب فاطمہؓ کے کہنے کے مطابق اس دریچے کو بند

کر دیا۔ (۵۰)

ان حالات میں خباب فاطمہؓ کے لئے حضرت عائشہؓ کے جذبات کو سمجھانے
کی بات ہے اور ان کی روشنی میں ازواج مطہرات کے دو حلقے چھپے نہیں رہتے جن
میں ایک طرف حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت صفیہؓ، دوسری طرف ام سلمہؓ
اور دوسری تمام ازواج دکھائی دیتی ہیں جو شہزادی فاطمہؓ کی طرف دار تھیں۔

حضرت علیؓ فاطمہؓ کے شوہر تھے جن کے بارے میں خباب عائشہؓ کی رائے
نامنصف سے نامنصف مودرخ بھی جانتا ہے کہ وہ علیؓ کا ذکر سننا بھی گوارا نہ کرتی تھیں
گھر کے اندر کا یہ حال تھا اور گھر کے باہر شطرنج کی ایک بساط بچھی ہوئی تھی جس
کے ہر کھلاڑی نے علیؓ کو اوڑھ پر لگا رکھا تھا۔

آنحضرتؐ کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے تو علیؓ کہے میں اپنے مہر سے لے
گرا آنحضرتؐ کی لحد تک سوتے جاگتے ساتھ رہے تھے بلکہ اب بھی ساتھ تھے۔
فرق صرف عالم اذواج اور عالم اجسام کا تھا۔ علیؓ کے منصب کی بات تو صرف خدا و
رسول تک محدود تھی، لیکن ظاہری مشرف تمام دنیا دیکھ رہی تھی۔ رہ گئیں حدیثات
تو ہر غزوہ کا فاتح علیؓ، محمدؐ کے محافظ علیؓ، صداقت و امانت کے سفیر علیؓ اور حدیث
کہ محمدؐ کی زندگی علیؓ: دعوتِ ذوالعشرہ سے خم غدیر کے میدان تک ایک خطِ مستقیم
کھینچا جائے تو اس پر علیؓ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ لوگ جو اپنے کو ممتاز اور مقرب
خاص قرار دیتے ہیں اور جنہوں نے اندر سے باہر تک حضورؐ کے گرد ایک جال بن رکھا
تھا، ان کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اگر حیاتِ پیغمبر سے انہیں منہ کی کر دیا جائے تو کیا کمی ہو جائیگی

اسلام میں سیلائے عام ہے یا ران نکتہ داں کے لئے۔

لیکن اس کے برعکس علیؑ کو نکال کر دیکھیں اور ایک ایک محاذ کا جائزہ لیں تو نتیجہ کھل کر سامنے آجائے گا: دعوت ذوالعشیرہ میں صداقت محمدؐ کی تائید کرنے والے لڑنے والے گاہک اور نہ فتح مکہ کے بعد پہل کا بہت شکن۔ خندق میں عمر و ابن عبدود نے لٹکارا تھا تو صحابہ کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو، اور خیبر میں تو باری باری سب ہی گئے تھے پھر اُحد میں تو وہ بھی بھاگ گئے تھے جو حضورؐ کی موت کی خبر پر دیوانے ہو گئے تھے اور ہنتر زمین پر مار مار کر کہتے تھے کہ کوئی آپؐ کو مردہ کہے گا تو اس کی کھال اُدھیر دیں گے کسی نے یہ بھی سوچا کہ اُحد میں اس جذبہ محبت کو کیا ہو گیا تھا؟ جب حضورؐ ان کے نزدیک قتل ہو چکے تھے تو ان کی لاش کو چھوڑ کر پہاڑی پر چڑھ گئے تھے۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ رحلت حقیقی کے وقت اتنا جنون طاری ہونے کا سبب یقیناً یہ مصلحت ہوگی کہ حضرت ابوبکرؓ آجائیں تو منصوبے کے مطابق موت کا اعلان کیا جائے اور وہ سقیفہ کی مہم پر روانہ ہو جائیں۔

دیانت اور حق پسندی کے ساتھ واقعات کا جائزہ لیا جائے تو اشاعتِ دین کی ہر مہم میں، وہ رزم ہو یا بزم، اعلیٰ اور صرف اعلیٰ ہی کو اہمیت تھی اور حضورؐ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ صرف اعلیٰ ہی کو جوڑ کر تاریخ رسالت کا مکملہ ہو سکتا ہے باقی سب فاضلات میں تھے۔ ان کو خارج کر کے کسی واقعہ کا نتیجہ بدل نہیں سکتا نہ بنا اعلیٰ کی وہ شخصیت ہے جس کو نظر انداز کر کے رسالت کی کوئی مہم غیر متغیر نہیں رہتی اعلیٰ نہ ہوتے تو خود حضورؐ کو ان کی جگہ لینا پڑتی کیونکہ اور سب تو ہر موقع پر آزمائے جا چکے تھے۔

نظیر کے طور پر جنگِ اُحد اور جنگِ طائف کو لیا جاسکتا ہے جب مسلمان اپنی محرائی جبلت کے تحت ٹوٹ مار میں لگ گئے اور دشمن موقع پا کر حملہ آور ہو گیا تو وہ اپنے محبوبِ قائد کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جنگِ اُحد کا واقعہ ہر ایک کو تسلیم ہے طائف میں صرف حضرت علیؑ، حضرت عباسؓ، حضرت ابنِ حارثؓ اور حضرت ابنِ مسعودؓ

رہ گئے تھے۔ اُحد میں بھاگنے والے پھر آنحضرت کو چھوڑ گئے تھے۔ کسی جھوٹے سے جھوٹے تاریخ نگار کا بیان بھی ان کی موجودگی ثابت نہیں کر سکتا۔ کیا یہی ہے وہ فداکاری جس پر ان کے درجاتِ عالیہ بلند قرار دیئے جاتے ہیں؟ لیکن یہ سب چلے بھی گئے تو کیا ہوا؟ علی تو موجود تھے لہذا رسول بھی محفوظ ہے اور اسلام بھی۔۔۔۔۔ اور ناسیخِ قیامت، جب تک علی کا نام اور علی کا نشان باقی ہے، محمد بھی محفوظ رہیں گے اور اسلام بھی۔

عرب کے تاریخی پس منظر کو دیکھا جلتے تو وطن پرستی، قسوت، باہمی جنگ و جدل، کینہ پروری، عصبیت اور سر خود غلط تقاضا، عرب کا قومی اور قبائلی مزاج تھا۔ تلوار، دولت، عورت اور شجاعت ان کا مذہب اور نسلی انتقام جذبہ ایمان تھا۔ علی کی ذات سے ان سب پر ضرب پڑی تھی۔ رحمتہ للعالمین کی معجزہ بیانی اور صلہ رحمی نے ذہنوں کو جھنجھوڑا ضرور تھا اور ان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا پھر بھی بارانِ رحمت کا اثر مزین پر یکساں نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ بدلے تھے تو سلمان، ابوذر، مقداد، حذیفہ یمانی، ابوالیوب انصاری، مالک بن نویرہ اور بلال بن کعبہ گئے تھے، مگر اکثریت میں سے بعض چھپے ہوئے ابوسفیان اور بعض کھلے ہوئے ابولہب تھے۔ علی نے ان کے بزرگوں اور خردوں کو قتل کیا تھا، وہ علی کو مٹا نہ کر سکتے۔۔۔۔۔ علی کی تلوار نے کفر کی ہر سطح پر اگنے والے درخت کی جڑوں کو کاٹ دیا تھا اور بیشتر قبیلوں کے سرداروں کا خون علی کی تلوار پر قرض تھا جس کو وصول کرنا پس ماندگانِ قبیلہ کی نسلی حمیت پر واجب ہوتا تھا جس کے لئے وہ موقع کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ کیفیت اُس طبقے کی تھی جس نے اسلام کی حقانیت کو تہہ دل سے قبول نہ کیا تھا۔ دوسرے طبقے میں وہ لوگ تھے جو چڑھتے سورج کو دیکھ کر سچا ریلوں میں شامل ہو گئے تھے۔ دل اسلام کو ماننا ضرور تھا مگر نیت ڈانواں ڈول ہو جاتی تھی تبسرا طبقہ اس گردہ کا تھا جو دین میں مخلص مگر قبائلی مفاد میں کسی بات کی پرواہ نہ کرتا

چوتھا طبقہ اسلام کے سچے فداکاروں اور رسول کے مخلص شیعیانوں کا تھا اور صرف یہی طبقہ دل و جان سے علی کے ساتھ تھا، باقی تین ایسے دشمن جنہوں نے رسول کی حالت خراب ہوتے ہی ایک خفیہ منصوبہ بنالیا تھا اور اس پر وہ عمل کر رہا تھا

رسولؐ کے صحابی ہر لحاظ سے قابل احترام اور لائق عزت ہیں لیکن معصومیت صرف انبیاء کے لئے خاص ہے، غیر نبی انسانوں میں کوئی شخص اس معنی میں بزرگ نہیں ہوتا کہ اس سے غلطی کا صدور و محال ہے یا اس نے عملاً کبھی غلطی نہیں کی بلکہ اس معنی میں بزرگ ہوتا ہے کہ علم اور عمل کے لحاظ سے اس کی زندگی میں خیر غالب ہے، پھر جتنا کسی میں خیر کا غلبہ ہو، وہ اتنا ہی بڑا بزرگ ہے اور اس کے کسی فعل یا بعض افعال کے غلط ہونے سے اس کی بزرگی میں فرق نہیں آسکتا۔ (۵۱)

مولانا مودودی کے اس حق پسندانہ معیار پر اگر اصحاب سقیفہ کو پرکھا جائے تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ سرفہرست آجائیں گے۔ ان بزرگوں کی اسلام دوستی سے انکار نہیں ہو سکتا بلکہ حضرت ابوبکر تو اس تعریف میں ہیں کہ ایک بڑی تعداد انھیں مسلم اولٰیٰ مزانے پر بے بند ہے، انہوں نے حضورؐ کے لئے بعض بیش بہا خدمات انجام دی ہیں لیکن کئی موقعوں پر ان کا دامن بھی خود غرضی اور نافرمانی کے داغوں سے پاک نظر نہیں آتا اور حضرت عمرؓ تو رسالت پر شک کرنے کے مرتکب بھی ہوئے ہیں بہت دور کی باتوں سے قطع نظر کیا جائے، تب بھی اسامہ بن زید کے لشکر کے ساتھ نہ جانا اور پیغمبر کی میت کو پیٹھ دکھا کر انتخاب کی مہم میں لگ جانا ان کے مخلصانہ ایمان پر وہ دھبہ ہے جس کو دھویا نہیں جاسکتا۔

علیؑ کی طرف سے بھیجے ہوئے امام تھے اس کو تسلیم نہ کیا جائے تب بھی اتنے مواقع پر حضورؐ نے علیؑ کی فضیلت کو بتایا تھا کہ اس کو نہ ماننے کے لئے چاہا کہ بات کرنا پڑے گی اور پھر بھی انکار ممکن نہ ہو گا۔ اس کے مقابلے پر دوسروں کی برتری کی جو روایات گڑھی گئی ہیں، ان میں ساڑھے تین سال کی حیات محمدؐ میں ہزاروں آیتوں

کے راوی ابو ہریرہ کی روایات کی اکثریت ہے۔ ہم ان کو جھٹلانے کی کوشش نہ کریں تب بھی علیؑ کے حق میں بعض روایتیں صریح اور واضح ہیں جن پر حضورؐ کی زندگی میں سب کو یقین تھا کہ علیؑ ہی آپؐ کے جانشین ہوں گے اور اکثریت علیؑ کے دشمنوں کی تھی۔ ان دشمنوں میں کون کون شامل تھے، اس کی صراحت ایک فاضل کام ہوگا لیکن یہ بات دلیل کی محتاج نہیں کہ آنحضرتؐ کی زندگی سے مایوس ہوتے ہی اقتدار طلب حلقے میں خفیہ خفیہ دوڑ دھوپ شروع ہو گئی تھی۔

انصار ایک طرف، ہاجر دوسری طرف، جن میں اُسامہ بن زید کے لشکر کے ساتھ نہ جانے والے بھی شامل تھے، ان لوگوں میں سے کچھ تو در محمدؐ پر حاضر رہ کر بار بار خیریت دریافت کرتے رہے اور حضرت ابوبکرؓ دو ڈھائی میل دور محلہ سخ میں اپنے گھر چلے گئے، ہو سکتا ہے کہ چلتے چلتے لوگوں سے کہتے گئے ہوں کہ پیغمبرؐ کی زندگی سے اپنا رشتہ توڑنے والے ہیں، ان کی جانشینی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے سقیفہ میں جمع ہو جائیں۔ یہ کہنا تو بالکل غلط ہوگا کہ مدینے کی گلیوں میں کھڑے ہوئے لوگوں نے سقیفہ میں جمع ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس پر ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس جگہ کا انتخاب قدرت نے کس سے کر لیا جو مشورہ باطل کے لئے ضرب المثل تھی؟ خود بخود تو لوگ سقیفہ جمع نہیں ہو گئے۔ ماننا پڑے گا کہ کوئی معشوق تھا اس پردہ رنگاری میں! اگر انصار نے یہ منصوبہ بنایا تھا تو تمام ہاجروں کو اچانک اس جگہ کی اطلاع کیسے ہو گئی اور آنحضرتؐ کے بچپن کے دوست گھر سے واپس ہوتے ہی حضرت عمرؓ کو لے کر میدان سقیفہ ہی ساعدہ کیوں چلے گئے؟ بات بالکل سادہ کی ہے کہ مسلمانوں کو آنحضرتؐ کا عدم کم اور اس کی فکر زیادہ تھی کہ علیؑ جانشین رسولؐ بننے نہ پائیں جس کی کچھڑی اندر ہی اندر پک رہی تھی۔

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے جانشین ہونے کا اعلان کر دیا تھا، ان سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب حضورؐ نے کہہ ہی یا تھا تو پھر سقیفہ کے التزام کی کیا ضرورت تھی؟ مسلمانوں سے انتخاب کرنا حکم رسولؐ کی توہین کے

مصدق تھا۔ اس توہین کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر کسی نے غلطی سے اجتماع کا اعلان کر دیا تھا تو دوسرے لوگ کیوں گئے؟ اور حضرت ابو بکر کو تو جانا ہی نہ چاہیے تھا۔ ان کے حق میں تو ارشاد پیغمبرؐ ہو ہی چکا تھا۔ لوگ ان کو تو مان ہی لیتے جس طرح علیؑ نہیں گئے کہ وہ تو ہیں ہی مامورین اللہ امام، ان کے لئے دنیاوی خلافت کا منصب ضروری نہیں ہے۔

ادریہ علیؑ کی خلافتِ الہیہ کی صداقت ہے کہ جابر حکومتوں نے سب کچھ کڑالا صدیوں تک غلو یوں کے لئے زمین سخت اور آسمان دور رہا۔ خاندان کے خاندان تقیہ میں اپنے آبائی مسک کو چھوڑ بیٹھے پھر بھی دنیا میں مسلمانوں کی ایک چٹھائی سے زائد آبادی آج بھی صرف علیؑ اور اولادِ علیؑ کی پیروی ہے۔

ستیفہ کے اس چھوٹے سے مگر تاریخی اجتماع نے اسلام کے دھارے کا رخ ایک نئی سمت میں موڑ دیا۔ حضرت ابو بکر جمہورِ مسلمین کے خلیفہ ہو گئے اور حضرت علیؑ نے رسول کے دفن سے فراغت پاتے ہی امامت کا آغاز کر دیا جس کو خلافتِ بلا فصل بھی کہا جاتا ہے۔

اُحد اور خندق میں چمکنے والی تلوار کندہ ہوئی تھی۔ بابِ خیبر کو انگلیوں سے اکھاڑ لینے والے بازوؤں میں اب بھی وہی طاقت تھی۔ سچے مسلمان سب کے سب علیؑ کے ساتھ تھے۔ جنابِ فاطمہؑ زہرا کو باپ کا پر سادے کر وہ خدمتِ علیؑ میں با ادب ہو کر بیٹھ تو کسی نے توجہ دلائی کہ یہ بزدل کتنی دیر مقابلے میں ٹھہر سکیں گے؟ علیؑ نے جواباً حضورؐ کی سنت پر توجہ دلائی کہ کلمہ طیبہ پڑھ لینے کے بعد حضورؐ نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی منافقوں کو برداشت کیا تھا ادریہ لوگ تو اسلام کے نام پر حکومت کرنا چاہتے تھے اور جہاں تک علیؑ کا تعلق ہے وہ تو تھے ہی پیغمبرِ اسلام کے جانشین۔ اقتدار کبھی اس منصب میں شامل نہیں ہوتا۔ آپؐ نے نہایت ہی مختصراً جواب دے دیا۔

”رسول کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔ یہ سب اسلام سے منہ پھیر کر ترید ہو جائیے!“

حضرت علیؓ جن معنیٰ میں کل ایمان تھے۔ سلمانؓ ان معنیٰ میں نصف الایمان تھے اور حضرت حتمی مرتبتؓ کی تصدیق کے مطابق ایمان کے دس درجوں پر فائز جب کہ ابوذرؓ نو درجے کے مومن۔ یہ دونوں اپنے امام کے منشاء کو سمجھ گئے، پھر مقدادؓ اور دیگر صحابہ نے بھی علیؓ کے مافی الضمیر اور مجبوریوں کا اندازہ کر لیا۔ ان کے ایمان کی آزمائش تو یہی تھی کہ امامِ وقت کی مرضی کے سامنے سرخم کر دیں۔ یہی انہوں نے کیا مگر خدمت میں حاضری سے باز نہ رہے۔

ہمارے پہلے امام نے بظاہر خانہ نشینی اختیار کر لی تھی مگر رشد و ہدایت کے چشمہ جاری تھے۔ ایمان کے متوالے در دولت پر حاضر ہوتے اور دامنِ مُراد بھر کر واپس ہوتے۔

ایک دن ابوسفیانؓ نے آکر کہا۔

”ان لوگوں نے تمہارا حق غضب کر لیا ہے، تم چاہو تو مدینے کی گلیوں کو لوٹو اور پسیدلوں سے بھروں؟“

”ابوسفیانؓ تو اب تک مناققت سے باز نہیں آیا۔“

علیؓ نے ابوسفیانؓ کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور وہ سقیفہ کے ہیرو کی گود میں جا بیٹھا جو اس کی صیغہ جگہ تھی۔

پیغمبرِ اسلامؐ کے موقر صحابی عظیم تھے اور عظیم رہیں گے مگر انسان کی حیثیت سے جہاں وہ غلطی کریں اور اس کی نشاندہی کی جائے تو اس کو مان لینے ہی میں بڑا پتہ اس سے صحابیوں کی عظمت کم نہ ہو جائے گی، بزرگی بہر طور اپنی جگہ پر رہے گی۔ اس سلسلے میں ایک بنیادی بات تخلیقِ روایات کی ہے جن سے صحابہ کرام متاثر ہوتے اور یہ سبھی ہو سکتا ہے کہ بعض صحابی اپنے مقاصد کی خاطر اس کے مرتکب ہوئے ہوں کیونکہ صحابی انسان ہی تھے، معصوم نہیں تھے، ہوس اقتدار میں سٹھو کر کھا سکتے تھے ہماری حد تک تو یہ مسئلہ ہے کہ ہم صرف ہادی برحقؐ اور ان کے اہلِ ثبیت کے متقلد ہیں۔ روایات کے جنگل میں صرف ان روایتوں کو صحیح سمجھتے ہیں جو ہمارے آئمہؑ

سے ثقہ و سائل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں یا ان روایتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں جن کے مزاج روایاتِ ائمہ سے ملتے جلتے ہیں اور جن کا آہنگ آیاتِ قرآنی کے مطابق ہوتا ہے بڑا سکون ہے اس گوشہٴ عاقبت میں ورنہ روایتی تاریخ کا ایک سرسری مطالعہ بھی یہ بتا دیتا ہے کہ علیؑ کے لئے جو پیغمبر کے ارشادات تھے، وہی سب کچھ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے لئے بھی فرما دیا اور حضرت عمرؓ کے لئے تو یہاں تک فرما دیا کہ پیغمبری ختم نہ ہو جاتی تو عمرؓ کو ملتی!

یہ کن خدمات کے سلسلے میں؟ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں تو ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ہر آدمی کو پہلے ابوطالب، پھر علیؑ ہی علی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بزرگ بھی موقع موقع سے نظر ضرور آتے ہیں اور ان کی صحابیت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن زہد و تقویٰ، علم و ایمان اور دیانت و شجاعت سب کچھ ان سے منسوب کر دیا جاتے، صرف علیؑ کا مد مقابل بنانے کے لئے تو یہ حق کا خون کرنے کے مترادف ہو گا لیکن ہم اپنے ہاتھ اس میں رنگنے کے لئے تیار نہیں۔

غضبِ خدا کا کہاں پیغمبری اور کہاں وہ کردار جس کی ادھی عمر کفر میں گزری اور ادھی عمر کا دامن تشکیک اور نافرمانی سے آلودہ ہے۔ کیا منصبِ پیغمبری ایسے ہی لوگوں کے لئے ہوتا ہے؟ لیکن ہم اس کے لئے کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے کیونکہ نبوت کے لئے جب ان کی معصوم ہونے کی قید نہیں، صرف اپنا سانس بڑھانا ضروری ہے تو حضرت عمرؓ کی کسی بڑے سے بڑے گنہگار کی کسی بات پر خوش ہو کر خدا شق الصدرا کر سکتا ہے اور خلعتِ نبوت عطا کر کے اُس درجے پر فائز کر سکتا ہے، جہاں وہ کبھی نبی اور کبھی غلطی کرنے والا عام انسان!

منت گزار ہیں ہم خلاق مطلق کے کہ اس نے ہمیں ایک سیدھی شاہراہ پر ڈالا ہے جہاں ہمیں خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا ہے اور اللہ کا متعین کیا ہوا امام جو کچھ دے وہ اٹل، جو کچھ بنا دے وہی حق۔

صحابی ہماری نظر میں موقر اور اہمات المؤمنین واجب الاحترام لیکن وہ کسی

کی عداوت میں یا کسی دنیادی مصلحت کی خاطر کسی بات کو رسول کا قول قرار دے دینے
تو اس کے اگے ہمارا ستر قطعاً نہیں جھکے گا جب کہ اقوال رسول کے متعلق خود ان کے
مابین متواتر اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے،
”حضرت عمر سے ایک روایت سماع موتی کے متعلق پائی جاتی ہے کہ رسول
نے آپ کے دریافت کرنے پر فرمایا۔

”یعنی وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے۔“

جب حضرت عائشہ نے اس روایت کو سنا تو فرمایا کہ رسول اللہ کا ارشاد یہ
نہیں تھا کیونکہ اس کے خلاف نص قطعی موجود ہے کہ
”اے رسول! تو نہ مردوں کو اپنی بات سنا سکتا ہے اور نہ قبر

(۵۲)

میں مدفون ہونے والوں کو۔“ بخاری غزوہ بدر

ان دونوں میں کون صحیح تھا؟ لوگ اس کا فیصلہ کرتے رہیں۔ اس کے برعکس
ہماری روایات کی صورت حال یہ ہے کہ جو کچھ علی مرتضیٰ نے فرمایا۔ اس کو جس نام
سے بھی پوچھا گیا، اس نے زیر و زبر کی تبدیلی کے بغیر من و عن دم ہی دھرا دیا۔ یہ بات
متقی علم لدنی کی۔ اس طرح کوئی غلط حدیث کبھی بیان ہی نہیں ہوئی، کیونکہ گھر
کے رموز سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہے۔ اس
کے مقابلے پر اصلی اور نقل روایات کا آمیزہ جب تیار ہوا تو سننے والے اور بیان
کرنے والے دونوں جھگڑے میں پڑ گئے اور ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے
جہاں تک اس روایت کی صحت کا تعلق ہے، ہمارے نزدیک حضرت عمر
کی روایت صحیح ہے کیونکہ آنحضرت وفات سے چند روز قبل جنت البقیع گئے پھر
جناب فاطمہؓ بھی اور علیؓ نے تو اہل قبر کو مخاطب کر کے ایک مبلغ خطبہ ارشاد فرمایا تھا
ہم اس کے لئے کسی کو مطعون نہیں کرتے، جس کے مقاصد تھے اس نے
روایات آفرینی اور سیفہ سازی کی تو اس کو مبارک ہو لیکن کسی کی ذات سے محمدؐ اور
آل محمدؐ پر آپس آتی ہے تو ہم برداشت نہیں کر پاتے۔ علیؓ نے کسی کو خلافت کی طرف جھکا

سے روکا نہیں، جس نے چاہا، دُنیاوی مفاد حاصل کرنے کے لئے گیا اور پھر علی کے پاس حصول دین کے لئے آیا تو آپ نے اس کو محروم نہیں رکھا۔ ہم بھی علی کے پیرو ہیں، کسی سے کوئی تعرض نہیں کرتے لیکن کوئی اہل بیت پر ضرب لگاتا ہے تو ہم تلملا جاتے ہیں اور حقیقت کا انکشاف ہمارا فرضِ ایمانی بن جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ ہم اس کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے کہ اُحباب المؤمنین میں سے کسی پر غلط الزام تراشی کی جائے جس کسی نے جہاں مظاہرۂ عداوت یا تشدد دیکھا ہے وہاں ہم یقیناً اظہارِ بیزاری کریں گے لیکن اس کے بعد ہم اپنے مولا علیؑ کے پیرو ثابت ہوں گے۔ جنگِ جمل کے بعد آپ نے اُم المؤمنین حضرت عائشہ کے لئے جو رد و شش اختیار کی تھی وہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہوگی۔

ناقابلِ فہم ہے ان راویوں کا ذہن جو ایک طرف تو حضرت عائشہ کی درجِ سرائی میں جھوٹ پیچ کی تمیز نہیں کرتے، دوسری طرف ایسی روایات بیان کرنے لگتے ہیں جن سے زوجہٴ رسولؐ کی حرمت پر انگشت نمائی ہو سکتی ہے۔ یہ کرشمہ ہے روایت سازی کی بہتات کا۔ ابوسلمہ سے روایت ہے:-

”ایک دن میں حضرت عائشہ کے بھائی کے ساتھ اُم المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے پوچھا: آنحضرتؐ غسل کس طرح فرماتے تھے؟ اُم المؤمنین نے بیان کیا مگر ہم پوری طرح سمجھ نہ سکے تو ہم نے کہا کہ غسل کر کے دکھا دیں۔ چنانچہ بیچ میں ایک حجاب ڈالا گیا، اور پانی لا کر رکھا گیا، اور اُم المؤمنین نے سر پر پانی ڈالنا شروع کیا۔“ (۵۳)

اس طرح اُم المؤمنین نے ابوسلمہ اور اپنے بھائی کی شرعی راہ نمائی فرمائی ظاہر ہے کہ حجاب کے دوسری طرف سے ان لوگوں نے اُم المؤمنین کے عمل کو دیکھا ہوگا۔ اور شاید اس سے پہلے انہیں غسل کرنا آتا بھی نہیں تھا

ورنہ زبانی بتانے پر سمجھ جاتے یا پھر طریقہ غسل اتنا پیچیدہ ہوگا کہ الفاظ سے سمجھ میں نہیں آیا۔

لیکن اس بات کو مانا نہیں جاسکتا کیونکہ حضورؐ نے سب کو یہی بتایا تھا اور ہر ایک کی سمجھ میں آگیا تھا، پھر حضرت عائشہؓ کے بتانے سے دونوں میں سے کوئی کیوں نہیں سمجھا؟

ظاہر ہے کہ روایت بالکل جھوٹی ہے اور صرف عائشہؓ کی ہمہ دانی جانے کے لئے گڑھی گئی ہے لیکن اس سے یہ مقصد پورا ہونے کے بجائے ایک دوسرا پہلو پیدا ہو گیا کہ اُم المؤمنین کے نسائی پیکر پر ایک نامحرم کی نگاہ پڑ گئی۔

اُمّت کی محترم ماں کی طرف سے اتنی شرعی بداعتیا طعی ہمارے لئے قابل یقین نہیں ہے اور ہم اس کو روایتی ٹکسال کا کھوٹا سکہ سمجھتے ہیں۔

بعض ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے حضورؐ کا دامن جنیبات میں اتنا ملوث نظر آتا ہے کہ ان کی صفائی پیش کرنا آسان نہیں۔ بالخصوص حضرت اُم المؤمنین عائشہؓ اور اُم المؤمنین صفیہؓ کی باہمی چشمک دکھانے کے لئے بعض نروں نے جو روایت آفرینی کی ہے، وہ سیرت محمدیؐ کا بد نما داغ ہے۔ ایسی روایتوں کو پڑھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ کیسے مسلمان تھے یہ لوگ جنہوں نے اسلام کے عظیم المرتبت آدمی کو کچھ سے کچھ بنا دیا اور اب کوئی انہیں دیکھ کر تصویر کشی کرتا ہے تو اس کو واجب القتل سمجھا یا جاتا ہے۔ حرمت محمدؐ پر حملہ کرنے والا یقیناً گردن زدنی ہے لیکن جھوٹی روایت سازی کرنے والوں کے گریبان پکڑنا بھی انصاف کا تقاضا ہوگا۔

ایسے حالات میں ہمارا گوشہ عافیت بڑا غنیمت ہے، جہاں ہر کردار نور مشیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور زمانے کے ممکن گرد و غبار کی زد سے بھی باہر ہے۔

دربار خلافت

امام کی حیثیت سے علی کا فیصلہ تھا کہ مسلمانوں کو جب ان کی رہبری کی ضرورت ہوگی تو آپ اپنے آپ کو سمجھے نہ رکھیں گے، پھر بھی آپ دربار خلافت میں گئے اور سیدہ کو نین نے بھی اتمام حجت کیا ورنہ کہہ دیا جاتا کہ مطالبہ ہی نہیں کیا ورنہ جس کا حق تھا، اس کو ضرور دیا جاتا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علی کے احتجاج پر جب حضرت عمرؓ نے کوراجواب دے دیا تو آپ نے ابو عبیدہ بن الجراح کو توجہ دلائی اور ابو عبیدہ نے تسلیم کیا۔
”تم سچ کہتے ہو، حق ہے تمہارا لیکن اب سب مسلمانوں نے اتفاق کر لیا ہے تم بھی مان جاؤ۔“

علیؓ خاموشی سے چلے آئے لیکن ابھی رسولؐ کی اکلوتی وارث باقی تھی۔ وہ ایک نظیر قائم کرنے کے لئے بھرے دربار میں آگئی۔ اُم ایمن دونوں بیٹے اور دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں بھی انکلی پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ تھیں۔ شاید رسولؐ کی بیٹی کو ان بچیوں سے کہنا تھا کہ دقت پڑ جائے تو کسی ظالم کے دربار میں اسی طرح چلی جانا۔ علیؓ اور ان بچیوں نے ذک کے سلسلے میں سیدہ کے حق میں شہادت دی مگر اس کو مسترد کر دیا گیا۔

جواب شہزادی کو بھی وہی ملا، جو علیؓ کو ملا تھا۔ اس موقع پر سیدہ طاہرہ دربار میں ایک خطبہ دیتی نظر آتی ہیں اور جواب میں پھر حدیث رسولؐ پیش کی جاتی ہے کہ انبیاء اپنی وراثت نہیں چھوڑتے۔ اس حدیث سے صرف حضرت ابو بکر اور اُم المومنین عائشہ واقف تھیں، باقی کسی مسلمان کو علم نہ تھا۔ ہر ایک کو حضرت ابو بکر کی ذبانی معلوم ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ سیدہ کو نین کے احتجاج پر حضرت ابو بکر راضی ہو گئے تھے اور انہوں نے ذک کی سند لکھ کر سیدہ طاہرہ کو دے دی تھی مگر عین اس وقت حضرت عمرؓ نے اس سے آگے، انہوں نے کاغذ رسولؐ کی بیٹی سے لے کر نوچ ڈالا اور کہہ دیا کہ رسولؐ کی

ہر شے اُمت کی ہے۔

اس واقعہ سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں پہلی تو یہ کہ حدیثِ توریت کے راوی نے اپنے عمل سے خود اپنی بیان کردہ حدیث کو جھٹلا دیا۔ دوسرے یہ کہ حضرت عمر کا حکم خلیفہ کے حکم پر حاوی تھا۔ کہنے کو حضرت ابوبکر سربراہ مملکت تھے لیکن مگر حضرت عمر کا چلتا تھا۔

اس ہٹ دھرمی کا اثر اگرچہ جنابِ فاطمہؓ زہراؓ پر صرف اتنا ہی پڑا کہ ان کی مالی حالت خستہ رہی اور اس کا مقصد بھی یہی تھا، کیونکہ رسولؐ کی اولاد اگر معیشت کی طرف سے مطمئن ہوتی تو خطرہ تھا کہ کہیں تیاری کر کے وہ انتخابِ سقیفہ کے خلاف اُٹھ نہ کھڑی ہو لہذا اس کا التزام پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا اور یہ صرف اُم المؤمنین عائشہؓ اور حضرت ابوبکرؓ کا منصوبہ تھا۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔

”جب ابوبکر نے اس روایت کو بیان کیا تو علیؓ اور عباسؓ نے ان کو جھوٹا

کہنا شروع کیا اور خاتنِ ٹھہرا بایا۔“ (۵۴)

جلال الدین سیوطی کا بیان بھی اسی قسم کا ہے کہ اس کے راوی صرف حضرت ابوبکرؓ ہیں، انہوں نے بی بی عائشہؓ کو اپنا شریک کر لیا تھا۔ اس منصوبے میں اولیت حضرت ابوبکرؓ ہی کو حاصل رہی ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایک طرف حضورؐ فدک جنابِ فاطمہؓ کو تحریری طور پر دے دیتے۔ دوسری طرف وہ ابوبکرؓ کو علیحدہ لے جاتے اور کان میں کہہ دیتے کہ انبیاءؑ اپنی وراثت نہیں چھوڑتے۔ ان کی وراثت صرف اُمت ہوتی ہے۔ حرفِ آتا ہے عدلِ خداوندی پر ————— کہتے ہی بیویوں کی وراثت ان کی اولاد ہوئی، ہر طرف خاتم المرسلین کی اکلوتی بیٹی کو قدرت نے وراثت سے محروم کر دیا۔

یہ مسلمانوں میں ضمیرِ نام کی کوئی چیز نہیں ہے کہ بعد کے مسلمانوں نے اسی فدک کے بارے میں متضاد فیصلے کئے پھر بھی مسلمان اس حدیث کو وضعی نہیں کہتے۔ ابوبکرؓ و عمرؓ کی نظر میں فدک مالِ مسلمین تھا مگر عثمانؓ نے مروان کی ملک بنا دیا۔

معادیہ نے اپنے بیٹے یزید، عمر بن عثمان اور مروان بن حکم کے درمیان سادی تقسیم کر دیا۔

عمر بن عبدالعزیز جیسے فقیہہ متقی نے فدک اولاد جناب فاطمہ کو واپس کر دیا۔ یزید بن عبدالملک نے پھر چھپین لیا۔

پہلے عباسی حکمران ابوالعباس سفاح نے عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن جستن کو دیے منصور نے لے لیا۔

مہدی بن منصور نے پھر فدک بنی فاطمہ کو پٹا دیا موسیٰ بن مہدی نے لے لیا

ماہول رشید نے پھر بنی فاطمہ کا حق انہیں دے دیا۔

متوکل نے اپنے زمانے میں اپنے حجام کو دے دیا جو پھر واپس نہیں ہوا۔

اس طرح پیغمبر اسلام نے اپنی زندگی میں بیٹی کو جو عطیہ دیا تھا، وہ ایک حجام کی اولاد میں ہمیشہ کے لئے پہنچ گیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اور کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ حدیث درانت کو حضرت ابوبکر کے بعد خود حضرت عثمان نے غلط سمجھا تھا ورنہ مالِ سلیم کو کسی فرد کی ملک بنانے کی خطانہ کرتے اور عمر بن عبدالعزیز جیسے مسلمان سے تو خطا کی نسبت ہی نہیں دی جاسکتی۔ انھوں نے اپنے عمل سے فتویٰ دیا تھا کہ حدیث تو ریث قطعاً غلط تھی۔ اب مسلمان فیصلہ کریں کہ اس وضعی حدیث کے نتائج اگرچہ خلافت کے مفاد میں نکلے ہوں مگر اس سے رسول کی بیٹی کو جو صدمہ پہنچا اس کے نتیجے میں نبیؐ پیغمبر جس جس سے ناراض رہی، خود پیغمبر اسلام کے الفاظ میں اس کا انجام کیا ہو گا؟

”جس نے فاطمہ کو ناراض کیا، اُس نے مجھے ناراض کیا اور جس سے میں ناراض ہوا، اس سے خدا ناراض ہوا“

خدا کرے، یہ سخن گسترانہ استدلال حق پسندوں کو مشتعل کرنے کے بجائے ایک دعوتِ فکر دے!

اس موقع پر اگر دربارِ خلافت کے اس منظر کا تصور کیا جائے، جب تختِ خلافت
مسلمانوں کے ”صدیق“ منکمن تھے اور حدیثِ توریث کی واحد گواہ عائشہ صدیقہ کی
شخصیت ان کے ساتھ تھی۔

دوسری طرف رسولِ اسلام کی اکلوتی بیٹی، جو خود رسول کے لئے واجبِ التعظیم
رہی تھی، آیینہِ تطہیر کی چادر اُدھے ہوئے، صدیقہ طاہرہ کا کردار ادا کر رہی تھی اور
اتمامِ حجت کے لئے فدک کا ہمہ نامہ دکھا رہی تھی۔ اس کی تائید ایک صدیقِ اکبر کر رہا تھا
جو ہر نوعِ تمامِ حاضرین سے افضل تھا مگر ان دونوں کو جھٹلایا گیا اور رسول کی تحریر
کو بے قیمت قرار دے دیا گیا، یہ کہہ کر کہ رسول کو اپنی زندگی تک کے لئے دینے کا
حق تھا، اس کے بعد نہیں۔

ایک مبینہ صدیق نے دوسرے صدیق کی شہادت کو غلط سمجھ لیا اور صدیقہ
طاہرہ کا دعویٰ مسترد کر دیا۔ ————— بالفاظِ دیگر اس کا اعلان کیا کہ علیؑ کا
زہر دونوں نے ناجائز مطالبہ کیا تھا۔ ————— کتنی ستم ظریفی ہے کہ آج جس کو
جھوٹا قرار دیا گیا، کل جب اپنی قوتِ فیصلہ جواب دے سکتی تو مقدمات کے فیصلوں
کے لئے اُسی سے رجوع کیا اور اس کے فیصلوں کو حتمی مان لیا۔

رسول کی بیٹی گریاں بولاں واپس ہو گئی اور گھر آکر باپ کی صفِ ماتم
پر بیٹھ گئی۔ ————— امامِ وقت خاموش تھا۔ میدان کی شجاعت اور مردانگی کے
جوہرِ حضور کی زندگی میں دکھایا تھا۔ اب اس سے بڑا امتحان پیش آنے والا
تھا۔ ضبطِ دھیر کا امتحان، جس کے لئے رسول کا مسند نشین تیار تھا۔

اس غیر معمولی تحمل کے باوجود اباب سفیفہ کو علیؑ اور علیؑ کے دوستوں کی طرف سے
ایک کھٹکا لگا رہتا کہ نہ جانے کب وہ مطالبہ حق کیلئے اٹھ کھڑے ہوں لہذا بیتِ سیدہ میں ہر آنے جانے
والے پر نگاہ رہتی۔ یہ نہیں سوچا کسی نے کہ رسولؐ کے بعد صاحبِ ایمان جاتے تو کہاں جاتے لہذا جب
کسی کا دل اندھا تو وہ آنسو بہانے کیلئے علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا جس کو کسی منصوبہ سازی پر
محول کیا جاتا حالانکہ حقیقت یہ کہ منصوبہ ہمیشہ سے خانہ سیدہ زہرا کے بجائے حجرۂ جناب عائشہ میں بنائے
جاتے تھے جس کی شہادتِ حضورؐ کے ارشادِ گرامی سے ملتی ہے۔

”ابن عمر کہتے ہیں کہ ایک دن جناب رسول خدا حضرت عائشہ کے گھر سے برآمد ہوئے اور

نکلے وقت فرمایا کہ اس گھر سے کفر کا سر نکلے گا جس طرح کہ شیطان کے سینک نکلے ہیں۔“ (۵۵)

اور بعد رسول وہی ہوا کہ ایک دن اسی حجرے میں کچھ طے کر کے حضرت عمر ایک جماعت کے ساتھ نکلے اور جناب فاطمہ کے دروازے پر دستک دینے لگے۔

اُم المؤمنین کی منزلت اپنی جگہ پر لیکن تاریخی خدائق کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ ہو سکتا ہے کہ جناب عائشہ دروازے سے جھانک کر دیکھ رہی ہوں کہ اب کیا ہوتا ہے۔ حضرت علی باہر آئے تو حضرت عمران کے دُور و کھڑے تھے، جناب فاطمہ پس دروازہ ایستادہ تھیں۔ بدرجین کے ناسخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والا حیات محمد میں زندہ پلٹ کر نہ جاتا اگر آج علی کی حیثیت بدل گئی تھی۔ وہ اپنے وقت کے امام تھے لہذا انہیں غصہ آنے کے بجائے حضرت عمر پر رحم آیا، حضرت عمر نے بھی نزاکت کو محسوس کر کے منہ دروازے کی طرف کیا اور کشت آوازیں کہا

”بنت رسول اللہ! خدا کی قسم، آپ ہم کو سب سے زیادہ

محبوب ہیں لیکن لوگ اسی طرح آپ کے گھر میں جمع ہوتے رہے تو میں

آپ کے گھر میں آگ لگا دوں گا۔“ (۵۶)

علامہ شبلی نے دبی زبان میں اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے۔

”اگرچہ سند کے اعتبار سے اس روایت پر ہم اپنا اعتبار ظاہر

نہیں کر سکتے کیونکہ اس روایت کے رواۃ کا حال ہم کو معلوم نہیں ہو

سکا تاہم درایت کے اعتبار سے اس واقعہ کے انکار کی کوئی وجہ نہیں

حضرت عمر کی ہندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں۔“ (۵۷)

اگر حضرت عمر کے الفاظ کو دھمکی ہی تصور کیا جائے تب بھی اس منظر کو کچھ

نظر انداز کیا جاسکے گا، جب سرکار ختمی مرتبت چند ہفتے قبل اسی دروازے پر آکر

کہا کرتے تھے۔ السلام علیکم یا اہل البیت النبویہ! آج وقت اتنا

بدل گیا تھا کہ دنیا ادب سے بات کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی تھی اور اس

کے بعد بھی سنت رسول پر عمل کرنے کا دعویٰ تھا۔ قاعۃ برویا اولی البصار۔

حضرت ابو بکر کو مرتے وقت اپنی تین غلیطوں پر بہت کچھتا و انتہا جس کا اظہار انہوں نے عبدالرحمن ابن عوف سے کیا تھا۔ ان تین باتوں میں اہم ترین بات یہ تھی کہ کاش وہ باب فاطمہ کی بے حرمتی نہ کراتے! اس واضح اقبالِ جرم کے بعد بھی علامہ شبلی روایت و درایت کی باتیں کرتے ہیں۔

ابن قتیبہ، طبری اور دوسرے مؤرخین نے بھی لکڑیوں کا ذکر کیا ہے۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ معصومہ نے سختی کا جواب سختی سے دیا اور کہا۔

”دفان ہو میرے دروازے سے ورنہ میں سر کے بال کھولتی ہوں اور خدا سے فریاد کرتی ہوں“

کتنا اعتماد تھا معصومہ کو پیدا کرنے والے پر مکرملانوں کے قائد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اور دروازے کو اس زور سے دھکیلا کہ وہ رسول کی چہیتی پیٹ پر گر پڑا۔ شہرستانی کے الفاظ میں

”آنے والے نے شکم مبارک پر ضرب لگائی۔۔۔ یہاں تک دھس شہید ہوئے اور چیخ کر کہا کہ گھر میں جو بھی ہے اُسے

بلا دو“ (۵۸)

اس واقعہ کو بہت سے علماء نے لکھا ہے اور اس میں انسا اضا نہ کیا ہے کہ دروازہ معصومہ کی کو کھ پر گرا۔ اس کی ضرب سے پیٹ میں جناب محسن کی شہادت واقع ہوئی پھر انہوں نے علی کے گلے میں رسی باندھی اور کھینچتے ہوئے دروازے کے باہر لے گئے۔ بعض نے تحریر کیا ہے کہ جناب فاطمہ نہرانے بال کھول کر بددعا کی دھمکی اُسی وقت دی تھی اور جلالتِ سیدہ سے خائف ہو کر لوگوں نے علی کو چھوڑ دیا تھا۔

فاتح خیر کا گلا اور رسی! ایک ناقابلِ یقین حقیقت ہے لیکن کیسوی کے ساتھ غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ علیؑ کی حیثیت اس وقت کیا تھی۔ وہ رحمتہ للعالمین کی مسند پر نیابت کا منصب ادا کر رہے تھے اور جہادِ بالفسح کی منزل میں تھے، آپ نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کر کے دیکھا تو عیسیٰ کو رس لبتہ

کشاں کشاں دار کی طرف بڑھتے پایا ختم المسلمین کا جانشین عالم نور میں نوح کو طوفان سے نکال چکا تھا۔ وہ صبر کی آزمائش میں عیسیٰ سے سمجھے کیونکر رہتا۔ اس نے اپنے کو غلامیت کے دھارے پر ڈال دیا اور اس میں کوئی بے عزتی محسوس نہیں کی ورنہ عمر موتے یا طلسم و زہر، اگر ذوالفقار نیام سے باہر آجاتی تو مدینہ تو مدینہ، صحرائے عرب میں خون کے دریا بہہ جاتے لیکن علیؑ کس پر تلوار اٹھاتے، پیغمبر اسلام کا کلیڑ پھنے والوں پر ادرہ بھی ان پر جو خیر و شر کی مخلوط منزل پر کھڑے ہوتے تھے۔

علیؑ نے سوچا، ابھی نہیں، خیر کا بچا کھچا حصہ بھی تم میں سے بکھل جائے تو میرا بیٹا کسی ریگ زار میں آج کی کمی پوری کر دے گا!

غرض فاطمہؑ زہرا کی فریاد پر سب نے علیؑ کو چھوڑ دیا اور چلے گئے۔

چشم تصور سے دیکھا جائے تو علیؑ نے صبر و ضبط سے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا، اس کی نظیر تاریخ انبیاء میں بھی نہیں ملے گی۔ فاتح بدر و حنین کے بازوؤں میں قوت تھی۔ لوگ میدان میں بکھل آنے کے لئے آپ کی ایک آواز کے منتظر تھے ذوالفقار نیام سے برآمد ہونے کے لئے چمچ رہی تھی لیکن قبضہ ذوالفقار پر رسالتیاب کا ہاتھ رکھا ہوا تھا، علیؑ اس کو کیونکر ہٹا دیتے لہذا بزدل سمیڑیوں کو سپارگی دے کچھ کر رہ گئے۔

یہ تشدد اور زیادتیاں صرف اس لئے ہو رہی تھیں کہ حضرت علیؑ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لیں جس کا مطلب یہ تھا کہ ابوبکرؓ نے خود رسولؐ سے بیعت طلب کی تھی۔ ————— مانا کہ رسولؐ کی بعض احادیث، وہ اصل ہوں یا نقلی حضرت ابوبکرؓ کے حق میں جاتی تھیں مگر وہ سب اس تنبیہ کو بھول گئے تھے جو حضورؐ قافلاً ان کو بتاتے رہتے تھے۔ آخری دنوں میں سر منبر سب کو مخاطب کر کے کہا تھا:-

”میں اس سے خوف نہیں رکھتا کہ تم میرے بعد شرک میں مبتلا ہو گے لیکن میں خوف رکھتا ہوں کہ تم پر دنیا غالب آجائے گی۔ تم اس کے شائق ہو گے، فتنہ میں پڑو گے اور ہلاک ہو گے، جس طرح کہ وہ ہلاک ہوئے جو تم سے پہلے تھے۔“

آنحضرتؐ علم پیغمبری سے استقبال کو دیکھ رہے تھے۔ اسی لئے بار بار محض لوگوں کو مخاطب کر کے تنبیہ کر رہے تھے، پھر بحوالہ اسد الغابہ، ایک دن آپؐ نے علیؑ سے بھی کہہ دیا: ”علی تم مثل کعبہ ہو، کعبہ خود کسی کے پاس نہیں جاتا، لوگ کعبے کے پاس آتے ہیں۔ تم بھی خود کسی کے پاس نہ جانا، لوگ خود ایں تو انہیں مایوس نہ کریا“
حضرت فاطمہؑ زہراؑ صلوة اللہ علیہا

”ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ صلعم نے زمین پر چار خط کھینچے اور فرمایا: ”تم جانتے ہو، یہ کیا ہے؟“

لوگوں نے کہا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔

فرمایا۔ جنتی عورتوں میں سب سے زیادہ افضل چار بیویاں ہیں:-
خدیجہؓ بنت خویلد، فاطمہؓ بنت محمدؐ، مریمؓ بنت عمران اور آصفیہؓ بنت

مزامہ البلیہ فرعون“ (۶۰)

بعض راویوں نے اس حدیث میں جناب ہاجرہ اور جناب سارا کا اضافہ کیا ہے مگر جناب خدیجہؓ ہر روایت میں اسم آغاز ہیں جن کے بعد جناب فاطمہؓ زہراؓ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ خدیجہؓ الکبریٰ نے وہ بساط بچھائی تھی جس پر کھڑے ہو کر حضورؐ نے اللہ اکبر کا آواز بلند کیا تھا اور خدیجہؓ کے بعد ان کی عظیم المرتبت بیٹی نے ان کی آوازیں آواز ملائی تھی۔ زہراؓ بہر طور شریک رسالت تھیں، ۲۸ صفر کو حضورؐ تکیل دین کر کے چلے گئے تو زہراؓ کا منصب بھی پورا ہو چکا تھا۔ علیؑ نے امانت کے لئے اپنی رفاقت کا احساس دلایا تو رسولؐ کی عظیم المرتبت بیٹی نے اس کام کے لئے زین کو تجویز کر دیا جو باپ کا ساتھ تو نہ دے سکیں مگر چھوٹے بھائی حسینؑ کے لئے تسخیر کوفہ و شام کی مہم انجام دیتی رہیں۔

جناب فاطمہؓ بلیکۃ العرب کی بیٹی تھیں مگر جب آپؐ نے آنکھ کھولی تو حضورؐ پر کفار قریش کی یلغار تھی۔ آپؐ نے بھی ماں کے ساتھ حضورؐ کی خدمت کی۔ کلوتی بیٹی تھیں مگر بچپن فقر میں گزرا، البتہ والدین کے ساتھ دوسری بزرگ خواتین کا ہوتا

پیار ملا کہ آپ اس کو کبھی فراموش نہ کر سکیں۔ فاطمہ بنت اسد، اسماء بنت عیسٰی
 اُمّ بانی ہمیشہ جناب ابوطالب، امّ امین، سب آپ کو آنکھوں کا تارا سمجھتی تھیں
 اور آپ سچیں بھی اسی قابل۔ قدرت نے آپ کو نکھار سنوار کر بھیجا تھا۔

جب آپ کم سن تھیں تو حضور اپنے زانو پر بیٹھتے، لبوں کے بوسے لیتے اور
 آپ کو اپنی زبان چسپا کرتے تھے۔

کتنے ہی معجزات آپ سے منسوب ہیں اور آپ کی عصمت کی شہادت تو
 خود باری تعالیٰ نے دی ہے۔

ابھی آپ پانچ سال کی تھیں کہ ماں کے سائے سے محروم ہو گئیں مگر فاطمہ
 بنت اسد، اُمّ امین، اُمّ سلمہ نے اس کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔ آنحضرت کی
 ہجرت کے پندرہ روز بعد آپ مدینہ پہنچیں۔ یحییٰ ذی الحجّہ کو حضرت علیؑ کے
 ساتھ آپ کا عقد ہوا۔ ۲۴ ذی الحجّہ کو رخصتی عمل میں آگئی۔

جناب فاطمہؑ اپنی ذات سے عورتوں کے لئے ایک مثالیہ تھیں۔ ایک بیٹی
 ایک بیوی اور ایک ماں۔ بیوی کی حیثیت سے آپ نے کسی موقع پر حضرت علیؑ
 کو تنکائیت کا موقع نہ دیا، شوہر سے کوئی ایسی فرمائش نہیں کی جس کو وہ پورا نہ کر
 سکتے۔ آپ گھر کے تمام کام خود انجام دیتیں، جھاڑو دینا، چرخہ کاٹنا، کھانا پکانا
 چکی پیسنا اور بچوں کا دیکھ بھال اور تنہا آپ، مگر کبھی تیوری پر بل نہیں آئے۔
 سچ میں جب جناب فتنہ کنیز کی حیثیت سے گھر کی خدمتیں تو ایک دن یہ سزا
 کام دہ کرتی تھیں، دوسرے دن خود سیدۃ عالم۔ اطاعت کا یہ عالم تھا کہ
 کبھی حضرت علیؑ سے رنجش تو درکنار شکر رنجی بھی نہیں ہوتی۔

پردے کی اتنی پابند تھیں کہ حجرہ مسجد سے متصل ہونے کے باوجود کبھی باہر
 جھانک کر بھی نہیں دیکھا کہ آپ کی نظر کسی نامحرم پر نہ پڑ جائے یا کوئی نامحرم آپ
 کو نہ دیکھ لے۔

آپ عورتوں کے لئے جہاد بالنفس کی پابند تھیں مگر زخموں کی مرہم پٹی کے

لئے میدان میں جانا ثابت ہے، مبالغہ میں آپ وفد کی روح رواں تھیں۔
 خواتین کے لئے حضور کے تمام ارشادات کو سامنے رکھ کر حجاب معصومہ
 کا جائزہ لیا جائے تو آپ ان سب کا نمونہ عمل تھیں۔ مثلاً:-
 ”عورت کا جہاد مشوہہ کے ساتھ حسن سلوک ہے۔“

”عورت اگر خداوند کا حق ادا نہیں کرتی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اللہ کے
 حقوق بھی ادا نہیں کر سکتی۔“

”اگر خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو
 کو سجدہ کریں۔“

مختصر سی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا، جب آپ نے حضرت علی کی
 رضا جوئی کو ملحوظ نہ رکھا ہو، حالانکہ آپ خواتین جنت کی سیدہ تھیں۔ آپ کے
 مقابلے پر دوسری عورتوں کا جائزہ لیا جائے تو آپ کی عظمت کا صحیح اندازہ
 ہو سکتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضور کی نظر میں آپ کی اتنی قیمت
 کیوں تھی۔

”حضور کی عادت کریمہ یہ تھی کہ جب فاطمہ علیہ السلام کو
 دیکھتے تو کھڑے ہو جاتے اور متوجہ اور مستقبل ہو کر ان کا بوسہ

لیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے۔“ (۶۱)

محدث دہلوی کے علاوہ اکثر مورخین نے بھی حضور کے اس عمل کو صراحت
 کے ساتھ لکھا ہے اور حضور کے اس معمول کی تو حضرت عائشہ اور دوسری خواتین
 نے تصدیق کی ہے کہ سفر کی روانگی کے وقت سب کے آخر میں اور واپسی پر
 سب سے پہلے مایہ ناز بیٹی ہی سے ملتے تھے۔ اس کا سبب محبت پدری ہی
 نہ تھی، خود حجاب فاطمہ زہرا کے محاسن ذات تھے۔ جس کا خود خلاق عالم نے بھی
 کئی موقعوں پر اعتراف کیا ہے۔

گھر بیوا اور اخلاقی ذمہ داریوں کے دوں بدوش تہی عبودیت ادا کرنے میں

بھی آپ پیش پیش تھیں۔ تہجد گزار، شب زندہ دار، جب آپ سجادہٴ عبادت پر ہوتیں تو آپ کے چہرے سے ایسا نور ساطع ہوتا کہ دُور دُور تک ماحول منور ہو جاتا تھا۔

نبیِ رسول کی سیرت کو دیکھ کر خود اُجہات المؤمنین کا جائزہ لیا جائے تو ماں کے علاوہ کوئی مقابلے پر ٹھہرتا ہی نہیں۔ ہمارا مقصد کسی کی اہمیت کو کم کرنا ہرگز نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تحقیق میں اگر کوئی عظیم ہے تو اس کو عظیم تر بنائیں، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ کثرتِ ازدواج میں جہاں حضور کی دوسری مصلحتیں تھیں وہاں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ ہر ذہن اور ہر مزاج کی عورت حرم میں داخل کریں اور اس کو نباہ کر دکھادیں تاکہ اُمت کے کسی مرد کو کوئی بری عورت مل جائے تو وہ یہ نہ کہہ سکے کہ ایسی عورت آنحضرتؐ کو ملتی تو گزارا محال ہو جاتا!

بلاشبہ ہمارے عقیدے میں جنابِ فاطمہؑ زہراؑ انتخابِ مشیت تھیں تب ہی تو آپ بار بار بارگاہِ احدیت سے فوازی گئیں۔ کبھی جبریلؑ نے بچوں کی گوارہ جنبانی کی، کبھی طباقِ جنت اور عیشین کے لئے خلعتِ بائے سبز و سرخ لے کر حاضر ہوئے۔ آپ کی شان میں کتنی ہی احادیثِ مردی ہیں۔

”فاطمہؑ دنیا میں بھی سیدہ ہیں اور جنت میں بھی عورتوں کی سردار“
 ”جس نے آپؑ کو تکلیف پہنچائی۔ اُس نے رسولؐ کو تکلیف پہنچائی اور جس نے رسولؐ کو تکلیف پہنچائی، اُس نے خدا کو“
 ”فاطمہؑ میرا جزد ہے“

”نُزولِ آیہٴ تطہیر کے بعد آنحضرتؐ نمازِ صبح کے وقت درِ فاطمہؑ پر جا کر آواز دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے خدا نے تمہیں ہر اکودگی سے پاک کیا ہے۔“

یہ سچی عظمتِ فاطمہؑ زہراؑ کی خدا اور رسولؐ کی نگاہ میں۔ رسولؐ کے بعد چھ ماہ کی زندگی میں آپؑ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، اس پر کتنا ہی طبع چڑھایا جائے مگر تاریخ ٹھہلا نہیں سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹی کو باپ سے بہت محبت ہوتی ہے مگر اتنی محبت کہ ۲۸ صفر کے بعد آنکھوں سے آنسوؤں کے ہی نہیں۔ پوٹے متورم ہو گئے۔ دیدے سرخ

پڑ گئے مگر فاطمہ کبھی بلند آواز سے کبھی ہچکیوں سے روتی ہی رہیں۔ اس گریہ زاری کو بھی اُمّت برداشت نہ کر سکی مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ اس سے ان کا سکون برباد ہوتا ہے۔ آخر فاطمہ نے یہ معمول بنالیا کہ صبح کو ام ایمن کے ساتھ بچوں کو لے کر نکل جاتیں اور دن بھر حنت البقیع میں روتی رہتیں۔ بقیع کی اس جگہ کو آج بھی بیت الاحزان کہا جاتا ہے۔

خود جناب فاطمہؑ نے اپنے تاثرات کو نظم کا قالب عطا کیا ہے۔

”بابا آپ کے بعد مجھ پر وہ مہیبتیں پڑیں کہ اگر روشن دنوں پر پڑتیں تو وہ تیرہ دتار ہو جاتے۔“

لوگ کہتے ہیں نہ گھر مٹو نہ گنا گیا نہ دروازہ گرایا گیا مگر اس کو کیا کہیں گے کہ پیٹ کے ایک حصّے پر ضرب شدید کا نشان تھا اور اس میں سخت تکلیف تھی جس کے نتیجے میں احتفاظ ہوا اور اندر کی چوٹ سے پھر معصومہ سنبل نہ سکیں اور ایک دایت کے مطابق ۵۷ دن کے اندر وفات پا گئیں۔

یہ انتقال نہیں تھا، قتل تھا جس کو روایتیوں اور تادیلوں کے گور کھ دھندے میں پھنسا کر چھپایا نہیں جاسکتا۔ جو چپ رہے گی زبان نخر لہو پکارے گا آستیں کا۔ رسول کی علیہ منزلت بیٹی اتنی مختصر مدت میں باپ سے جاملی مگر اپنے بعد درد کی وہ داستان چھوڑ گئی جو رہتی دنیا تک ظالم و مظلوم میں ایک حد فاصل ہے گی۔ آپ نے حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور کئی دوسرے لوگوں کو معاف نہیں کیا بلکہ وصیت کی کہ یہ لوگ میت میں شریک نہ ہوں اس شمول میں جناب عائشہ بھی تھیں ۳۔ جہادی الشافعی رحمہ اللہ یکشنبہ کو دونوں بچوں کی انگلیاں پکڑ کر قبر رسول پر آکھڑی ہوئیں۔ قبر و منبر کے درمیان دو رکعت نماز ادا کی اور بچوں کو مسجد میں علی کے پاس چھوڑ کر گھر آگئیں۔ حضور کی چادر اٹھائی، غسل کر کے آپ کا بچا ہوا کفن پہنا، حجرے میں داخل ہوئیں اور مصلىٰ عبادت پر جا بیٹھیں۔ تسبیح و تحلیل کی آواز آنا بند ہوئی تو اسماء زوجہ جعفر طیار نے حسب عادت آپ کو پکارا، جواب نہ ملا تو اسماء

تاریخ شاہد ہے کہ باغِ فدک کے مقدمہ میں حضرت اُم کلثوم اتنی بڑی تھیں کہ آپ نے گواہی دی تھی اور نابالغ کی گواہی کو رد کر دیا گیا تھا۔ اس طرح آپ کی عمر تین سال ضرور ہوگی۔ یہ واقعہ ۱۱ھ کے اوائل کا ہے جس لڑکی سے حضرت عمر نے عقد فرمایا، وہ چار پانچ سال کی تھی۔ جب کہ اُم کلثوم کی عمر اس حساب سے ۱۸ھ میں دس گیارہ سال ہو جاتی ہے، لہذا روایت جھوٹی ٹھہرتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُم کلثوم بنت علیؑ کا عقد محمد بن جعفرؑ کے ساتھ اسی زمانے میں ہوا۔

۱۸ھ یا ۱۹ھ میں جس لڑکی کی عمر چار پانچ سال تھی۔ اس کی پیدائش یقیناً ۱۳ھ یا ۱۴ھ میں ہوئی ہوگی، جب کہ جناب فاطمہؑ زہراؑ کا انتقال ۱۱ھ میں ہو چکا تھا یعنی اس روایت کی رو سے جناب اُم کلثومؑ، سیدہ کونین کی وفات کے دو سال بعد پیدا ہوئیں۔ دروغ کو راجح قطع نہ باشد۔

پھر اس بات کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ جناب حفصہؑ، اُم کلثومؑ کی مائی ہوتی تھیں۔ جس کو عرب کے معاشرے میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اس رشتے سے حضرت عمر اُم کلثومؑ کے پرانا تھے۔ اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ حضرت عمر جناب فاطمہؑ کے بھی خواستگار ہوئے تھے۔ ماں کی طرف سے مایوسی مئی تو بیٹی کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ عرب کی ضرب المثل حمیت میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ان عقل دلائل کے بعد حقیقت حال گوش گزار کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ جس اُم کلثومؑ سے حضرت عمر نے عقد کیا تھا وہ علیؑ کی بیٹی نہیں تھی بلکہ حضرت ابوبکرؑ کی بیٹی تھی۔ اور اس کلثوم کے بارے میں بھی بعض روایات ہیں کہ صرف بات حیت ہوئی تھی۔ عقد کی نوبت نہیں آئی۔

” اُم کلثوم ابوبکرؑ کی دختر تھی۔ اس کی ماں کا نام اسماء بنت عیسٰی تھا۔ اسماء ابتداً جعفر طیارؑ کی بیوی تھی، پھر ابوبکرؑ کے نکاح میں آئی۔ جس سے عبدالرحمنؑ اور اُم کلثوم پیدا ہوئے۔ اس کے بعد علیؑ ابن ابی طالبؑ نے اسماء سے عقد کر لیا اور اُم کلثومؑ اپنی ماں

نوٹ:- عبدالرحمنؑ کے بجائے محمدؑ ہونا چاہیئے۔

کے ساتھ علیؑ کے گھر آگئی۔ پھر عمر ابن خطاب نے ام کلثوم بنت ابوبکر

سے نکاح کر لیا۔ (۶۲)

ان سب پرسترازیہ حقیقت ہے کہ حضرت ام کلثوم واقعہ کر بلا میں موجود تھیں تو کبھی کسی نے کہا کہ عمر ابن خطاب کی بیوہ شام کے دربار میں گئی تھی؟ سچ ہے، جھوٹ کا حافظہ نہیں ہوتا پھر اس میں وہ راوی بھی مرچکے تھے جنہوں نے اپنی مصلحت سے اس روایت کا شاخسانہ چھوڑا تھا۔

کتنی دشمنی تھی مسلمانوں کو بنت رسول سے کہ قبر میں بھی چین نہ لینے دیا اور اس کی بیٹی کو رسوا کر کے صغیر سنی کی ایک مثال پیش کر دی لیکن چاند پر جاک ڈالنے سے کبھی خاک نہیں پڑتی۔

دربار خلافت اور علیؑ

خلافت کی گرفت اب مضبوط ہو چکی تھی۔ جہاجیرین کی اکثریت اور انصار کی ایک بڑی تعداد نے بیعت کر لی تھی کیونکہ انہیں زندہ رہنا تھا۔ اہل اقتدار سے ٹکر لینے کی سکت کسی میں نہ تھی، بالخصوص ان حالات میں جب کہ حضرت علیؑ نے کنارہ کشی کر لی تھی۔ علیؑ کے ساتھ تھے تو وہ لوگ جو منصوص من اللہ امام کو پہچانتے تھے۔ عام لوگوں کا خمیر عرب کی آب و ہوا میں تیار ہوا تھا پھر حکومت جو کچھ کر رہی تھی، وہ پیغمبر اسلام کے نام پر اور اصول اسلامی کا حوالہ دے کر لہذا کچھ تو حالات کو سمجھ ہی نہ سکے اور کچھ سمجھے بھی تو مفاد دنیا کو پس پشت نہ ڈال سکے۔ ایسے میں بقائے اقتدار اور فوائد ذاتی کے لئے کسی پر ظلم بھی ڈھایا گیا تو فتنہ و حدیث کا جواز پیدا کر کے، خواہ وہ احادیث اور وہ اصول من گھڑت ہی کیوں نہ ہوں۔

فاطمہ اور آل فاطمہ کے ساتھ جو سلوک رکھا گیا، اس کو شرعی تاویلات سے جائز قرار دے دیا گیا اور اس پالیسی کا سنگ بنیاد پڑ گیا جس کو آگے چل کر شام میں معاویہ نے ارتقائی جامہ پہنایا۔

علیؑ سب کچھ سمجھتے تھے مگر اس کا علاج تلوار اٹھانے کے علاوہ کچھ نہ تھا اور

علیؑ تلوار اٹھا نہ سکتے تھے کیونکہ وہ امام تھے مسلمان و البوذر کے بھی اور ابو بکر و عمر کے بھی۔ رسولؐ کی پوری زندگی علیؑ کے سامنے تھی جس پر انہیں من و عن عمل کرنا تھا۔ خود رسولؐ نے جنہیں برداشت کیا تھا، علیؑ کو بھی برداشت کرنا تھا۔ اس لئے آپؐ نے اسلام اور اہل اسلام دونوں کے لئے ایک لاکھ عمل بنا لیا تھا۔ اسلام کی صحیح صورت حال اپنے اقوال و اعمال سے ہر موقع پر پیش کرتے اور ملاحوں کو من حیث القوم بنینے کے لئے مشوروں سے نوازتے رہتے۔ یہی اصول آپؐ کے حلقے کے اہل ایمان نے بھی اپنایا، جن میں سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ و عمارؓ شامل تھے۔ یہ کہنا بہت ہی دوسری باتوں کی طرح غلط ہے کہ علیؑ نے جنابِ خاطر ص کے انتقال کے چھ ماہ بعد بیعت کر لی تھی۔ علیؑ امام نہ ہوتے تب بھی وہ اور دشمنِ زہر کی بیعت!

دوستوں نے جھوٹ کے سر پر سینگ لگا دیئے۔۔۔۔۔ ان سے پوچھا جائے کہ بیعت کر لی تھی تو حضرت عمرؓ نے اپنے بعد سیرتِ بخین پر عمل کرنے کی شرط کیوں لگائی تھی، کوئی تھا ہمزہ نامزد لوگوں میں، جس سے سیرتِ بخین کو ٹھکرا دینے کا خدشہ تھا، اور جب علیؑ نے قرآن و سنتِ نبویؐ پر عامل رہنے کی حامی ہو کر لی تھی تو اس کو مانا کیوں نہیں گیا؟ کیا سیرتِ بخین سیرتِ نبویؐ سے مختلف تھی؟ اپنے عمل سے خود ثابت کر دیا کہ خلافت کے دو دور دورِ نبوتؐ سے پوری ملت نہ رکھتے در نہ سیرتِ بخین اور سیرتِ نبویؐ کو الگ الگ قرار نہ دیا جاتا۔

جھوٹی روایتیں بیان کر دینے سے حقائق پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ سچ یہ ہے کہ علیؑ تو علیؑ، علیؑ کے کسی پیرو نے بھی بیعت نہیں کی، صرف تعاون کیا، وہ بھی تختِ خلافت پر بیٹھ ہوئے لوگوں کی خاطر نہیں بلکہ مذہب و ملت کے لئے جس کی قیادت پر محمد مصطفیٰؐ کا نام لکھا ہوا تھا۔

عملی زندگی میں آپؐ بار بار دربارِ خلافت میں گئے مگر اکثر و بیشتر اس وقت جب اربابِ اقتدار کو فقہی مسئلے میں فیصلہ نہ کر سکے یا اس وقت جب جنگی مصالح

میں کسی اہم رائے کی ضرورت ہوئی۔ عموماً آپ کا جانا بلانے پر یا استدعا کرنے پر
 پر ہوا۔ امام کی حیثیت سے آپ انکار نہ کر سکتے۔ دینی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا
 آپ کا کام تھا۔

خلافتِ اول کی تسخیری مہمات

سقیفہ کے انتخاب خلافت کے بعد حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کی تاریخ کے
 ایک نئے دور کا آغاز کر چکے تھے۔ اس کا اٹھان مایوس کن تھا پھر سچی محسوس ہوتا
 تھا کہ وہ آنحضرتؐ کی سنت کو باقی رکھیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے
 اُسامہ بن زید کو اُس مہم پر روانہ کیا جو ان کی عدم شرکت اور حضورؐ کی وفات کے
 سبب ملتوی ہو گئی تھی۔ یہ مہم چالیس روزیں سر ہو گئی اور اُسامہ پلٹ کر آ گئے
 اس میں یقیناً حضرت ابوبکرؓ کی تلافی مافات کا تصور تھا اور یہ نظریہ بھی کہ اس
 طرح بنی ہاشم کا ایک طرف دار اُدھر سے ٹوٹ کر ادھر آ جائے گا

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مدینان نبوت پر توجہ کی، اسود عنیؓ، طلحہ
 بن خویلد، سیدہ کذاب اور اس کی بیوی سجاح بنت خویلد کا استیصال کیا۔ اب دو
 گروہ باقی تھے۔ ایک مرتدین کا، دوسرا منکرینِ زکوٰۃ کا۔ مرتدین میں نعمان بن منذر
 لقیطین مالک اور بعض دوسرے سردارانِ قبائل۔ ہو سکتا ہے کہ خاندانِ رسالت
 کے ساتھ مسلمانوں کے سرگ سے وہ متاثر ہوئے ہوں اور انہوں نے بوجہ ہو
 کر یہی اسلام ہے تو اس سے توبہ بھلی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کا قلع قمع کیا، پھر زکوٰۃ
 نہ دینے والوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

شاہِ معین الدین ندوی کے بقول صحابہ کبار میں سخت اختلاف تھا کہ وہ
 زکوٰۃ کے منکر ہی نہ تھے بلکہ ان توبہ میں، ان پر تلوار اٹھائی نہیں جاسکتی مگر حضرت
 ابوبکرؓ نہیں مانے۔ یہ قبائل درحقیقت خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے
 اور اس کو آلِ محمد کا حق قرار دیتے تھے۔ ان میں مالک بن نویرہ حاکمِ ساج بھی
 تھے جو آنحضرتؐ کی طرف سے تحصیلِ صدقات و زکوٰۃ پر متعین تھے۔ حضورؐ کی

خبر رحلت پر مدینے آئے تھے اور بلا بیعت کئے واپس چلے گئے تھے۔
 ”مالک عرب کے مشہور شاعر و شہسوار تھے اور ایک نامور شخصیت کے

مالک۔ ان کا شمار حق پسندوں میں ہوتا تھا حضرت ابوبکر نے خالد بن
 ولید کو تعینات کیا۔ خالد نے عین نمازیں ان پر حملہ کیا اور مالک کو اکثر
 ساتھیوں سمیت قتل کر دیا اور اسی رات مالک کی حسین و جمیل بیوی ام تیمم
 بنت منہال کو برائے نام عقد میں لا کر اس سے زنا کیا۔ (۶۳)

حضرت عمر سے خالد کی عداوت ایام جاہلیت سے چلی آ رہی تھی۔ مدینے
 واپس آنے پر حضرت عمر نے خالد پر زنا کا فتویٰ لگایا، مگر حضرت ابوبکر نے صرف
 اتنا کیا کہ ام تیمم کو طلاق دلوا دی۔۔۔۔۔ یہ سچی ابتدا ظلم و ستم کی ہوا خواہانِ اہل
 محمد پر، اسی لئے مالک بن نویرہ کو کشتہ محبت امیر المومنین کہا جاتا ہے
 سعد بن عبادہ بھی اسی تعریف میں ہیں۔ وہ حضرت عمر کے دور میں قتل کئے گئے۔
 حضرت موت کے قبائل کا شمار بھی منکرینِ زکوٰۃ میں کیا جاتا ہے لیکن ان کے
 نظریات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

”ام اسی وقت تک خدا و رسول کے حکم کے تابع تھے جیت تک صاحبِ
 شریعت ہم میں موجود تھا۔ اب اس کی طلبی میں فرمانِ الہی پہنچ چکا ہے، اگر
 اس کے اہل بیت میں کوئی اس کی جگہ مقرر ہوا ہے تو ہم اس کی اطاعت کریں گے
 ابو قحافہ کے بیٹے کی حکمرانی کیسی!“

”حارث ابن سراقہ کے ان تاثرات کے بعد اشعث ابن قیس کے الفاظ
 حضرت موت کے ہزاروں افراد کے محسوسات کے ترجمان ہیں۔

”مجھے یقین ہے کہ اہل عرب ابوبکر کے خاندان یعنی تیمم بن
 مرہ کی اطاعت اختیار نہ کریں گے اور بطحا کے سرداروں یعنی بنی
 ہاشم کا ساتھ نہ چھوڑیں گے کیونکہ یہی لوگ معدنِ رسالت اور

لائقِ امامت ہیں۔“ (۶۴)

ان قبائل سے افواج خلافت کے زبردست معرکے ہوئے، گھمان کے دن پڑے
مگر انہیں شکست ہوئی۔ حضرت ابوبکر نے اپنی بیٹی ام فروہ کا عقد اشعث کے ساتھ کر دیا
اور اس کے بعد اس کا رویہ بدل گیا۔

مولانا شبلی الفاروق ص ۲۸ پر لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ سقیفہ چلے جاتے تب بھی
کوئی ان کی تائید نہ کرتا۔ کیوں، کیا پورا مدینہ اولاد رسول کا دشمن تھا، کیا علیؑ کے مخالفین
اسلام کے لئے دوسروں کی خدمات کچھ زیادہ تھیں؟ بات صرف اپنے محبوب داروں
کے اعمال پر پردہ ڈالنے کی ہے ورنہ کیا تخت خلافت اور کیا صحرائے عرب، علیؑ اور
ان کے ساتھی، تختہ الٹ کر رکھ دیتے اور یہ قبائل پہنچ جاتے تو ابوسفیان کی زبان
میں مدینے کی گلیاں سواروں اور پیدلوں سے بھر جاتیں لیکن منصب امامت نے
علیؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے اور خدا کی طرف سے علیؑ کو اجازت مل جاتی
تو عرب میں صرف اتنے ہی مرتد نہ ہوتے بلکہ اکثریت اپنے عزائم میں منہ کی کھا کر
اسلام سے روگرداں ہو جاتی۔ اس میں کون کون ہوتا؟ اس کا فیصلہ اہل دانش تو
کر سکتے ہیں۔

ان مہات سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکر نے رومی اور ساسانی حکومتوں کی طرف
توجہ کی، جن سے چھڑ چھاڑ کا سلسلہ حضورؐ کے حین حیات میں شروع ہو چکا تھا۔
خالد بن ولید دربار خلافت سے جرنیل بنا کر بھیجے گئے، ان سے ایرانیوں کی بڑی بڑی
لڑائیاں ہوئیں۔ بیشتر میدان خالد کے ہاتھ رہے جو مسلمانوں کی عام تاریخ کا
حصہ ہیں۔

اس جنگ کو نامکمل چھوڑ کر خالد مدینے واپس ہوئے اور حضرت ابوبکر نے
انہیں رومیوں کی سرکوبی پر متعین فرما دیا۔ چند چھوٹی چھوٹی جنگوں کے بعد فیصلہ کن
معرکوں کے منصوبے بن ہی رہے تھے کہ حضرت ابوبکر کا انتقال ہو گیا اور خالد کو
واپس بلا لیا گیا۔

علیؑ کے حلقہ گوش اپنے آئمہ کے علاوہ کسی کو امیر المومنین تسلیم نہیں کرتے مگر

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو بھی نہ مانا جاتا ان میں پہلا نام حضرت ابوبکر کا ہے۔ انہوں نے اچھا یا بُرا جو کچھ کیا، ہم اس کے معترف ہیں۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ نے اندرون خانہ جو سازشیں کیں، ان سے حضرت ابوبکر بری الذمہ نہیں ہو سکتے پھر سقیفہ بنی ساعدہ میں جو کچھ ہوا، اس سے بھی ان کا دامن صاف نظر نہیں آتا، پھر بھی مسلمانوں کے دُنیادی مفاد میں انہوں نے بعض کارنامے نمایاں انجام دیئے، تاریخ مسلمانان جس کی ممنون رہے گی۔

حضرت ابوبکر کے شرف و فضائل میں بہت سی روایات منقول ہیں لیکن اصل اور کتنی جعلی؟ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن تمام جعلی حدیثوں کو اصل مان لیا جاتا تب بھی فضیلت کے روشن اور تاریک پہلو باقی رہتے ہیں۔ پہلا شرف یہ ہے کہ مسلم اول اور یارِ غار تھے، دوسرے حضورؐ نے بار بار آپؐ کی صداقت کی تصدیق فرمائی، تیسرے یہ کہ آپؐ حضورؐ کی محبوب ترین بیوی اُم المؤمنین عائشہ کے پدرِ محترم تھے۔

ہم کسی پیغمبرؐ کے لئے اس کے قائل ہی نہیں ہیں کہ وہ جمال و شباب پر پرفریقہ ہو یا کی نظر میں تو ذہد و تقویٰ، سیرت و کردار موجب شرف ہوتا ہے، پھر ہمارا بی تو بغیر حکم الہی سانس بھی نہ لیتا تھا۔ اس کے لئے تو سن سے اُتری ہوئی حضرت حفصہ اور جواں سال حضرت عائشہ دونوں برابر تھیں۔ آپؐ کی نظر میں کبھی کی کوئی قیمت تھی تو اس کی سیرت کی بنا پر۔ چنانچہ علمی زندگی میں خدیجۃ الکبریٰ کی جو قدر و منزلت تھی وہ اس وجہ سے نہ تھی کہ جناب خدیجہ اپنے وقت کی حسین ترین عورت تھیں۔ بلکہ خدیجہ کی قربانی، آپؐ کا ایثار، منزلتِ ایمانی سبب امتیاز تھی جو ہمیشہ باقی رہی اسی سے اُم المؤمنین عائشہ جلتی رہتی تھیں۔

ذوِ وجہ کی حیثیت سے حضرت عائشہ کا درجہ بھی وہی تھا جو رسولؐ کی کسبی و مہری بیوی کا۔ بعض گمراہی ہوئی حدیثیں ملتی ہیں کہ خدائے جبریلؑ کے ذریعہ آپؐ کو سلام

کہلایا۔ ظاہر ہے کہ خدا کی نظر میں جو چیزیں پسندیدہ ہیں وہ جنابِ عائشہ میں پائی جاتی ہوں گی تب ہی تو اتنی عزت بخشی تھی۔ اس کا فیصلہ عبادت کے خضوع و خشوع اور یا صنتِ نفس کے استغراق کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے مگر اس سلسلے میں تین کے قلم کی روشنائی نے کام نہیں کیا اور ایسی کوئی حدیث نظر نہیں آتی۔ دلیل کے طور پر مبالغہ کو کیا جاسکتا ہے۔ جب طاہر بن کا ایک معیار مقرر ہوا تو نہ کسی خوبصورت صفیہؓ کا پتہ چلتا ہے اور نہ عائشہ حمیرا کا۔ وہاں تو صرف حضرت خدیجہؓ الکبریٰ کی عظیم المرتبت بیٹی ہی منتخب مشیت ہوتی ہے۔ مردوں، بچوں اور عورتوں میں تنہا اسی کی ذات محور مبالغہ بنتی ہے: فاطمہؓ کے باپ اور شوہر، فاطمہؓ کے بچے اور خود فاطمہؓ۔ یہ تھا قطعی فیصلہ خوشنودی الہی کا۔ اس کے بعد بلا سبب گھما پھیر کر باتیں کی جاتی ہیں اور فضائلِ سیر کے دریچے وضعی احادیث کی دشکوں سے دا کئے جاتے ہیں۔

دوسری فضیلت صداقت کی ہے اور اسی کی بناء پر حضرت ابو بکرؓ کو صدیق کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اس کے لئے ایک معیار بنانا پڑے گا کہ کیا عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، کیا کبھی رسولؐ سے بے وفائی نہیں کی؟ ہم کچھ نہیں کہتے، خود اپنی روایتی تاریخ کا جائزہ لے لیں، بچپن کے دوست تھے، پسینے پر اپنا خون گرانے والے، لیکن شعب ابی طالب میں نامہ و پیام کا سلسلہ تک باقی نہیں رکھا۔ بنی ہاشم کے کچھ لوگ چاروں طرف سخت پہرہ ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ سامان پہنچا دیتے تھے مگر آپؐ نے کبھی کوئی کوشش بھی کی ہو تو ہم جھوٹی سے جھوٹی روایت کو بھی سن لیں گے۔ کیا یہی تقاضا تھا بچپن کے یارانے کا اور سلم اول ہونے کے ادعا کا۔ بات آگئی ادلیت اسلام کی تو ہمارے نظریے سے یہ بحث ہی بیکار ہے کیونکہ ہم تو پختہ تن پاک کو تخلیق اول مانتے ہیں، اسلام و قرآن سے بھی پہلے، ہر چیز سے پہلے، محمدؐ، علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ اور ان کے ذیل میں باقی ائمہ۔ محمدؐ محور اسلام اور بقیہ تمام محافظ اسلام۔ ان ذواتِ مقدسہ کی سیرت و کردار

کا نام ہی اسلام ہے تو ان کے لئے "اسلام لانے" کا مجاورہ ہی کیوں استعمال کیا جاتا ہے۔

ہاں اس کا سلسلہ باہر کے لوگوں سے شروع ہو سکتا ہے تو ان میں اگر حضرت ابوبکر نے پہل کی ہے تو یقیناً وہ افضل ہیں لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض روایات اس کے خلاف بھی ملتی ہیں۔ تاہم یہ ہمارا مبحث نہیں ہے، وہ پہلے اسلام لانے ہوں یا بعد میں لیکن اکثر مواقع پر ان سے بے وفائی ضرور سرزد ہوئی۔ جنگ اُحد میں ابوعبیدہ بن الجراح کے ساتھ رسول کو تنہا چھوڑ کر پہاڑی پر چڑھ گئے۔ طائف میں بھی ایسا ہی کردار ادا ہوا مگر زیادہ دُور نہیں گئے۔ اُسائنہ بن زید کے لشکر کے ساتھ تاکید پیغمبر کے باوجود نہیں گئے بلکہ حضور کو عالم نزاع میں چھوڑ کر کئی میل دُور اپنے گھر روانہ ہو گئے، جب کہ دوسرے لوگ شب و روز در رسالت پر حاضری دیتے رہے، پھر جب آپ واپس آئے تو میت کو پیٹھ دکھا کر سقیفہ بنی ساعدہ میں اپنا انتخاب کرانے کے لئے دوسروں کو بھی ساتھ لے گئے۔

بعض باتیں اور بھی ہیں جن کا اعتراف خود حضرت ابوبکر نے آخر وقت میں کیا تھا۔

حدیث توریث اگر سچی ہے تو وہ صدیقِ درنہ غیر صدیق اور چونکہ اس حدیث کو غلط قرار دینے والے علیؓ، فاطمہؓ، حسنینؓ، فاطمہؓ کی کم سن بیٹیاں اور اُم ایمن تھیں، اس لئے ہم تصور میں بھی ان کی بات کو چھوٹی نہیں سمجھ سکتے لہذا اس حدیث کو وضعی احادیث میں شامل کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی کا صدیق ہو تو اُسے مبارک ہمارے صدیق اکبر تو علی ابن ابی طالب ہیں جو قیامت تک رہیں گے۔

مسئحہ گسترانہ طور پر اسلام میں شرفِ اولیت کو ایک دوسرے زاویہٴ نگاہ سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ہر بچہ اپنی نوعِ ولادت میں فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اس میں علیؓ، ابوبکرؓ، عمرؓ، ابوعبیدہؓ اور ابوسفیانؓ میں کوئی تخصیص نہیں علی کا جہاں تک تعلق ہے وہ کعبے میں پیدا ہوئے، رسول کی آغوش میں آنکھ کھولی

دنیا میں پہلی چیز جو دیکھی، وہ رسول کریم کا چہرہ اقدس تھا، پھر آپ کی زبان چوس چوس کر پروان چڑھے اور آپ ہی کے زیر سایہ سمپن کی منزلیں طے کرتے رہے حتیٰ کہ دعوتِ ذی العشرہ میں پیغمبرِ اسلام کی حمایت کا اعلان کیا۔

وہ بچہ جس نے آنکھ کھول کر اسلام کو دیکھا، زبان کو حرکت دی تو کلامِ الہی کی تلاوت کے لئے، رسول کے پیچھے اس طرح چلتا رہا، جیسے بکری کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے، پھر اس بچے نے آغوشِ لہذا تک ماں کا ساتھ نہ چھوڑا، اس بچے کے لئے کون حکم لگا سکتا ہے کہ کب اس نے ماں کی زبان سمجھنا شروع کی اور کب وہ ماں کے ایمار سے آشنا ہوا؟

اس کے مقابلے میں بات کسی حدیق یا کسی فاروق ہی کی نہیں ہے بلکہ سارے عرب کی ہے کہ پیدا ہوئے تو فطرتِ اسلام پر، پرورش پائی تو کفر کی گود میں اور جوان ہوئے تو آیامِ جاہلیت کے ماحول میں۔ کون انسانی درندگی کے رسم و رواج میں کتنا آلودہ ہوا، کسی پر نماشی کا رنگ کس قدر چڑھا؟ اس کے تجزیے کی ضرورت نہیں، کیونکہ قبولِ اسلام سے ہر ایک یکساں طاہر و مطہر ہو گیا، البتہ حلقہٴ گوشِ دین میں ہونے کے بعد اگر کسی کے پاؤں ڈنگ گئے تو وہ دائرہٴ اترداد سے باہر نہیں جاسکتا۔

ہم اس روشنی میں کسی کا زندگی نامہ کیوں مرتب کریں۔ ہمیں تو اپنے محمدین کی بات کرنا ہے، ان کی سطح پر ہم کسی کو نہیں پاتے، لہذا گنتی میں بھی نہیں لاتے پھر بھی کسی سے کوئی کار نمایاں انجام پایا ہے تو اس کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں اور اسی تعریف میں حضرت ابوبکر کو بھی لاتے ہیں۔

سر سید کا قول تھا کہ ”حضرت ابوبکر کی خلافت دراصل حضرت عمر ہی کی خلافتِ اول تھی۔“ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ۲۹ صفر ۱ھ سے ۲۱ جمادی الثانی ۳۰ھ تک کا زمانہ بھی ایسا قرار پائے گا جس میں زمامِ حکومت تو حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں تھی مگر اس کو حرکت حضرت عمر دیتے تھے۔ اس طرح اس دور کے امتیازات

کا سہرا بھی حضرت عمرؓ ہی کے سر بندھا ہے تاہم اس دور میں جو مرحلے سر ہوئے، ان پر نام حضرت ابوبکرؓ کا لکھا ہے۔

خلافت دوم

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد خلافت کے لئے حضرت عمرؓ کو نامزد کر دیا تھا۔ اس لئے پیغمبرؐ کی قبر سے فارغ ہوتے ہی تختِ خلافت پر ممکن ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کی بیعت کر لی۔ حالانکہ ان کا انتخاب شورعی کے ذریعے عمل میں نہ آیا تھا۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ بنائے جانے کے لئے شورعی کی قید نہ تھی شورعی کا شاخسانہ صرف حضرت علیؓ کو محروم کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تھا، ورنہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد ایک بار پھر سقیفہ بنی ساعدہ میں گہما گہمی ہوتی اور حضرت عمرؓ کو کسی دوسرے امیدوار خلافت کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ یہ احسان ہے حضرت ابوبکرؓ کا حضرت عمرؓ پر کہ انہوں نے سابقہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر کسی سعد بن عبادہ کو مسئلہ خلافت میں درانداز ہونے نہیں دیا۔ بعض مستند روایات کی رو سے آغاز خلافت کے بعد ایک دن حضرت عمرؓ نے اعتراض کیا کہ جب حضورؐ نے کاغذِ اقلیم ذاتِ سال کاٹھا تھا تو حضرت عمرؓ نے جان بوجھ کر نہیں دیا، کیونکہ آپؐ علیؓ کی محبت میں اکثر حجادۃ النصار سے گزر جاتے تھے اور ایسی باتیں کر جاتے جس سے اسلام کو نقصان پہنچتا تھا اور حضرت عمرؓ کو اسلام سے محبت تھی لہذا انہوں نے حضورؐ کو ایک مفرت رساں کام سے باز رکھا۔

بقول حضرت عمرؓ حضورؐ علیؓ ہی کے حق میں وصیت لکھ دیتے تاکہ مسلمانوں میں آئندہ کوئی حلفشمار پیدا نہ ہو حضرت ابوبکرؓ بھی شاید اس نکتے کو سمجھتے تھے تب ہی انہوں نے ممکن انتشار سے مسلمانوں کو بچا لیا اور حضرت عمرؓ کو نامزد کر دیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وصیت نامے کے ابتدائی الفاظ لکھوائے ہی تھے کہ صنف

عسے شس آگیا، حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے حضرت عمرؓ کا نام لکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش آیا تو تحریر پڑھوا کر شنی، حضرت عمرؓ کا نام سن کر بے اختیار زبان سے اللہ اکبر نکل گیا اور فرمایا:

خدا تم کو جو تائے خیر دے، تم نے میرے دل کی بات لکھ دی۔“ (۶۵)
 ان لوگوں میں واقعی آپس میں اتنی ہم آہنگی تھی کہ ایک دوسرے کے نافی الضمیر
 کو جانتا تھا یا ہو سکتا ہے کہ خود اس کی رائے بھی جی ہو۔

غینم تھا کہ حضرت ابو بکر مرتے دم تک حاضر دماغ رہے۔ ان پر حضور کی
 طرح کوئی ہذیانی کیفیت طاری نہیں ہوئی ورنہ وہ اس کام کو انجام نہ دے سکتے
 جس کو حضور نہ کر سکے تھے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اسلام کا پیغمبر مسلمانوں کو کتنا پیارا تھا کہ اس کے
 آخر وقت میں خود اس کے ساتھ اور وفات کے بعد اس کی اولاد کے ساتھ مسلمانوں
 کا رویہ یکساں رہا اور بعد کے لوگ بھی کتنے عاشق رسول ہیں کہ آج تک بد لوکی
 کرنے والوں کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

اس طرح مسلمانوں کے دوسرے دور خلافت کا آغاز ہوا جس کے دامن پر
 بددیانتی اور حق تلفی کے داغ ضرور ہیں لیکن جس کے افق پر فتوحات کا وہ آفتاب
 چمکتا نظر آتا ہے جس نے عراق و شام اور مصر کو اسلام اور اہل اسلام سے آشنا کر دیا
 ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر کو صحرائی جبلت اور عربوں کی فطرت سمجھنے میں مہارت تانہ
 حاصل تھی۔ انہوں نے ایسے جرنیلوں کا انتخاب کیا جنہوں نے روم و ایران میں تہلکہ
 ڈال دیا اور حکومتوں کے پرچمے اڑا دیئے۔

خالد بن ولیدؓ میں معز دل ہو گئے۔ حضرت عمر سے ان کی دشمنی کے
 بازار اور عکاظ کے میلے میں ہوئی۔ مالک بن نویرہ کے قتل کے بعد سے اضافہ ہو
 گیا اور حضرت عمر اپنے عہد میں ان پر اعتماد نہ کر سکے۔ ابو عبیدہؓ جراح مغنی
 سعد بن ابی وقاص، عمر عاص اور دوسرے بہادروں نے سکندر اعظم کی یاد تازہ
 کر دی۔ شام فتح ہونے پر یزید بن ابوسفیان کو گورنر بنایا جا چکا تھا۔ ابو موسیٰ اشعری
 کو بصرے کا حاکم بنایا گیا اور تخیم کا سیلاب آگے بڑھا ہی چلا گیا۔ اسی لئے جاہ طلب
 دُنیا نے انہیں عمر اعظم کے لقب سے بھی پکارا ہے۔

عربوں کی مسلسل فتوحات بلاشبہ حضرت عمر کی قیادت اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہیں مگر اس دوران پیغمبر کا حقیقی نائب جس کو حقیقی خلافت سے محروم کر دیا گیا تھا، بے تعلق نظر نہیں آتا۔ اعلیٰ کے بجائے کوئی اور ہوتا تو جمل بھن کر کباب ہو جاتا، لیکن اعلیٰ امام کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کتنی ہی خلق کی ہر پھر بھی تھے رسول کے امتیٰ اور جو کچھ کر رہے تھے وہ اسلام کا نام لے کر، لہذا اعلیٰ کسی مقام پر دامن کش نہیں ہوئے بلکہ جب خلیفہ نے مشورے کے لئے بلایا تو بلاتا مل برجل مشورہ دیا اور حضرت عمر جب خود جانے کو تیار ہوئے تو مرکز کے دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی قبول کی، کیونکہ آپ کا مقصد تو اشاعت اور استقرار اسلام تھا، وہ کسی عنوان سے بھی ہوتا، اس سے آپ کا مقصد تخلیق پورا ہو رہا تھا۔ اس میں خلیاں ضرور تھیں تو علی ان کو دور کر سکتے تھے۔

جنگوں کی تفصیل خود جرنیلوں کے تدبیر کا نتیجہ ہیں جن کو ہر مورخ نے اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ ہمارے مسلک میں جو قیود اور شرعی پابندیاں ہیں ان کو سامنے رکھ کر ان جنگوں کو دیکھا جائے تو ان میں اکثر مقامات پر آداب اسلام کے بجائے عربوں کی قسادت اور بربریت بھی پائی جائے گی۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ عرب جب ایرانی علاقوں پر قابض ہوئے تو انہوں نے ساسانی تمدن کا اتباع کیا اور تاریخ عالم میں پہلے فاتح کی نظیر قائم کی جو مفتوح سے متاثر ہوا۔ اسلام کے نقطہ نظر سے کسی قوم کی اچھی باتوں کو اپنانا کوئی جرمی بات نہیں ہے لیکن عرب کی سادگی ایران کی ترقی بھرک سے چونکہ حیا رہی تھی اور زرق برق پرستوں سے اپنے کو بلوس کر رہی تھی۔ جس سے جذبہ اسلام کی روح کمزور پڑنے لگی تھی۔

شام میں سلاطین سے بنی امیہ کی حکومت تھی۔ سلاطین میں یزید بن ابوسفیان گورنر بن چکے تھے اور رومی جاہ و جلال دمشق کے دربار میں داخل ہو چکا تھا جس نے امپراطور آرمینہ غلبہ حاصل کر لیا اور مدینے کے معاشرے سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہ گیا۔

حضرت عمر کا گیارہ سالہ دور حکومت ۲۹ ذی الحج ۳۳ء کو تمام ہوا۔ تو وسیع مملکت کے دنیاوی مطمع نگاہ سے یہ ایک زریں عہد تھا جس کے بعض اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے۔ پھر بھی اس میں پیغمبرانہ جبروت کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی بلکہ تسخیر عالم کے اس خواب کی ابتداء نظر آتی ہے جو مستقبل بعید میں پورا ہوا اور کہا جاسکتا ہے کہ وہ آنحضرت کے سجادہ نیابت پر بیٹھ کر اتنے ممالک فتح نہ کرتے اور تسخیر کا دھارا زیادہ تیز نہ ہوتا تو اس کو بہت جلد استحکام میسر آ جاتا اور تحسین عالم میں ان کا درجہ بہت بلند ہوتا، تاہم ان کی دانشمندی اور سیاسی سوجھ بوجھ داد لئے بغیر نہیں رہتی کہ انہوں نے عرب کے نسلی مزاج کو پہچان کر صحرائیوں کو وہ راستہ دکھا دیا جس پر ایمان کی جہر تو لگی ہوئی تھی مگر مال غنیمت کی منزلیں بھی دُور دور تک تباہ نہ تھیں۔

ان کی موت ایک بڑا سانحہ تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ کے پارسی غلام ابو لولؤ نے نماز پڑھتے میں آپ پر حملہ کیا اور آپ شہید ہو گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ابو لولؤ فیروز بخارا اور آہن گر تھا۔ حضرت عمر سے اس کی دشمنی تھی۔ ایک دن وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ اس نے ایک نئی قسم کی چکی بنائی ہے اور خلیفہ سے اس کا افتتاح کرانا چاہتا ہے۔ آپ نے رضامندی ظاہر کر دی اور وہ چلا گیا۔

وقتِ مقررہ پر آکر وہ حضرت عمر کو لے گیا اور اپنے ہاتھ سے چکی چلانے کی استدعا کی۔ حضرت عمر نے زور لگا کر چکی کو گھمایا تو اس کے اندر چھپی ہوئی ایک چھری اس تیزی سے نکلی کہ آپ کے پورے پیٹ کو چاک کر گئی اور آپ دو سرے ہی دن اس زخم سے انتقال کر گئے۔

ابو لولؤ فیروز موقع ہی پر مر گیا یا مار ڈالا گیا تاہم مغیرہ بن شعبہ کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

حضرت عمر کا اسلام کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن رسول کے عین حیات وہ

جن جن مواقع پر ڈانوا ڈول ہوئے اور جو نفرشیں ان سے سرزد ہوئیں ان پر ملج چڑھانے سے نہیں چڑھتا۔ ہم ان کی نیت پر شک نہیں کرتے لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں کہ پیغمبر کی نیابت شروع ہی سے ان کی منزل نظر تھی۔ اس مقصد کے لئے جو کردہ انہوں نے بنایا اور اُم المؤمنین عائشہؓ کے تعاون سے جو سازشیں کیں وہ سب اپنی جگہ پر ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ ان میں اُس وقت تک کامیابی نہ ہو سکتی جب تک علیؓ کو راستے سے ہٹایا نہ جاتا اور اس پر وہ قادر نہیں تھے۔ البتہ عوام کی نگاہ میں علیؓ کی منزلت کم کی جاسکتی تھی تو وضعی روایات کا سہارا لیا گیا اور ابو ہریرہ جیسے لوگ انہیں مل گئے۔

روایات کا حربہ اس عہد کے لحاظ سے ایک کامیاب حربہ تھا۔ جس کی ابتداء تو اس زمانے میں ہوئی مگر حضرت معاویہ نے اس کو بام عروج پر پہنچا دیا اور اتنی دُلیا درآمد کرائیں کہ اصل و نقل کا امتیاز ہی ختم کر دیا۔

آل محمد افضل بھی تھے، شجاعت، زہد و تقویٰ، علم، حب و نسب اور سیرت و کردار میں، اور رسول اسلام کی قرابت سے حقدار بھی جس کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ خلافت کو تدبیر و حکمت سے اپنایا گیا تھا تو پہلا قدم یہ ہونا چاہیے تھا کہ انہیں اس جگہ پہنچا دیا جائے جہاں سے وہ کوئی آواز بلند ہی نہ کر سکیں۔ اس لئے انہیں ہر طرح نشانہ مستم بنایا گیا۔

محبت و جنگ میں سب جائز ہوتا ہے، جس پر اربابِ خلافت نے پورا عمل کیا اور بعد کے مسلم سلاطین نے اس لائحہ عمل کو پروان چڑھایا۔

اگر حالات کو دُنیوی آنکھ سے دیکھا جائے تو حضرت عمر ایک کامیاب ترین تدبیر تھے لیکن دین مقدس کی علم برداری کے ساتھ ان کا جواز کسی طرح نہیں مل سکتا۔ آپ نے بعض قابلِ قدر اصلاحات بھی کیں مگر بعض بدعتیں بھی سرزد ہوئیں جن کا کوئی شرعی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔ حضور نے اگر کسی بات کو جائز قرار دیا تو اس کو ناجائز قرار دینے کا حق حضرت عمر کیا، ان کے بڑوں کو بھی نہ تھا۔ تاریخ الخلفاء۔

سینوٹی کی رو سے آپ نے متعہ کو نہ کرایا بلکہ اس کو حرام قرار دیا۔ مروج الذہب کے بیان کے مطابق مسئلہ میں تراویح کو رائج کیا جو آج تک جاری ہے مگر دور رسالت اور عہد خلافت اول میں اس کا کوئی وجود پایا نہیں جاتا۔

ہماری نظر میں حضرت عمر کی شخصیت کے دورِ رخ ہیں — ایک تو وہ جس میں ان کے خوشخوار جرنیلوں نے یرموک سے ساحلِ نیل تک اسلام کے نام سے مسلمانوں کا بول بالا کیا، دوسری طرف ایوانِ خلافت پر ان کے گاڑے ہوئے علم کی پرچھائیں اتنی دُور تک گئی کہ سادات کے خون کے دھبے بھی اس میں چھپ گئے اور تاریخ کی خوردبین بھی ان کو دیکھ نہیں سکتی۔

خلافت سوم

نامزدگی کا سلسلہ حضرت ابوبکر سے چلا تو یہاں تک پہنچا کہ حضرت عمر نے اپنے بعد چھ آدمیوں کو نامزد کیا۔ علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعدؓ اور عبدالرحمنؓ اور نصیحت کی کہ ان چھ میں سے جو قرآن و سنت اور سیرتِ شیعین پر عمل کرنے کی حامی بھرے اس کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ جانتے تھے کہ علیؓ نے بیعت نہیں کی تو سیرتِ شیعین کو قبول کیے کریں گے۔ علیؓ نے ایک عالمانہ جواب دیا کہ سیرتِ شیعین میں جہاں سیرتِ نبویؐ ہے اس پر عمل کریں گے۔ سیرتِ شیعین غالباً سیرتِ نبویؐ سے مختلف تھی لہذا علیؓ کی شرط مافی نہیں گئی۔ عثمانؓ نے ہر بات قبول کر لی اور وہ خلیفہ بن گئے۔

یہ تاریخ کا تیسرا المیہ ہے جس کا آغاز یکم محرم ۳۲ھ سے ہوا اور جس میں حضرت علیؓ پھر سیاسی ہتھکنڈوں کا شکار ہوئے مگر انہیں اس کی پرواہ کب تھی؟ وہ بدستور اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ حضورؐ نے چالیس سال غریبوں کو انسان بنانے میں گزارے تھے، علیؓ مسلمانوں کو مسلمان بنانے میں لگے رہے۔

ایوانِ خلافت میں چند روز تک ایک سکوت سا طاری رہا، پھر جہلِ پہل شروع ہو گئی: ”ابتدا میں کچھ دنوں تک حضرت عثمانؓ نے فاروقی نظام میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا، مگر

میغیرہ بن شعبہ کو حضرت عمر کی وصیت کے مطابق کوفہ کی ولایت سے معزول کر کے ان کی جگہ سعد بن ابی وقاص کو مقرر کیا۔“ (۶۶)

باقی سب کو بدستور اپنی اپنی جگہوں پر باقی رکھا۔

حضرت عمر کا قاتل ابولولو میغیرہ بن شعبہ کا غلام تھا۔ غالباً حضرت عمر کو شک تھا کہ اس نے میغیرہ کے اشارے پر ایسا اقدام کیا اس لئے وہ میغیرہ کو سزا دینے کی تاکید کر گئے۔ اسی زمانے میں اسکندریہ، آرمینیا اور آذربائیجان میں بغاوتیں ہوئیں مگر وہ فرو کر دی گئیں۔

عمرو ابن عاص والی مصر پر حضرت عمر کے دور سے خیانت کا شبہ تھا۔ حضرت عثمان نے ان کو معزول کر دیا اور ابن ابی سرح کو پورے مصر کا حکمران بنا دیا۔ اس نے ۲۷ھ میں طرابلس فتح کیا۔ اسی زمانے میں حضرت عثمان نے حضرت معاویہ کے زیرِ تخت علاقے میں اضافہ کیا۔ ۲۹ھ میں ابو موسیٰ اشعری کو معزول کیا گیا۔ ۳۰ھ میں ولید بن عقبہ کی جگہ کوفہ میں سعید ابن العاص کا تقرر ہوا۔ اسی سال طبرستان فتح ہوا۔ خراسان، طخارستان، کرمان اور سجستان پر مکمل قبضہ حاصل کیا گیا اور حضرت معاویہ نے اپنے علاقوں کو وسیع تر کر لیا۔

حضرت عثمان کو ایک بنی بنائی زمین حکومت کے لئے ملی تھی مگر ان کی عمر بہت زیادہ ہو گئی تھی، پھر وہ کمزور بھی تھے۔ اس پر مسترزاد ان کی اقربا پروری اور غلط پالیسی۔ ان سب نے مل جل کر حالات کو ناہموار کر دیا۔

”حضرت عمر بڑے عاقبت اندیش تھے، انہوں نے اپنے زمانے میں اکابرِ قریش کو، جن کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو سکتا تھا، مدینہ کے باہر نکلے نہیں دیا۔ حضرت عثمان نے یہ قید اٹھادی یہ لوگ مدینے سے باہر نکلے تو خاندانِ رسالت کے تعلق سے لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ بڑی بڑی جاگیروں کے

مالک بن گئے۔“ (۶۷)

نے اس کو لے لیا۔“

پھر ایک دن مدینے کے بھرے بازار میں بنی ہاشم کو لٹکا رہا تھا لیکن حقیقتاً اس کا مخاطب الیہ حضرت علیؑ تھے

”ہاشمیو! اُؤ دیکھو، ہمارے بچے حکومت کی گیند سے کھیل رہے ہیں“

ولید بن عقبہ ایک مشہور بدکار اور شرابی تھا، نشے میں نماز پڑھا دیتا تھا۔ حضرت عثمان نے اس کو مختلف عہدوں پر نوازا۔

سعید بن عاص نے بعض صحابیوں پر مظالم کئے تھے، حضرت عثمان نے اس کو باعزت عہدے عطا کئے۔

عبداللہ بن مروح کا قتل برداشت نہ کر کے آنحضرتؐ نے مباح کو دیا تھا۔ حضرت عثمان نے اس کو حاکم بنایا۔

عامر بن قیس مشہور صحابی رسول تھے۔ ان کی توہین کی اور عبداللہ بن عامر کو شام کی طرف جلا وطن کیا۔

جلا وطن ہونے والوں میں حضرت جذب بن جنادہ المعروف ابو ذر غفاری بھی تھے۔ آپ اتنے جلیل القدر صحابی تھے کہ جنگِ مصطلق پر جاتے وقت حضورؐ آپ کو مدینے میں اپنا قائم مقام بنا گئے تھے۔ حضرت عثمان کی بدعنوانیوں سے دل بڑبڑاتا ہو کر آپ شام چلے گئے تھے مگر وہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کرتے رہے اور حضرت معاویہ نے سخت قید و بند کے ساتھ ایک اُونٹ پر بٹھا کر آپ کو مدینے بھیج دیا۔ حضرت عثمان نے پہلے تو ان کا معاشرتی معاہدہ کرایا، پھر زندہ کی طرف جلا وطن کر دیا جو ایک بے آب و گیاہ دیار تھا۔

مروان نے حضرت ابو ذر کو ایک اُونٹ پر سوار کرایا اور اعلان کیا کہ جو نہیں پہنچانے جائے گا، اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔

امیر المؤمنین بحیثیت امام مسلمانوں پر تلوار اُٹھانے کے پابند تھے مگر حضرت ابو ذرؓ رکنِ ایمان تھے اور یوں بھی حضرت عثمان کا حکم آپ کے لئے واجب التعمیل

تو نہ تھا۔ آپ اپنے بھائی عقیل، بھتیجے عبداللہ ابن جعفر، عمار یا سر اور دونوں بیٹوں کو لے کر چلے۔ عمالِ خلافت نہایت بے عزتی کے ساتھ صحابی رسول کو لے جائے تھے۔ اس صحابی کو جس کے لئے حضور کی کئی حدیثیں تھیں۔ جس کے بارے میں مشہور ارشادِ پیغمبر ہے کہ روئے زمین پر ابوذر سے زیادہ کوئی ذی نطق صادق القول اور حق گو نہیں ہے، مکے کے صادق و امین کی یہ سند حضرت ابوذر کی پیشانی پر چمک رہی تھی اور حضرت عثمان کے کارندے ان کو اُونٹ پر بٹھائے اُونٹ کو کوہنکاتے جا رہے تھے کہ امیر المؤمنین پہنچ گئے۔ مروان مانع ہوا۔ حضرت علیؑ نے ایک چابک مروان کے اُونٹ کو رسید کیا اور فرمایا۔

”دور ہو، خدا تجھے جہنم رسید کرے۔“

پھر آپ نے ابوذر کی مشالعت کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ابوذر عارفِ اسرارِ رسالت و امامت تھے۔ ان سے اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی، وہ اُتر کر سب سے گلے ملے جسنین کی پیشانیوں کو بوسہ دیا۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ منزلِ آخر کی طرف جا رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمادیا تھا: ”ابوذر! تمہیں جلا وطنی میں موت آنے کی“۔

مدینے کے باہر تک علیؑ آپ کے ساتھ گئے۔ حضرت ابوذر ایک بار پھر گلے ملے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو الوداعی نظروں سے دیکھا، لبوں سے کچھ کلمات ادا کئے اور ابوذر اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ روتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ واپسی پر حضرت علیؑ سے حضرت عثمان کا بڑا سخت مکالمہ ہوا مگر حضرت عثمان کے لئے ضبط کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ پورا دار الخلافہ امنڈ آتا تب بھی علیؑ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔

ابوذرؓ نے حق رسالت و امامت ادا کر دیا تھا۔ ربذہ میں کچھ بکریاں پال کر آپؐ گزر بسر کرنے لگے۔ پھر بکریاں یکے بعد دیگرے مرنے لگیں اور ابوذر بھوک کی شدت سے جاں بلب ہو گئے اور اسی عالم میں آپ کی روح نور رسالت کی

کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔

آپ نے بیٹی کو وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد بیٹی پر جا کر کھڑی ہو جانا ایک قافلہ گزرے گا، اس کو آواز دے کر بلا لینا۔ لڑکی بلندی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ قافلہ نظر آگیا۔ اس نے اگر حضرت ابوذر کی تجہیز و تکفین کی۔ بیٹی نے حسب ہدایت آخری بکری جو بیچ رہی تھی، اس کو ذبح کر کے اہل قافلہ کی صیانت کی۔ قافلہ حضرت ابوذر کی بیوی اور بیٹی کو لے کر روانہ ہو گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قافلہ مالکِ شتر کا تھا اور کچھ کسی اور کا بتاتے ہیں۔

عبداللہ ابن مسعود کا مرتبہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ حضرت عثمان کے حکم سے غلاموں نے انہیں اس زور سے زمین پر پڑکا کہ ان کی دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ خطا ان کی یہ تھی کہ انہوں نے اپنا جمع کیا ہوا قرآن عثمان کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اسلام کے لئے عمار یا سر کی خدمات بیان کی محتاج نہیں۔ آپ کی برگزیدہ ماں سمیہؓ کو ابو جہل نے نیزے سے شہید کیا تھا اور پھر یا سر کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ عمار صحابی رسول بھی تھے اور صحابی امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب بھی آپ حضرت عثمان کو سمجھانے کے لئے گئے تو انہوں نے غلاموں سے اتنا پٹوایا کہ عمار کا پیٹ پھٹ گیا، ایک پسلی ٹوٹ گئی اور جسم کے دوسرے حصوں پر چوٹیں آئیں۔ بہت لڑ پڑ تھے۔ بے ہوش ہو گئے۔ غلاموں نے مردہ سمجھ کر باہر پھینک دیا۔ حضرت ام سلمہؓ اٹھو اکر لے گئیں اور علاج کرایا۔ عمار کے پدر عالی مقام یا سر اور مادر گرامی سمیہؓ اسلام کے شہدائے اولیں تھے۔ خود ان کے مقابلے میں حضرت عثمان کی کیا قیمت تھی۔؟

ان لوگوں کے علاوہ کتنے ہی بزرگوں کے ساتھ حضرت عثمان نے اہانت آمیز برتاؤ کیا جس سے ایک عام نفرت پھیل گئی، اور ہر طرف بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔ اسی زمانے میں آپ نے محمد بن ابی بکر کو شام کا گورنر مقرر کیا لیکن مروان بن ابی حنفیہ خط عبداللہ ابن ابی سرح کو لکھ دیا کہ محمد کو پہنچتے ہی قتل کر دینا۔ یہ

خط راستے میں محمد بن ابی بکر کے ساتھیوں نے پکڑ لیا اور واپس آکر دار الخلافہ کا محاصرہ کر لیا۔
بغداد کی آگ پہلے ہی پھیل چکی تھی۔ مدینے کے لوگ بھی آکر محمد بن ابی بکر
کے شہریک ہو گئے۔

حضرت علیؓ کو اطلاع ہوئی تو آپؓ نے جنہیں کو بھیجا اور رسولؐ کے نواسے دروازے
پر آکر کھڑے ہو گئے کہ کسی کو اندر جانے نہ دیں مگر لوگ عقب سے سیڑھیاں لٹکا کر
چڑھ گئے اور حضرت عثمانؓ کی ڈاڑھی نوچی، مگر ان کے گڑ گڑانے پر چھوڑ دیا۔
پھر دوسرے لوگ گئے۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا۔ ان کی بیوی نائلہؓ
نے بچانے کی کوشش کی تو تلوار ماری، جس سے نائلہ کی انگلیاں کٹ گئیں۔
مورخین قاتلوں کے نام یقین سے نہ لکھ سکے، لیکن ان میں کنہ بن بشر، عمرو بن الحمق
اور طلحہ بھی شامل تھے۔

تین روز تک ان لوگوں کا مدینے پر قبضہ رہا۔ حضرت عثمانؓ کی لاش کوٹے
کرکٹ میں پڑی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ جانور ان کی ایک ٹانگ کھا گئے تھے۔
پھر حضرت علیؓ کی مداخلت سے یہ لاقانونیت ختم ہوئی اور حضرت عثمانؓ کو قبر
میں آسکی۔

۸۰۳ھ کو ۱۲ سال کی خلافت کے بعد اس دور کا خاتمہ ہو گیا۔
ستر سال کی عمر میں آپؓ تحت خلافت پر بیٹھے، بیاسی سال کی عمر میں انتقال ہوا۔
حضرت علیؓ نے بار بار حضرت عثمانؓ کی بداعتدالیوں پر نکتہ چینی کی تھی لیکن
اس قتل میں ان کا ہاتھ نہ تھا۔ ایسا ہی کرنا ہوتا تو پیغمبرؐ کی تجویز تکفین کے بعد کس نے
آپؓ کی شمشیر کو باہر نکلنے سے روکا تھا مگر آپؓ حصول اقتدار کے لئے گشتِ دخون
کو پسند نہ کرتے، لہذا ان کے حقوق غضب کئے گئے۔ ساتھیوں اور بہی خواہوں کو
تہ تیغ کیا گیا، ذیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر آپؓ نے اُت نہیں کی
ایک کمزور خلیفہ کے قتل کی سازش میں بھلا کیا شریک ہوتے لیکن آنحضرتؐ کے
حینِ حیات مدینے میں جو شرطیں بساطِ سیاست بچھائی گئی تھی اس کے کھلاڑی ایک

دوسرے کی جگہ لیتے رہے تھے۔ ان کھلاڑیوں نے علیؑ کو معاف نہیں کیا اور فوراً آپ کا نام لے لیا۔

حضرت عثمان اگرچہ ایک کامیاب حکمران ثابت نہیں ہوئے مگر ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں اور کمزوریاں بھی، جن میں سے بعض کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے۔ ”حضرت عمرؓ خدا کی خاطر اپنے اقرباء کو اپنے اقرباء کو مکرے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقرباء کو دیتا ہوں۔“ ابوبکر و عمرؓ بیت المال کے معاملے میں اس بات کو پسند کرتے تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقرباء کو بھی اسی حال میں رہنے دیں مگر میں اس میں صلہ رحمی کرنا پسند کرتا ہوں۔“ (۶۷)

اس کا نتیجہ مولانا مودودی کے بقول یہ نکلا کہ ”ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے بلکہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سُلگ اٹھیں جن کا شعلہ خلافت راشدہ کے نظام ہی کو پھونک کر رہا۔“ (۶۸)

امپراط آف اسلام ۳۶ء پر بھی اس قسم کی ایک رائے ملتی ہے۔ ”پہلے دو خلفائے راشدین نے ان کی حب جاہ کو حدود کے اندر محدود رکھا تھا اور ان کی ریشہ دوانیوں اور مکارانہ سازشوں کو سراٹھانے کا موقع نہ دیا تھا۔ حضرت عثمان کے مندر نشین ہوتے ہی وہ سب کے سب مدینے میں آکر جمع ہو گئے۔ ان کا خلیفہ بننا تھا کہ نفرت کا وہ آتش نشاں پھٹ پڑا اور ہوس رانی اور مستح پرستی کا وہ فاسد مادہ بہہ نکلا جس نے اسلامی دنیا کا سینہ دہلا دیا اور اس کے بہترین اور اشرف ترین نفوس کو لقمہ اجل بنایا۔“

خلافت چہارم

حضرت عثمان نے خلافت کیلئے کسی کو نامزد نہ کیا تھا اور نہ کوئی انتخابی مجلس بنائی تھی لہذا خود مسلمانوں کو اس کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس وقت مدینہ اور فلاح مدینہ کی صورت وہ نہیں تھی جس میں آلِ فاطمہ کو راس لیتا و شہداء ہوتا۔ حضرت عثمان کی بدعنوانیوں نے پچھلے ماحول کو بددل دیا تھا لیکن حصول

اقتدار کے لئے داؤں پیچ کرنے والے ابھی موجود تھے۔

بصرے کے لوگ طلحہ کے حق میں تھے اور کوفہ والے زبیر کے حامی، مگر اہل مدینہ ان دونوں کو خون عثمان سے بے تعلق نہ سمجھتے، اس لئے علیؑ کے نام کا آواز بلند ہو گیا۔ حضرت علیؑ اپنے کو اس جھنجھٹ میں ڈالنا پسند نہ کرتے لیکن امام برحق کی حیثیت سے جب بالاتفاق ہدایت خواہی کا مطالبہ ہوا تو آپ انکار نہ کر سکے اور ذی الحجہ ۳۵ھ کی آخری تاریخوں میں آپ نے مسلمانوں کی دنیادی قیادت کی باگ ڈور سنبھالی، جس کو عرف عام میں چوتھی خلافت کہا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام کو گزرے ہوئے چوبیس سال ہو چکے تھے۔ آپ نے قوم کو جو راج دیا تھا، وہ اگرچہ پوری طرح قبول نہیں کیا گیا تھا پھر بھی اس نے عربوں کی قدیم فطرت کو کسی حد تک دبایا تھا اور اکثریت حق شناسی کی طرف مائل تھی۔ خلافت کے تین امداد میں اگرچہ نام اسلام ہی کا لیا گیا تھا لیکن ذاتی مصلحتوں نے دھنی بڑائیوں کے ذریعہ اسلام کی صورت بگاڑ دی تھی تاہم ابھی یہ صورت پہچانی جاسکتی تھی اور مسلمانوں کو دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ یہ ہادی عرب کے پیرو ہیں۔

ان حالات میں علیؑ اصلی قرآن و سنت لے کر اُڑ رہے تھے جس کی قبولیت کا اللہ حافظ تھا مگر علیؑ کرتے بھی کیا؟ وہ تو پیدا ہی اسی کے لئے ہوئے تھے، اسی لئے آپ نے بسم اللہ کہہ کر اس حیثیت سے بھی اپنے منصب کا آغاز کر دیا۔

حضرت علیؑ کے حریفوں کا پہلا گروہ بدلی ہوئی شکلوں میں اسی طرح موجود تھا۔ اس کے برعکس خود علیؑ کے حق پرست ساتھی کم ہو گئے تھے نئی نسل میں کچھ مقلدین سامنے آئے تھے۔ پھر بھی وہ سُلطان، ابو ذر اور مقداد کا بدل تو نہ ہو سکتے تھے۔

مسلمان فارسی کا نام روزیہ تھا۔ آپ حضرت عیسیٰؑ کے آخری وصی تھے، دس بار غلام بنا کر بیچے گئے۔ آخر میں آنحضرت نے خرید کر آزاد کر دیا۔ سُلطان کا ریحہ

حضور کی نگاہ میں اتنا بلند تھا کہ انہیں اپنے اہل بیت میں شمار کرتے تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے انتخاب کے بعد بارہ آدمیوں نے طے کیا کہ حضرت ابوبکر کو بھری مجلس میں ممبر سے آتالیں۔ ان میں چھ مہاجر مقداد بن اسود، ابوذر غفاری، سلمان فارسی، برید اسلمی، خالد بن سعید، عمار یا سر اور چھ انصار، عثمان بن حنیف، سہل بن حنیف، خزیمہ بن ثابت، ابی بن کعب اور ابوالویب انصاری شامل تھے جب یہ لوگ حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:-

”اگر تم ایسا کرو گے تو یہ لوگ تمہیں بکف میرے پاس آئیں گے کہ ابوبکر کی بیعت کرو اور ویسا ہی جواب انہیں دینا پڑے گا، حالانکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ اُمت میرے بعد عہد و پیمان توڑ دے گی، تم سے غداری کرے گی۔“ اس وقت تم ناصر و مددگار پانا تو جنگ کرنا ورنہ میرے پاس آنے تک صبر کرنا۔“

مجلس المؤمنین میں ابان بن تغلب کی یہ روایت اس دور کی صورت حال پیش کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کس طرح پہلے ہی سے انتخاب خلافت کی زمین ہموار کر لی گئی تھی ورنہ عام مسلمانوں کے اہل بیت رسول سے منحرف ہو جانے کی کوئی وجہ تو معلوم نہیں ہوتی جب کہ علیؑ ہر اعتبار سے افضل تھے۔ اسی روایت سے وہ چھو بھی کھل جاتا ہے کہ سب نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ علیؑ ادران کے کسی پیرونے کبھی بیعت نہیں کی مسلمان ہونے کے رشتے سے خود حضرت علیؑ ہی کی طرح تعاون کیا اور جب وقت پڑا تو مسلم مفاد کی خاطر اڑے آئے۔ حضرت سلمان فارسی کا بھی زندہ گی بھری یہی دلیہ رہا۔

خلافت کی طرف سے انہیں ایذا بھی پہنچائی گئی، اس قدر مارا گیا کہ گردن ٹیڑھی ہو گئی مگر سلمانؑ محبت علیؑ میں ثابت قدم رہے۔ ۳۳ھ میں آپ نے مدائن میں قاتل پائی اور امیر المؤمنین نے مدینے سے جا کر تہبیر و تکفین کی۔

حضور کے جلیل القدر صحابہ میں ایک عظیم نام مقداد کا ہے۔ آپ عمرو بن عبیدہ

حضرمی کے بیٹے تھے جو اپنے قبیلے سے بھاگ کر آگئے تھے۔ یہاں اسود بن یثوث زہری نے انہیں پناہ دی اور بیٹا بنالیا۔ اسی نسبت سے مقداد بن اسود کہے جاتے تھے آپ کو حضور کا اتنا تقرب حاصل تھا کہ ایک روز آپ نے فرمایا:-

خدا نے مجھے چار آدمیوں کی محبت کا حکم دیا ہے۔ علیؑ، مقدادؓ، سلمانؓ اور ابوذرؓ۔ مقداد کا شمار اُن سات آدمیوں میں ہے، جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ آپ حضرت علیؑ کے فدائی تھے۔ سوائے علیؑ کے کسی خلیفہ کی بیعت نہیں کی۔ اُس پر آشوب دور میں بھی اہل بیت کی مدد و خاوی کرتے رہے۔ انتخاب کے بعد چار ہزار کا ایک لشکر مسجد نبوی میں جمع ہوا تھا، اُس نے ڈر نے دھمکانے کے لئے بنی ہاشم کے ساتھ حیمان آل رسول میں مقداد کا نام بھی لیا تھا۔ آپ نے سترہ سالوں میں وفات پائی۔

خالد بن سعید

پورا نام ابو سعید خالد بن سعید بن عاص بن امیہ تھا۔ مجالس المؤمنین کی روایت ہے کہ آپ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے لئے جا رہے تھے کہ راہ میں حضرت ابوبکر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ آپ نے خواب بیان کیا۔ حضرت ابوبکر بھی ساتھ ہو لئے اور دونوں ایک ساتھ حضور کی خدمت میں پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

دور رسالت میں حضرت خالد صدقات یمن کے والی تھے۔ ابان بن سعید والی بحرین، دوسرے بھائی عمرو بن سعید سمار خبیرہ وغیرہ کے حاکم تھے۔ انتخاب سقیفہ کے بعد تینوں بھائی استغنیٰ دے کر واپس چلے آئے۔ دور خلافت میں ان لوگوں نے کئی بار علیؑ کے حق میں سخت احتجاج کیا اور تکلیفیں سہیں۔ حضرت علیؑ میں بمقام مرہبہ حضرت خالد کو قتل کیا گیا۔

ابی بن کعب

پورا اسم گرامی ابی بن کعب بن قیس خزرجی انصاری تھا۔ بڑے جلیل القدر صحابی عظیم المرتبت مجاہد، فقیہ، تادی قرآن اور کا تیب دجی تھے۔ عمر بھر اولاد رسول کے

حق کے لئے جہاد باللسان کرتے رہے، اتنے جری اور بہادر تھے کہ سر عام سقیضہ کی سازش کو اچھالتے تھے۔ سخت سے سخت ایذا سہی، دُرے کھاتے مگر حق گوئی سے باز نہیں آئے اور بیعت نہیں کی۔ ۱۵ھ میں وفات پائی۔

بلال بن رباح حبشی

مشہور ہے کہ بلال کو ان کے ظالم و کافر آقا سے حضرت ابوبکر نے خرید کر آزاد کیا تھا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر کی مالی حالت اُن دنوں ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ کوئی غلام خرید سکتے، وہ اس کے محرک ضرور ہوئے تھے لیکن حضرت بلالؓ کو خرید تھا، حضرت عباس ابن عبدالمطلب نے اور خرید کر حضرت ابوبکر کو دے دیا تھا۔ (۶۹)

حضرت بلال لا بنی، دُبے پتلے اور کمزور انسان تھے۔ آپ کا رنگ بہت کالا نہیں تھا بلکہ گندمی تھا، حضرت علیؓ کے تربیت یافتہ تھے اور اسلام کے پہلے موزن تھے انتخابِ خلافت کے بعد مدینہ چھوڑ کر چلے گئے تھے مگر اہل بیت رسولؐ کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے۔ جنابِ فاطمہؓ نے وفات کے دن آپ سے ظہرِ یاعصر کی اذان دینے کو کہا تھا۔ جیسے ہی آپ کی زبان سے اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ نکلا، شہزادی رحلت فرما گئی تھیں۔

چونکہ آپ نے بیعت سے صاف انکار کر دیا تھا لہذا عموماً مدینے کے باہر ہی رہا کرتے، جب آتے تو خدمتِ امیر المؤمنین کے علاوہ کہیں نہ جاتے۔ ۱۵ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ ان سب پر یہ آفتیں صرف اس لئے ٹوٹیں کہ انہوں نے خلافت کے ناجائز انتخاب پر مہرِ تصدیق ثبت نہیں کی۔ رسولؐ نے انہیں سدا یمان عطا کی تھی۔ انہوں نے ایمان کی لاج رکھی۔ کوئی جلا وطن کیا گیا، کسی نے تشدد سے بچنے کے لئے خود جلا وطنی اختیار کی۔ ریزہ، دمشق اور مختلف مقامات پر مر گئے، مگر حمیر کا سودا نہیں کیا۔ ان کی نظیریں آج بھی منزلِ صداقت میں چسپاںِ راہ ہیں۔

اسی طرح کے کچھ لوگ اور بھی تھے جو موت کی آغوش میں سوچکے تھے۔ زندہ

لوگوں میں جس کسی نے خلافتِ امیر کی خبر سنی، وہ یا تو خود حاضر خدمت ہو گیا یا اس نے کسی ذریعہ سے رابطہ قائم کیا۔

بیعت کرنے والوں میں سارا مدینہ تھا اور اطراف و جوانب کے لوگ بھی آگئے صرف ایک جماعت کنارہ کش رہی جس میں سعد بن ابی قاص، عبداللہ ابن عمر، سعید ابن زید، زید ابن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری شامل تھے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ، پیغمبر اسلام کے شاگردِ رشید تھے لہذا پہلے ہی مرحلے میں آپ نے تقسیم اموال کے اس دستور کو منسوخ کر دیا جس کی نمایاں خصوصیت شکی امتیاز تھا۔ حضرت عمرؓ نے جس کو مرتب کیا تھا اور جو مسادات محمدی کے خلاف تھا۔

اگلے دن جب لوگ اپنے حقے لینے آئے تو چھوٹے بڑے کے فرق کے بغیر ہر ایک کو برابر کا حصہ دیا گیا لیکن علیؑ عدل کی مسند پر ظلم کو رد کر کھٹنے والے نہ تھے۔ انہوں نے اپنی روش میں کسی تبدیلی سے انکار کر دیا۔ انجام کار پہلے ہی دن سے ایک مخالف گروہ پیدا ہو گیا اور ظلم و زیرِ عثمانی گروہ سے جا ملے۔

دومرا اقدام حضرت علیؑ نے یہ فرمایا کہ عہدِ عثمانی کے تمام نااہل اور ظالم عمال کو برطرف کر دیا اور ان کی جگہ نئے عامل مقرر کئے۔ سہل ابن حنیف کو معاویہ بن ابی سفیان کے بجائے شام کا عامل بنایا مگر انہیں شام کے ایک دستہ فوج نے راستے ہی سے واپس کر دیا اور سہل نے بغیر اجازت امیرِ خوزیری نہیں کی۔

حضرت معاویہ حاکمِ شام

حضرت معاویہ اب دمشق میں خلافتِ مدینہ کے عامل نہ رہے تھے بلکہ عملی طور پر بادشاہ بن چکے تھے۔ ماضی کی تاریخ کا ایک جائزہ لیا جائے تو قبل اسلام ہی سے بنی امیہ کا شام سے تجارتی رابطہ تھا اور لوگ ابوسفیان سے واقف تھے۔ شام جب مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو پہلا گورنر یزید بن ابوسفیان اور معاویہ بن ابوسفیان کو بنایا گیا۔ بالفاظِ دیگر شام کو اسلام سے معرفت بنی امیہ کے ذریعہ ہوئی اب اگر ابوسفیان کے اسلام کی حدیں متعین کی جائیں تو اس کے خال و خد اس اسلام سے

مختلف میں گئے، حضرت محمد مصطفیٰؐ نے جس کی رونمائی کی تھی۔

اگر کوئی ابوسفیان کے اسلام کو صحیح مانتا ہے تو خدا مبارک کرے۔ ہم نے تو شروع ہی سے اس کو اصول اسلام اور رسوم جاہلیت کا آمیزہ پایا بلکہ ہمیں تو ہمیشہ دین کے خول میں بے دینی کا مرکب نظر آتا رہا۔

کوئی رضی اللہ عنہ کہے یا رحمۃ اللہ علیہ لیکن ابوسفیان تھا وہی جو حضورؐ کی نبوت کو بادشاہت سمجھتا تھا اور جس نے علیؑ کو مقابلے کے لئے سواروں اور پیادوں کی پیش کش کی تھی اور جب اس سازش میں ناکامی ہوئی تو اُدھر چلا گیا جہاں اس کی پذیرائی کی گئی اور جہاں سے اس نے شام کو اپنی نسل حکومت کے لئے حاصل کر لیا۔ مسلمانوں کی تاریخ پر مقصدی روایات کی اتنی دھند پڑ چکی ہے کہ تاریخ کے اصلی نقوش دکھائی دینا مشکل ہے لیکن من پسند کرداروں کو منطقی دلائل اور تاویلوں سے اجاگر نہ کیا جائے تو غیر جانبدار آنکھ کچھ نہ کچھ دیکھ ضرور دے سکتی ہے اور کوئی عقل کی روشنی استعمال کرے تو اسلام کا نقاب چہرے پر پڑے ہونے کے باوجود اصل صورت نظر آنا ناممکن نہ ہوگا۔ ابوسفیان چڑھتے ہوئے سورج کا چُبھاری تھا۔ اس کو سرداری کا منصب درکار تھا۔ کافر بن کر ملتا یا مسلمان بن کر اور جب مسلمان بن کر سرداری کے بجائے حکومت بلکہ بادشاہت مل گئی تھی تو مسلمان کیوں نہ بنارہتا۔ حضرت معاویہ اسی کے بیٹے تھے انہیں کوئی دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا مگر خالص مسلمان ہرگز نہیں تھے بلکہ اموی مسلمان تھے۔ ہاشمی مسلمانوں کے اذلی دشمن۔ انہوں نے ہاشمی پیغمبرؐ کو بُرا نہیں کہا تو یہ کسیران کے باپ اور بیٹے نے پوری کر دی۔ ایستہ انہوں نے ایک ذاب ضرور حاصل کیا کہ علیؑ، اولاد علیؑ اور حجتان علیؑ پر تبرک کرنے کی رسم شروع کر دی اور جہاں علیؑ دوستی کا گمان بھی ہو گیا دلوں اتنے منظم ڈھائے کہ تاریخ کے بھی آنسو نکل پڑے۔

”اُم المؤمنین اُم سلمہؓ نے آنحضرتؐ کا ایک قول بیان فرمایا ہے کہ جو شخص علیؑ کو بُرا کہے وہ جہنمی ہے“ اس کے بعد علیؑ پر تبرک کرنے

دلوں کا اسلامی تشخص کسی دلیل کا محتاج نہیں رہتا۔ سوال الہدایہ النہایہ

(۶۲)

_____ اور یوں بھی دونوں میں کسی لحاظ سے کوئی مطابقت پائی نہیں جاتی۔ بنیادی تضاد تھا علیؑ اور معاویہ میں۔ علیؑ کو حق پہنچتا تھا خلافت کا، رسولؐ کے رشتے سے بھی اور اپنی افضلیت کی بنا پر بھی۔ انصار و جہا بجرین کی ایک بڑی تعداد آپؐ کے اشارے کی منتظر تھی اور آپؐ کی تلوار کا لوہا سارا عرب مان چکا تھا مگر مسلمانوں کو خیزری سے بچانے کے لئے آپؐ نے تلوار نہیں اٹھائی جب کہ اس کا جواز بھی موجود تھا کہ سیفہ میں بنی ہاشم کی نمائندگی نہیں تھی۔ برخلاف اس کے معاویہ کو کسی طرح استحقاق ہی نہ تھا۔ علم و فضل، نجابت و شرافت، عدالت و شجاعت ہر اعتبار سے علیؑ کے سامنے بے قیمت تھے، پھر کل تک ایک صوبے کے عامل ہے تھے آج انہوں نے خلیفہ وقت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

کوئی انہیں صحابیؓ رسولؐ کہتا ہے اور کوئی کاتبِ وحی۔ صحابیؓ تو ابنِ اُبی بھی تھا اور رہ گئی کاتبِ وحی ہونے کی بات تو کون سی آیت ان سے لکھوائی گئی کچھ خطوط ضرور ان سے لکھوائے گئے تھے تو اتنا شرف مل گیا کہ ظلم کے پہاڑ بھی ڈھائیں تو خطائے اجتہادی۔ خدا کے لئے موت کو یاد کریں اگر خدا پر ایمان ہے تو یہ ہٹ دھرمی اور ستم پروری آخرت میں بہت مہنگی پڑے گی۔

حضرت معاویہ کا یہ مختصر سا تعارف اُس حریف کا تعارف ہے جس کا سالہ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ کو کرنا پڑا اور جس نے پہلی ہی منزل پر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ دوسرے عامل بھی معاویہ سے زیادہ مختلف ثابت نہیں ہوئے مگر انہوں نے بغاوت نہیں کی کیونکہ ان کے پاس فوجی طاقت نہیں تھی۔ لیلیٰ بن اُمیہ نے یمن اور عبداللہ بن عامر نے بصرہ چھوڑ دیا اور خزائن اپنے ساتھ لے گئے۔

جنگِ جمل

حضرت عائشہؓ ان دنوں حج کے لئے مکے گئی ہوئی تھیں۔ واپسی پر راہ میں قبل

عثمان کی خبر ملی تو اس امید پر آگے بڑھتی رہی کہ خلافت طلحہ کو ملی ہوگی اور شاید اسی امید پر طلحہ نے قتل عثمان میں شرکت بھی کی تھی مگر حضرت عائشہ کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ علیؓ خلیفہ ہو گئے۔ بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا: "کاش یہ خبر سننے سے پہلے میں مر گئی ہوتی"۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "خدا کرے کہ آسمان زمین پر پھٹ پڑے اور میں اس میں سما جاؤں؟"

حضرت عائشہ اسی مقام سے پلٹ پڑیں۔ اس دوران طلحہ وزیر بھی ان سے ملے۔ عبدالبنی ام کلاب نے کسی انتقامی ارادے سے باز رکھنے کے لئے کہا۔ "مادر گرامی! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ عثمان کافر ہو گئے ہیں۔ انہیں مار ڈالو آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ ہمارے نزدیک تو عثمان کا قاتل وہ ہے جس نے حکم دیا۔"

پھر عبدالبنی ام کلاب نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "اب لوگوں نے اس عظیم المرتبت کی بیعت کر لی ہے جو ہر گرامی کو دُور کر دے گا اور ہر کجی کو سیدھا کر دے گا۔" دفاکیش بد عہدوں اور غداروں جیسا نہیں ہوتا۔

حضرت عائشہ نے جواب دیا۔

"عثمان کو قتل کرنے کی بات صرف میری نہیں تھی دوسرے لوگ بھی ایسا ہی

کہتے تھے۔" مگر اب جو میں کہہ رہی ہوں وہ قطعی ہے۔" (۷۰)

طلحہ وزیر ایک منصوبہ بنا کر آئے تھے۔ انہوں نے قتل عثمان کا الزام علیؓ پر لگا دیا اور جناب عائشہ کو انتقام لینے پر آمادہ کر لیا۔

علیؓ کے عدل اور حق پرستی نے ایک تعداد کو ابتداء ہی میں علیؓ سے برہم کر دیا تھا۔ اُدھر یمن اور بصرے کے خزانے کا ایک حصہ حضرت عائشہ کو مل گیا تھا۔ رہی سہی کسر معاویہ نے پوری کر دی اور مسلمان خونِ عثمان کے نام پر عائشہ کے پرچم تلے جمع ہونے لگے۔

کے کی مرکزیت تے طلحہ وزیر کو پروپگنڈے کے مواقع فراہم کر دیے اور جلیان سیفہ کی ادلا د حضرت عثمان کا خون بھرا کُرتہ اور نالہ کی کٹی ہوئی انگلیاں لے کر پھرے کی طرف چل پڑی۔ دو ہزار کالاش کو صفر ۳۷ھ میں روانہ ہوا پھر اس میں بتدیج اضافہ ہوتا رہا۔

آنحضرتؐ نے کئی بار جناب عائشہؓ کو اشارہ سمجھایا تھا: ”ایک عورت اونٹ پر سوار ہو کر جنگ کے لئے نکلے گی؟“

پھر کھلے لفظوں میں کہا تھا: ”حوآب کے کتے تم پر بھونکیں تو پلٹ جانا۔“ چلتے چلتے جب اُم المؤمنین چشمہ حوآب پر پہنچیں تو کُتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں۔ آپؐ کو حدیث رسولؐ یاد آگئی مگر طلحہ وزیر نے کہہ دیا کہ یہ حوآب نہیں ہے آخر حضرت عائشہؓ بڑھتی رہیں۔

مورخین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ حضرت عائشہ حوآب سے واپس ہو رہی تھیں مگر چالیس آدمیوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ یہ حوآب نہیں ہے قسم کھانے والوں کے سردار تھے، حضرت زبیر اور حضرت طلحہ، جن کا شمار شروع ہی سے امیدوارانِ خلافت میں ہوتا تھا اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت انہیں خلیفہ بنا پر مقرر تھی۔

خود حضرت عائشہؓ کا بھی یہی خیال تھا کہ حضرت عثمان کے بعد طلحہ یا زبیر مندر نشین خلافت ہوں گے مگر ان کے بجائے علیؓ کا نام کان میں بڑا تو وہ میدان میں اتر آئیں۔۔۔ حالانکہ یہی وہ لوگ، میں جنہوں نے کلام اللہؐ ہاتھ میں لے کر جھوٹی قسمیں کھائیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ وہ گھر میں ہوتے یا باہر بوریتے کے فرش پر ہوتے یا تحتِ خلافت پر، اپنے مقصد کے لئے جھوٹی قسم کھا لیتا ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا۔ اس کے بعد یہ کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا کہ خلافت حاصل کرنے کے لئے کوئی جھوٹ نہیں بولا گیا۔ کوئی غیر جانبدار انصاف کی فریاد سننے پر تیار ہو تو حقیقت اب بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔

امیر المومنین حضرت معاویہ سے لڑائی کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ حضرت عائشہ کے میدان میں آجانے کی خبر ملی۔ آپ دقتی طور پر پریشان ہو گئے۔ حضرت عائشہ کے دل میں آپ کی طرف سے بوعداوت تھی، اس کا تجربہ بار بار کر چکے تھے مگر یہ خیال بھی نہ تھا کہ حرم رسول کی نمائندہ عورت جنگ میں جرنیلی کے فرائض انجام دے گی اس لئے بصرے کے قریب پہنچ کر حضرت علیؑ نے لشکر کو روکا اور صلح کی ہر ممکن کوشش کی مگر طلحہ و زبیر نے آپ کی چلنے نہ دی اور آخر فوجیں ایک دوسرے کے مقابل اٹھ رہی۔ علیؑ نے مسلمانوں کے خلاف تلوار نہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا مگر اب دین اسلام خطرے میں تھا اس لئے خیبر و خندق میں چلنے والی تلوار ایک مرتبہ نیام سے باہر آگئی صبح ہوتے ہی دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں تو امیر المومنین تہمتے دشمن کے پردوں میں گھس گئے اور زبیر و طلحہ کو رسول کی حدیثیں یاد دلانے لگے۔ زبیر نے وعدہ کیا کہ وہ نہ لڑیں گے مگر طلحہ ٹپس سے مس نہ ہوئے۔ ان کے سر پر خلیفہ بننے کا بھوت سوار تھا۔ علیؑ کے واپس آتے ہی فوج مخالف سے تیر رہنے لگے اور کئی آدمی شہید ہو گئے مگر آپ نے جوابی کارروائی کرنے نہ دی

دوسری صبح کو امیر المومنین نے مسلم نامی مرد مجاہد کو قرآن سر پر لے کر میدان میں بھیجا۔ طلحہ نے پہلے ہی داریں اس کے دونوں ہاتھ قلم کر دیئے، دوسرا وار اس کے سینے پر کیا اور وہ مع قرآن کے زمین پر آرا۔ اب امیر المومنین نے اپنے بیٹے محمد حنفیہ کو حملے کا حکم دیا۔ محمد آندھی کی طرح اُسٹے اور طوفان کی طرح دشمنوں پر چھا گئے۔

زبیر میدان سے ہٹ چکے تھے۔ مروان ایک مدت سے طلحہ کی گھات میں تھا اس نے اپنے غلام کی آڑ لے کر زہر میں سبھا ہوا تیر طلحہ پر مارا تو وہ ختم ہو گئے، دوسرے ڈھلتے ڈھلتے لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ امیر المومنین نے بلند آوازیں سب کو پناہ دی پھر محمد بن ابی بکر کو عائشہؓ کی خبر گیری کو بھیجا وہ بہن کی ہودج کو عزت و احترام کے ساتھ ایک طرف لے گئے۔

حضرت عائشہؓ بہت شرمندہ تھیں۔ کہتی تھیں کہ کاش ایسا قدم اٹھانے سے قبل

انہیں موت آگئی ہوتی۔

جنگ میں حضرت عائشہ کے ۱۶۷۹۲ آدمی مارے گئے۔ حضرت علیؑ کے صرف ۱۰۷۰ انصار شہید ہوئے۔ زیر ایک طرف کو نکل گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی ان کا ذاتی دشمن تھا، جس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر قتل کر دیا۔ حضرت علیؑ کے کئی فداکار اور رفیق بھی قتل ہوئے۔ جن میں شمامہ ابن مثنیٰ، ہندابن عمر، غنیہ بن ہشیم، سبحان بن سوہان اور زید بن محمد درج بھی شامل تھے۔

جنگ جمل کے بعد حضرت علیؑ نے مدینے کے بجائے کوفے کو دار الخلافہ بنالیا کیونکہ یہ جگہ بچوں بیچ میں تھی اور یہاں سے مملکت کی دیکھ بھال متبادلہ بہتر طریقے سے ہو سکتی تھی۔

جنگ میں

حضرت علیؑ کے جنگ جمل میں اُلجھ جانے سے حضرت معاویہ کو تیاری کا بہت موقع مل گیا۔ یہ جنگ بلاشبہ طلحہ اور زبیر کی سازش سے ہوئی تھی لیکن معاویہ نے بھی اس میں کردار ادا کیا تھا۔ اس کے دو مقصد تھے ایک یہ کہ خلافت کی فوجی طاقت کچھ کمزور پڑ جائے گی اور ہر دو صورت میں فائدہ معاویہ کا ہوگا اگر اتفاق سے حضرت عائشہ کا میاب ہو گیس تو معاویہ فوراً اپنی پوری طاقت سے پہنچ جائیں گے اور خلافت پر قبضہ کر لیں گے۔ بصورت دیگر حضرت علیؑ تھکی ہاری فوج ان کے مقابلے میں لاسکے گئے اور پھر جنگ کے نتیجے میں ایک نئے حلقے کے دل میں علیؑ کی کدورت بڑھ جائے گی۔ حضرت علیؑ اس سے واقف تھے مگر جنگ سر پر مقبوض دی گئی تھی تو ان کو لڑنا ہی پڑی اور کوفے پہنچ کر آپ نے بڑی تیزی کے ساتھ عمال کا تقریب کرنا شروع کر دیا۔

سہل بن حنیف کو مدینہ، قیس بن سعد کو مصر، عبداللہ ابن عباس کو بصرہ، شعث بن قیس کو آذربائیجان، یزید بن قیس کو مدائن، عمر بن ابی سلمہ کو بحرین، مصقلہ بن ہبیرہ کو اردشیر خرو، منذر ابن جارد کو اصفہان، زیاد بن ابیہ کو فارس، قدامہ بن عجلان کو

کسکر، عدی بن حاتم کو بہرہ سیر، ربیع بن کاس کو سیستان، خلید بن کاس کو خراسان
اشتر نخعی کو موصل سے شام تک کا حاکم بنایا۔ اشتر سے معاویہ کے عاملوں کے کئی
مقابلے ہوئے مگر اشتر نے کسی کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔

اس دوران معاویہ اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے۔ حضرت علیؑ نے ان حالات
میں بھی آداب اسلام کو ملحوظ رکھا اور معاویہ کو خط لکھا تاکہ مسلمانوں کا خون نہ بہے۔ انہوں
نے عثمان کے قاتلوں کو تلاش کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ معاویہ نے اس کا امید افزا
جواب نہ دیا بلکہ شام میں حضرت علیؑ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ حضرت
علیؑ نے پھر خط لکھا مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چار و ناچار امیر المؤمنین کو
مقابلے کے لئے نکلنا پڑا۔ ابو مسعود انصاری کو آپؑ نے کونے میں اپنا قائم مقام
بنایا اور شوال ۳۵ھ میں اسی ہزار فوج کے ساتھ شام کی طرف پیش قدمی کی۔

معاویہ کو اس لشکر کی روانگی کا پتہ چلا تو وہ بھی دمشق سے روانہ ہو کر صفین
پہنچ گئے اور نہر فرات پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ اسلام کا لشکر بھی مقابلے میں آکر خیمہ
زن ہوا تو پانی کا سوال پیدا ہوا اور مجبوراً حضرت علیؑ نے مزد شربانی لانے کا حکم دیا۔
چنانچہ ”عراقی فوج کا ایک دستہ چشمے پر پہنچا۔ ابوالاعور نے

روکنا چاہا، دونوں میں مقابلہ ہوا، عراقی دستے نے شکست دے کر

چشمے پر قبضہ کر لیا، لیکن حضرت علیؑ نے شامیوں کا پانی بند نہیں کیا۔

بلکہ اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ پانی لے کر لوٹ آئیں۔“ (۷۱)

اس عرصے میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اور صلح کی بات چیت بھی
لیکن معاویہ کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ اگر کوئی نرم آدمی پیام صلح لے کر جاتا تو اسے
حکومت اور دولت کا لالچ دیا جاتا اور اگر سخت آدمی جاتا تو صاف انکار ہو جاتا
مقابلہ تھا ایک دیندار بلکہ عین دین اور ایک فتنہ پرور مسلمان کا بلکہ اس عیسائی
کا جو اپنے سینے میں زہور چھپائے ہوئے تھا۔ آنحضرتؐ نے منافقین کو بھی مسلمان بنا
تھا۔ اس لئے معاویہ کو بھی مسلمان کہنا پڑے گا حالانکہ حقیقتاً ان کا نہ کوئی مذہب تھا

اور نہ مسلک، دولت ان کا دین اور اقتدار ان کا ایمان تھا۔

”وہ پہلا شخص تھا جو بیٹھ کر وعظ کرتا، پہلا امیر جس نے ذاتی خدمت گاری کے لئے محنت مقرر کئے، پہلا رئیس جو اپنے مصاحبوں سے کھلم کھلا ہنسی ٹھٹھا کرتا، ہوشیار اور کجیوس مگر ضرورت کے وقت بڑا فیاض، بظاہر مذہبی مراسم کا پیکار اپنی حرص و اُذی کی تجاویز کی تکمیل کے وقت کسی شخص یا خدائی حکم کی پرواہ نہ کرنے والا“ (۷۲)

حضرت علیؓ صول اسلام کے یکے تھے اور معاویہ ہر طریقے اور ہر کیفیت پر خلافت کے متنبی۔ وہ تو خن عثمان کی دیت میں تختِ مدینہ چاہتے تھے۔ تخت مل جاتا تو صلح کر لیتے حضرت علیؓ اس طرح دینے والے نہ تھے لہذا انجام جنگ تھا جو ہو کر رہی۔

جنگِ جمل میں بھی حضرت علیؓ نے پہلے ایک نوجوان کو قرآن لے کر بھیجا تھا۔ آج بھی اتمامِ حجت کے لئے وہی کیا نتیجہ جو دہاں نکلا تھا، وہی یہاں بھی نکلا۔ ایک نوجوان درجہ شہادت پر فائز ہو گیا۔ علیؓ نے پورے جاہ و جلال کے ساتھ اپنے گھوڑے کو ایڑ دی اور شکرِ شام پر حلا کر دیا۔ علیؓ کی تلوار بہت دنوں کے بعد چمکی تھی کشتوں کے پستے لگ گئے۔ آپ جس طرف جاتے گیند دل کی طرح سر اُچھل اُچھل کر دوڑ جا گرتے۔ اس طرح شام ہو گئی۔

ایک ہفتے کی جنگ میں شام کی فوج کا ستھراؤ ہو گیا۔ علیؓ کی شجاعت اور حقانیت مسلم لیکن سازش اور فتنائیت میں معاویہ کا جواب نہ تھا۔ انہوں نے اپنے بھائی عتبہ بن ابوسیفان کے ذریعہ اشعث بن قیس اور خالد بن عمر کو توڑ لیا اور دن بھر کی جنگ کے بعد وہ رات آگئی جو لیلۃ الحریر کہی جاتی ہے۔ اس رات شام کی سطوتِ شوکت کا قُل پڑھا جا چکا تھا اور صبح ہوتے علیؓ کا شہرہ آفاق کمانڈر مالکِ اشتر لڑتے لڑتے معاویہ کے خیمے تک پہنچ چکا تھا کہ عمر غاص کے مشورے سے معاویہ نے ایک ہزار قرآن نیزوں پر بلند کرادیئے

یہی قرآن تھا جس کو جنگ کی ابتداء میں علیؓ نے بھیجا تھا مگر اس کی بے حرمتی کی

گئی تھی۔ آج شکست سے بچنے کے لئے ایک منصوبہ بنا کر وہی قرآن بلند کئے جا رہے تھے آگے کئی نيزوں پر ذوق کا بڑا قرآن اور اس کے پیچھے ایک ہزار قرآن۔ آپ کے صاحب ایمان ساتھی اس فریب کو سمجھ رہے تھے مگر معاویہ کے خریدے ہوئے اشعث بن قیس اور خالد بن عمر سامنے آگئے کہ فیصلہ کتاب خدا پر رکھ دیا گیا ہے۔ جنگ روک دی جائے حضرت علی نے سمجھایا کہ فتح قریب ہے یہ لوگ میدان چھوڑنے ہی والے ہیں اس دھوکے میں نہ آؤ مگر کوئی نہ مانا اور میں ہزار آدمیوں نے امیر المؤمنین کو گھیر لیا جن میں ایک تعداد خود شام کے آدمیوں کی تھی۔

یہ بڑا ناکہ وقت تھا۔ حضرت علیؑ کے لئے۔ آپ ان سب کو انجام تک پہنچا سکتے تھے اور شام کے لشکر کو بھی شکست دے دیتے مگر نتیجہ نہ نکلتا کہ خود آپ کی فوج کا ایک حصہ ٹوٹ کر معاویہ کی طرف چلا جاتا جو بعد میں آپ کے مقابل آتا اور قرآن کو درمیان میں لا کر اتا ہی تو ہو رہا تھا کہ معاویہ ایک یقینی شکست سے بچ رہے تھے تو یہ شکست بعد میں بھی دی جاسکتی تھی اور اس کا بھی امکان تھا کہ قرآن کی رو سے جو فیصلہ ہوتا، وہ صحیح ہوتا۔ لہذا آپ خاموش ہو گئے لیکن مالک اشتر معاویہ کی پشت پر آخری ضرب لگانے کیلئے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس لئے غداروں نے حضرت علیؑ پر زور دیا کہ انہیں واپس بلا لیں۔ حضرت علیؑ نے پیغام بھیجا مگر مالک نہیں رُکے۔ آخر معاویہ پر اٹھنے والی تلواروں کا رخ علیؑ کی طرف ہو گیا، لہذا علیؑ نے پھر کبلا بھیجا کہ ان کی جان خطرے میں ہے۔ مجبوراً مالک کو تلوار نیام میں رکھنا پڑی اور وہ دل شکستہ و مایوس پلٹ آئے۔

مالک اشتر کے لئے علیؑ کے پیغام کی وہی صورت تھی جو علیؑ کو ارشاداتِ پیغمبرؐ سے پیش آئی تھی۔ وہاں اقتدار کی خاطر تلوار بے نیام نہ کرنے کا حکم تھا۔ یہاں جیتی ہوئی جنگ ہار جانے کے لئے تلوار نیام میں رکھ لینے کی تاکید اور الفاظ بھی ایسے کہ مجھے اگر زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو پلٹ آؤ۔ یہ الفاظ خالی جا ہی نہ سکے مالک نے جہاد بال نفس کیا اور تلوار روک لی۔

بغیر زرہ کے لڑنے والا سورما کم از کم موت سے ڈرنے والا تو نہ تھا۔ انہوں نے تو ملک کا چلتا ہوا ہاتھ روکنے کے لئے عام الفاظ کا استعمال کیا تھا اور جنگ صرف مسلمانوں کو ایک سبق دینے کے لئے روکی تھی۔ دل ہی دل میں کہا ہوگا:-

”تم نے طائف میں اپنے رسول کا کہنا نہیں مانا، محاصرہ اٹھانے کے بجائے جنگ کی اور اس کا نتیجہ بھگتا — آج مجھے حیتی ہوئی جنگ روک دینے پر مجبور کر رہے ہو۔ انجام کار سچھٹانا پڑے گا“

طیہ ہوا کہ دو حکم مقرر کئے جائیں وہ فیصد کر دیں۔ معاویہ نے عمر بن العاص کو نامزد کیا۔ غداروں نے اصرار کیا کہ ادھر سے ابو موسیٰ اشعری کو بھیجا جائے۔ حضرت علی عبداللہ ابن عباس یا مالک اشتر کو متعین کرنا چاہتے تھے لیکن اشعث بن قیس اور اس کے ساتھی پھراڑ گئے۔ حضرت علیؑ پھر منہ میں پڑ گئے مگر صورت حال یہ تھی کہ علیؑ اشعث کا کہنا نہ سنے یا اپنی فوج میں باہم تلوار چلواتے۔ بڑی سخت منزل تھی لیکن علیؑ اس سے بڑی آزمائشوں سے گزر چکے تھے لہذا آپؑ نے بڑے ضبط سے کام لے کر ابو موسیٰ اشعری کو نامزد کر دیا۔ بادوی النظر میں ہر آدمی یہ کہہ دے گا کہ قرآن بلند کرتے یا سنگ اسود لے کر آجاتے

کھلا ہوا فریب تھا، علیؑ نے اس کو کیوں مانا اور اپنی مرضی کا حکم مقرر کرنا تو ان کے اختیار کی بات تھی۔ اشعث کون ہوتا تھا حکم چلانے والا لیکن یہ انداز فکر تو ہم قیاداروں کا ہے۔ ایسا ہی ہوتا تو علیؑ رسولؐ کی تدفین کے دوسرے ہی دن بنی ہاشم، مہاجرین اور انصار جران کے ساتھ تھے اور بنی مینس انصار سعد بن عبادہ اور ابو ایوب انصاری بھی شامل تھے، ان سب کو لے کر سقیفہ بنی ساعدہ پر چڑھ دوڑتے، کون تھا جو علیؑ کی تلوار کے سامنے آتا۔ فتح ہو جاتی، اقتدار مل جاتا لیکن فرائض امامت پر حرج آجاتا اور علیؑ کی حیثیت صرف تابع عرب کی بن کر رہ جاتی۔

علیؑ میدان جنگ میں بھی امام ہی تھے ان کے سامنے دین ہی دین تھا۔ آپؑ اشعث کے ضمیر کو جھانک کر دیکھ چکے تھے۔ اس کے ماتھے پر منافقت کی لیکروں کو پڑھ چکے تھے۔ انہیں اسلام کی اشاعت کرنا تھی۔ اس لئے آپؑ نے تمام حجت کے لئے ابو موسیٰ اشعری کو مان لیا۔

سب جانتے ہیں کہ اشعری کیا تھے اور حکیم کا فیصلہ بھی عالم آشکار ہے مگر ہم اس
 مفاد میں نہیں آتے کہ اشعری دھوکہ کھا گئے۔ دھوکہ کسی کو نہیں ہوا۔ معاویہ کا منصوبہ
 بھی یہی تھا کہ اشعری علیؑ اور معاویہ دونوں کو برطرف کریں اور عمر عاص صرف علیؑ کی طرف
 کر کے معاویہ کی خلافت کا اعلان کر دے، اور جنگ ایک تلخی کے ساتھ ختم ہو جائے
 ابو موسیٰ اشعری بظاہر فریب خوردہ چلے گئے لیکن عمر بھر خزانہ دمشق سے وظیفہ لیتے رہے۔
 عہد نامہ ہو جانے پر لوگ پچھتائے کہ وہ سیاسی چوٹ کھا گئے مگر اب جنگ پر ان
 کا اصرار بے کار تھا۔ علیؑ حکم بنانے کے بعد دوبارہ جنگ نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ وقت کا
 مورخ دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھ دیتا کہ حکیم نے علیؑ کے خلاف فیصلہ دیا لہذا انہوں
 نے نہیں مانا۔۔۔۔۔ انبیاء و مرسلین کو ہمیشہ ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا
 پڑا ہے اور ایسے ہی لمحات میں ان کی آزمائش ہوئی ہے۔

خلیفہ وقت کے خلاف معاویہ کی بغاوت کو خطائے اجتہاد کی کانام دیا جاتا
 ہے۔ کہاں معاویہ اور کہاں اجتہاد! کتنے دن انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں گزارے
 تھے اور دین سے ان کی کتنی واقفیت تھی جو اجتہاد کے اہل قرار دیئے جاتے۔ مجتہد
 تو ان کے پیش رو ابو بکر و عمر بھی نہیں تھے، البتہ بعض اور لوگ جو مجتہد کہے
 جاسکتے، ان میں عبداللہ ابن عباس اور ابن مسعود کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ امام فخرالزین
 رازی، امام غزالی وغیرہ۔ ہم اپنے ائمہ کے اسمائے گرامی اپنے لئے مخصوص رکھتے ہیں کیونکہ
 وہ مجتہد نہیں امام تھے۔

اجتہاد کے لئے یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اجتہاد اصول میں نہیں ہوتا، فروعات
 میں کیا جاتا ہے اور علیؑ کی ذات گرامی اصول دین میں تھی۔۔۔۔۔ پھر حضرت معاویہ
 کے ان اجتہادات کو کیا کہا جائے گا؟ جن میں اصحاب رسولؐ کا قتل اور علیؑ پر تبرا بھی
 شامل ہے۔

کتنی ستم ظریفی ہے کہ ایک خطا دار اسلام کی گنہگار سی کو خطائے اجتہاد سے
 تعبیر کیا جائے۔۔۔۔۔!

کوئی مانے یا نہ مانے، ہم معاویہ کو جنگ صغین کا فاتح قرار دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس جنگ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو خارجی بنایا اور اتنے ہی عمائدین اسلام کو موت کے گھاٹ اتارا، زمانہ پھر جن کی نظیریں پیش نہ کر سکا

عمار یاسر

آپ کا پورا نام عمار بن یاسر کنیت ابوالیغظان تھی۔ آپ کی ماں اور باپ دونوں رسول کی حمایت میں شہید ہوئے۔ رسول آپ کو سراپا ایمان کہا کرتے تھے۔ حضرت امیر المؤمنین کے ذیائی تھے۔ آپ کی مدح سرائی اور طرفداری میں بڑی آزمائشوں سے گزرے مگر کبھی پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ ۴۹ سا کی عمر میں خلیفہ برحق کی طرف سے لڑنے آئے تھے۔ جوانوں کی طرح جنگ کی، بہت سے آدمی مارے، پھر درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

پیغمبر اسلام کی مشہور حدیث ہے کہ عمار کو باغیوں کا ایک گروہ قتل کرے گا۔ شہادت کی خبر جب معاویہ کو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ علیؑ ان کو لڑوانے کے لئے لائے تھے، وہی ان کے قاتل ہیں۔

حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ باغی گروہ عمار کو میدان میں لائے گا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ باغی گروہ ان کو قتل کرے گا اور ظاہر ہے کہ ان کو قتل معاویہ کے گروہ نے کیا تھا نہ کہ حضرت علیؑ کے گروہ نے۔

”جنگ جمل میں حضرت زبیر کے ہٹ جلنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد یاد تھا اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت علیؑ کے لشکر میں حضرت عمار بن یاسر موجود ہیں“

”قتل عمار کے بعد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حق علیؑ کے ساتھ تھا“ (۴۳)

ہاشم بن عقبہ

ابو وقاص کے پوتے اور سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے تھے، چچا کے مسلک کے خلاف عمر بھر حضرت علیؑ کی نصرت میں پہاڑ کی طرح جے رہے۔ آپ میدان جنگ میں دوڑ دوڑ کر ایک ساتھ کئی کئی دشمنوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ اس لئے آپ کا لقب

مترقال پڑ گیا، بہت دوڑنے والا۔ جنگ صفین میں بہت سے دشمنوں کو مار کر شہید ہوئے
پھر آپ کا بیٹا عقبہ بن باشم بہت سے موزیوں کو قتل کر کے درجہ شہادت پر پہنچا۔
اویس قرنی

یمن کے ایک گاؤں قرن میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام عامر بن جرز تھا
اُونٹ کے بالوں کا بکسل اُوڑھے ہمہ وقت ایک دارفتگی کے عالم میں رہتے تھے۔
مشہور ہے کہ آپ دیکھ بغیر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے عاشق
تھے کہ جنگ اُحد میں آپ کا ایک دانت شہید ہو جانے کا واقعہ سُن کر خود اپنا دانت
توڑ لیا تھا۔ حضور اپنے علم سے آپ کو جانتے تھے اور کئی مرتبہ فرمایا کہ قرن کی طرف سے
بڑے دوست آتی ہے۔ آپ نے حضرت عمر کے ذریعے ان کو سلام کہلایا تھا۔ حضرت
عمر نے انہیں تلاش کر کے ملاقات کی۔ آنحضرت کا خرقہ پیش کیا اور اپنے زہد کا اظہار
کرتے ہوئے کہا

”کون ہے جو ایک روٹی دے کر اس خلافت کو خرید لے؟“

حضرت اویس نے جواب دیا

”عقل والا تو اس خرید و فروخت پر راضی نہیں ہوگا۔ تم سچے ہو تو خود خلافت
چھوڑ کر چلے جاؤ۔“

پھر حضرت عمر نے فرمایا۔

”اویس میرے لئے دعا کرو۔“

اویس نے مسکرا کر جواباً کہا

”میں ہر نماز کے بعد جمیع مومنین و مومنات کے لئے دعا کرتا ہوں۔ تم مومن
ہو تو میری دعا تم تک ضرور پہنچے گی اور اگر مومن نہیں ہو تو اپنی دعا ضائع نہیں کر دو گی۔“
ائمہ المومنین جب صفین کے لئے لشکر جمع کر رہے تھے تو حضرت اویس خود آکر ملے۔
مردج الذہب اور روضۃ الاجاب کا بیان ہے، حضرت علیؑ موضع ذیقار

میں فروکش تھے کہ ایک ضعیف و نحیف شخص پیٹھ پر زاد راہ لائیے ہوئے پانی کی چھانگل لٹکائے لشکر
نگاہ میں داخل ہوا۔ اس نے امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: ”میں قرن کا اویس ہوں“
”حاضر خدمت ہوا ہوں کہ آپ کے قدموں پر اپنی جان بچھاؤں کر دوں۔“

امیر المؤمنین نے آپ کو نگلے لگایا اور کہا کہ آپ تلوار اٹھانے کے لائق نہیں ہیں
مگر آپ نہیں مانتے۔ میدان جنگ میں نصرتِ اسلام کی اور لڑتے ہوئے مارے گئے۔
ادیس قرنی کے سے کتنے ہی بزرگ تھے، جنہوں نے علی کی حمایت میں تلوار
اٹھائی تھی۔ جیسے آنحضرت کے پہلے میزبان حضرت ابو ایوب انصاری۔ آپ نے بھی
حق جہاد ادا کیا اور زخمی ہوئے۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ سقیفہ میں علیؑ موجود تھے
تو نتیجہ انتخاب وہی نکلتا جو چالاک سے نکالا گیا۔

ان تمام ذواتِ مقدسہ کی جنگ صفین میں موجودگی دلالت کرتی
ہے اس حقیقت پر کہ حق و باطل کی اس لڑائی میں صحابہ کرام علیؑ کی طرف
سے رسول اکرم کی نمائندگی کر رہے تھے۔ (۷۴)

اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے علیؑ کے ساتھ ہونے کی ایک بین دلیل اور بھی تھی اور
وہ تھا شکرِ اسلام کا نشان جو کبھی ہاشم، عبدالطلب اور ابوطالب کے ہاتھ میں ہاتھا
اسی نشان کو لے کر عبدالطلب ابہرہ سے ملنے گئے تھے پھر اس کو حضورؐ نے دوسرے
رسم و رواج کی طرح مشرف بہ اسلام کر کے دین کا علم قرار دے دیا تھا۔ یہی علم حمزہ کے
ہاتھ میں رہا تھا اور جعفر طیار کے ہاتھ میں بھی اور آج خیر و خندق کے بعد علیؑ اس کو
لے کر معاویہ کے مقابلے پر جا رہے تھے اور اس قوت سے متصادم ہونے کا ارادہ رکھتے
تھے جو اسلام سے ٹکر لینے کے لئے اُمّیڈ کر آئی تھی۔

دقت اور مابعد دقت کے مورخین کے لئے ایک دعوتِ فکر ہے کہ ایک طرف
رسول کی پیغمبری کا نشان تھا تو دوسری طرف کیا ہوگا؟ جب کہ شہنشاہیت کے اس
نشان کی وضع قطع بھی بدلی ہوئی تھی اور رنگ بھی مختلف تھا اور یہ بات مسلم ہے کہ
وہ اور جو کچھ بھی ہو مگر اسلام کا علم نہ تھا۔

برید بن حصین اسلمی

پیغمبر اسلام کے مقرب تھے اور حضرت امیر المومنین کے مخصوص اصحاب میں شامل تھے۔ آپ کو جب حضرت رسالت مآب کی خبر رحلت ملی تو اپنے قبیلے میں ایک علم سچایا۔ اس کو لے کر مدینے آئے اور درجناب سیدہ پر نصب کر دیا۔ اس کی اطلاع حضرت عمر کو ہوئی تو بلا کر ان سے کہا۔

”سب نے تو ابوبکر کی بیعت کر لی ہے، تم مخالفت کیوں کر رہے ہو؟“
 ”میں تو صرف اس گھر کے مالک کی بیعت کر دوں گا جہاں میں نے علم نصب کیا ہے۔“ حضرت برید نے کہا۔ اتنے میں بہت سے صحابہ جمع ہو گئے اور دروں سے ڈرا دھمکا کر بیعت حاصل کر لی۔ — جنگ صفین میں امیر المومنین کے ساتھ جہاں میں شریک ہوئے اور شہادت کا شرف حاصل کیا۔ امیر المومنین کے دشمنوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

”خدا قبیلہ اسلمیہ کے اُس گروہ کو جو اے خیر دے جو خوبصورت تھے اور ہاشم کے گرد قتل کر دیئے گئے۔ وہ ہیں برید و عبداللہ اور مالک کے دونوں بیٹے منفذ و عروہ۔ یہ سب معزز و مکرم افراد ہیں ماخل ہیں۔“

مالک ابن تیہان

آپ کا پورا نام ابوالہیثم مالک بن تیہان انصاری ہے۔ آپ عقبہ کی دونوں بیعتوں میں شریک تھے۔ پیغمبر اسلام کی تقریباً تمام جنگوں میں جہاد کا شرف حاصل کیا۔ جنگ صفین میں خزیمہ بن ثابت کے دوش بدوش جوہر شہادت دکھائے، اور شہادت پائی۔

خرزیمہ ابن ثابت

آپ اس مرتبے کے صحابی تھے کہ حضور نے آپ کی گواہی کو دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا۔ معرکہ صفین میں جناب عمار یا سر کے ساتھ تلوار سونت کر حملہ کیا تو دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے اور لڑتے لڑتے مارے گئے۔

حذیفہ یمانی

پورا نام حذیفہ ابن یمان غسانی تھا۔ رسالت مآب کے معتبر صحابی تھے۔ غزوہ تبوک سے واپسی پر جب حضور پر منافقین کا حملہ ہوا تھا تو حضور نے آپ کو اور عمار یا سرکو ان کے نام بتائے تھے۔ اس راز کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بیعت امیر المومنین کے بعد چالیس روز زندہ رہے۔ میدان میں وفات پائی۔ آپ کے دو بیٹے صفوان اور سعید تھے۔ دونوں نے جنگ صفین میں حق جہاد ادا کیا اور شہادت پائی۔

عبداللہ ابن بدیل خزاعی

آپ کی کنیت ابوربیعہ تھی۔ حضور کے ممتاز اور بہادر صحابیوں میں گنے جاتے، بیشتر غزوات میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ جنگ صفین میں دوزر ہی پہنچے ہوئے تھے۔ دتلواریں لئے رجز خواں تھے۔

”سوا صبر و توکل کے کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ ہاں فوج کے اگلے حصے میں اس طرح چننا ہے جیسے اُونٹ چستے کے غوص پر وارد ہوتے ہیں۔ خدا جو چاہتا ہے حکم لگاتا ہے اور کرتا ہے۔“

امیر المومنین کثکریں پیادوں کے سردار تھے۔ جذبہ جہاد کی سرشاری میں معاویہ تک پہنچ گئے اور محافطوں کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ پھر معاویہ کے لوگوں نے آپ پر اتنے پتھر برسائے کہ زخموں سے چور چور ہو کر شہید ہو گئے۔ معاویہ نے ان کی لاش کو دیکھ کر ایک شعر پڑھا۔

”قبیلہ خزاعہ کی عورتیں بھی قدرت رکھتیں تو مجھ سے بڑے کے لئے میدان جنگ میں آجاتیں۔“

آپ کے بھائی عبدالرحمن ابن بدیل بھی اسی جنگ میں نصرت امیر المومنین کرتے ہوئے شہید کئے گئے۔

عقیل بن مالک

معاویہ کی طرف سے جنگ صفین میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ سربراہ آوردہ

اور مشہور ترین بہادر تھے۔ صلح کی گفتگو میں اپنے امیر کی زیادتی دیکھ کر حق کی طرف مائل ہو گئے اور معاویہ سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ علی ابن ابی طالب خلیفہ رسول، وحی ابن عم اور داماد ہیں۔ ان سے لڑوں گا تو عاقبت خراب ہوگی۔ معاویہ نے جل کر نہیں کھانے میں زہر دلوادیا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔

حارث بن مرہ

جناب امیر، معاویہ سے دوسری جنگ کے لئے صفین کی طرف جا رہے تھے کہ راہ میں جناب اور ان کے ساتھیوں کے قتل کا حال معلوم ہوا۔ آپ نے حارث بن مرہ کو تحقیق کے لئے بھیجا تو انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔

یہ تھے اُسمان رسالت کے درخشاں ستارے جو عرصہ صفین میں ڈوب گئے۔ منصف مزاج علمائے اہل سنن مولانا مودودی سمیت میدان صفین میں علی کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔ لہذا ان تمام اصحابِ نبی کا خون معاویہ کے سر جاتا ہے۔ مسلمان ابن ان سے مجاہدہ تو نہیں کر سکتے مگر انہیں شہرِ اسلامی کی رو سے قاتل تو گردان سکتے ہیں۔

نہروان کا پس منظر

صفین میں حضرت معاویہ نے جو دیر انداز دہر مسلمانوں کو دیا تھا اس کا اثر کمی مرض متعدی کی طرح ہونے لگا اور صفین سے کوٹنے پہنچتے پہنچتے لوگوں کے نظریات میں اتنا اختلاف پیدا ہو گیا کہ وہ آپس میں ٹکرائے لگے۔ کوئی اشعث بن قیس کو بُرا کہتا، کوئی ابو موسیٰ اشعری سے بیزار ہی کا اظہار کرتا اور جب حکمین کا فیصلہ سامنے آ گیا تو ان اختلافات نے گالی گلوچ اور دھینگا مٹتی کی شکل اختیار کر لی اور پھر کوٹنے کی مسجدیں ان تنازعات کی آماجگاہ بن گئیں۔ ایک گروہ نے تو حضرت علی کو بھی سخت و سست کہنا شروع کر دیا۔

انتخابِ ستیفہ کے بعد تلوار نہ اٹھانے پر جب ایک دوست نے اس کا سبب پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ یہ سب مرتد ہو جائیں گے۔ اس وقت اس گروہ کی کیفیت لگ بھگ ویسی ہی تھی۔ انہوں نے کہنے کو تو اسلام کی رسی بہت مضبوطی سے

پکڑ رکھی تھی لیکن اس رسی میں اتنے قسم کا موخ لگا ہوا تھا کہ اس کو اصول اسلامی کی رسی کہا نہ جاسکتا۔

حضرت علیؑ نے پہلے تو ان کی زیادہ مخالفت نہیں کی مگر جب وہ تشدد پر اتر پڑے تو نادیب کرنا پڑی اور خوارج ہر طرف سے سمٹ کر نہروان میں جمع ہونے لگے۔ ان میں ایک تعداد حضرت معاویہ کے وظیفہ خواروں کی بھی تھی جو زہریلے الفاظ سے ہوا دے کر آگ کو اور بھڑکار رہے بمقصد صرف اتنا تھا کہ حضرت علیؑ ادھر اُلجھ جائیں اور شام پر حملے کی تیاری نہ کر سکیں۔

خارجیوں کا کوئی ایک نظریہ نہ تھا، کوئی ابوبکر و عمر کا قاتل تھا، کوئی عثمان کو مانتا تھا مگر علیؑ کے خلاف سب ہی تھے۔ ایک مرتبہ خارجیوں نے معترف فرماتے کے بانی واصل کے والد عطا کو پکڑ لیا اور جب انہوں نے اپنے کو مشترک بتایا تب چھوڑا۔ ایک بار حضور کے صحابی عبداللہ بن خباب کو گرفتار کر لیا اور علیؑ کے لئے اچھے لفظ استعمال کرنے کے جرم میں ذبح کر ڈالا۔ اس پر خباب امیرؑ نے ان کی سرکوبی کا عزم کر لیا۔ چنانچہ آپ ایک لشکر کو لے کر نہروان کی جانب چل پڑے۔

جنگ نہروان

خوارج کے مقابلہ پر پہنچ کر امیر المومنین نے مطالبہ کیا کہ حریت و عبداللہ کے قاتلوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے تو وہ بغیر لڑے واپس ہو جائیں گے اور انہیں مہلت دیں گے اپنے عقائد پر غور کرنے کی۔ خوارج نے جواب دیا کہ وہ سب ہی حوشت عبداللہ اور دوسرے مسلمانوں کے قاتل ہیں۔ اس پر امیر المومنین نے خود آگے بڑھ کر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، پھر بھی وہ راہ راست پر نہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی کو بات حثیت کرنے کے لئے طلب کیا۔

عبداللہ بن الکو خارجیوں کے نمائندے کی حیثیت سے آیا اور لا جواب ہو کر چلا گیا مگر خوارج نے سر نہ جھکایا۔ مجبوراً امیر المومنین نے ان کے مقابلے پر لشکر کی صف بندی کا حکم دیدیا تاہم لڑائی میں پہل نہیں کی اور اعلان کر دیا۔

”جو عبداللہ اور مسلمانوں کے قاتل نہیں ہیں وہ ادھر آجائیں یا جو جماعت کو چھوڑ کر کوفہ یا مدائن جانا چاہیں وہ چلے جائیں، انہیں معاف کر دیا جائے گا۔“

یہ سن کر فروہ بن نوفل پانچ سو سواروں کے ساتھ علیحدہ ہو گیا۔ سو آدمی لشکر امیر المومنین سے آئے۔ اسی آئنا میں ایک خارجی نے بڑھ کر مسلمانوں کے تین آدمی مار دیئے اور امیر المومنین کا نام لے کر لگا مارا۔ آپ نے بڑھ کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس درمیان کچھ خارجی اپنے ساتھیوں سمیت اور الگ ہو گئے، باقی لوگوں نے مقابلہ کیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ خارجیوں کے تین ہزار آدمی قتل ہوئے امیر المومنین کے لشکر کے آٹھ آدمی شہید ہوئے۔ نو خارجی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کی پیش گوئی آپ نے پہلے سے فرمادی تھی۔

نہروان کی طرف جاتے وقت ایک نصرانی منہم سامنے سے اُڑا ہوا تھا۔ اس نے ہلکا کر کہا ”مسلمانوں کا ستارہ پستی میں ہے۔ طالع کمزور ہے۔ جنگ کے لئے نہ جاؤ۔“ حضرت نے مسکرا کر فرمایا۔

”تیرا حساب غلط ہے۔ ہمارے دس سے کم آدمی مارے جائیں گے اور دشمن کے دس سے کم آدمی بچیں گے۔“

وہی ہوا کہ چار ہزار میں سے ۳۹۹ خارجی قتل ہوئے اور لشکر امیر کے صرف آٹھ آدمی شہید ہوئے۔ یہ دس کا اشارہ علم لدنی کی طرف سے مستقبل بعید کے اعتدالی نظام کی علامت تھا۔ جس کو اس وقت کوئی نہیں سمجھا، بعد کو دنیا کی سمجھ میں آیا۔

یوں تو امیر المومنین کی ہر سائنس اشاعت اسلام میں گزری لیکن آپ کو حالات نے قرار ہی نہ لینے دیا۔ پھر بھی جنگ حمل کے بعد آپ نے نئے علاقے حاصل کرنے پر توجہ دی جہاں پیغمبر اسلام کے دین کو دشمناس کرایا جاسکتا۔

حضرت عثمان نے ۳۶ھ میں حکیم بن جبہ الوردی کو ایک ستہ فوج کے ساتھ سندھ بھیجا تھا جو ساحلی علاقوں کو دیکھ کر واپس گیا تھا۔ پھر حضرت عثمان نے دشوار گزار راستوں کے سبب یہ مہم ملتوی کر دی تھی — حضرت علیؑ کو فتوحات کی

فہرست میں کوئی اضافہ مقصود نہ تھا بلکہ آپ کا مطمح نگاہ صرف تبلیغِ دین تھا اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ کچھ خارجی مکران جا کر پناہ گزین ہوئے ہیں اور وہاں اپنی قوت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ نے ایک دستہ فوج روانہ کیا، مگر وہ کوئی کارگزاری دکھانہ سکا۔

ادّٰی ۳۹۹ میں عبداللہ ابن عباس نے آپ کی ہدایت پر حارث بن مرہ عبدی کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا۔ انہوں نے مکران و سیستان کے بعض مقامات پر حملہ کیا اور سندھ کے ملحقہ علاقوں پر قبضہ کیا۔ حارث بن مرہ ایک مدت تک وہاں رہے۔ اس دوران مسلمانوں کے حسن اخلاق اور اخوت نے مقامی باشندوں کو بہت متاثر کیا۔

حارث نے مالِ غنیمت کے ساتھ ہندو اسیروں اور ایک ہزار کینیزوں کو بھی بھیجا تھا۔ اسیروں کو رہا کر دیا گیا تھا اور کینیزیں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ اسیروں نے واپس ہو کر آلِ رسول کی انسانیت کا ایسا بیان کیا کہ یہ بنیت کے سنائے ہوئے انسان خود بخود اسلام کے گردیدہ ہو گئے اور بعض نے خود حارث بن مرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ (۷۵)

سیستان اور مکران کے بعض وہ علاقے بھی مسخر ہوئے جن میں برہمابریس سے ایران کے شہرہ آفاق تاجدارِ ضحاک کی نسل حکمران تھی اور اس دور کے فرماں روا کا نام شنسب تھا۔

”وہ امیر المؤمنین، اسد اللغات، علی ابن ابی طالب کے

عہد میں تھا اور بدست مبارک آنحضرت کے ایمان لایا اور فرمان

حکومت غور کا بخط مبارک شاہِ ولایت پناہ پایا۔“ (۷۶)

اس طرح وہاں سے لے کر سندھ کے قریبی حلقوں تک اسلام کی ہمہ گیریت کا سکہ بیٹھ گیا اور آلِ محمد کی حلقہ یگوشی کا کلمہ پڑھا جانے لگا جو بعد کے متصوفین کی

کوششوں سے اب تک جاری ہے۔ اور جس کے لئے شہاب الدین غوری فاسج
ہندوستان کا فخریہ جملہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ غزنی میں جو کچھ بھی ہوا مگر ”غور میں کبھی علی
اور اولاد علی پر تبرا نہیں ہوا۔“

نہروائی کے بعد جنگ صفین میں قریب کھانے کا امیر المؤمنین کے بھی خواہوں کو بہت
صدمہ تھا اور وہ معاویہ کو فوراً جواب دینا چاہتے تھے مگر بیچ میں خارجی آپسکے، لہذا ان
سے فراغت پاتے ہی آپ نے پھر صفین کی طرف بڑھنے کا عزم کیا لیکن لشکر کی مختلف
بہانے بنانے لگے کسی نے کہا تھک گئے ہیں کسی نے تلواریں کند ہو جانے اور تیر ختم ہو جانے
کا بہانہ کیا۔ بیشتر نے کوئی نہ کوئی عذر لنگ پٹیا کیا۔

امیر المؤمنین نے بہت سمجھایا مگر اکثریت راضی نہیں ہوئی۔ آخر آپ نے ایک بلیغ
خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ہر قسم کے تشدید و فراز گوش گزار کئے مگر شکر والے اس سے
مس نہ ہوئے۔ یہی حضرت معاویہ کا منشاء تھا۔ بات یہ تھی کہ عرب و عرق کے
لوگ صرف مال غنیمت کے لئے لڑتے تھے۔ حضرت علیؑ کا سخت عدل و انصاف طبقتوں
پر بار بن گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں غیر تو غیر خود ان کے بھائی عقیل ایک بار دمشق چلے
گئے مگر علیؑ پر بدشمنی کر کے لہذا پلٹ آئے حضرت عقیل کے دشمن جانے کی وجہ کوئی مصلحت بھی ہو سکتی ہے
مومن خالص اب بھی امیر المؤمنین کے حکم پر سرکٹانے کو تیار تھے مگر عام مسلمان
اکٹا گئے تھے۔ اور حضرت معاویہ نے شام کے خزانوں کے مزہ کھول دیئے
تھے اور کوثر و لصرہ والوں کے گھر بھر دیئے تھے۔ شام کے جاسوس خلیفہ کے لشکر میں
میں گھل مل کر ان کے کانوں میں زہر گھول رہے تھے اور بغیر لڑے بھڑے دولت کے
انبار لگا دینے کے وعدے کر رہے تھے۔

علیؑ کی طرف سے ایسی کسی بات کا امکان نہ تھا لہذا مجبوراً کوثر و لصرہ ہونا پڑا۔
حضرت معاویہ صرف جنگی چالیں چلنے ہی کے ماہر نہ تھے۔ گھروں میں پھوٹ ڈولانے
میں بھی انہیں جہارت تامہ حاصل تھی۔ انہوں نے اس عرصے میں کونے کے اندر بھی
اپنے نیچے گاڑ دیئے تھے اور شہریوں میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے تھے جو خطبوں کے

دوران بھی خلیفہ کو ٹوک دیتے۔ عدل پسند علی کسی غصے کے بجائے نرمی سے اس کا جواب دیتے۔
 خارجی نہروان میں بڑی طرح پٹ جانے کے بعد بھی ختم نہ ہوئے تھے۔ ان کے پاس
 نہ جانے کہاں سے دولت آجاتی کہ آئے دن مختلف مقامات پر سر اٹھاتے رہتے چنانچہ
 سکرہ میں اشرف بن عوف شیبانی نے علم بغاوت بلند کیا جس کو امیر بن احسان نے
 جا کر قتل کیا۔ ہلال بن علفہ کو معقل بن قیس نے مارا۔ اشہب بن بشر کو جاریہ بن قدام
 نے ٹھکانے لگایا۔ سعید بن مدائن کے قریب سعد بن مسعود کے ہاتھوں انجام کو
 پہنچا۔ ابو مریم سعدی کو بھی جنگ کر کے ختم کیا گیا۔ خریث بن راشد کو نے میں امیر المؤمنین
 سے گستاخی کر کے بھاگ گیا تھا۔ زیاد بن حفصہ نے کافی جنگ و دو کے بعد اس کو قتل کیا۔
 حضرت معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ حضرت علی حسین سے بیٹھے نہ پائیں اور اس
 قابل نہ رہیں کہ اس پر شکر کشی کر سکیں۔ اس مقصد میں وہ کامیاب تھا اور امیر المؤمنین
 ہر ممکن سعی کے باوجود فوج کو از سر نو مرتب کرنے کا موقع نہ پا رہے تھے۔

دمشق کا اسلامی خانہ

مدینے میں کبھی روایت سازی کی ایک کمال کھلی تھی جو ۱۹۰۲ء میں دمشق
 منتقل ہو گئی۔ دور عثمانی کے آغاز تک اس میں قدرے سست روی سے کام ہوا،
 پھر چاہک تیزی آگئی اور برق رفتاری سے کام ہونے لگا۔ اس کمال
 میں تنخواہ داریا اعزازی ملازم نہیں تھے بلکہ ایک دینار فی روایت اجرت مقرر ہوئی
 تھی۔ روایت کی اہمیت اور راوی کی شخصیت کے لحاظ سے اس شرح میں اضافہ
 ہو جاتا اور ضرورت کے مطابق روایت گڑھنے پر راوی کو گراں قدر انعام سے نوازا
 بھی جاتا تھا۔

فنکار کا معیار اس کی عمر، ذہانت اور کھنہ شتی پر منحصر ہوتا۔ نسل اور خاندان
 کو بھی ایک اہمیت حاصل تھی۔ کوئی شخص خود کے یا مدینے کا ساکن ہوتا یا نہ ہوتا مگر
 اس کے باپ دادا کا تعلق کسی طرح بھی آنحضرت کے دور سے ثابت ہو سکتا تو اس کا
 رشتہ اس کمال سے جڑ سکتا تھا۔ یقیناً اس کمال نے بڑی بیش بہا خدمات انجام

دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے روایتی سکوں کے انبار لگ گئے اور پھر اس میں اتنا اضافہ ہوا کہ بعد کے محدثین کے لئے ان کا جمع کرنا دشوار ہو گیا۔

ہمارا معیار روایت کو پرکھنے کا یہ ہے کہ اس کا سلسلہ مقدس اور معتبر وسائل سے حضور تک پہنچتا ہو اور روایت کی قرآن کے مزاج سے ہم آہنگی ہو۔ اس ٹکسال کا معیار صرف یہ تھا کہ آلِ محمد کے خلاف جاتی ہو اور جو روایتیں آنحضرتؐ سے اپنی اولاد کے لئے منسوب ہیں، ویسی ہی معاصرین کے لئے گڑھی جائیں۔

زہد و تقویٰ، عدل و انصاف، علم و دانش اور شجاعت و دیانت اگر علیؑ سے منسوب ہیں تو وہی خصوصیات روایات کی اساس پر دوسروں میں بھی دکھادی جائیں۔ ملکہ العرب حضرت خدیجہ الکبریٰ کی دولت اشاعت اسلام کے کام آئی تو کسی دوسرے کو دین کے مفاد میں زرو مالی سے اتنا مستغنی ثابت کیا جائے کہ اس کا لقب ہی غنی پڑ جائے۔ خاتونِ اول اگر عمر میں زائد ہونے کے باوجود آنحضرتؐ کو محبوب تھیں تو کسی کم سن اور خوبصورت لڑکی پر حضورؐ کی اتنی فریفتگی کا بیان کیا جائے کہ کوئی اُم المؤمنین اس کے مقابلے پر ٹھہر ہی نہ سکے، خواہ ان مساعی میں پیغمبر کی سیرت ہی مسخ کیوں نہ ہو جائے۔ رسول کی بیٹی کے گھر پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہو تو کسی بی بی کو جبریل کے ذریعہ خدا سلام کہلوائے۔ مقصود صرف اتنا تھا کہ آلِ نبیؐ کی منزلت اور قیمت کم کر دی جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ مساعی بھی جاری رکھی جائیں کہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے کردار بدلی ہوئی شکلوں میں دنیا کے سامنے آئیں تاکہ ان کی نا اہلی محتاج ثبوت نہ رہے۔ اصل حقدار کو اس کے حق سے محروم کرنے کے لئے دنیا میں جو کچھ کیا جاتا ہے وہ سب کیا جائے تاکہ غاصب کو غاصب کہا نہ جاسکے۔

ان ریشہ دوانیوں کی بنیاد رسول اسلام کی زندگی ہی میں رکھی جا چکی تھی اور زمین کو آہستہ آہستہ ہمارا کیا جا رہا تھا۔ بدیہی طور پر جب وقت آیا تو پہلے سے بنایا ہوا منصوبہ کامیاب ہو گیا۔ علیؑ کو تو ایسی کسی بات کی پرواہ نہ تھی، البتہ آپ کے بعض ساتھی سلمان، ابوذرؓ اور مقداد وغیرہ اپنے کو نہ رد ک سکے اور انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ

پہنچ کر علی کے حق میں سعد بن عبادہ سے ایک آواز اٹھوائی جو نقار خانے میں طوطی کا آواز بن کر رہ گئی۔

انصارِ مدینہ کی کوشش یقیناً کامیاب ہوتی، اگر علیؑ اور بنی ہاشم وہاں موجود ہوتے۔۔۔۔۔ علیؑ کی اہلیت، استحقاق اور منہ کی مرورت کسی کی کچھ چلنے نہ دیتی، مگر وہ ہوتے ہی کیوں؟ سب جانتے تھے کہ علیؑ رسولؐ کی میت چھوڑ کر جاتے والے نہیں ہیں اس لئے ایک غیر نمائندہ مجمع میں، ایک پارٹی یعنی بنی ہاشم کے بغیر نہ مانی کر لی گئی۔ اس کا رونا نہیں ہے کہ خلافت علیؑ کو نہیں ملی۔ رونا ہے تو اس کا کہ اس کے بعد رسولؐ کی اولاد سے بہت ہی ناروا اور بے رحمانہ سلوک کیا گیا اور اسی کو دیکھ کر حضرت معاویہ کی ہمت پڑی کہ نہ صرف آلِ محمدؐ بلکہ محمدؐ کے برگزیدہ صحابیوں کی بھی بے نرمی کریں اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں۔

دمشق کی کسال ایسے ہی اغراض و مقاصد کے لئے کام کر رہی تھی جو انجام کار اسلام خانے کا جو دین گئی۔۔۔۔۔ حضرت معاویہ نے امارت کی سند مدینے سے حاصل کی تھی۔ جاہ و شتم اور سیاست دربار ہرقل سے مستعار لی پھر اس میں اضافہ کیا۔ روم میں دشمنوں کو راستے سے ہٹانے کے لئے ذہر کا استعمال ہوا تھا معاویہ نے اس میں اجتہاد کیا۔ ذہر کا منقہ کر لیا اور اس کی اقسام ایجاد کر لیں، پھر ان ذہروں کو اسلام خانے میں داخل کر دیا۔

سازش اور تلوار و راشت میں ملی تھی۔ اس میں معاویہ کی ذاتی صلاحیت نے چار چاند لگا دیئے۔۔۔۔۔ یہ والی شام کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے مقابلے پر جو فریق تھا، وہ پیغمبر کا صحیح جانشین تھا۔ اس کی طرف سے ان حربوں کا جواب ایسے حربوں سے دیا ہی نہیں جاسکتا، دہاں تو جھوٹ، فریب، سازش، بددیانتی، رشوت، ہربت کا جواب صداقت تھی اور کوفیوں، عراقیوں اور شامیوں کو روکھی پھینکی صداقت درکار نہ تھی، انہیں تو دین و ایمان کے نام پر دولت چاہیئے تھی۔ اس کے لئے جائز و ناجائز کا امتیاز نہ تھا، اسی کے وہ برسوں سے عادی رہے تھے جو علیؑ سے ممکن نہ تھی۔ یہ علیؑ

کے صادقانہ جبروت کی بات تھی کہ ضیفروشی کچھ کہنے کے بجائے لیت و لعل کرتے رہے۔

ان حالات سے فائدہ اٹھا کر معاویہ کے فوجی دستے مقبوضات خلافت پر حملے کرتے رہے اور علوی عاملوں کی طرف سے ان کا دفاع ہوتا رہا۔ آخر معاویہ نے مصر پر دھاوا بول دیا جس پر ان کی نظریں شروع ہی سے لگی ہوئی تھیں۔

مصر: ایک مقبوضہ خلافت

زمانے کی روایت کے مطابق اس دور میں مسلمانوں کے تین مدبر تھے معاویہ بن ابی سفیان، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، تہریران ہی معنی میں، جن میں آج مستعمل ہوتا ہے اور اس میں مطلب براری کے لئے کوئی عمل نادرانہ نہیں ہوتا۔ ان میں ایک کا اضافہ سعد بن عبادہ کے بیٹے قیس سے ہو سکتا تھا جو امیر المومنین کے طرف دار تھے اور آپ کے وقت میں مصر کے والی تھے۔

معاویہ نے ان کو خریدنے کی بہت کوشش کی مگر قیس معاویہ کے فریب میں نہیں آئے۔ امیر المومنین کو ان سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن مصر کے ایک دفعنے جب قیس کی شکایت کی تو امیر المومنین کو سوچنا پڑا پھر بھی وہ قیس کو ٹھانا نہ چاہتے لیکن بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ قیس پر اتنا اعتماد نہیں کر سکتے جتنا محمد بن ابی بکرؓ حضرت محمد بن ابی بکر جناب امیر کی نظر میں مثل محمد حنفیہ کے تھے۔ چنانچہ آپ نے محمد بن ابی بکر کو بھیج دیا کہ قیس کی مدد کریں۔ یہ بات قیس کو ناگوار ہوئی اور وہ استعفیٰ دے کر مدینہ چلے گئے۔

حضرت معاویہ نے جب عمرو بن العاص کو مصر کی تسخیر کے لئے مامور کیا تو اس سے قبل ہی وہاں سازش کا جال بچھا دیا۔ شام سے قربت کے سبب یوں بھی مصری بنی امیہ کے حق میں تھے اور معاویہ نے پہلے سے وہاں کے علمائین کو خرید رکھا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شام و مصر میں آل محمد کا صحیح تعارف بھی نہ ہوا تھا ان کی جو تصویریں سپیش کی گئی تھیں، وہ بلا تشبیہ اولادِ نوحؑ کی تھیں بلکہ لوگ یہی جانتے تھے کہ حضورؐ کے قریب ترین رشتہ دار خود معاویہ ہی۔

ان حالات میں مصر پر استقرار حکومت کے لئے واقعی قیس بن سعد جیسے جبرئیل کی ضرورت تھی مگر وہ مصر سے جا چکے تھے۔ وفادار اور باصفا محمد بن ابی بکر نے بڑے استقلال کے ساتھ ہر طرف کی خبر رکھی اور جب مصریوں نے بغاوت کی تو یزید بن حارث اور محمد بن جہان کو ان کی سرکوبی کے لئے متعین کیا، مگر دونوں مارے گئے۔ پھر حضرت محمد بن ابی بکر نے بنی کلب کے ایک سردار کو روانہ کیا۔ اس نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ نتیجے میں ہر گلی دگرچہ بغاوت کے نفروں سے گونج اٹھا اور محمد بن ابی بکر نے حضرت علی سے مدد مانگی۔

مالک اشتر

حضرت علی کا سرمایہ اب صرف مالک اشتر رہ گئے تھے، آپ نے انہیں مصر روانہ کر دیا۔

حضرت معاویہ کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے حاکم قلم سے رابطہ قائم کیا جو پہلے ہی دمشق کے حلقہ تنزیہ میں چھنسا ہوا تھا۔ معاویہ نے اپنے اسلحہ خانے کا خاص زہر پہلے سے اس کے پاس بھجوا دیا۔ مالک اشتر کے شجاعانہ روزگار میں تھے۔ کون تھا جو سامنے آکر مقابلہ کرنا؟ حاکم قلم نے مکر سے کام لے کر مالک کی دعوت کا اہتمام کیا اور اس زہر کو کھانے میں ملوا دیا۔ ایک روایت کے مطابق شہد میں ہلا کر دے دیا۔ جس کے پیتے ہی مالک اشتر جاں بحق ہو گئے۔ شجاعت میں علی کا مد مقابل اگر کوئی تھا تو مالک اشتر۔ جنگ صفین میں مالک کے کشتوں کی تعداد علی کے مقتولین سے ایک کم تھی، جس پر مالک کو تفاخر ہوا۔ علیؑ نے مالک کی بہار رسی کی تعریف کی، اور کہا۔ تم تو سامنے پڑے والے دشمن کو سامنے سے ہٹا دیتے تھے، مجھے یہ بھی دیکھنا پڑا تھا کہ اس کی نسل میں کوئی دیندار ہونے والا تو نہیں ہے۔ مالک کے ایمان پر حضرت علیؑ کو بڑا اعتماد تھا، اسی لئے یہ بات کہہ بھی دی تھی۔

امیر المومنین مالک کے انتقال کی خبر سے اتنے افسردہ ہو گئے تھے گویا وہ خود آدھے مر چکے ہوں۔ آپ نے فرمایا:-

”خدا رحم کرے مالک پر۔ وہ میرے لئے ویسے ہی تھے جیسے میں رسول اللہ کے لئے“
یہ مالک کا شرف تھا جو پیغمبر کے جانشین نے ان کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے تھے
مالک کا قبیلہ کونے کی آباد کاری سے قبل ارضِ مینوا سے دُور کونے کے نواح
میں آباد تھا جو نخ کا علاقہ کہلاتا تھا۔ مالک کے برادر بزرگ کا نام عبد اللہ تھا۔ شجاع
جنگ اُذما، متدین، بلند کردار، قول کے دھنی اور فرزند شمشیر۔ مالک نے قبیلہ کی
سرمداری اور میرت معزز باپ سے ورثے میں پائی۔

جنگ قادسیہ کے بعد سے اس قبیلے کا مدینے سے رابطہ رہا اور حق پرستی کے
رجحان کے سبب وہ آلِ محمد کا حلقہ بگوش رہا۔ ایک معرکے میں مالک کی ایک
آنکھ کے اوپر تلوار کا زخم آگیا تھا لہذا آپ اشتر کے نام موسوم ہو گئے پھر یہی آپ کا
لقب قرار پایا گیا۔

حضرت علیؑ نے جب کونے کو دار الخلافہ بنایا تو بارگاہِ امامت میں مالک کا اقرب
بہت بڑھ گیا اور آپ صفتِ اول میں بھی ممتاز اور منفرد ہو گئے۔ آخر آپ
نے اپنی جان حق کی حمایت میں قربان کر دی اور رہتی دُنیا تک شجاعت و دفاعِ آپ
سے منسوب ہو کر رہ گئی۔

مصر کی سیاست پر مالک اشتر کی شہادت کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ حضرت معاویہ
نے بڑی تیزی سے اپنی چالیں چلنا شروع کر دیں، اور عمرِ عاص کی سازشوں سے معاویہ
بن خدیج اور معاویہ بن سلم نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ علمِ بغاوت بلند کر دیا
امیر المومنین انتہائی پریشانی میں محمد بن ابی بکر کو ملک بھیجنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سو
دو سو آدمیوں سے نامد تیار نہ ہوئے۔ بڑی دقت سے دو ہزار آدمی مالک بن کعب ابھی
کی سرکردگی میں روانہ کئے گئے مگر ان کے پہنچنے سے قبل عمرِ عاص مصر میں وارد ہو گیا
اور جنگ شروع ہو گئی۔

محمد بن ابی بکر چار ہزار فوج لے کر مقابلے کے لئے نکلے بعد مدینہ الحبش
کی کمان کمان بن بشر کے ہاتھوں میں سٹی۔ یہ نہایت شجاع اور بہادر

تھے، بڑی بہادری اور پامردی کے ساتھ شامیوں کا مقابلہ کیا۔ جو دستہ آگے بڑھتا، اسے پسپا کر دیتے۔ یہ رنگ دیکھ کر عمرو بن العاص نے معاویہ بن خدیج کو اشارہ کیا۔ اس نے کمانہ کو گھیر لیا اور ہر طرف سے شامی ان پر ٹوٹ پڑے۔ کمانہ نے گھوڑے سے اتر کر لڑنا شروع کر دیا لیکن تنہا ایک شخص کا جم غفیر سے مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ بالآخر وہ لڑتے لڑتے مارے گئے۔ کمانہ مصری فوج کے قوت بازو تھے۔ ان کے قتل ہوتے ہی مصریوں نے میدان چھوڑ دیا۔ محمد بن ابی بکر دپوش ہو گئے لیکن معاویہ بن خدیج نے ڈھونڈھ نکالا اور عمرو بن العاص

نے نہایت میدردی کے ساتھ قتل کرادیا۔ (۷۷)

ایک معتبر روایت میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن العاص نے محمد کو زخمی حالت میں گدھے کی کھال میں سلوا دیا تھا، پھر اس کو جلوا دیا۔

کہا جاتا ہے کہ محمد بن ابی بکر کا غلام سالم جب آپ کا پیر بن لے کر مدینے پہنچا تو معاویہ کی بہن اُم المؤمنین اُم حبیبہ نے ایک جھنڈا ہوا مینڈھا ساتھ حضرت عائشہؓ کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا۔

”محمد بن ابی بکر اسی طرح سٹون ڈالے گئے تھے۔“

حضرت عائشہؓ کو اس سے اتنا صدمہ ہوا کہ آپ نے پھر کبھی جھنڈا ہوا گوشت نہیں کھایا۔ اس دن کے بعد سے ہر نماز میں آپ معاویہ، عمرو عاص اور معاویہ بن خدیج کے لئے بدعا کیا کرتی تھیں۔

اس واقعہ سے ایک بدیہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ آنحضرت کی حیات طیبہ میں کوئی اُم المؤمنین خواہ اپنی ازدواجی حیثیت کے علاوہ کچھ اور نہ رہی ہو لیکن آپ کی وفات کے بعد ہر اُم المؤمنین کی ہمدردیاں صرف اپنے قبیلے میں مرکوز ہو کر رہ گئیں اور بعض میں تو حق و ناحق کی تمیز بھی باقی نہیں رہی تھی۔ یہی صورت اُم حبیبہ کی بھی تھی۔ چونکہ اُم المؤمنین عائشہؓ معاویہ کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں اور معاویہ بھی انہیں

اپنی راہ کا کاما قرار دیتے تھے لہذا بھائی کے زندہ جلا دیے جانے کی خبر اُم حبیبہ نے اُم المؤمنین عائشہؓ کو بھیجی ہوئی ران بھیج کر دی اور ان کا کلیجہ کباب کر دیا۔

اس کام مطلب یہ ہے کہ معاویہ کی بہن بھی بھائی سے کم بے رحم اور سنگ دل نہ تھی۔ یہ حقیقتاً آنحضرتؐ کا دل گردہ تھا کہ آپؐ نے ایسی ہر عورت کو نیاہ دیا۔ بے محل نہ ہوگا، اگرچہ امیہ کی افترا پر دازی کی ایک داستان اور گوش گزار کرتا چلوں اجوز یزید بن معاویہ کے بعض حمایتی وقتاً فوقتاً اڑاتے رہتے ہیں کہ واقعہ کربلا سرے سے واقع ہی نہیں ہوا، کیونکہ یزید بن معاویہ تو معرکہ روم میں حضرت ابو ایوب انصاری کے ساتھ مارا چاچکا تھا۔ اس کی قبر قسطنطنیہ کی دیوار تلے بنی ہوئی ہے۔ — ان کی اطلاع کے لئے یہ بات تباہنا ضروری ہے کہ خود معاویہ بن ابوسفیان کی فوج میں معاویہ نام کے پانچ جرنیل موجود تھے اور شہریوں میں تو نہ جانے کتنے لوگوں کے نام معاویہ ہوں گے۔

دو جرنیل معاویہ بن خدیج اور معاویہ بن مسلم تو صرف مصر کے محاذ پر تھے۔ جن سے عمرو بن العاص نے محمد بن ابی بکر کے قتل کی سازش کی تھی۔ یوں تو ہر آدمی کے منہ میں زبان ہوتی ہے۔ جھوٹ پیس جو چاہے کہتا چلا جائے لیکن اتنی احتیاط تو کرنا ہی چاہیے کہ جھوٹ آسانی سے پکڑا نہ جائے۔ کہنے والے کو اتنی تحقیق تو کر ہی لینا چاہئے کہ کس کس معاویہ نے بادشاہ کی خوشنودی کیلئے اپنے بیٹوں کے نام یزید رکھے، اور ان میں سے کون سا یزید بن معاویہ جنگ روم میں مارا گیا — تاریخ اگر اسی طرح افسانوی رنگ اختیار کرتی رہی تو لوگوں کا اعتماد تاریخ پر سے ختم ہو جائے گا۔

حضرت علیؑ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؑ نے کلیجہ پکڑ لیا۔ محمد بن ابی بکر آپؑ کو حشنین سے کم پیارے نہ تھے۔ انھیں محسوس ہوا کہ جیسے واقعی ان کا بیٹا درجہ شہادت پر فائز ہو گیا، مگر آپؑ اس آزمائش میں بھی پورے اترے۔

محمد بن ابی بکرؓ

حضرت امیر المومنین کا کہنا تھا کہ محمد، ابوبکر کے صلب سے آپ کا بیٹا ہے یہ قول محمد کے شرف کی دلیل ہے۔ حسب نسب کے لحاظ سے آپ اسماء بنت عمیس کے بطن سے ابن ابوبکر بن قحاذہ تھے۔ اسماء سب سے پہلے حضرت جعفر طیار کو میا ہی تھیں۔ ان سے عبداللہ بن جعفر پیدا ہوئے۔ جعفر طیار کی جنگ موتہ میں شہادت کے بعد حضرت ابوبکر کی زوجیت میں آئیں اور ان سے محمد پیدا ہوئے۔ اسماء کی والدہ ہند، اُم المومنین میمونہ اور عیاس بن عبدالمطلب کی زوجہ ام الفضل کی بہن تھیں۔

حضرت ابوبکر کے مرنے کے بعد اسماء کو حضرت علیؓ کی زوجیت کا شرف حاصل ہوا۔ محمد بن ابی بکر کے ساتھ ان کی بہن اُم کلثوم بھی تھیں، جن سے پانچ سال کی عمر میں حضرت عمر کا عقد کرنا بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت عمر نے خلافت کے دبدبے میں اُم کلثوم بنت ابی بکر کا رشتہ حضرت علیؓ سے مانگا تھا مگر آپ نے صغیر سنی یا کسی دوسرے سبب سے انکار کر دیا تھا۔

حضرت محمد بن ابوبکر کی تربیت امیر المومنین نے بیٹے ہی کی طرح کی تھی اور انہوں نے اس کا حق بھی ادا کر دیا۔

سنہ ۱۱ھ میں حجۃ الوداع کی روانگی کے وقت آپ کی ولادت ہوئی تھی حضرت عائشہؓ نے نام رکھا تھا۔ صفر ۳۵ھ میں آپ کی شہادت ہوئی۔

محمد عبادت گزار، صاحب اجتہاد اور بہادر تھے۔ محبت اہل بیت کا درس آپ نے اپنی ماں سے پایا تھا۔ اسماء نے ان کی خبر شہادت پر اس کردار کا مظاہرہ کیا۔ جس کی نظیر صرف کربلا میں ملتی ہے۔ محمد کی موت کو آپ نے اپنی سر بلندی کی علامت قرار دیا اور اس پر فخر محسوس کرتی رہیں۔

اب ساطحہ سیاست پر بنی امیہ کے تسخیری خانے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے اور شام کی فوجیں خلیفہ وقت کے علاقوں پر چھاپے مار رہی تھیں۔ حضرت علیؓ کے

کے باوجود جاں نثار موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ صرف حق کے دانے رہ گئے تھے
ایسے میں عبداللہ ابن عباس نے بھی منہ پھیر لیا۔

دُنیا علی سے روگرداں ہو چکی تھی۔ سرفروشی کے لئے گنتی کے افراد باقی تھے
جن میں ابن عباس کا شمار بھی تھا۔ پھر بھی حضرت علیؑ سیاست الہیہ سے سرموٹنے
کو تیار نہ تھے۔ شاید اسی لئے دوسروں کی طرح عبداللہ ابن عباس بھی اپنے مستقل
کے بارے میں سوچنے لگے اور بیت المال کا ایک حصہ محفوظ کرنے لگے جس کی اطلاع
ابوالاسود خزاعی نے امیر المؤمنین کو دے دی، آپ نے ابن عباس کو خط لکھا، اور
اس خط و کتابت میں تلخی پیدا ہو گئی۔

علیؑ کے کے صادق و امین کے جانشین تھے انہوں نے دیانت کے لئے اپنے
حقیقی بھائی عقیل کی ناراضگی کی پرواہ نہ کی تھی اور بیت المال سے ان کے حصے
سے زائد ایک کوسڑی نہ دی تھی۔ امام وقت کی حیثیت سے آپ کی نظر میں سب
برابر تھے۔ آپ عبداللہ ابن عباس کی پرواہ کیا کرتے، ادھر عبداللہ بھی صورت
حال کو سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے جو کچھ سمیٹ سکتے تھے، سمیٹا اور بصرے میں زیاد
بن سمیرہ کو اپنا قائم مقام بنا کر کے کوسدھا رکھے۔

شام کی یلغار

حضرت معاویہؓ نے راجی کی ہم شروع کر چکے تھے۔ ۳۹ھ میں انہوں نے
نعمان بن بشر کو دو ہزار فوج کے ساتھ عین التمر روانہ کیا، مگر اس کو مالک بن کعب
کے ہاتھوں شکست ہوئی۔

اسی سن میں انہوں نے سفیان بن خوف کو چھ ہزار آدمی دے کر انبار و
مدائن روانہ کیا۔ حضرت علیؑ کی طرف سے سعید بن قیس مقابلے کے لئے پہنچے تو
وہ لوٹ مار کر کے جا چکا تھا۔

پھر حضرت معاویہؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کو فزاری کو تیار روانہ کیا جو مکے
اور مدینے پہنچا۔ حضرت علیؑ کی طرف سے مسیب بن نجبهؓ مقابلے پر آئے۔ فزاری

ہزیمت یاب ہوا اور قلعہ بند ہو گیا۔ مسیب نے قلعہ میں آگ لگا دی مگر معافی مانگنے پر چھوڑ دیا۔

صناک بن قیس تین ہزار سپاہ کے ساتھ اقوصہ کے نشیبی علاقوں پر حملہ آور ہوا امیر المومنین نے حجر بن عدی کو متعین کیا۔ حجر نے اس کے انیس آدمی قتل کئے اور لشکر کو مار بھگایا۔

ذی الحج ۳۹ھ میں حضرت معاویہ نے حج میں خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد ہی معاویہ نے عبدالرحمن بن قیث کو جزیرہ سیحیا مگر اس کو کیل بن زیاد کے ہاتھوں ایسی شکست ہوئی کہ اس کے لشکر کا بڑا حصہ کٹ گیا۔

صدقات وصول کرنے کے سلسلے میں ایک مقابلہ شام کے سالار فوج ذہیر بن مکحول اور علیؑ کے جرنیل عبداللہ الشجعی کے درمیان ہوا، جس میں ذہیر مارا گیا۔ دومۃ الجندل میں سلم بن عقبہ معاویہ کی طرف سے آیا تھا۔ اس کو علیؑ کے جرنیل مالک بن کعب نے بری طرح پسایا۔

سکھ میں ہسرن ابی ارطاط معاویہ کے حکم پر مدینے پہنچا، کئی گھر مسار کر کے مکہ آیا۔ وہاں سے یمن روانہ ہوا۔ یمن پہنچ کر اس نے عبدالمدان، ان کے بیٹے اور عبداللہ بن عباس کے دو کم سن بچوں کو قتل کیا۔ حضرت علیؑ کی طرف سے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود مقابلے کے لئے پہنچے تو ہسر سجاگ نکلا۔ آخر جاریہ اور وہب مکہ، مدینہ ہوتے ہوئے کوثر واپس ہو گئے۔

حضرت معاویہ کی پالیسی غالباً صرف بد امنی اور قتل و غارتگری تھی۔ گئے گزے حالات میں بھی ان کے لشکروں کو شکست پر شکست ہو رہی تھی کیونکہ حضرت علیؑ کے ساتھ جتنے بھی لوگ رہ گئے تھے وہ میدان جنگ کی موت کو شہادت قرار دیتے، لہذا دشمن ان کے سامنے سے بچ کر بکلی نہ پاتا اور شام کے غارتگر ہزدلی میں جان دیتے یا پیٹھ دکھا جاتے، لیکن حضرت علیؑ عوام کے محافظ تھے وہ

بے گناہ شہریوں کا خون دیکھ نہ سکتے۔ اس لئے بعض لوگوں نے صلح کرانے کی کوشش کی تو آپ نے مفاد عامہ کی خاطر ہاتھ بڑھا دیا۔ مسلمانوں میں ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رد سے شام و مصر اور مغرب کے علاقے پر معاویہ کی حکومت تسلیم کر لی گئی۔

خانہ جنگی کا یہ خاتمہ ایک طرف معاویہ کے منصوبوں کے لئے مہلت تھا اور دوسری طرف علیؑ کے لئے صفین کا جواب دینے کا موقع فراہم کر رہا تھا، لہذا دونوں اس پر مطمئن ہو گئے۔ معاویہ تو اس لئے مطمئن تھے کہ علیؑ نے ان علاقوں پر ان کی حاکمیت تسلیم کر لی تھی اور علیؑ اس لئے کہ وہ کیسویہ کو مسلمانوں کے مفاد پر توجہ دے سکیں گے۔

شہادت سے پہلے

امیر المومنین کے دونوں بازو شکستہ ہو چکے تھے۔ ۹ سال کے عمار یا صفین میں ساتھ چھوڑ گئے۔ مالک اشتر معاویہ کے زہر سے دنیا کو خیر باد کہہ کئے گئے تھے۔ قوم ایک قنوطیت کا شکار تھی اور معاویہ کی چہرہ دستی کے سبب خلافت کا رعب و داب ختم ہو رہا تھا۔ علیؑ نے تمام زندگی کبھی شکست کا منہ نہ دیکھا تھا۔ صفین میں انہیں اگرچہ حقیقی ہزیمت نہ ہوئی تھی پھر بھی انہوں نے سیاسی شکست کھائی جس کا انہیں ملال تھا اور اس سے زائد غم اس کا کہ ایک غاصب نے ان کے علاقے پر قبضہ کر رکھا تھا اور خیر و خندق میں چمکنے والی تلوار کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔

ایک دن بڑے مجمع سے خطاب کے دوران آپؑ نے جذبات میں ڈوب کر کہا ”کہاں ہیں میرے وہ بھائی جو سیدھی راہ پر چلتے رہے اور حق پر گزر گئے کہاں ہیں عمار، کہاں ہیں ابن تیہان، کہاں ہیں ذوالشہادتین، کہاں ہیں ان جیسے دوسرے بھائی، جنہوں نے مرنے پر عہد و پیمان کئے تھے اور جن کے سروں کو کٹھنوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔“

پھر آپؑ ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتے رہے، آنسو رخساروں پر بہتے رہے اور آپؑ اس لمحے میں بولتے رہے گویا راجہ حق میں جہاد کرنے والوں کو خراج تحسین

پیش کر رہے ہوں۔۔۔ بولتے بولتے آپ سنبھلے پھر آواز بلند فرمایا:-
 ”جہاد، جہاد۔۔۔ خدا کے بند جہاد!“
 ”دیکھو میں آج لشکر تیار کرتا ہوں۔ جو خدا کی طرف بڑھنا چاہے، وہ بڑھے

آپ نے ایک لمبی سانس لی اور کہتے رہے
 ”میری خلافت قبول کرنے کے بعد شورش پسندوں نے ہنگامہ کیا۔۔۔ خیر
 خدا نے ان کی پریشانیوں سے نجات دی۔ انہیں ذلیل کیا۔ ان کی کوششوں کو ناکام
 بنایا اور ان کا انجام بُرا کیا۔۔۔ ایک جماعت جو اسلام میں فتنے پھیلا رہی ہے
 ہوا و ہوس پر عمل پیرا ہے۔ اسلام میں غلط فیصلے کرتی ہے مگر وہ چیز جس کی مدد
 ہے اس کی ہرگز سزاوار نہیں۔۔۔ میں تمہیں سرزنش کرتے کرتے اور سمجھاتے
 سمجھاتے تھک گیا ہوں۔ تم مجھ سے صاف کہہ ہی دو کہ آخر چاہتے کیا ہو؟“
 ”تم اگر دشمن کی طرف کوچ کرنے کو تیار ہو تو یہ مرضی ہے۔ تمہیں چلنا چاہتے
 تو صاف صاف بتا دو تاکہ میں کوئی راستے قائم کر سکوں۔۔۔ خدا کی قسم۔ اگر تم
 میرے ساتھ جنگ کے لئے نہ چلو گے اور اس وقت تک نہ لڑو گے جب تک
 احکم الحاکمین ہمارے مابین فیصلہ نہ کر دے تو میں تمہارے لئے بدعا کروں گا اور
 خود روانہ ہو جاؤں گا، خواہ میرے ساتھ دس ہی آدمی کیوں نہ ہوں۔

شام کے اوباش اور فریب خوردہ لوگ گمراہی کی مدد کرنے اور باطل پر
 متحد ہونے میں تم سے زیادہ ثابت قدم ہیں، حالانکہ تم حادۃ ہدایت اور راہِ حق
 پر ہو اور وہ مسلکِ باطل پر۔۔۔ شام والے بھی تمہارے ہی جیسے انسان ہیں
 ایک مرتبہ مرنے کے بعد دوبارہ قیامت تک زندہ نہ ہوں گے!“

سردارانِ فوج اس خطبے پر بہت شرمندہ ہوئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ حضرت
 امیر المومنین جو کہتے ہیں وہ کر گزریں گے جو سرداروں کے لئے بڑی ذلت کی بات
 ہوگی۔ انہوں نے باہم مشورہ کر کے امیر المومنین کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔۔۔

پھر سب نے اپنے اپنے قبیلوں کو جمع کیا۔ معقل بن قیس نے بصرہ جا کر لوگوں کو آمادہ کیا اور ایک بڑا لشکر کوچ کے لئے تیار ہو گیا۔

امیر المؤمنین نے زیاد بن حنفہ کو بطور ہرا دل متعین کیا۔ دس دس ہزار کے لشکر حسین بن علیؑ، قیس بن سعد اور ابوالیوب انصاری کی سرکردگی میں تیار کئے اور چونکہ رمضان سر پہ تھا اس لئے روانگی رمضان پر ملتوی کر دی گئی۔

حضرت معاویہ بھی اپنی تدابیر سے غافل نہ تھے مگر علیؑ کے تصور سے ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ جنگ صفین کا منظر انہیں یاد آ جاتا اور خدشہ پیدا ہو جاتا کہ کہیں پھر ویسا ہی ہوا تو کیا ہوگا۔ انہوں نے علیؑ کے لئے ایک ذہنی منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس خبر کے کان میں پڑتے ہی ایک عزم کر لیا۔ اپنا قاصد اشعث بن قیس کے پاس بھیج دیا۔ پھر کیا ہوا؟ اس کا اندازہ نوعیت واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ عبدالرحمن بن ملجم ایک عورت قطا مہ پر عاشق تھا جس کے باپ اور سچائی جنگ نہروان میں قتل ہوئے تھے۔ اس بنا پر وہ علیؑ کی سخت دشمن تھی۔ اس نے ابن ملجم سے کہا تھا کہ میری تین ہزار درہم، ایک غلام، ایک مطربہ لونڈی اور علیؑ کا سر در کار ہے۔ اتنی چیزیں بیک وقت ابن ملجم کے لئے ممکن نہ تھیں۔ اشعث نے جب اس کو اس کام کے لئے آمادہ کرنا چاہا تو اس کو ایک ہی مہم میں ساری شرائط پوری ہوتے نظر آنے لگیں اور وہ فی الفور قطا مہ کو اپنے پہلو میں محسوس کرنے لگا۔

قطا مہ کا ایک آدمی دروان اس کے ساتھ تھا۔ ابن ملجم نے مزید احتیاط کے طور پر شیب بن بجرہ کو بھی لے لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اشعث بن قیس نے اس کو ساتھ کیا تھا۔ یہ تینوں مسجد کے سامنے خیمہ لگا کر فروکش ہو گئے اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

امیر المؤمنین نماز صبح کے لئے تشریف لائے تو یہ تینوں مسجد میں موجود تھے اور اشعث بن قیس تھوڑے فاصلے سے موجود تھا۔ ابن ملجم اور شیب آپ کے

بالکل کچھ کھڑے ہوئے تھے۔ جیسے ہی آپ پہلا سجدہ کر کے اُٹھے۔ شیبیب نے تیزی کے ساتھ کھڑے ہو کر وار کیا جو خالی گیا، دوسرا وار ابن بلجم نے کیا جو سراقہس پر پورا بیٹھا اور سر میں دماغ تک تسکات پیدا ہو گیا۔ تلوار نہ ہراؤ دھتی وہ اپنا کام کر چکی ابن بلجم تلوار چلاتا ہوا سرعت کے ساتھ بھاگا۔ نمازی پیچھے دوڑ پڑے تھے مغیرہ بن نوفل نے اپنی چادر ابن بلجم پر پھینکی وہ اس میں الجھ گیا اور دوسرے لوگوں نے اس کو کپڑا لیا۔ شیبیب فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

راویوں نے اس سلسلے میں شام کا حق نمک لکھا ہے اور معاویہ کو خون سے بری الذمہ کرنے کے لئے خارجیوں کی ایک جماعت کا شاخسانہ چھوڑا ہے۔ اور یہ شاخسانہ بھی سیاق و سباق سے درست کہ تین خارجیوں نے معاویہ بن ابی سفیان عمرو بن العاص اور حضرت علیؑ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ سامنے کا سوال ہے کہ معاویہ اور عمرو عاص سے ان خارجیوں کو کیا عداوت تھی؟ جب کہ ان کی تنظیم خود ان دونوں ہی کی ساختہ و پرداختہ تھی اور جل کی طرح نہروان کی جنگ بھی علیؑ کے سر اس لئے تھوپ گئی تھی کہ آپ کی عسکری طاقت کمزور پڑ جائے اور کوئی دوسرا مرکز صفین پیش آنے کا امکان ختم ہو جائے۔

حالاتِ بادی النظر میں ایسے ہی ہو گئے تھے اور یہی سمجھ کر معاویہ نے غارت گری کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر اس میں ان کی فوجوں کو منہ کی کھانا پڑی۔ یہ نتیجہ خلاف توقع تھا۔ معاویہ کو یہ اندازہ نہ تھا کہ صداقت کی راہ میں مٹھی بھر سرفروش بھی بڑے سے بڑے لشکر کو تہہ وبالا کر سکتے ہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے سادہ باز سے کام لے کر جڑ ہی کو کاٹ دینے کا عزم کیا اور اشعث بن قیس کے ذریعے زر کثیر دے کر عبد الرحمن ابن بلجم کو اس خدمت پر مامور کر دیا۔

ابن بلجم نے بھی سوچا کہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو دنیا ہی میں جنت بل جائے گی ورنہ پس ماندگان اور قحطامہ تو عیش و آرام سے گزر کر مریں گے ہی اور یوں بھی ذہنی طور پر حضرت علیؑ کی طرف سے اس کو اتنا بھردیا گیا تھا کہ وہ علیؑ کے

نام سے بھی نفرت کرتا تھا۔۔۔۔۔ اس پر قسامہ کے حاصل کرنے کی طلب نے اس کو از خود رقتہ کر دیا۔

ایک سنی عالم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ صفین میں حضرت عمر اگر معاویہ کے مقابل ہوتے تو وہ کبھی قرآن بلند کر دینے کے فریب میں نہ آتے۔ دوسرے نے کہا۔ یہ صحیح ہے مگر حضرت عمر کا صرف ایک رُخ تھا۔ معاویہ کے ہزار دُخ تھے وہ کوئی اور صورت پیدا کر لیتے۔

بڑی نکتہ رسی کی بات تھی اور بالکل صحیح عرفان تھا انہیں معاویہ کا کہ خلیفہ کا خون بھی ہو گیا اور معاویہ کے خنجر پر نہ کوئی داغ آیا اور نہ ان کے ہن پر کوئی چھینٹ۔ اصل یہ کوئی قتل نہیں تھا بلکہ کراماتِ سیاست تھی جس کے بعد تاج و تخت خلافت کے خود اپنی طرف کھنچ کر آ جانے کی توقع وہ کر سکتے تھے۔

امیر المومنین کی شہادت

بعض معتبر روایات شاہد ہیں کہ حضرت امیر المومنین کو علمِ کُدنی سے اپنی موت کا علم ہو گیا تھا اور ماہِ رمضان شروع ہوتے ہی اشاروں اور کنایوں میں آپ اپنی اولاد کو بتا بھی رہے تھے۔ ۱۰ رمضان کا دن گزرنے کے بعد آپ کو ایک اضطراب سا تھا۔ شب کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارا۔ صبح کو وقت سے پہلے بیدار ہو گئے اور مسجد میں پہنچ گئے۔

ابنِ عجم آپ کا جانا پہچانا ہوا تھا۔ اسرائیلیّت سے بھی آپ واقف تھے مگر مجرم اُس وقت تک مجرم نہیں ہوتا جب تک از تکابِ مجرم نہ کرے۔ ابنِ عجم کی تلوار سر پر پڑی تو آپ کے مُنہ سے نکلا۔

”برب کعبہ! میں کامیاب ہوا۔۔۔!“

اس کامیابی میں کیا رموزِ پنہاں تھے، اس کو آپ ہی جانتے ہوں گے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ قاتل کے ہاتھ میں جس نے تلوار دی تھی، آپ اس کو بے نقاب کر رہے تھے لیکن ہٹ دھرم دُنیا نے اس کو بھی وضعی روایتوں کے پردے میں چھپا

دیا اور آج صبح صورتِ حال سامنے رکھنے پر بھی ماننے کو تیار نہیں۔

اطلاع پاتے ہی حسین، حضرت محمد حنفیہ، حضرت عباس اور دوسرے بنی شام آگئے۔ امیر المومنین کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ بڑا حوں کو فودا بلایا گیا۔ ٹانگے دلوئے گئے مگر تلوار زہر آلود تھی۔ حضرت معاویہ کے اسلو خانے میں جو مہلک ترین زہر تھا اس میں ایک ماہ تک بھی ہوئی تلوار کا زخم بڑا حوں کے پس کا ثابت نہ ہوا، اور ۲۱ رمضان کو شب ڈھلے پر آپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مرنے سے قبل آپ نے بہت سی وصیتیں کیں جس میں کو امیر امامت تعلیم فرمائے سارے بیٹے اور بیٹوں کو امام حسن کے سپرد کیا۔ عباس کا ہاتھ امام حسین کے ہاتھ میں دیا۔ اس طرح حضرت عباس کو حضرت امام حسین کی نصرت کی تلقین کی۔ آپ ان ذمہ داریوں سے ہمکدوش ہو گئے جو رسولِ آپ کے سپرد کر گئے تھے۔

دارِ ثمان بالحد

حدیثۃ الکبریٰ کی اٹھوٹی بیٹی آپ کی شریکِ حیات تھیں۔ پیغمبر اسلام کی اس شہنت پر سبھی عمل پیرا رہے کہ جنابِ فاطمہؑ زہراؑ کی زندگی میں کسی عقد کا تصور بھی نہیں کیا۔ دینا کو نہ جانے آپ کی ذاتِ گرامی سے کتنا بغض ہے کہ اس امتیاز کو بھی چھین لینے کی کوشش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ عکرمہ کی دختر سے عقد کو چاہتے تھے مگر حضورؐ ناراض ہوئے اس لئے نہیں کیا۔ یہ اعتراض حقیقتاً علیؑ پر نہیں ہے بلکہ ہادی دین پر خود غرضی کا الزام ہے کہ اُمت کو تو عدل کی شرط کے ساتھ چار شادیوں کی اجازت دے دی مگر اپنی بیٹی کا مسئلہ آیا تو ناگواری کا اظہار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حدیثۃ الکبریٰ کے سامنے بھی کسی عورت کی کوئی قیمت نہیں تھی اور آپ کی بیٹی فاطمہؑ زہراؑ تو سیدۃ النساء العالمین تھیں بٹی کو اس سے زائد کیا چاہیے تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ علیؑ اس معاملے میں خود پیغمبرؐ سے زیادہ خوش نصیب تھے کہ انہیں صورت میں عینِ جلال، سیرت میں سراپا کمال بوی ملی تھی جو رسولؐ کے لئے محترم اور پروردگار کی نظر میں عزیز و محترم

تھے، وہ بنتِ عکرمہ یا کسی دوسری عورت کے بارے میں سوچ کر کفرانِ نعمت تو نہ کر سکتے
حضرت علیؑ کی ازدواجی زندگی صحیح معنی میں ساڑھے آٹھ سال یا نو سال کی تھی
اور یہ وہ زمانہ تھا جس کو آپؐ بھی فراموش نہ کر سکے۔۔۔۔۔ یوں تو بعد میں آپؐ
نے دس عورتوں سے عقد فرمایا جو تقاضائے بشری تھا اور اس سے زائد کا مقصد نشانے
مشیت کو پورا کرنا تھا۔ رحلت کے وقت آپؐ کی چار بیویاں موجود تھیں۔ جنابِ امامہ
جنابِ اسماء، جنابِ لیلیٰ و اُم البنین۔ بارہ بیٹے اور سولہ بیٹیاں یادگار تھیں۔

محمد حنفیہ

پانچ بیٹے، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت عمر بن علیؑ، حضرت
عباسؑ اور حضرت محمد حنفیہؑ یادگار عصر گزرے۔۔۔۔۔ محمد حنفیہؑ مردِ فقہ و متقی تھے
آپؐ کی والدہ گرامی قبیلہ حنفیہ بن لحیم سے تھیں۔ نامِ خولہ عرفیت حنفیہ تھی۔ محمد حنفیہؑ کی
ولادت ۷۱ھ اور وفات ۱۱۷ھ میں ہوئی۔ شجاعتِ ماں اور باپ دونوں سے
پائی تھی مگر داہنے ہاتھ کی انگلیاں ایک زرہ کو ہاتھ سے چھوٹی کرنے میں بیکار ہو گئی
تھیں۔ اس لئے سفر میں امام حسینؑ کا ساتھ نہ دے سکے۔

حضرت علیؑ کی شہادت یقیناً شام کے لئے دل خوش کن ہوئی ہوگی لیکن کوٹنے
میں گہراں میچ گیا اور مدینے میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ رسولؐ کی میت گنتی کے لوگوں نے
اُٹھائی تھی، لیکن علیؑ کا جنازہ بڑی دھوم سے اُٹھا۔ دوست تو شریک تھے ہی، دشمنوں
نے بھی مشایعت کی تاکہ ان پر شریک قتل ہونے کا شبہ نہ کیا جاسکے۔ کوفہ سے پانچ میل
اور بغداد سے ایک سو بیس میل کے فاصلے پر آپؐ کا مزارِ مرجعِ خلافت ہے۔

اسپرٹ آف اسلام میں آپؐ کی شہادت پر میجر او زبرن کا ایک تبصرہ نقل کیا گیا

ہے کہ :-

”حضرت علیؑ کی موت ایک ایسے شخص کی موت تھی جو ان تمام افراد میں، جن کی
یاد تاریخِ اسلامی نے محفوظ رکھی ہے، سب سے صادق القلب اور افضل ترین مسلمان

تھا۔ اگر حضرت علی سات سو سال پہلے دنیا میں آئے ہوتے تو انھیں عیسوی کلیسا کی طرف سے ولایت کا درجہ عطا ہوتا اور اگر تیرہ صدیوں بعد آتے تو ان کی ذہانت، قابلیت، نیک سیرتی اور شجاعت، مہذب دنیا سے خراج تحسین حاصل کرتی۔ ایک حکمران کی حیثیت سے وہ بہت پہلے پیدا ہو گئے۔ ان میں صداقت پسندی، حلم و تواضع اور رحمہ دلی کی جو صفات تھیں، ان کے ہوتے ہوئے بنی امیہ کی غداریوں اور دروغ باقیوں سے ہنٹان کے بس کا کام نہ تھا۔“

اس تبصرے میں ایک اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ دیگر زائرِ عرب کے ہادی نے حکومتِ الہیہ کے لئے جو زمین تیار کی تھی اور اپنے نائبِ برحق کو جو مزاجِ حکمرانی عطا کیا تھا، ان دونوں کے مابین اگر کوئی فصلِ واقع نہ ہوتا اور مسلکِ نظم و نسق میں مفاد پرستی اور مصلحت کی رکاوٹیں کھڑی نہ کر دی جاتیں تو نبیؐ کے بعد بھی صداقت و نفاذی میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا لیکن اس کو اسلام کی بد نصیبی ہی کہنا چاہیے کہ علیؑ کی موت کے اُس وقت ملا حجب و ابتدائی فرمانرواؤں کے بعد تیسرے کی خود غرضانہ اقربا پروری پوری بساطِ حکومت پر اپنے پنجے گڑھ چکی تھی اور دونوں کے ایمانِ خالص پر حوصِ دنیا کی ہر مہر ثبت ہو چکی تھیں۔ ایسے میں شاگرد تو شاگرد اگر خود استادِ مطلق بھی آتا تو اس کو بھی انہیں حالات سے گزرنا پڑتا جن سے ابوطالب کا بیٹا دو چار ہوا۔

علیؑ :- ایک نشانِ تجلی

عقیدے کی روشنی میں علیؑ کے فضائل اُن گنت ہیں۔ مسجود ملک، استادِ جبریل، مولودِ کعبہ، نائبِ رسول، مددگارِ انبیاء، صاحبِ ذوالفقار، سان اللہ، نفس اللہ، وجہ اللہ، ید اللہ، قسیمِ الجنت والدار، مالکِ لوائے حمد، ساتی کوثر وغیرہ وغیرہ۔ آیۃِ تطہیر، آیۃِ صالح المومنین، آیۃِ ولایت، آیۃِ مباہلہ، آیۃِ بخوی، آیۃِ اذنِ داعیہ، آیۃِ طعام، آیۃِ بلخ، سورہ ہل اتی، آپ کی شان میں نازل ہوئیں۔ سرورِ کائنات کی کتنی ہی حدیثیں آپ سے متعلق ہیں: حدیثِ مدینہ، حدیثِ سفینہ، حدیثِ نور، حدیثِ منزلت، حدیثِ خیر، حدیثِ خندق، حدیثِ طبر، حدیثِ ثعلین، حدیثِ غدیر وغیرہ

پیغمبر اسلام کے بعد آپ کائنات کے لئے ہادی برحق تھے لہذا آپ نے اپنی ذات سے اکل حلال حاصل کرنے کی ایک نظیر قائم کی۔ مزدور کی حیثیت سے کام کیا، مٹی دھوئی کنویں سے پانی کھینچا، باغ سینچا اور دنیا کو بتایا کہ کسبِ معاش جائز طریقہ سے حاصل کیا جائے تو کوئی کام چھوٹا نہیں ہوتا۔ اجرت میں آپ عموماً جو لیا کرتے تھے جناب فاطمہؓ زہراؓ خود چکی پیس کر اٹا تیار کرتیں اور روٹی پک کر تیار ہوتی تو عموماً مانگنے والوں کو دے دی جاتی۔ اہل بیت اطہار کو اکثر بغیر کچھ کھائے سوتا پڑتا تھا۔

علیؑ، علم، شجاعت، ایمان، دانائی، حکمت، ذہانت اور جود و سخا کا پیکر تھے سب سے پہلے جامع قرآن، مُصنّف، خطیب اور شاعر، مرنے سے کچھ دن پہلے مسجد کوفہ میں سر منبر فرمایا تھا۔ ”پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے۔“ مگر دینا نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، اور کچھ ہی دنوں بعد ۶۲ سال کی عمر میں یہ نشانِ کفر و خفیہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ آپ کے خطبات کا مجموعہ تنج البلاغہ کے نام سے موجود ہے۔ باقیات میں سے بعض خطبات منظرِ عام پر آتے جا رہے ہیں۔ کلام کا ایک حصہ دیوانِ حضرت علیؑ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ باقی کلام نہیں ملتا۔

علامہ اقبال مسلم اول شہِ مردان علیؑ
مولانا روم افتخارِ سہروردی و ہر ولی

دوسرے امام

امیر المومنین حضرت امام حسن علیہ السلام

رمضان ۴۸ھ تا ۲۸ صفر ۵۰ھ

تعارف

سرور کائنات کا پہلا نواسہ ۱۵ رمضان ۳۲ھ کو پیدا ہوا کسی نے اس کا نام حمزہ تجوید کیا تھا مگر حضرت جبریل ایک رومال لے کر حاضر ہوئے جس پر حسن لکھا تھا اس لئے آپ کا نام حسن رکھا گیا اور غریت، بارون و صی موسیٰ کے بیٹوں کے نام بشرف و کبر کی رعایت سے شرف قرار دی گئی۔

پیغمبر اسلام نے باپ کی طرح بیٹے کو بھی اپنی زبان چسائی، پھر آپ سید علیان کے دودھ سے پرورش پانے لگے۔ آپ کی تربیت کے لئے صرف حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کا نام کافی ہوگا لیکن سترادیر کہ مدینۃ العلم اور باب مدینۃ علم دونوں سے فیض حاصل کیا۔ پھر رسول کے بعد کا پر آشوب دور بھی دیکھا۔ حضرت علی کی خلافت ظاہری میں آپ پوری طرح جوان تھے۔ جنگ صفین میں جو ہر شجاعت دکھائے۔ بعد کے زمانے میں حضرت معاویہ کی سازشیں بھی آپ کے علم میں تھیں اور وہ دور بھی یاد تھا جب امیر المومنین معاویہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے لیکن لوگوں نے تعاون نہیں کیا۔

نوٹ:- مولف کے نزدیک تمام ائمہ ہی امیر المومنین ہیں لیکن بعض روایات کی بنا پر اختلاف ہے اس لئے بریکٹ میں کر دیا گیا۔

زمانے کی بے وفائی

حضرت علی کی شہادت کے بعد جب آپ کو بالاتفاق منصب خلافت پر بٹھایا گیا تو حالات روز روشن کی طرح آپ کے سامنے تھے۔ کوفہ شامی جاسوسوں اور خلافت کے غداروں سے بھرا ہوا تھا۔ اشعث ابن قیس، عمرو بن حرث، شیش ابن ربیع، عمار بن ولید، حجر بن عمر، عمر ابن سعد، ابوسرہ بن موسیٰ اشعری، اسمعیل بن طلحہ اور اسحق بن طلحہ کتنے ہی لوگ تھے جن کا دمشق سے رابطہ تھا۔ خارجیوں کے نام ان سے الگ لئے جاتے ہیں مگر یہ تاریخی خیانت ہے۔ عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن الکوا، اشعث بن قیس اور شمر ذی الجوشن وغیرہ بھی انہی میں شامل تھے۔ یہ معاویہ کی سیاست تھی کہ وہ علیؓ علیحدہ دو گروہوں کو ایک ہی ہدایت دیتے تاکہ ایک کی خیر دوسرے سے ملتی رہے۔

ان بگڑے ہوئے حالات میں بھی جوہر خالص ابن علی کے پاس موجود تھا قیس بن سعد، عدی بن حاتم، معقل بن قیس ریاحی اور زیاد بن صعصعہ وغیرہ وہ افراد تھے جنہوں نے ایسے ہی حالات میں علی ابن ابی طالب کا ساتھ دیا تھا اور علی کی شخصیت کا سہارا لے کر بے غیرتوں کو غیرت دار بنا کر لڑنے پر تیار کر لیا تھا لیکن فی الوقت شام کے اسلحہ خانے سے زرد جواہر کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ ساری قوم لوٹنے میں لگ گئی آخر جس طرح مسلمانوں نے اُحد میں رسول کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح آپ کے نواسے کے گرد چند ہوا خواہ باقی رہ گئے۔ ایسے میں بنی ہاشم بھی متحد نہ رہ سکے۔

عبداللہ ابن عباس نے علی سے دو گردانی ہنرور کی تھی مگر شام کی پناہ میں نہیں گئے اور چند روز بعد منہجیل بھی گئے مگر ان کے چھوٹے بھائی عبید اللہ ابن عباس نے یہ بھی کر دکھایا اور امام حسن کے شکر سے نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ معاویہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی طرح شب کی تاریکی میں روز کچھ نہ کچھ آدمی جاتے رہے اور اس کا اثر عام سپاہیوں پر بڑا پڑتا رہا۔ پھر بھی قیس بن سعد اور عدی بن حاتم طائی بددلی کو دُور کرتے کی کوششیں کرتے رہے۔

حضرت معاویہ ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر بغداد سے دس فرسخ پر خمیہ زن تھے

جن کے مقابلے پر جناب امام حسن علیہ السلام نے بارہ ہزار فوج بطور ہرا دل بھیجی اور باقی لشکر کے ساتھ خود عقب میں بڑھ رہے تھے۔ صفین کا کھلاڑی مکرو فریب کا ہر داؤں پہلے ہی عمل میں لا چکا تھا اور اپنے آدمی اس نے امام حسن کے لشکر میں جمع کر دیئے تھے۔ اس موقع پر اس نے ایک طرف توقیس کے لشکر میں یہ خبر اڑائی کہ امام حسن نے معاویہ سے صلح کر لی لیکن جہانہ قیس خود اسی میدان کے مشہور تھے، معاویہ ان سے بازی کیا لے جاتے مگر امام حسن کے ساتھیوں میں جب یہ خبر پھیلی کہ قیس نے صلح کر لی تو وہ بد دل ہو گئے اور ایسے میں معاویہ کے آدمی ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

”حسن اپنے باپ کی طرح کافر ہو گئے ہیں۔“ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ امویوں ہی کے ہو سکتے تھے، کوئی پیر و علی تو یہ گستاخی کر ہی نہ سکتا۔ اس کے بعد یہ لوگ امام حسن کے خیمے میں در آئے۔ سامان لوٹ لیا، مصلیٰ نیچے سے کھینچ لے گئے یہاں تک کہ دوشِ مبارک سے روتا تک اتار لی۔ منصوبہ یہ تھا کہ امام حسن علیہ السلام کو گرفتار کر کے معاویہ کو پہنچا دیں لیکن ان کا زور نہ چلا۔ امام کے خدا کا آپ کو بچا لے گئے اور مدائن کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں معاویہ کے آدمیوں نے آپ پر حملہ کیا اور ایسا خنجر مارا کہ ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

مدائن پہنچ کر آپ نے علاج کرایا۔ اس آئنا میں شام کا جرنیل عبداللہ ابن عامر بیس ہزار فوج لے کر مقابلے کے لئے آ پہنچا اور اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ خود معاویہ ایک بڑا لشکر لے کر آ رہے ہیں۔ اس سے امام حسن کے شکاریوں سرسبک پیڑا ہو گئی۔ امام حسن خیر تنگن کے بیٹھے تھے۔ بطحا امن پسند ضرور تھے اور زہد و تقویٰ آپ کے خمیر میں تھا مگر جنگ میں پیٹھ دکھانا شرافتِ نسل سے بعید تھا۔ پھر بھی غور طلب یہ امر تھا کہ چھوٹی سی فوج اور اس کی بھی ہمتیں پست۔ ایک لشکرِ قہار کا مقابلہ کیونکر کیا جا سکتا تھا!

صلح حسن

صلح حدیبیہ امام حسن علیہ السلام کی دیکھی ہوئی بات تھی لیکن امام کو علم لَدُنِی ہوتا ہے اور بزرگوں سے بھی اس کی تفصیل سن رکھی تھیں۔

سقیفہ کے انتخاب کے بعد عظیم المرتبت باپ کی خاموشی کو آپ نے چشم خود دیکھا تھا اور یہ آپ ہی تھے جنہوں نے چھوٹے بھائی کی ہمراہی میں بھری مجلس میں حضرت ابوبکر کو ٹوک دیا تھا۔

”اُتر میرے ناناکے منبر سے۔۔۔!“

کچھ دنوں پہلے کی بچپانگی کو بھی انہوں نے محسوس کیا تھا۔ آج آپ انہیں حالات میں تھے جن سے امیر المؤمنین دوچار رہے تھے مسلمانوں کا رنگ طبیعت ناناکا کی موت پر معلوم ہو چکا تھا۔ ایک امام کے لئے دوسرے امام کی سیرت سنت کا درجہ رکھتی ہے، لہذا آپ نے اقتدار کے لئے مسلمانوں کا خون نہ بہانے کا فیصلہ کیا۔ بخیر اس کو آپ کی کمزوری پر محمول کرتا ہے مگر ان سے پہلے یہ الزام حضرت علی ابن ابی طالب پر لگانا پڑے گا، جنہوں نے سقیفہ کے بعد نیام میں چلتی ہوئی ذوالفقار کو تھپک کر سُلا دیا تھا اور اپنے صحابیوں کے کھولے ہوئے خون کو نرم گفتاری سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ لہذا آپ کے بیٹے نے بھی طے کیا کہ وہ تو منصوص من اللہ ہے، خلافت ظاہری یا اقتدار اگر مسلمان آپ کے پاس رکھنا نہیں چاہتے تو خوں ریزی کیوں کی جائے؟ علیؑ نے خلافت خود کو حاصل نہیں کی تھی، مسلمانوں نے دروازے پر حاضر ہو کر پیش کش کی تھی تو آپ نے قبول کر لیا تھا۔ اب تنھوڑے سے لوگوں کو پھوڑ کر باقی سب داس لینا چاہتے تھے تو بزدل شمشیر روکنے کی سعی کیوں کی جاتی۔ آپ نے فیصلہ کر لیا کہ آپ صرف فرائض امامت ادا کرتے رہیں گے۔ معاویہ کوئی بار صلح کی پیشکش کر چکے تھے آپ نے حامی بھر لی جو مفاد اسلام، احساس فرض اور نفس کشی کی آخری منزل تھی، اور اس کے بعد شرائط صلح مرتب ہو گئے۔

۱۔ معاویہ نے حکومت میں کتاب خدا اور سنت رسول پر عمل کریں گے۔

۲۔ معاویہ کو اپنے بوجہ کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔
 ۳۔ شام و عراق، حجاز و یمن ہر جگہ کے لوگ محفوظ و مامون ہوں گے۔
 ۴۔ شیعان علیؑ اور اصحاب علیؑ جہاں بھی ہیں یا ہوں گے، ان کے جان و مال عزت و ناموس ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

۵۔ معاویہ کی طرف سے حسن ابن علیؑ یا حسین ابن علیؑ یا خاندان رسالت کی کسی فرد کو خفیہ یا علانیہ ڈرایا دھمکایا نہ جائے گا اور نہ ان کو نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۶۔ امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی شان میں جامع مسجد اور قنوت میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ بند کر دیئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔
 ۲۵ ربیع الاول ۴۰ھ میں کوفہ کے قریب انبار میں فریقین کا اجتماع

ہوا اور دونوں نے دستخط کر دیئے۔ حضرت معاویہ کی عہد شکنی

امام حسنؑ نے بڑے ضبط و تحمل اور صبر و استقلال کے ساتھ یہ سب برداشت کیا کہ اس طرح پرسکون حالات میں انہیں تبلیغ کا موقع میسر آجائے گا۔ معاویہ نے سیاسی اقتدار مضبوط ہوتے ہی نخیلد میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے کہا۔

”جنگ سے میرا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو، روزہ دار بن جاؤ یا حج و زکوٰۃ کی پابندی کرو۔ یہ سب تو تم کہتے ہی ہو۔ میرا مقصد تو حکومت پر مکمل تسلط حاصل کرنا تھا، وہ میں نے کر لیا۔ رہ گئے شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کئے ہیں، وہ میری ٹھوکر پر ہیں۔ چاہوں تو پورا کر دوں، چاہوں نہ کر دوں۔“

اس تقریر پر مجمع ساکت رہ گیا مگر اب کس میں دم تھا کہ زبان کھول سکتا۔

اور صحیح کہا تھا معاویہ نے، انہوں نے واقعی ایک شرط بھی پوری نہیں کی
 آخر امام حسنؑ کوفہ کی سکونت ترک کر کے مدینے آ گئے۔

آلِ محمدؐ کا اب اقتدار سے کوئی تعلق نہ رہ گیا تھا مگر ظالم خواب میں بھی اپنے

خداشات سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس لئے حضرت معاویہ اب بھی امام حسنؑ کو اپنی راہ کا کاٹنا سمجھتے تھے، انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی امام حسنؑ کو فراموش نہیں کیا، تلوار اور زہر دو کاری حربے ان کے پاس تھے۔ تلوار کو حضرت معاویہ نے آزمایا تھا مگر امام حسنؑ بچ گئے تھے پھر وہ تلوار کی زد ہی سے ہٹ گئے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ معاویہ کے خلاف درزی کرتے ہوئے اب اگر کھلم کھلا تلوار کا استعمال کیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ بغاوت ہو جائے اس لئے زہر کا استعمال مصلحت وقت کے مطابق ٹھہرا اور معاویہ نے اس کے استعمال کے لئے مہرتے ملاش کرنا شروع کر دیئے۔

امام حسنؑ کی شہادت

موصل کا ایک آدمی حبیب اہل بیت تھا۔ وہ طمع دنیا میں چھنس گیا۔ اس نے بصرے کے سفر کے دوران موصل کے قیام میں تین مرتبہ امام علیہ السلام کو زہر دیا مگر اس نے اثر نہ کیا۔ آخر وہ پکڑا گیا اور ہلاک ہوا۔

مدینے میں بھی حضرت معاویہ نے امام حسنؑ کی ایک بیوی جعدہ بنت شعث کو توڑ لیا تھا۔ ایک ہزار دینار مخرج، پچاس مہری خلعت اور زید سے شادی ہو جانے کے لالچ میں بدلیصیب عورت نے کئی بار کھانے میں زہر ملا یا مگر اس کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ آخر جعدہ نے اس پانی میں زہر ملا دیا جو امام سوتے سوتے اٹھ کر پیتے تھے۔ آپ صبح نماز کے لئے بیدار ہوئے تو وہ پانی اٹھا کر پی لیا اور پیتے ہی حالت غیر ہو گئی۔ آپ نے بچا ہوا پانی مع برتن زمین پر پٹکا تو زمین ابلنے لگی۔ امام کا کھجہ زہر کے اثر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ امام حسینؑ بھائی سے لپٹ کر رونے لگے امام حسنؑ نے سنبھل کر سب لوگوں کو صبر کی تلقین کی، امام حسینؑ کو صیتیں کر کے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور ۲۸ صفر ۵۵ھ میں بعمر ۴۲ سال سپرد خاک کر دیئے گئے۔

دجازے میں اٹنا ہجوم تھا کہ مدینے میں اس کی مثال نہ ملتی

ایک شریک جنازہ کا بیان ہے کہ اگر سوئی پھینکی جاتی تو کثرتِ ازہار

سے زمین پر نہ گر سکتی تھی“ (۷۸)

یہ خبر جب دمشق پہنچی تو معاویہ نے حبش فرمایا۔ اس کے بعد جودہ بنت اشعث اپنا انعام پانے کے لئے وارد ہوئی۔ معاویہ نے کہا۔ تو جب امام حسن کی نہ ہوئی تو کسی اور کی کیا ہوگی؟ کہا جاتا ہے کہ معاویہ نے ہاتھ پاؤں بندھوا کر جودہ کو دریائے نیل میں ڈالوا دیا تھا۔

اہل بیت رسول کے لئے یہ سانحہ عظیم تھا لیکن مصائب ان کا مقدر بن چکے تھے انہوں نے بڑے ضبط سے پیغمبر کے بڑے نواسے کا خازن اٹھایا اور وہ رسول کی طرف لے کر چلے۔ قریب پہنچے تو ایک مجمع سدرہ تھا۔ مورخین نے اس موقع پر بددیانتی کا ثبوت دیا ہے کہ ام المؤمنین عائشہ نے اجازت دے دی تھی مگر مردان نہیں مانا۔ مردان کی کیا ہمت تھی کہ عائشہ اجازت دے دیتیں اور وہ راستہ روک لیتا اور اس کو مان بھی لیا جائے تو حضرت عائشہ خیر پر سوار وہاں کیا کر رہی تھیں جس کی بعض مورخین نے تصدیق کی ہے۔

واقعات پر مسلسل تاریخی ملے سازی کے باوجود بعض مورخوں نے واضح الفاظ میں حضرت عائشہ کا جواب لکھ دیا ہے۔

”انہوں نے فرمایا: یہ جگہ میری ہے میں اس میں دفن کرنے

کی اجازت نہیں دیتی“ (۷۹)

جگہ ان کی تھی یا نہیں؟ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے فی الوقت تو زیر بحث یہ بات ہے کہ پیغمبر کے نواسے کو نانا کے پہلو میں دفن نہیں ہونے دیا گیا اور ام المؤمنین خود اپنے نواسے کی میت روکنے کے لئے سدرہ ہو گئیں۔

امام حسین، محمد حنفیہ، عبداللہ ابن جعفر اور عباس ابن علی، قاسم بن محمد اور بنی ہاشم کی بڑی تعداد اور مہزاروں مہمان اہل بیت کی موجودگی میں امام کا خازن کون روک سکتا۔ تنواریں بے نیام ہو گئیں مگر امام حسن نے پہلے ہی چھوٹے بھائی کو دھیت کر دی تھی کہ جھگڑا نہ کرنا۔ آپ نے بڑی بے چارگی سے بھائیوں کو سمجھایا اور خازنہ کے جنت البقیع کی طرف چل پڑے لیکن پیچھے سے تیروں کی باڑھ پڑی

اور کئی درجن تیر خازے میں پیوست ہو گئے۔ ایک بار پھر صورتِ حال قابو سے باہر ہو گئی لیکن امام حسین نے پھر سنبھال لیا اور بڑے بھائی کو جنت البقیع میں لے جا کر دفن کر دیا۔

ازدواج و اولاد

آپ نے مختلف اگات میں نو شادیاں کیں۔ اُم فروہ، خولہ، اُم بشیر، ثقیفہ، رملہ، اُم اسحاق، اُم الحسن، بنت امر القیس، جودہ بنت اشعث، آسمٹھ بیٹے اور سات بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ نسل صرف جناب زید اور جناب حسن مثنیؑ کے چلے۔ زید نے بعمر ۹ سال انتقال فرمایا۔ جناب حسن مثنیؑ کی شادی جناب فاطمہ بنت حسین سے ہوئی تھی۔ سلیمان بن عبد الملک نے ۵۹ھ میں آپ کو زہراؑ دلوا دیا تھا جس سے آپ نے ۵۲ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

سیرت

آپ کی صورت حضور اکرم سے بہت مشابہ تھی۔ مفسر قرآن، عابد و زاہد، عالم، بہیمان، تہجد گزار، رحمدل، وسیع النظر، سخی اور پیادہ حج کرنے کے بہت شوقین تھے۔ توکل، اخلاق اور حسنِ عمل آپ کا طرہ امتیاز تھا۔ مہمان نوازی خیر میں داخل ان باتوں کے با وصف شجاعت میں علی ابن ابی طالب کے وارث اور اتنے شجاع تھے کہ امیر المومنین نے جبل و صفین میں آپ کو علمدار رکھ دیا تھا۔ اہل بیت سے متعلق ہر حدیث اور ہر آیت میں شامل تھے۔ سید شباب اہل جنت تھے اور خدا کی طرف سے رسول کے دوسرے جانشین۔

مخالف مؤرخین نے آپ کو کثرت ازدواج کے الزام سے مطعون کیا ہے یہ سچے بغیر کہ وہ سنت پیغمبری کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس بہتان کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو شرعاً اس کا جواز خود فقہاء کی سمجھ میں آجائے گا۔ رسول کی اس سنت کا مقصد تنہا کھانا و تنہا سلوا (نکاح کرو اور نسل بڑھاؤ) ہوتا ہے۔ ہمارا کوئی امام عام انسانوں جیسا تو نہیں۔ اس کا ہر کام مقصدی تھا۔

کسی نے کسی امام سے پوچھا تھا کہ بیوی کے پاس کب جانا چاہیئے؟ جواب ملا کہ جب ضرورت ہو۔ یہ ضرورت وسیع المعنی ہے اور امام کے سامنے تو ضرورت تھی رسول کا قتل عام پیش نظر تھا۔ ایسے میں اولاد کثرت سے چھوڑ نہ جاتے تو کوئی نام لیا بھی باقی نہ رہتا۔

حضرت معاویہ کا شاطرانہ دور حکومت

حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت امام حسن سے جو جنگیں ہوئیں ان میں معاویہ نے جو تدبیریں کیں اور زہر و تلوار کے جو حربے استعمال کئے وہ مادی نظریئے سے بھی بمشکل ردوار کھے جاسکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی خلافت حاصل کرنے کا امیدوار اگر ان کا مرکب ہو تو سرسبز سے ٹھک جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جانبدار قلم ایسے ہر عیب کی تاویل ڈھونڈھے اور کفر کو اسلام ثابت کرنے کا ہتھیار کر لے۔

حضرت معاویہ کا کردار اگر آج کے دور میں برائے کار آتا تب بھی انسانی نزائے نگاہ سے دنیا حیح اُٹھتی۔ آج بھی کوئی قوم جنگ میں نہ رہے ہم استعمال کر لیتی ہے تو خلق اللہ میں مطعون ہوتی ہے نہ کہ چودہ سو سال پہلے والی شائے روم سے درآمد کئے ہوئے قاتل زہر سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ دشمن بھی ایسے جو حق و صداقت کے علم بردار تھے اور جن کے کرداروں پر انگلی نہ اُٹھائی جاسکتی۔

شیاعت کا جہاں تک تعلق ہے وہ ان میں عام سطح سے زائد نہ تھی وہ کسی طرح اولاد رسول کا مقابلہ نہ کر سکتے لیکن مکاری میں اولاد رسول کیا، بڑے بڑے سامنے نہ ٹھہر سکتے۔ ہاں ان ہی جیسا کوئی ہوتا تو دانت کھٹے کر دیتا۔ جیسے امام حسن کے سپہ سالار قیس تھے، جو رئیس انصار سعد بن عبادہ کے بیٹے تھے۔ قیس بن سعد کو امام حسن کی صلح ایک نظر نہ بھائی تھی مگر کرتے کیا، باپ نے مسلمانوں کے خلاف تلوار نہ اُٹھائی تھی تب بھی سعد بن عبادہ نے ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی۔ بیٹے نے تلوار رکھ دی تو سعد کے جانشین قیس نے بیعت نہیں کی اور وہ بیعت کیوں کرتے؟ مٹا سے وہ کسی طرح کم تو نہیں تھے بلکہ شجاعت میں زیادہ تھے۔

اور ہوا بھی دیا ہی کہ معاویہ نے ہزار جتن کر ڈالے۔ کتنے ہی قاصد بھیجے۔ صلح کی آسان سے آسان شرائط پیش کیں مگر قیس ان کے جھانسنے میں کہاں آنے والے تھے انہوں نے ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ قیس کے پاس بیس ہزار سپاہ تھی اور معاویہ ان کے مقابلے میں لاکھوں کاشتکاراں کے تھے لیکن مرد میدان قیس قطعاً ہر سال نہ تھے ان کو اپنے قوت بازو پر یقین تھا کہ مقابلہ ہو گا تو چھکے چھڑا دیں گے۔ اُدھر معاویہ کی سوچ یہ تھی کہ اگر قیس سے ٹکر ہوئی اور انہیں شکست ہو گئی تو دوسروں کی ہمت بڑھ جائے گی اور خلافت ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے معاویہ نے قیس کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ مدائن پہنچ کر چہار جانب سے چوکنٹا بیٹھ گئے ایک مدت کے بعد انہوں نے معاویہ سے اپنی شرائط پر صلح کو لی اور بیعت نہیں کی۔

سچ تو یہ ہے کہ معاویہ صرف اللہ کے حق پرست سفیروں کے مقابلے پر شیر تھے ان پر ان کے تمام عیارانہ حربے کامیاب ہوتے رہے۔ ایک کو پشت سے تلوار کا وار کر کے، دوسرے کو زہر دلا کر ٹھکانے لگا دیا۔ سامنے سے آکر ضرب لگانا ان کے پس کا نہ تھا اور رسول کے جانشین اسی طریقہ جنگ کے قابل تھے۔ عرصہ صفین میں آج بھی امیر المؤمنین کی آواز گونج رہی ہے۔ تاریخ نے جس کو محفوظ کر لیا ہے ایک دن آپ نے جنگ شروع ہونے سے قبل میدان میں آکر لٹکرا تھا۔

”معاویہ کیوں خلق اللہ کو کٹوارا ہے۔ میدان میں آجا۔ میرے اور تیرے درمیان فیصلہ ہو جائے“

معاویہ نے کوئی جواب نہ دیا تو عمر عاص نے کہا

”سچ تو کہتے ہیں علیؑ جھگڑا تو تمہارا اور ان کا ہے تم دونوں ہی فیصلہ کر لو“

”شیر کے منہ میں جھونک دینا چاہتا ہے مجھے“ معاویہ نے جواب دیا اور کہا ”تا کہ میرے بعد تو خلافت پر قبضہ کر لے“

عمر عاص اس کی تردید کیا کرتا۔ وہ تو خود میدان میں مارے دہشت کے

علیؑ کے سامنے گھوڑے سے گر گیا تھا اور علیؑ کی تلوار سر پر چبکتے دیکھ کر اس نے اپنے کو
ننگا کر دیا تھا۔ علیؑ نے لاحول و لاشوۃ کہہ کر ہاتھ روک لیا تھا اور منہ دوسری
طرف کر لیا تھا۔

علیؑ کی لشکار پر معاویہ یا عمر عاص کوئی میدان میں نہیں آیا۔ ان کی جگہ باران
تیرنے علیؑ کا استقبال کیا اور پھر دونوں فرجیں متصادم ہو گئیں۔

یہی انداز شام کے ابتدائی دور حکومت سے چلا آ رہا تھا۔ حصولِ خلافت
کے لئے مشروع میں جس کسی نے گروہ بندی کی، غلط روایتیں گڑھوائیں یا آلِ محمدؐ
کی مفلوک الحالی کے اسباب فراہم کئے، وہ اس بیمانے پر نہ تھے۔ ان میں کبھی بھی
اولادِ رسولؐ کی تددانی کے مناظر بھی مل جاتے لیکن جب سے معاویہؓ تحتِ خلافت
کو مدینہ اور کوفہ سے دمشق اٹھا لائے تھے، اس وقت سے تو بنی ہاشم پر زمین
سخت اور آسمان دُور ہو گیا تھا۔ گویا ان کا بانی اسلام سے کوئی تعلق ہی نہ
تھا۔ حق تھا تو بنی اُمیہ کا، وراثت تھی تو بنی اُمیہ کی، اہلیت تھی تو بنی اُمیہ میں،
اہل بیت کچھ تھے ہی نہیں۔ کوئی ان کے ساتھ کچھ سلوک کرنا تو رحم کھا کر
ہندوستان کی عورتوں میں ایک محاورہ ضرب المثل ہے ”نچو اس کی
ڈھاڑی جس نے پہلی راہ بگاڑی“ اس محاورے کی صداقت سے انکار نہیں بلاشبہ
دیوار کی بنیادی اینٹ ٹیڑھی نہ ہوتی تو عمارت میں اتنی کچی پیدا نہ ہو سکتی لیکن دمشق
میں اسلام کا جو محل تعمیر کیا گیا تھا، اس میں بنیادی کچی سے بہت زائد کچی پیدا
کر دی گئی تھی۔ اس محل کی آرائش میں قیصر و کسریٰ کا رنگ غالب تھا
اور اس کو مدینہ کی سادگی سے کوئی ربط ہی نہ رہ گیا تھا۔

حدیث سازی

اس صنعت میں اولیت کا سہرا مدینہ والوں کے سر بند تھا ہے لیکن اس
کو عروج پر معاویہؓ نے پہنچایا۔ پہلے انہوں نے خلفائے ثلاثہ کی شان میں حدیثوں
کے انبار لگوائے اور جیسی حدیثیں حضرت علیؑ سے متعلق تھیں ان سے بہتہ دیا

ان جیسی ایک ایک موضوع پر کئی کئی حدیثیں تصنیف کرائیں اور ان کی اتنی تشہیر کی کہ اصل حدیثیں لوگوں کو یاد ہی نہ رہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آیات قرآنی کی غلط تفسیروں کے لئے علماء کی ایک ٹیم متعین کی جو منبروں پر اور کبھی کبھی بازاروں میں ان کے فرضی مطالب بیان کرتی رہی۔ ان مطالب میں اصل ممدوحین کو پس پشت ڈال کر آیتوں کی نسبت دوسروں سے دی جانے لگی۔ مثال کے طور پر مہابے میں جانے والوں کے علاوہ اہل بیت میں ازواج اور دوسرے سب لوگ شامل کئے گئے جن میں بنی امیہ کو خصوصیت حاصل ہے بلکہ اگر اس توسیع پسندی کو ڈھیل دی جائے تو اس میں تمام امت آجاتی ہے۔

حدیث سازی کی اس دھوم دھام میں یہ فیصلہ ناممکن ہے کہ کون کس پر بازی لے گیا۔ جامعین کا ذخیرہ اتنا بنتا ہے کہ علی کا کوئی شرف ایسا نہیں ہے جو دوسروں کو نہ ملا ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خود آنحضرت کے طرہ بڑے امتیاز بھی آپس میں منقسم ہو گئے۔

حضور کو اہل عرب نے صادق و امین مانا تھا تو بعد میں صدیق و امین سامنے آ گئے۔ لیکن ہمارے خیال میں ابو عبیدہ بن الجراح کو امین الامت کا لقب اس لئے دیا گیا تھا کہ علی شیبہ ہجرت سے امین رسالت قرار پائے تھے۔

حیرت بالائے حیرت اس پر ہوتی ہے جب خالد بن ولید کو سید اللہ اور لافقی الاہلی لا سیف الا ذوالفقار کے مقابلے پر سیف اللہ لکھا جاتا ہے، حالانکہ انہوں نے جنگِ اُحد کے بعد اسلام قبول کیا اور بعد کی کسی جنگ میں کوئی کار نمایاں انجام نہیں دیا۔ فتح مکہ کے وقت حضور نے ایک ہم پر بھیجا تھا تو ذاتی عداوت میں ایک قبیلے کو تہ تیغ کر دیا تھا اور حضور نے ان کے فعل پر باری تعالیٰ سے پشہ مانگی تھی۔

اس کے بعد ایک سال میں کون سا کار نمایاں انجام دیا کہ سیف اللہ بن گئے۔

ابن عثرہ المعروف بن لطفویہ کا شمار بزرگ ترین علماء و محدثین میں ہوتا ہے آپ

اپنی کتاب تاریخ میں ایک روایت نقل کرتے ہیں۔
 ”صحابہ کے فضائل کی اکثر جھوٹی روایتیں بنو اُمیہ سے تقرب حاصل کرنے کے لئے گڑھتے اور بناتے تھے۔ اس لئے کہ بنو اُمیہ صحابہ کے لئے جھوٹی حدیثیں گڑھا کر اور رواج دے کر یہ گمان کرتے تھے کہ اس سے بنو ہاشم کی توہین و تذلیل ہوتی ہے“
 پھر ایک سب سے بڑا ستم یہ ڈھایا کہ رادیوں میں ہمارے آئمہ کرام کا نام لیا جانے لگا کہ فلاں امام نے یہ حدیث بیان کی۔ وہ تو غنیمت ہے کہ اکثر متعصب جامعین نے ان حدیثوں کو لیا ہی نہیں جن کی نسبت اماموں سے ہے۔ بعض نے کچھ حدیثیں شامل کر لی ہیں تو ہم انہیں بغیر تحقیق کے مقبر نہیں سمجھتے۔

میزان، سیرۃ النعمان، آثار مرفوعہ، مشکوٰۃ اور صحیح مسلم کی رو سے آتی حدیث وضع کی گئیں جن کا شمار مشکل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ قدیم فنکار تھے۔ انہیں اس فن میں مہارت تامہ حاصل تھی لیکن بعض دوسرے بھی ان سے پیچھے نہیں رہے ابویہ بصری سے ۳۰۰، احمد بن حنبل سے ایک ہزار، احمد بن محمد سے ۵۰۰، احمد بن محمد بن فضل سے تین ہزار، جعفر بن زہیر سے چار سو، عبد الرحیم بن حبیب خاریانی سے ۵۰۰، عبد اللہ بن ابی العوجانہ سے چار ہزار، عمر بن جارد بن بلخی ستر ہزار بزرگ زندقہ سے چودہ ہزار احادیث منقول ہیں۔

احمد بن محمد بن عمر کو حدیثیں مسخ کرنے میں ملکہ حاصل تھا اور بعض ایسے تھے جو فی البدیہہ موقع کے لحاظ سے گڑھ لیا کرتے تھے، جیسے حسن بن عمر نخعی، سعد بن طارق، زید بن رفاع کذاب، محمد بن عمرو قدی۔ یہ صنعت اس زمانے میں انتہائی عروج پر تھی اور اصل احادیث کے الفاظ اتنی روانی سے بدلے جاتے تھے کہ صحیح کو جو حدیث سنائی گئی، شام کو اس حدیث کے الفاظ بدل گئے۔ اس لئے جامعین احادیث کو بڑی دشواریاں پیش آئیں اور حدیث ثقلین کئی کئی طرح سے بیان ہو گئی، کہیں عسقری، کہیں عسقری داہل بیت ہے، کہیں صرف سنئی ہے، کہیں سنئی و عسقری وغیرہ۔ جامع احادیث بے چارہ کیا کرتا، اس نے تو جو پایا وہ نقل کر دیا۔

ان احادیث سے بنی ایامہ کا مقصد ضرور پورا ہوا اور آل محمدؐ کی شخصیتیں، وقار اور سیرتیں سب مجروح اور مسخ ہو گئیں لیکن ان کے ساتھ توحید، رسالت اور کردار پیغمبرؐ بھی بچ نہ سکے، بالخصوص دین اسلام کی ہمہ گیری اور آفاقیت پر وہ کاری ضرب لگی کہ اس کی صداقت پر حرف آگیا۔ فاران کی چوٹی سے بلند ہونے والی آواز نے ضمیر انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن اب اس آوازیں اتنی آوازیں مخلوط ہو گئی تھیں کہ وہ پہچانی نہ جاتی۔

خدا کے بارے میں چند حدیثیں قابلِ ملاحظہ ہیں۔
اس کے بیٹھنے سے عرش چرچراتا ہے، جیسے نئی زمین کسی سوار کے بیٹھنے سے آواز دیتی ہے۔

خدا تخلیق کائنات سے پہلے ابریں اڑتا پھرتا تھا۔
خدا اپنی پنڈلی کھولے گا تو مومنین و مومنات سجدے میں گر جائیں گے۔
دوزخ تشنہ ہے، خدا اپنی پنڈلی ڈالے گا تب وہ بھرے گا۔
ملک الموت موسیٰ کی روح قبض کرنے کے تو موسیٰ نے اس زور کا ہلچل نہ کیا کہ ملک الموت کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔
خاتم المرسلین کی عزت افزائی اس طرح کی گئی:-

میں اور ابوبکر دو گھوڑے تھے۔ دونوں نبوت کے لئے دوڑ رہے تھے
میں آگے نکل گیا، مجھے نبوت مل گئی۔ وہ پیچھے رہ گئے تو خلیفہ بنے۔

سیاسی مقاصد کے حصول میں شروع ہی سے تین چیزیں پیش نظر تھیں اسلام
پیغمبرؐ اسلام اور اہل بیت۔

اسلام میں وضعی احادیث کے ذریعہ اتنی لچک پیدا کر دی گئی کہ اس کو اپنے
مقاصد کی خاطر کسی بھی سانچے میں ڈھالا جاسکے۔

پیغمبرؐ کی حیثیت ایک عام آدمی کی متعین کی گئی جو کبھی نبی ہوتے تھے اور
کبھی دنیا دار بشر۔ اس دنیا دار بشر کے لئے جنیات کی کہانیاں ذخیرہ کیا

میں پائی جاتی ہیں اور یہی دُنیا دار بشر جو اُس سال اُمّ المؤمنین عائشہؓ کے لئے ایسی باتیں کر گزرتا تھا جن کے سبب یورپین مورخین نے مطعون کیا ہے۔

سلسلہ نبوت ان پر ختم ہو چکا تھا اور نہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہونے کی بجائے نبی ہوتے۔ ایام جاہلیت کی زندگیوں کے داغ نکالنے کے لئے انشقاق صدر کر لیا جاتا اور انہیں طاہر کر کے تختِ نبوت پر بٹھادیا جاتا۔

آنحضرتؐ کے کردار کو مسح کرنے میں یہی نظریہ کار فرما تھا تا کہ اپنی لغزشوں کا جواز پیدا ہو سکے اور اسی لئے حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے روایتوں کے ذریعے ایسے واقعات منسوب کر دیئے گئے جو نبیؐ تو نبیؐ کسی محتاط آدمی میں بھی پائے نہیں جاتے۔

”علیقہ نے عبداللہؓ کے حوالے سے روایت کی ہے کہ ایک دن

آنحضرتؐ ظہر کی نماز پڑھانے کھڑے ہوئے تو چار کے بجائے پانچ رکعت پڑھا دی۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا تو آپؐ نے سہو کے

دو سجدے ادا فرمائے“ (۸۰)

”ایک دوسری روایت میں ابوسریہؓ سے منقول ہے کہ ایک بار حضورؐ کو چار رکعت پڑھانا سہی مگر آپؐ نے دو ہی رکعتوں پر نماز ختم کر دی۔ ایک شخص نے ادب کے ساتھ ٹوکا تو آپؐ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ آپؐ نے واقعی دو رکعتیں ہی پڑھائی تھیں؟ حاضرین نے تصدیق کی تو آپؐ پھر نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہو گئے اور مزید دو رکعتیں پڑھا دیں“

سہو و نسیان کا یہ مواد شاید اس لئے فراہم کیا گیا کہ حضرت عمرؓ نے کاغذ و قلم و دوات مانگنے پر فرمایا تھا کہ یہ شخص معاذ اللہ ہذیان بک رہا ہے یہ شخص جو زندگی میں اتنی بھول کا عادی رہا ہو، وقتِ آخر میں وہ بہکی بہکی باتیں کر سکتا ہے کسی کی غرض کچھ ہو، روایتیں لاکھوں گڑھ لی جائیں لیکن ہمارا نبیؐ خطا و

نسیان سے پاک تھا۔ اس سے غلطی تو غلطی ترکِ اولیٰ کا امکان بھی نہ تھا اور نہ ہم ایسی بے ہودہ روایات کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ ہماری روایت کا سلسلہ میرزا

اور صاف ہے اور درایت کا اصول بالکل واضح۔
 خدا مبارک کرے انہیں روایات کا یہ جنگل، جنہوں نے اس کا التزام کیا،
 نبی کی سیرت کو مجروح کر کے آپ کے اہل بیت پر دستِ تم دراز کیا اور وہ سب
 کچھ پایا جس کی انہیں آرزو تھی۔

بنی امیہ اور معاویہ کا مقصد اولیں حصولِ خلافت تھا یا زائد
 سے زائد یہ کہ اولادِ رسول کو اتنا پریشان حال اور بدنام کر دیا جا
 کہ وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے لیکن بڑا ظلم ڈھایا انہوں نے کہ توحید میں شرک
 شامل کر دیا اور سیرتِ رسول کو اتنا بد نما بنادیا کہ وہ ایک بلند کردار
 آدمی بھی باقی نہ رہے۔ (۸۱)

پیغمبر اسلام کو معراج جمائی نہیں ہوئی۔
 آپ میں جنسی ہوس اس درجہ تھی کہ شب و روز اپنی گیارہ بیویوں کے
 پاس جاتے تھے۔

آپ کے دل پر اکثر پردے پڑ جایا کرتے تھے۔

آپ کے باپ دادا سب کافر تھے۔

ابوطالب بالکل مفلس تھے۔

علیؑ نے عثمان کو قتل کیا۔

علیؑ و فاطمہؑ نماز صبح ادا نہیں کرتے تھے۔

امام حسنؑ کی بے شمار بیویاں تھیں۔

ایسی ہی بے شمار حدیثیں ہیں جن کو شہرت دے کر ہادی برحق اور ان
 کے نائبین کی سیرتوں کو آلودہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا خیمازہ آج
 مسلمانوں کو جھگتنا پڑتا ہے اور ہر دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر
 کیچڑا چھلتی رہتی ہے۔

ظلم کا طوفان

امام حسن علیہ السلام نے شرائط صلح میں ہر بات کا تحفظ کر لیا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ خلافت سے دستبرداری کے بعد معاویہ کی دشمنی ختم ہو جائے گی اور کسی کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے گا مگر محسوس ہوتا ہے کہ بات صرف خلافت کی نہ تھی بلکہ دشمنی تھی، اس صداقت سے جو رسول سے ان کی اولاد میں منتقل ہوئی تھی اور عدالت تھی اس نسل خون سے جو رسول کے بعد ان کی اولاد کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اس لئے معاویہ نے خلافت پاتے ہی ہر علاقے میں جابر اور ظالم عمال کو متعین کیا اور انہوں نے جاتے ہی حجازِ اہل بیت کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

مغیرہ بن شبہ کو کوفہ، زیاد بن سمیہ کو بصرہ اور ابوہریرہ کو مدینہ کا گورنر بنایا گیا اور زیاد کی مدد کے لئے سمیرہ بن جندب کو مقرر کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی عموماً ایسے ہی لوگ بھیجے گئے جو دشمنِ آلِ رسول تھے۔

حضرت ابوہریرہ تاریخ کی سلسلہ شخصیت ہیں آپ ابتداءً ایک فلاکت زدہ نبوی تھے۔ سلسلہ میں اسلام لائے۔ ساڑھے تین سال حضورؐ کا زمانہ دیکھا۔ اتنی مختصر سی مدت میں بے گنتی اور بے شمار حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔ ۲۱ھ میں حضرت عمرؓ نے آپ کی کارگزاری پر بحرن کا حاکم بنا دیا تھا مگر خیانتِ بحرمانہ کے باعث معزول ہوئے پھر معاویہ نے آپ کے جوہر قابل کی قدر دانی کے صلے میں مدینے کی امارت سونپ دی۔ آپ کے ہاتھ سادات کے خون میں تو نہیں رنگے لیکن دروغ بیانی سے سختی و صداقت کا اتنا خون ہوا کہ تاریخ اسلام آج بھی آپ کے نام پر کراہنے لگتی ہے۔

زیاد ایک پیشہ ور کینز سمیہ کا بیٹا تھا جس کو ابوسفیانؓ نے گھر ڈال لیا تھا مگر زیاد کو اپنا بیٹا تسلیم نہیں کیا تھا۔ لہذا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بنی امیہ کا دشمن ہے اور ان کے ہاتھوں بک نہیں سکتا۔ امیر المومنین نے بے خطر سمجھ کر اس کو ماتر کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ حضرت معاویہ نے سیاسی مصلحت کے تحت اپنا بیٹا تسلیم کر لیا اور کوفہ اس کے سپرد کر دیا۔

شروع میں مغیرہ بن شعبہ کو نے کا گورنر تھا۔ اس نے سیکڑوں علی والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے وظائف بند کر دیے۔ وہ علیؑ اور ان کی اولاد پر تبرہ ہی نہیں کرتا تھا بلکہ گالیاں بھی دیتا تھا۔ معاویہؓ کی بات پر اس سے ناراض ہو گیا تو اس کو بصرہ کے بجائے کو نے کا گورنر بنا دیا اور بصرے میں سمیرہ بن جندبہ اختیار ہو گیا۔

زیادہ کو نے کے ہر شیعہ کو جانتا تھا۔ اس نے پہنچتے ہی ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ حجاز علیؑ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کیا، کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے، کسی کی آنکھوں میں سلائیاں پھردا کر اندھا کر دیا، کسی کو زندہ دفن کر دیا، کسی کو گھریں آگ لگا کر جلا ڈالا، ظلم کی کوئی حد اس نے اٹھانہ رکھی۔ قید خانے شیعوں سے بھر دیئے اور جو بچ گئے انہیں شہر بدر کر دیا۔ کو فہ و بصرہ میں مجموعی طور پر ایک لاکھ پچاس ہزار اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ بدلہ دیا زیادہ بن ابوسفیان نے علیؑ کے حسن اخلاق کا۔

بصرے میں سمیرہ بن جندبہ زیاد کا ماتحت تھا وہ زیاد سے کم ظالم نہ تھا اس نے اٹھ ہزار آدمی قتل کئے۔ ہنرین ارطاطہ نے تیس ہزار شیعوں کو قتل کر کے معاویہؓ کی خوشنودی حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے عراق و شام اور عرب میں ہر جگہ حب علیؑ گردن زدنی قرار پایا۔ یہی وہ حالات تھے جہاں سے تقیہ کی ضرورت پیدا ہونے لگی۔ شیعوں کے قتل اور گرفتاری کے لئے معاویہؓ نے اپنے عمال کو سخت تاکید کی تھی لہذا کسی جگہ کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ زیادہ نے عبداللہ بن ہاشم مرقال کو گرفتار کر کے دمشق بھیجا۔ جمیل بن کعب ثعلبی رئیس قبیلہ ربیعہ پکڑ کر لائے گئے۔ جاریہ بن قدامہ تمیمی یاہ زنجیر کے بصرہ سے لائے گئے۔ معاویہؓ نے ایک ایک کو بھرے دربار میں بلایا۔ سخت کلامی کی نوبت آئی۔ تشدد کا ہر حربہ استعمال کیا گیا مگر ان میں سے کسی نے محبت علیؑ سے منہ موڑنے کی حامی نہیں بھری۔ آخر میں تنگ آکر معاویہؓ نے وقفہ وقفہ سے انہیں قتل کر دیا۔ انہیں میں صعصعہ بن صوحان عبدی بھی تھے آپ

شروع میں مغیرہ بن شعبہ کو خنے کا گورنر تھا۔ اس نے سینکڑوں علی والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے وظائف بند کر دیئے۔ وہ علیؑ اور ان کی اولاد پر تبرہ ہی نہیں کرتا تھا بلکہ گالیاں بھی دیتا تھا۔ معاویہؓ کی بات پر اس سے ناراض ہو گیا تو اس کو بصرہ کے بجائے کوخے کا گورنر بنا دیا اور بصرے میں سمروہ بن جندبہ با اختیار ہو گیا۔

زیادہ کوخے کے ہر شیعہ کو جاتا تھا۔ اس نے پہنچتے ہی ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ جتنا علیؑ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر گرفتار کیا، کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے، کسی کی آنکھوں میں سلاٹیاں پھرا کر اندھا کر دیا، کسی کو زندہ دفن کر دیا، کسی کو گھر میں آگ لگا کر جلا ڈالا، ظلم کی کوئی حد اس نے اٹھانہ رکھی۔ قید خانے شیعوں سے بھر دیئے اور جزیج گئے انہیں شہر بدر کر دیا۔ کوخہ و بصرہ میں مجموعی طور پر ایک لاکھ پچاس ہزار اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ بدلہ دیا زیادہ بن ابوسقیان نے علیؑ کے حسنِ اخلاق کا۔

بصرے میں سمروہ بن جندبہ زیادہ کا ماتحت تھا وہ زیادہ سے کم ظالم نہ تھا اس نے اٹھ ہزار آدمی قتل کئے۔ بصرہ میں ارطاة نے تیس ہزار شیعوں کو قتل کر کے معاویہؓ کی خوشنودی حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے عراق دشنام اور عرب میں ہر جگہ حب علیؑ گردن زدنی قرار پا گیا۔ یہی وہ حالات تھے جہاں سے تقیہ کی ضرورت پیدا ہونے لگی۔ شیعوں کے قتل اور گرفتاری کے لئے معاویہؓ نے اپنے عمال کو سخت تاکید کی تھی لہذا کسی جگہ کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ زیادہ نے عبداللہ بن ہاشم مرقال کو گرفتار کر کے دمشق بھیجا۔ جمیل بن کعب ثعلبی رئیس قبیلہ بیعہ پکڑ کر لائے گئے۔ جاریہ بن قدامہ تمیمی یاہ زنجیر کر کے بصرہ سے لائے گئے۔ معاویہؓ نے ایک ایک کو بھرے دربار میں بلایا۔ سخت کلامی کی نوبت آئی۔ تشدد کا ہر حربہ استعمال کیا گیا مگر ان میں سے کسی نے محبت علیؑ سے منہ موڑنے کی حامی نہیں بھری۔ آخر میں تنگ آکر معاویہؓ نے وقفہ وقفہ سے انہیں قتل کر دیا۔ انہیں میں مصعبہ بن صوحان عبدی بھی تھے آپ

جلاد طعن کر دیئے گئے۔ عالم غربت میں موت کو لبیک کہہ گئے۔ ایک طویل فہرست ہے علیؑ کے ان سرفروشنوں کی جنہوں نے سنگی تلواروں کی چھاؤں میں بھی حُبِ علیؑ کے نعرے بلند کئے۔ حجر بن عدی ان میں ایک درخشاں نام ہے۔

کوفہ میں زیاد کا قتل عام جاری تھا مگر وہ اس قدر چالاک تھا کہ کمزوروں کو چھانٹ چھانٹ کر قتل کر رہا تھا۔ حجر کی طرف اس نے مصلحتاً دستِ ستم دراز نہ کیا تھا۔ ایک دن اس نے حجر کی موجودگی میں حضرت علیؑ کے لئے گستاخانہ الفاظ استعمال کئے۔ حجر سے ضبط نہ ہو سکا، آپ نے بھرے مجمع میں اس کو ملامت کی زیاد نے معاویہ کو لکھ بھیجا اور معاویہ نے حجر اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا مگر حجر کوئی تروالہ نہ تھے جن کو زیاد چٹ کر جاتا۔ مقابلے کی نوبت آگئی حجر کے ساتھیوں نے محمد بن اشعث کو تروال کے چھکے چھڑا دیئے۔ آخر امان دینے کا فریب کر کے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ گیارہ آدمی آپ کے ساتھ پکڑے گئے۔

ارقم بن عبد اللہ کندی، شریک بن شداد حضرمی، صیفی بن ثعلبہ، قبیصہ بن حبیبہ، عبسی، کریم بن عقیف خشعی، عاصم بن عوف بجلي، درقان بن سمی بجلي، کدام بن حیان عبد الرحمن بن حسان عنتری، محرز بن شہاب، عبد اللہ بن حربہ سعدی۔

زیاد نے وعدہ خلائی کر کے ان کو دمشق بھیج دیا، پھر دو آدمی اور گرفتار کئے عتبہ بن احنس اور سعید بن غزان ہمدانی ان دونوں کو بھی ان کے بعد روانہ کر دیا معاویہ نے ان سب کے لئے ہدایت کی کہ جو علیؑ اور اولاد علیؑ پر لعنت کرے اس کو چھوڑ دیا جائے یا قاتی لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔

حجر بن عدی صحابی رسول تھے اور صحابی امیر المومنین بھی۔ وہ محبت علیؑ کو کیا چھوڑتے، انہوں نے سخت جوابات دیئے اور واجب القتل قرار پائے مگر ارقم بن عبد اللہ کندی، کریم بن عقیف خشعی، درقان بن سمی بجلي، عبد اللہ بن حربہ سعدی عتبہ بن احنس، سعید بن غزان ہمدانی اور عبد الرحمن بن حسان عنتری کو اہل دربار کی سفارش پر معاویہ نے واپس بلالیا۔ ان میں عبد الرحمن کو زیاد کے پاس واپس بھیج

دیا گیا۔ اس نے انہیں زندہ گڑوا دیا۔ باقی لوگوں کو معاویہ نے رہا کر دیا کیونکہ ان کے لئے سفارش کرنے والوں نے کہا تھا کہ وہ علیؑ کی مدح نہ کریں گے۔ حجر اور ان کے چھ ساتھیوں نے رات بھر نمازیں پڑھیں اور صبح کو ایک ایک کر کے قتل کر دیئے گئے۔

_____ خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک باطن پر!

”حضرت حسنؑ بصری فرماتے ہیں: حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں جہنمک ہو۔ ایک ان کا اُمت پرتلوار سونت لینا اور مشوے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا، درآنحالیکہ اُمت میں بقایا بے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے، ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور شہ باز تھا، ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا تھا۔ تیسرے ان کا زیادہ کو اپنے خاندان میں شامل کرنا، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کے لئے لنگر پتھر ہیں۔ چوتھے، ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا“ (۸۶)

حجر کی وصیت کے مطابق ان کی ہتھکڑیاں، بیڑیاں اتاری نہیں گئیں اور نہ غسل و کفن دیا گیا بلکہ اسی حالت میں دفن کر دیا گیا۔

جناب عمرو بن حق خزاعی بھی اسی دور کے شہیدوں میں ہیں۔ کہا جاتا ہے حضرت سلمانؓ کا جو درجہ دربار رسالت میں تھا وہی درجہ حضرت عمروؓ کا بارگاہِ امیر المومنین میں۔ مروز نامی بزرگ بھی شہیدوں کی طویل فہرست میں شامل ہیں جنہوں نے علیؑ کی محبت میں جان دینے کی ریت قائم کی۔ ادنیٰ بن حصین کو زیاد نے بے دردی سے قتل کیا۔ عید اللہ بن یحییٰ حضری گوشہ نشین ہو گئے تھے مگر معاویہ نے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ محمد بن حذیفہ دشت کے قید خانے میں ڈال دیئے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

سب سے زیادہ محیر العقول یہ واقعہ ہے کہ دربارِ شام کی مغینہ نے قتلِ علی کے جشن میں گانے سے انکار کر دیا تھا جب اس کو دُرے لگائے گئے تو اس نے فی الیہم لگانا شروع کر دیا۔

”حرب کے بیٹے معاویہ کو بتا دو کہ میں مطعون کرنے والوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک نہ پہنچے۔ اس نے ایسے شخص کو قتل کیا ہے جو بہترین خلق تھا۔ ماہِ رمضان میں ہمیں درمزد کیا“

ایک مغینہ کا یہ عمل اتنا گستاخانہ تھا کہ اس کے سر پر ایک لکڑی کی شدید ضرب لگائی گئی جس نے بھیجے کو پاش پاش کر دیا اور مدحِ علیؑ کے جرم میں وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ مغینہ کے کس گوشہٴ قلب میں عقیدتِ علیؑ کی شمع روشن تھی جس کی تجلیاں اچانک پھوٹ پڑیں اور اس مومنہ کے چراغِ حیات کو گل کر گئیں۔ ایسے ہی کتنے لوگ تھے جو دلوں میں محبتِ اہل بیت کے خزانے کو چھپائے ہوئے تھے اور دشمنانِ دین کو اس کا علم نہ تھا۔

بات صرف مردوں ہی کی نہیں ہے۔ عورتیں بھی اس مشقِ ستم سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ انھیں بھی خبر ملنے پر پکڑ بلیا جاتا، سرزنش کی جاتی اور سزائیں دی جاتی لیکن اس آزمائش میں بڑی لذت تھی۔ خواتین بھی ہنستی مسکراتی اس کو جھیل جاتیں۔ زرقار بنتِ عدی، اُم البرار بنتِ رضوان، دارمہ جونیہ کے نام تاریخ نے محفوظ کر لئے ہیں۔ انہوں نے موت سے بے نیاز ہو کر امیرِ شام کو دندان شکن جوابات دیئے کہ محبتِ نام کی کوئی چیز اس میں ہوتی تو پھر کسی عورت کو کبھی نہ بتایا لیکن ایسا ہی ہوتا تو معاویہ رسول کی قدسی صفت بیٹی کے خلاف ذہر کیوں اُٹھاتا۔

رواجِ تبرّا

صلحِ حسن کے بعد شیعوں کے خون کی اچانک ارزانی توقع کے بالکل خلاف تھی کیونکہ عہدِ نامے کی بنیاد ہی شرطِ یہی تھی مگر معاویہؓ نے کوئی وعدہ پورا کر کے

کے لئے تو کیا نہیں تھا۔ یہی صورت حضرت علیؑ پر سب و تتم کی بھی ہوئی۔ امیر شام نے اس کو مذکور کے بجائے کھلے عام برا کہنے کے احکام جاری کر دیئے۔ اب عراق و شام کی ہر مسجد اور ہر منبر پر حمد باری کے بعد علیؑ کی منقصدت کی جاتی اور ایک انداز کے مطابق بہتر سزا مندوں کے خطبات میں علیؑ پر سب و تتم کو داخل عبادت کر لیا گیا تھا۔ زیاد بن ابیہ اور مغیرہ بن شعبہ کے سے گرگ بارہا دیدہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر گالیوں پر اتر آتے۔

ایک طرف یہ عمل ثواب میں شمار ہوتا، دوسری طرف اگر کسی کی زبان سے مدح علیؑ میں ایک لفظ بھی نکل جاتا تو وہ مستوجب عذاب ٹھہرایا جاتا۔ اس کی زبان گدھی سے کھینچ لی جاتی اور کبھی کبھی تختہ دار پر اس کے تڑپنے کا منظر بھی دکھایا جاتا۔ یہ دونوں عمل حکومت کے ضابطے میں داخل تھے چنانچہ

”جب معاویہ نے کوہ کے لوگوں سے بیعت لینا شروع کی تو حضرت علیؑ سے برأت اور بیزاری پر بیعت لی۔ یہی اس کا معمول تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر بنی تمیم کے ایک شخص نے کہا: امیر المؤمنین! ہم زندوں کی اطاعت کریں گے مگر مردوں سے برأت نہیں کریں گے اس پر معاویہ زیاد کی طرف متوجہ ہوا، اور بولا۔ اس شخص کو اچھائی

کی وصیت کر۔“ (۸۳)

زیاد نے اس کو بیک ضرب شمشیر قتل کر دیا۔ ایسے بہت سے واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آئے اور جانوں کے خوف سے لوگوں نے اپنی زبانوں پر تالے ڈال لئے۔

اس تشدد کے دوش بدوش ایک زبردست پابندی یہ لگا دی گئی کہ کوئی اپنے بچوں کے نام اولاد رسول کے ناموں پر نہ رکھے۔ علیؑ کے چاہنے والوں کا یہ کڑا امتحان تھا۔ بادل خواستہ انہوں نے اس میں بھی تقیہ شروع کر دیا بعض عقیدت مندوں نے گھر کا نام کچھ اور یا ہر کا کچھ اور نام رکھا مگر اس میں بھی کپٹے

گئے۔ آخر زندہ گیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ بھی کرنا پڑا — شیعوں کی گواہی اب بھی ناقابل اعتبار تھی لہذا وہ عدالت میں پیش ہونے کے خطرے سے بچے ہوئے تھے۔
 اب ہر طرف بنی امیہ کا دور دورہ تھا، کوفہ، بصرہ اور تمام وہ جگہیں جو کبھی شیعیان علی سے بھری ہوئی تھیں وہ سب خالی ہو چکی تھیں۔ اکاؤد کا لوگ کونے کھدروں میں پڑے ہوئے تھے جو کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتے۔ مدینے میں امام حسن علیہ السلام نے تقریباً گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی مگر رشہ و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگ اب بھی فیضانِ علم سے بہرہ ور ہوتے تھے تاہم خانوادہ رسالت کو حکومت سے کوئی سروکار نہ تھا حضرت معاویہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ انہوں نے آپ کو کئی بار بلوایا تا کہ بھرے دربار میں ذلیل کریں مگر بغیر کے نواسے اور علیؑ کے بیٹے سے کون بازی لے جاسکتا تھا جس نے جو کچھ کہا، اس کا جواب پایا۔

رہ گیا قتل ہونے کا اندیشہ تو امام کو اس کی فکر کیوں ہوتی، وہ اپنے لئے تو زندہ نہیں تھے۔ آپ کی ہر سانس خدا اور اس کے دین کے لئے تھی۔ اس کے باقی رہنے یا ختم ہو جانے سے امام کا کوئی تعلق نہ تھا لہذا آپ بے فکر جاتے اور بے خطر چلے آتے اس طرح نو دس سال میں آپ نے دمشق کے کئی سفر کئے اور ہر سفر میں رموزِ دین کو منکشف کرتے رہے۔ لوگوں کو پاکبازی کی زندگیاں بسر کرنے کی تلقین فرماتے رہے۔ آخر وہ دقت آگیا کہ حیاتِ مستعار اپنے انجام کو پہنچی۔ معاویہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کے راستے کا بڑا کاٹا صاف ہو گیا تھا۔ وہ گئے تھے حسینؑ تو ان کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ امیر شام نے کر لیا تھا۔ البتہ ایک مہتی باقی تھی جو کسی وقت بھی ان کے مقابلے میں آسکتی تھی اور وہ مہتی سہی ام المومنین حضرت عائشہؓ کی، جن سے وہ ڈرتے بھی تھے اور چونکا بھی رہتے تھے۔

استقرارِ سلطنت کے لئے قتل و خونریزی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ جابر و ظالم حکمران اس سے پہلے اور بعد ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ سکندر و دارا، چنگیز و تیمور جیسے گتے ہی فرمانروا تاریخ کے شعور اور شعور سے پہلے ملتے ہیں مگر وہ پیغمبر

برحق و عادل کے سجادہ زہد پر بیٹھنے کے دعویدار نہیں تھے۔ معاویہؓ پر نکتہ چینی تو اس لئے کی جاتی ہے کہ ان کا ہر سو عمل اسلام سے منسوب تھا اور اسلام ان کے کروتے سے بدنام ہو رہا تھا۔

یوں تو وہ ایک باصلاحیت حکمران تھے۔ انہوں نے ایران اور دوسرے علاقوں کی بغاوتوں کو بڑی حکمت عملی سے فرو کیا۔ سندھ، بلوچستان، مکران اور ترکستان کے بعض علاقوں میں حضرت علی علیہ السلام نے اسلام پھیلایا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے مکہ میں مہلب بن ابی سفرة کو متعین کیا پھر عبداللہ ابن عامر کو بھیجا۔ اس کے بعد عباد بن زیاد کو۔ ان لوگوں نے کافی مقامات کو مسخر کیا اور جو علاقے باغی ہو رہے تھے، انہیں از سر نو قبضے میں کیا اور ایک دانشمندی یہ بھی کی کہ یہاں ابوسفیان کے بجائے محمد رسول اللہ کا نام روشن کیا۔

شمالی افریقہ میں کئی نئے علاقے مفتوح کئے۔ رومیوں کا مرکز حضرت معاویہؓ کا کارنامہ ہے۔ یزید بن معاویہؓ بھی اس جنگ میں شریک تھا۔ اسی جنگ میں حضرت ابوالیوبہ انصاری نے داعی اجل کو لبیک کہا اور قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے دفن کئے گئے۔ جہاں ان کا نام پیغمبر عرب کے دین کو متعارف کراتا ہے۔

تیسرے امام

امیر المومنین حضرت امام حسین ابن علی علیہ السلام

ربیع الاول ۵۵ھ تا ۱۰ محرم ۶۱ھ

سبط اصغر

سرور کائنات کے چھوٹے نواسے کا نام "حسین" تھا۔ دھی موٹی جناب یارون کے چھوٹے بیٹے شبیر کی رعایت سے آپ کو شبیر بھی کہا جاتا۔ آپ کی ولادت شعبان ۵۵ھ کو مدینے میں ہوئی۔ حضور نے آنکھوں میں لعاب دہن لگایا۔ کان میں اذان کہی اور حسین نام رکھ دیا جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا تھا۔

پیدائش سے قبل اور پیدائش کے بعد بہت سے معجزات آپ کی ذات کرامی سے منسوب ہیں جن میں جبریل کا خاک کر بلا کر دینا متفق علیہ ہے۔ آپ نے وہ مٹی ایک شیشی میں بھر کر اُم سلمہ کو دے دی کہ جب یہ منہ رخ ہو جائے تو سمجھ لینا کہ میرا بیٹا قتل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دونوں بچائیوں کے چہروں سے ایسی روشنی ساطع ہوتی تھی کہ جدھر جاتے، رات کا اندھیرا کٹتا جاتا تھا۔

حالت نماز میں نواسوں کا پشت پر چڑھنا اور حضور کا سجدے کو طول دینا مشہور واقعہ ہے۔ کا ندھے پر چڑھنا اور طرح طرح سے ناز برداری کرنا مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ نواسوں سے متعلق حضور کی کتنی ہی حدیثیں ہیں۔ معراج میں حضور نے باب جنت پر ایک طلائی نوشتہ ملاحظہ فرمایا تھا۔

”اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں ہے، محمد اللہ کے حبیب ہیں، علی اللہ کے ولی فاطمہ اللہ کی کنیز ہیں حسن اور حسین اللہ کے برگزیدہ ہیں جس نے ان سے بغض کیا، اُس پر خدا کی لعنت“

روایت ہے کہ جناب آدمؑ کی توبہ جن اسماء کے توسط سے قبول ہوئی تھی، آدمؑ نے اُن کے بارے میں باری تعالیٰ سے پوچھا تھا تو انہیں جواب ملا تھا:-

”یہ سب افضل ترین مخلوق ہیں: یہ محمدؐ، میں محمودؐ، میرے نام

سے مشتق ہیں محمدؐ۔ یہ علیؑ، میں علی عظیمؑ، مجھ سے نکلا ہے نام علی کا۔

یہ فاطمہؑ، میں فاطمہ ارض و سماء، میں نے ان کو اپنے نام کے حروف

سے منتخب کیا۔ یہ حسنؑ و حسینؑ، میں محسنؑ، دونوں مشتق ہیں میرے نام

سے اور دونوں بہترین کائنات ہیں۔ عذاب و ثواب ان کی رضا

اور ناراضگی پر منحصر ہے۔“ (۸۴)

مختصر یہ کہ آپ ناناک کی آنکھ کا تارا، ماں کے دل کا چین، باپ کے جگر کا ٹکڑا تھے اور پورے خاندان میں ہر دلعزیز تھے مگر آپ کو چھوٹی سی عمر میں سب کچھ دیکھنا پڑا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی گزر نہ سکتا تھا۔

نیرنگی زمانہ

آپ کا سن بمشکل پانچ چھ سال کا ہو گا کہ اپنی آنکھوں سے ناناک کو دفن ہوتے دیکھا۔ پھر آپ کی قبر پر کھڑے ہو کر آخری سلام کیا۔ اس کے بعد وہ مناظر بھی سامنے آئے کہ اپنوں کے بجائے غیر ناناک کے منبر پر فرود کش ہوئے۔ ماں نے دن رات گریہ و زاری کی۔ باپ نے وقت کے شدید برداشت کئے مگر منہ سے اُف نہیں کی۔ حسین بھی بڑے بھائی کی طرح خاموش رہے۔ پابند شریعت تھے بلکہ عین شریعت تھے اس لئے وقتی اقتدار کے بعد جب عظیم المرتبت باپ کو ضرب لگی، تب بھی دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹا لیکن پائے استقامت میں فرق نہ آیا، پھر بھائی کے جگر کے ٹکڑے طشت میں گرتے دیکھے۔ ان سب مشاہدات نے صورتِ حال آئینہ کر دی تھی۔

۶۴ سال کی عمر میں آپ پر اتنی ذمہ داریاں آپڑی تھیں جن کو کوئی پیغمبر ہی اٹھا سکتا تھا۔ آپ فخرِ انبیاء کے بیٹے تھے۔ بڑی متانت کے ساتھ آپ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور دل ہی دل میں کہا۔

”پروردگار! تو مجھے ہر حال میں ثابت قدم پائے گا۔۔۔ تو یہی جوائے صبر و تحمل سے تیرے عرش کو ہلا کر نہ رکھ دوں!“

وقت کا دھارا

چہار جانب ظلم و ستم کی گرم بازاری تھی۔ شیعانِ علی کا خون اتنا اڑاں تھا کہ معاویہ کے چند سکون میں بک جاتا تھا۔ وضعی روایتوں سے نہ صرف نبیؐ اور آلِ نبیؐ کی سیرت ہی بگاڑ دی گئی تھی بلکہ اسلام کی صورت میں بھی اتنا رد و بدل ہو گیا تھا کہ اس میں شرک و الحاد کے داغ پیدا ہو گئے تھے جن کا پر تو آج بھی پایا جاتا ہے امام حسینؑ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ماضی پر بھی آپ کی نگاہ تھی۔ غلی نے مفادِ خلافت میں پہلے خلافت ظاہری سے قطع نظر کی پھر عوام الناس کے اصرار پر اُسے قبول کیا اور نیابتِ پیغمبر کا حق ادا کرتے رہے۔ امام حسنؑ فلاحِ انسانیت کی خاطر اس سے دست بردار ہو گئے پھر بھی انہیں زہرِ مینا پڑا جیٹن جانتے تھے کہ ان کا وجود غاصبوں کی آنکھ کا کاٹنا بنا ہوا ہے انہیں پدرِ زوی وقارِ ادبِ برادرِ عالی مقام سے ہٹ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا مگر منصبِ امامت یہ تھا کہ جب تک ضبط و سکون کے ساتھ اُسے پورا کر سکیں، پورا کرتے رہیں۔ آپ امامِ حسنؑ کی روش پر جاہ و اقتدار سے بے نیاز اُمتِ مسلمہ کی ہدایت کر رہے تھے اور جہاں تک ان کی آواز جاتی صحیح اسلام کی تلقین کرتے رہتے۔

حضرت معاویہ بھی اپنے کردار میں پختہ کار تھے۔ انہیں اب ایک ہی فکر تھی کہ خلافت کو اپنی نسل میں موروثی بنادیں۔۔۔ شاید وہ رسول کی براہِ راست اولاد میں تھے، حقِ تنہا ان کا اسلام پر۔۔۔ !

انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے یزید کو سر پر اُرائے خلافت کر دیئے

کا عزم کر لیا تھا۔ جس کے لئے مغیرہ بن شعبہ اور زیاد بن ابیہ بڑا کام کر چکے تھے کوفہ اور بصرہ کی زمین ہموار تھی لیکن بیعت کے مرکزی مقامات مدینہ اور مکہ تھے لہذا معاویہ نے اپنے سارے عمال کو ایک فرمان جاری کیا کہ ہر جگہ مزید کی بیعت لے لی جائے احنف بن قیس اور بعض دورانیش لوگوں نے مخالفت بھی کی مگر امیر شام نے اسی دن کے لئے تو سب کچھ کیا تھا، وہ باز کیونکر آتے۔۔۔ مردان نے جب مدینے سے لوگوں کے انحراف کی اطلاع دی تو وہ خود مدینے جانے کے لئے تیار ہو گئے مگر ۵۷ھ میں انھیں یالوس واپس ہونا پڑا۔ لہذا ۵۸ھ میں انہوں نے پھر مدینے کا سفر کیا۔ اب کی وہ تمام آزمودہ حربوں سے لیس ہو کر مدینے پہنچے مگر وہاں اب لوگوں کا استعمال خطرے سے خالی نہ تھا لہذا انہوں نے اپنے کیسہ طلب سے صرف رشوت کے پیکان باہر نکالے کیونکہ ان کی کامنگاری پر انہیں پورا یقین تھا۔ مقتدر لوگوں میں عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر، حسیئن ابن علیؑ اور جناب عائشہؓ تھیں۔ ان سب نے شدید مخالفت کی۔ حضرت معاویہ نے ڈرایا دھمکایا اور آخر میں سب کو علیحدہ علیحدہ رشوتیں پیش کیں۔

عبدالرحمن بن ابی بکر نے ایک لاکھ درہم تو نہیں لئے مگر خاموش ہو کر بیٹھ ہے۔ عبداللہ ابن عمر نے پہلے تو ایک لاکھ درہم واپس کئے لیکن بعض شواہد کے مطابق بعد میں قبول کر لئے۔

عبداللہ ابن زبیر خود خلافت کے امیدوار تھے۔ وہ ایسی کسی پیش کش کو قبول کیوں کرتے۔

حسیئن ابن علیؑ خود معاویہ کو غاصب قرار دیتے تھے تو مزید جیسے بدکردار کو مان لینے کا سوال ہی کیا تھا۔

رہ گئیں اُم المؤمنین تو وہ معاویہ پر برس پڑیں۔ انھوں نے معاویہ سے محمد بن ابی بکر، حجر بن عدی اور دیگر صحابیوں کے قتل کا محاسبہ کیا اور کہا۔

”شخصین میں سے کسی نے اپنے لائق بیٹوں کو خلافت نہیں دی۔ تم اپنے نالائق اور بدترین بیٹے کو ولی عہد بنا رہے ہو۔ شرم کرنا چاہیے تمہیں!“
سیاسی ذہن کا معاویہ ایسی جھڑکیوں کا اثر کیا لیتا، وہ اس سے کہیں زیادہ تلخ گھونٹ پی چکا تھا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ ایسے شاطرانہ سکوت کو حلم سے تعبیر کیا جاتا ہے!

لیکن اس سے حضرت معاویہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مخالفین میں حسین ابن علیؑ سے اگر تعرض نہ کیا جائے تو وہ رشد و ہدایت میں لگے رہیں گے مگر ام المومنین یزید کی راہ میں سد سکندری بھی بن سکتی ہیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ کے لئے ایک منصوبہ بنالیا اور اگلے دن رات کے کھانے کی دعوت دے دی۔ حضرت معاویہ کا دسترخوان پہلے ہی سے مشہور تھا۔ اس لئے کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا۔

وفات ام المومنین عائشہؓ

اموی مورخین نے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ام المومنین کی وفات کیونکر واقع ہوئی؟ تاہم کئی مورخوں کے قلم رک نہ سکے۔ انہوں نے لکھ دیا کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے خیمے کی گزر گاہ پر ایک کنواں کھڈا کر اس میں چونا بھر دیا تھا اور کنویں کو خار خنس سے اس طرح چھپا دیا تھا کہ آنے والا اُسے راستہ ہی سمجھے۔ یہی ہوا کہ جناب عائشہؓ چلتے چلتے اس پر قدم رکھ دیا، یا اس کو سی پر آکر بیٹھ گئیں جو اوپر بچھائی گئی تھی اور کنویں کے اندر جا رہیں، جس کے بعد جسم کا گل جانا ایک لمحے کی بات تھی۔ (۸۵)

ساتھ والیوں کا منہ بند کر دینا امیر شام کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ زبانیں کاٹ دی گئی ہوں یا سونے کی ہبردوں سے منہ سی دیا گیا ہو۔ پھر بھی کسی نہ کسی کو بھنک مل ہی گئی۔ ————— لیکن حضرت معاویہؓ سے پوچھتا کون؟ وہ تو رات ہی میں کوچ کر گئے تھے۔

حضرت معاویہ کا انتقال

دمشق واپس پہنچتے وقت راہ میں حضرت معاویہ نے ”ابو“ میں قیام کیا۔ رات میں باہر نکلے تو اتفاقاً قریب کی باؤلی میں جھانکنے لگے جس سے ایسی گیس نکلی کہ منہ ٹیڑھا ہو گیا، تمام اعضاء میں لرزہ پڑ گیا۔ تیزی کے ساتھ وہ دمشق کو روانہ ہوئے مگر مرض شدت اختیار کرتا رہا۔ سوتے سوتے اُچھل پڑتے اور منہ سے نکلتا: — علی — حجر — عمرو بن حنظل — میں نے کیوں قتل کیا !

معاویہ کو جب مرنے کا یقین ہو گیا تو یزید کو بہت سی وصیتیں کیں۔ عبداللہ ابن زبیر سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی اور ہدایت کی کہ خیر دار حسین ابن علیؑ سے کوئی تعرض نہ کرنا۔ وہ قریبی بیعت نہیں کریں گے۔ پھر ایک وصیت نامہ تحریر کرایا جو یزید کی خلافت کے لئے تھا۔ اس میں لکھوایا کہ یزید عدل و انصاف کرے، ادلاء عثمان کو مقرب بنائے اور جو مخالفت پر کمر بستہ ہو، اس کا قلع قمع کر دے۔

۱۵ رجب یا ۲۲ رجب ۴۰ھ ۸۵ سال کی عمر میں شام کا وہ حکمران اپنے انجام کو پہنچا جس کا جاہ و چشم قیصر و کسریٰ کو مات کر گیا تھا۔ یزید شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں باپ کی تدفین ہوئی جب وہ پلٹ کر آیا تو باپ کی قبر پر جا کر بہت رویا سچراپے دنوں کو عید اور راتوں کو شب برات بنانے میں لگ گیا۔

یزید ابن معاویہ

شام کا یہ ”فیرو“ رجب ۴۰ھ میں اس تحت خلافت پر متمکن ہوا جو رحمتہ اللعالمین سے منسوب تھا۔ اس کا تقدس ہر طرح پامال ہو چکا تھا پھر سبھی اسلام کی روایات لب بھی اس سے دالت سمجھی جاتی تھیں — مگر بھلا ہو حضرت معاویہؓ کا کہ انہوں نے اس تحت خلافت پر جانتے بوجھتے ہوئے اس بیٹے کو بٹھادیا تھا جو ایام جاہلیت کے ابوسیفان کا پوتا تھا۔

خونریزی کی جن داستانوں کو شام کے تحت دماج نے جنم دیا تھا، وہ تو یزید

کاشلی درخت تھیں۔ اولاد رسول سے عداوت آبائی طریقت تھی، زہد و تقویٰ سے شنی سرشت میں شامل تھی، قساوت و سنگدلی اموی جبلت تھی، شراب کی بدستی ذاتی جہالت تھی۔ ان حقائق کے باوجود ماننا پڑے گا کہ اس میں لباس و طعام کا ذوق سلیم باپ سے زیادہ تھا اور اس کے دربار کا شانہ طہ طراق قسطنطنیہ اور مدائن کی شوکت و سطوت کو شرمندہ کر دیتا تھا۔

یزید اگر تخت خلافت پر بیٹھا نہ ہوتا تو عیش پسندی میں سلاطین عالم کے لئے آپ اپنی نظیر تھا۔ ادب کا دلدادہ اور حسن و شباب کا گردیدہ تھا۔ ذوق جمال اس بلا کا رکھتا کہ کسی حسینہ پر ایک نظر ڈال کر ناک نقشبے کا تناسب اور اعضائے جسمانی کا آہنگ تاڑ لیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ نفس پروری میں اس کو یہ امتیاز نہ رہتا کہ یہ شعلہ جوالہ اس کی بہن ہے یا ایسی کینز جو اس کے باپ کی زینت بستر رہی ہے۔

بلاشبہ ایام جاہلیت میں محرمات ہوس کا نشانہ بن جاتی تھیں اور کوئی معترض نہ ہوتا کیونکہ اس حمام میں سب ننگے تھے مگر اب تو اسلام کا پیغام عرب و ایران، مصر و روم ہر جگہ پہنچ چکا تھا اور یزید بن معاویہ بالذات اسلام کا نام نہاد جانشین تھا مگر ایسے موقعوں پر وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیتا اور جو پھول اس کو پسند آتا اُسے مسل ڈالتا تھا۔ کون اس کا روکنے والا تھا اور کون اس کو ٹوکنے کی

جسارت کر سکتا تھا۔ (۸۶)

تاریخ لاکھ کوشش کرے مگر یزید کی بد اعمالیوں کو چھپا نہیں سکتی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہے گی کہ بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہو کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اسلام کی روح حریت و جمہوریت کو فارت کیا اور مشورہ اجماع امت کی جگہ محض غلبہ جابرانہ اور مکر و خلع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا نظام حکومت شریعت الہیہ نہ

تھا بلکہ محض اغراض نفسانہ و مقاصد سیاسیہ۔ ایسی حالت میں ضرور
تھا کہ ظلم و جبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی اور حق و حریت
کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔“ (۸۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ سے اس خیال کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ جو
علماء حکومت شام سے وابستہ تھے، ان کا سکوت شرعی طور پر مجرمانہ تھا۔ کوئی
ایک آواز تو اُسٹھی مگر نا انصافی ہوگی، اگر یہ نہ کہا جائے کہ آزاد اُسٹھی تو زبان بریں شمشیر
سے قطع کر دی جاتی اور کشتگانِ اسلام میں ایک یا چند کا اضافہ ہو جاتا۔
تشدد کے اس طوفان میں مجتہد علی کا جو عالم تھا، وہ تو تھا ہی لیکن وہ لڑک
بھی محفوظ نہ تھے جو جذبہ دینی کی حرارت زندانہ میں محال ف بن کر زبان بھی ہلا دیتے
لہذا وقتی طور پر تائید کے سوا تردید کا لفظ ہی لغت سے نکل گیا تھا۔ اس لئے شاہ
نظام اور ریسانہ مزاج کی مطلق العنانی بڑھتی رہی اور یزید نے حکم دے دیا کہ
مدینے کے ایک ایک آدمی سے بیعت لی جائے اور جو سزائی کرے، اس کا سر اڑا
دیا جائے یا اس کو گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔

ولید بن عقبہ والی مدینہ کو جب یزید کا فرمان ملا تو اس نے عبداللہ ابن زبیر
اور امام حسین کو بلا بھیجا۔ ابن زبیر تو کے چلے گئے۔ امام حسین تیس بنی ہاشم کو لے
کر ملاقات کے لئے روانہ ہوئے۔ بنی ہاشم باہر ٹھہر گئے۔ امام اندر داخل ہوئے تو
ولید نے عزت کے ساتھ بٹھایا۔ معاویہ کی خبر مرگ سنائی اور بیعت یزید کا ذکر کیا۔
آپ نے فرمایا: میں اپنے خیال کا اظہار مجمع عام میں کرنا چاہتا ہوں۔ ولید کل آنے
کا وعدہ لے کر آپ کو رخصت کرنے ہی والا تھا کہ مردان بول اٹھا:

”حسین اس وقت قبضے سے نکل گئے تو پھر ہاتھ نہ آئیں گے۔“

امام حسین کو سنتے ہی جلال آگیا۔ آپ نے بلند آواز میں فرمایا۔

”کس میں دم ہے کہ حسین کو ہاتھ لگا سکے!“

بہادران بنی ہاشم اس آواز پر اندر داخل ہو گئے مگر امام نے سمجھا بھگا کر غموش

کر دیا اور اپنے جاں نثاروں کے ساتھ واپس ہو گئے۔

یزید کا دوسرا حکم جب صادر ہوا کہ حسین کا سر اُتار کر بھیج دے تو عقبہ کا بیٹا بڑے
منہمکے میں پڑ گیا، کیونکہ مدینے میں حسین پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا اور تعمیل نہ کرنے میں معزول
یقینی تھی۔ اس لئے اس نے حکمتِ عملی سے کام لے کر امام حسین کو کسی ذریعہ سے
اس کی اطلاع کرا دی اور امام حسین نے سمجھ لیا کہ مدینہ چھوڑنے کا وقت آگیا۔

کوہِ شیعان علی کا گڑھ رہا تھا۔ ظلم بہتے بہتے بچے کچھ ٹھٹھی بھر لوگ مرٹھے پر تیار
تھے اور امام حسین کے پاس خطوط کے انبار لگ گئے تھے کہ آپ کو فہمِ ابنِ اور ہمارے
ہدایت فرمائیں۔ اہلِ وقت کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری تھی کہ ان کی شرعی تسکین
کریں لیکن بڑے بھائی نے جو مصراطِ عمل چھوڑا تھا اس کو بھی آپ نظر انداز نہ کر سکتے
آپ کا ارادہ کیا تھا؟ یہ تو آپ نے ظاہر نہیں فرمایا، مگر یہ بات مسلم ہے کہ آپ کا ارادہ
جنگ کا نہیں تھا، ورنہ اہلِ بیت کو لے کر وطن سے نہ نکلتے، صرف جو انانِ بنی ہاشم
کو ساتھ لے جاتے اور ان حق پسندوں کو بھی جو آپ پر جان دینا اپنی سعادت سمجھتے
رہا انکی کا اعلان کرنے کے بعد آپ کئی مرتبہ نانا کے روٹنے پر گئے۔ یقیناً فریاد
کی ہوگی کہ اُمّتِ چین لینے نہیں دیتی پھر ماں کے مزارِ مقدس پر حاضر می دی۔ اس
سلسلے میں بہت سی روایتیں ہیں جو موعودہ شہادت کا اشارہ کرتی ہیں۔

عبد اللہ ابنِ عباس، محمد حنیفہ اور عبد اللہ ابنِ جعفر اور دیگر بزرگوں نے آپ
کو روکا۔ حتیٰ کہ پورے مدینے نے حفاظت کا وعدہ کیا مگر آپ جانتے تھے کہ بنیِ امیہ آپ
کا پیچھا نہ چھوڑیں گے۔ وہی ہوا کہ ۸ رجب سنہ ۶۱ھ کو مدینے سے روانہ ہو کر شیعان
کو تکے پہنچے تو تھوڑے ہی دنوں بعد شام کے جاسوس حاجیوں کے لباس میں اس
سرزمین پر وارد ہونے لگے کیونکہ والی مکہ سعید ابنِ عاص نے مدینہ پہنچ کر آپ کے
عزم سے یزید کو مطلع کر دیا تھا اور یزید نے کہے ہی میں آپ کو قتل کر دینے کا منصوبہ
بنالیا تھا

مدینے کا مسافر

امام حسین چار ماہ کے میں مقیم رہے مگر جب آپ کو یقین ہو گیا کہ حج کے دوران آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے گا تو آپ نے عزم حج کو عمرے میں بدل دیا اور طواف کعبہ کے ۲ ذی الحج ۶۰ھ کو مکے سے عراق کی طرف روانہ ہو گئے۔

سات آٹھ سال کی ایک بیمار بیٹی فاطمہ صغریٰ کے علاوہ تمام اہل و عیال اور متعلقین آپ کے ساتھ تھے۔ فاطمہ کو آپ نے ثانی ام سلمہ کے حوالے کیا تھا۔ امیر المومنین نے اپنے آخر وقت میں سارے پس ماندگان کے ساتھ امام حسنؑ کے ہاتھ میں دیئے تھے مگر ام البنین کے بڑے بیٹے حضرت عباسؑ کا ساتھ امام حسینؑ کے ہاتھ میں۔ عباسؑ امام حسینؑ کے دم کے ساتھ تھے اور تین چھوٹے بھائی عباسؑ کے تابع۔ سارے بیٹے بھانجے، بھتیجے ہم سفر تھے۔ اہل مدینہ نے مشورہ دیا کہ جانا ہے تو کہیں اور چلے جائیں عراق نہ جائیں مگر امام حسینؑ شرعی مصلحتوں کو جانتے تھے، پھر آپ حضرت مسلم بن عقیلؑ کو بھی اپنے سنہرے حلیت سے کوئے بھیج چکے تھے جن کے جواب کا انتظار تھا اور اسی پر مہزون سفر کا تعین ہو سکتا تھا۔

کوئے کا سفیر

تو کہیں امیر المومنین حضرت علیؑ کا دار الخلافہ رہا تھا اور اہل بیت کے فدائوں سے بھرا ہوا تھا مگر جمادی الثانی ۶۰ھ کو صلح حسن کے بعد سے حضرت معاویہ کے قبضے میں آ گیا تھا اور اس پر زیاد بن ابیہ کی قاهرانہ حکومت تھی۔ زیاد نے چُن چُن کر بچوں بوڑھوں سب کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ بچے صرف وہ تھے جن کے ساتھ کسی قبیلے کی طاقت تھی یا برقیہ کے چھپ گئے تھے۔ ایسے لوگوں کے علاوہ حب علیؑ نام کی کوئی شے نہ کو ذکیا، اطراف و جوانب میں بھی پائی نہ جاتی لیکن شیعوں کے علاوہ غیر جانبدار لوگ بھی زیاد کا نشانہ ستم بنے تھے۔ اس لئے معاویہ کی خبر مرگ گرم ہوتے ہی شیعوں اور ظالمانہ حکومت سے یزار حلقے نے اطمینان کا سانس لیا۔

اور جب یزید کی بیعت لی جانے لگی تو وہ لوگ، جن کے دل میں ذرا بھی حیثیت

اسلام باقی تھی، وہ ذہنی طور پر بغاوت کے لئے آمادہ ہو گئے، یہی وہ وقت تھا جب انہیں امیر المؤمنین کی صداقت یاد آئی اور دلوں میں احساس پیدا ہوا کہ انہوں نے نبیؐ کی آلؑ سے اچھا سلوک نہیں کیا مگر یہ دودھ کا اُبال تھا اور بہت جلد ٹھنڈا ہو جانے والا تھا۔ پھر بھی ایک دفعتی جذبے میں مختلف گروہوں نے حضرت امام حسینؑ کو خطوط لکھنے شروع کر دیئے اور یہ خط تین تین چار چار آدمیوں کے وفد کے ساتھ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے لگے۔ اہمستہ اہمستہ خطوط کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔

رسولؐ کا نواسہ پیدا ہی ان لوگوں کی رہبری کے لئے ہوا تھا۔ اس کی نظر میں دیکھ کر جو دوسری دینی حکومت پر بوجھ تھا، نہ کہ یزید بن معاویہ جو شرافت انسانی کی سطح سے بھی گڑا ہوا تھا۔ ایسے میں فرض تھا امامؑ کا کہ عوام کی اکثریت انہیں آواز دے تو وہ بڑھ کر دتلیگری کریں، تاہم احتیاط کے طور پر امام حسینؑ نے اپنے پیچھے بچائی مسلم بن عقیلؓ کو ۵ رمضان ۶۰ھ کو کوفہ روانہ کر دیا جو دیکھوں کو ساتھ لے کر عازم سفر ہو گئے۔ مسلمؓ کی بیوی اور باقی بچے امام حسینؑ کے ساتھ رہ گئے۔

۵ ر شوال کو جناب مسلمؓ وارد کوفہ ہوئے اور جناب مختار بن ابوعبیدہ ثقفی کے مکان پر قیام فرمایا۔ چند روز کے اندر اٹھارہ ہزار آدمیوں نے جناب مسلمؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان میں شیعہ بہت تھوڑے تھے۔ اکثریت ان لوگوں کی تھی جو یزید سے متنفر تھے یا جن کو معاویہ کا ساتھ دے کر کچھٹاوا ہوا تھا۔ چنانچہ وسط ذی قعدہ ۶۰ھ میں جناب مسلمؓ نے عابس بن ابی شیبہ شاکری کے ہاتھ ایک خط خدمت امامؑ میں بھیج دیا۔ نعمان بن بشیر حاکم کوفہ نے اس سیلاب کو روکنا خلافت مصلحت سمجھا مگر بعض ہواخواہوں نے خفیہ خفیہ یزید کو اطلاع کر دی اور یزید نے نعمان کو معزول کر کے عامل بصرہ عبید اللہ ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم بنا دیا۔ اسی دوران امام حسینؑ کے بعض خطوط ابن زیاد نے پکڑ لئے جو امامؑ نے بصرہ کے بعض قبائل کو لکھے تھے۔ حضرت علیؑ کے بعد اٹھارہ انیس سال تک معاویہ نے حکومت کی تھی اور لاکھوں

کر گر گئے۔ پھر آپ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور زمین پر آتے ہی گرفتار کر لئے گئے۔ زنجی شیر مٹھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے کے باوجود شیر تھا۔ تیور سے علی کا جلال اور بشرے سے اسلام کا کمال برس رہا تھا۔ ابن زیاد سفاکی اور قساوت کے ساتھ پیش آیا مگر آپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ نے اس کے ہر سوال کا جواب ایمان افروز لب و لہجہ میں دیا اور اموی دریدہ دہنی کو لاجواب کر دیا۔ سعد ابن ابی وقاص کا بیٹا عمر دہبی دربار میں موجود تھا۔ جنابِ مسلم نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تو ایک طرح سے ہمارا رشتہ دار ہوتا ہے۔ تجھ کو وصیت کرتا ہوں کہ امام حسینؑ کو ادھر آنے سے روک دے۔ میری ذرہ اور تلوار بیچ کر فلاں کو سات سو درہم ادا کر دے اور باقی سے میری میت کسی مقام پر دفن کر دے۔“

ابن زیاد معاویہ دیزید کی تعریفیں کر رہا تھا اور حضرت علیؑ، امام حسینؑ اور حضرت عقیلؑ کو گالیاں دے رہا تھا۔ حضرت مسلمؑ نے چیخ کر کہا:-

”خصیتِ باہ تیرے لئے نئی بات نہیں ہے۔ تیرا باپ تجھ سے زیادہ بد باطن تھا۔ جھوٹ تیری میراث ہے۔“

ابن زیاد نے اس سے زائد موقع نہ دیا، حکم دے دیا۔

”اوپر لے جا کر گردن کاٹ دی جائے۔“

لوگ کشاں کشاں جنابِ مسلمؑ کو بالا خانے پر لے گئے اور بکیر بن حمران کی تلوار فضا میں بلند ہو گئی۔ مسلم کا رخ کعبہ کی طرف تھا اور آپ فرما رہے تھے۔

”آپ پر آخری سلام ہو، یا ابا عبد اللہ الحسین!“

دوسرے ہی لمحے آپ کا سر کٹ کر نیچے آگیا۔ اس کے بعد پھر کتا ہوا جسم بھی بالا خانے سے نیچے پھینک دیا گیا۔

اٹھارہ ہزار بیعت کرنے والے دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ان میں کوئی شیعوں علیؑ نہ تھا، سب شیعیانِ معاویہ تھے جو خود معاویہ کی طرح اپنی اصل کی طرف پلٹ گئے تھے۔

ہائی اور مسلم کے جدِ مرثیہ رسی میں باندھ کر سربازار کھینچے گئے پھر ہانی کے قبیلے والوں نے لوہے کے دونوں لاشیں لے لیں اور انہیں دفن کر دیا۔ اس طرح فرنگی مسیحی ہجری کو کوفے میں حسین کی سفارت اختتام کو پہنچی۔

یتیمانِ مسلم

جنابِ مسلم کے دہکے محمد اور ابراہیم قاضی شریح کی پناہ میں تھے یہ حالات دیکھ کر قاضی نے اپنے بیٹے اسد کے ساتھ دونوں کو کوفے کے باہر بھیج دیا کہ مدینہ جانے والے قافلے کے ہمراہ چلے جائیں مگر قافلہ روانہ ہو چکا تھا اور سامنے جاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسد نے بچوں کو راستہ دکھا دیا کہ دُور قافلے سے جا ملیں۔

بچے تیزی سے چلے مگر قافلے کو نہ پاسکے بلکہ اموی سپاہیوں کے ہاتھوں پڑ گئے۔ ابن زیاد نے انہیں زندان میں ڈلوادیا — ایک قیاس کے مطابق کربلا کے امیروں کا قافلہ جب کوفے پہنچا تو یہ بچے قید خانے میں تھے۔ صرف وہی نہیں پورا قید خانہ مہمانِ علیؑ سے بھرا ہوا تھا۔

بچے دن بھر روزہ رکھتے۔ شام کو جو کی روٹی اور گرم پانی سے انظار کر لیتے ان کا بیشتر وقت عبادت ہی میں گزرتا تھا۔ اس معمول کو دیکھ کر ایک دن داروغہ زندان مشکور نے ان کے حالات پوچھے اور خاندانِ رسالت سے ان کی وابستگی کے سبب بڑی محبت سے پیش آیا اور رات کی تاریکی میں بچوں کو شہر کے باہر چھوڑ آیا — مشکور اس جرم میں پکڑا گیا اور اس کی جانِ حبِ علیؑ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ انجانا دیس، دشمنوں کا شہر، بچے راہ سے بھٹک گئے اور تھک کر ایک چٹنے کے کنارے سو گئے۔ صبح کو ایک جھاڑی میں چھپ رہے۔ اتفاق سے سہ پہر کو ایک کینز پانی بھرنے کے لئے آئی۔ اس کی نظر بچوں پر پڑ گئی۔ انہوں نے اس کی آنکھوں میں شفقت کی چمک دیکھ کر اپنے متعلق سب بتا دیا۔ کینز نے گھر واپس آ کر اپنی مالکہ سے سارا حال کہہ سنایا اور مالکہ خود آکر بڑے پیار سے بچوں کو لے گئی۔

مومنہ کو معلوم تھا کہ اس کا شوہر سخت دشمنِ اہلبیت ہے لہذا اس نے بچوں

کو کھلا پلا کر تہہ خانے میں سُلا دیا۔

ابن زیاد دعا دال رسول میں آنا کُتر تھا کہ کوئی جانور بھی علیؑ کے نام پر سڑتا تو اس کو ذبح کر ڈالتا۔ بچوں کی اس کو اتنی فکر پڑ گئی کہ اس نے چہار جانب آدمی دوڑوائے۔ حارث بن عروہ دن بھر دوڑ دھوپ کر کے شب میں پلٹا اور کھانا کھا کر بستر پر دراز ہوا تو اس کو ایک طرف سے سانسوں کی آواز محسوس ہوئی وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دبے پاؤں اسی طرف کو چل پڑا۔

حضرت مسلمؓ کے بچوں نے رسالتِ نبیؐ، امیر المؤمنینؓ، فاطمہؓ زہراؓ، امام حسنؓ اور حضرت مسلمؓ کو خواب میں دیکھا تھا اور چونک کر آپس میں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے کہ حارث اندر داخل ہوا۔ اس نے دونوں کو بال بچہ کو کہینچا اور دریافت کیا۔

”تم کون ہو۔۔۔؟“

بچوں نے ہم کو بتا دیا، پھر کیا تھا۔ دونوں تیمیوں کے رُخسار طمانچوں سے لال ہو گئے۔ اس نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیئے۔ بیوی منت سماجت کرتی رہی مگر جلدانے ایک نہ سنی۔۔۔ صبح کو انہیں لے کر چلا تو بومی نے راستہ رد کا۔ ظالم نے مومنہ کو تلوار مار دی۔ بیٹا اور غلام مزاحم ہوا تو دونوں کو قتل کر دیا اور بچوں کو دریا کے کنارے تک کھینچ لے گیا۔

انہوں نے ہاتھ جوڑ کر خوشامد کی کو بازار میں بیچ ڈال یا ابن زیاد کے پاس لے چل مگر وہ نہ مانا۔ آخر بچوں نے کہا۔

”اچھا ہمیں دو رکعت نماز پڑھ لینے دے۔۔۔“

”نماز کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے تو پڑھ لو۔“ اس نے کہا اور بچے دھوکہ کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن انہوں نے نماز ادا کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے کہ بڑے بھائی کی گردن پر تلوار پڑی۔ ملعون نے اس کی لاش اٹھا کر دریا میں پھینک دی مگر وہ پانی پر تیرتی رہی، جب چھوٹے بھائی کی لاش بھی دریا میں گری تو دونوں لاشیں بہتی ہوئی ایک دوسرے سے اکٹری گئیں اور پانی کی تہہ میں غرق ہو گئیں۔

یہ ہوا انجام کوفہ کے سفیر الی الحق کے بچوں کا۔ جن کا خون ادراقتاریخ
میں مسلمانوں سے اپنی بے گناہی کا محاسبہ کر رہا ہے !

حیرت ہوتی ہے اس فلسفہ عقائد پر جب زیاد اور ابن زیاد جیسے لوگوں کو رضی اللہ
یا رحمۃ اللہ لکھا جاتا ہے، جن کا اسلام ثنایت کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلام انسانیت
کے لئے آیا تھا اور جو لوگ انسان اور انسانیت دونوں کے قاتل ہوں، ان کے حق میں
فتویٰ دینے والے نہ جانے کون سے عالم ہوں گے۔ اور جو رسول کے جہنیموں
اور ان سے محبت کرنے والوں کا بلا سبب خون بہائیں، انھیں دائرہ اسلام میں کوئی
مقام دلانے والے فقیہ کس اسلام کے فقیہ کہلاتے گے۔ عبید اللہ ابن زیاد
کا تو یہ عالم تھا کہ کسی گھر میں اگر غلطیہ یا اولاد غلطیہ کا نام بھی لیا جاتا تو وہ گھر منہدم
کر دیتا۔ کوفہ اور نواح کوفہ میں علی کے ماننے والوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ اکاد کا
رکسی گوشے میں کوئی بوڑھا پڑا ہوا گاؤ اس پر بھی اس کی نظریں لگی ہوتی تھیں۔ ان ہی
میں ایک برگزیدہ شخصیت حضرت میثم تمار کی بھی تھی جو کھجوریں فروخت کر کے گزربھر
کرتے۔ ایک دن ابن زیاد نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ حضرت میثم حج کرنے
گئے ہوئے تھے۔ ابن زیاد نے عمر بن حریش کو تاکید کی کہ آتے ہی انہیں پیش کیا جائے
عمر کے سے واپسی پر آپ کو قادیسیہ سے جا کر پکڑ لایا اور ابن زیاد کے سامنے پیش کر
دیا۔ اس نے میثم بن یحییٰ سے کہا۔

”علی ابن ابی طالب پر تبرا کرو۔“

”میں۔۔۔ اور علیؑ پر تبرا؟“ میثم نے جواب دیا اور ابن زیاد قدرے بلند
آوازیں بولا میثم کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ مگر انھوں نے ضبط سے کام لیا۔

”میرے مولیٰ مجھے اس کی خبر دے چکے ہیں“ میثم نے بڑے اطمینان سے جواب
دیا پھر اسی سلسلے میں وضاحت کی۔ ”مجھے عمر بن حریش کے دروازے پر سولی دی جائے
گی، زبان کاٹی جائے گی۔۔۔ چوتھے دن میرے دونوں ہاتھوں سے خون جاری ہوگا۔“
”اچھا تو میں زبان چھوڑ دوں گا تا کہ تمہارے مولا کا کہنا جھوٹ ہو جائے۔“

ابن زیاد نے جواب دیا اور جلا د کو اشارہ کیا جو ہر وقت دربار میں موجود رہتا تھا۔

چنانچہ میثم تمار کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اب اس کو ایمان کا معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ میثم نہ چیخے نہ چلائے۔ خون بہنا رہا اور آپ امیر المومنین کی حدیث بیان کرتے رہے۔ — عمر بن حویش کے دروازے پر سولی پر چڑھائے گئے تھے ایک انوہ کثیر جمع تھا اور آپ کی زبان بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

”من لے، جس کو سنا ہے۔ میں قیامت تک پیش آنے والے واقعات بیان کرتا رہوں گا۔ پھر آپ نے کہنا شروع کر دیا۔ فلاں وقت یہ ہوگا، فلاں وقت یہ ہوگا۔“
روانی کا یہ عالم تھا کہ جیسے آپ کو سب کچھ اذہر ہو — لوگ ایک سکتے کے عالم میں تھے، جیسے کھڑے کھڑے سو رہے ہوں۔

ابن زیاد کو فوراً اس کی اطلاع دی گئی۔ اس کو ڈر ہوا کہ علی کے اس معجزے سے کہیں لوگوں کے دل ان کی طرف پھرنے جائیں۔ اس نے زبان کاٹ دینے کا حکم دیا۔ جلا د جب ان کی طرف بڑھا تو میثم چیخ اُٹھے۔

”ملعون میرے مولا کو جھٹلانا چاہتا تھا۔ — ان کا قول بھلا جھوٹا ہو سکتا ہے یا“
زبان کاٹ گئی۔ — خون اس کثرت سے بہا تھا کہ میثم اسی عالم میں جاں بحق ہو گئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ رشید ہجری کا بھی ہے۔ ان کی گرفتاری کے لئے بھی ابن زیاد نے آدمی مقرر کئے تھے۔ ۲۲ ذی الحج ۶۵ھ کو وہ پکڑ کر ابن زیاد کے دربار میں لائے گئے۔ اس نے پوچھا۔

”تمہارے دوست نے تمہیں بھی کوئی خبر ضرور دی ہوگی؟“
”ہاں، فرمایا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں اور زبان کاٹ کر سولی پر چڑھایا جائے گا“
آپ نے بتایا اور ابن زیاد نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اشارہ کیا اور سپاہیوں نے آپ کی ریشیاں کھول دیں لیکن رشید ہجری جب جانے لگے تو چیخ کر بولا۔

”فاپس لاؤ، اسے —“

پسامیوں نے پھر کھڑکیا تو ابن زیاد نے کہا۔
 ”واقعی تمہارے لئے اس سے بہتر سزا نہیں ہو سکتی ورنہ تم جیت تک زندہ رہو
 گے، ہماری جڑیں کھودتے رہو گے۔“
 ایک لمحے تک وہ خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔
 ”اچھا، میں تمہیں قتل بھی کرتا ہوں اور تمہارے آقا کے کذب کو بھی ثابت
 کر دوں گا۔“

پھر اس نے جلاد کو حکم دیا۔

”اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر چھوڑ دو۔“

جلاد نے حکم کی تعمیل کی اور رشید ہجری کو دارالامادہ کے باہر لے جا کر چھوڑ دیا
 گیا۔ رشید کی بیٹی ساتھ تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے بلک کر پوچھا
 ”بابا کیا تکلیف ہو رہی ہے؟“

”نہیں بالکل نہیں“ رشید نے شکفتہ لہجے میں جواب دیا۔ ”بس اتنی تکلیف ہے
 جیسے کوئی معمولی خراش آگئی ہو۔“

تماشا دیکھنے والوں کا مجمع لگ گیا تھا۔ رشید ہجری نے بھی وہی کیا جس کا منظر
 میثم تمار نے کیا تھا۔۔۔ ان کی زبان سے مدح امیر المومنین کے دریا اُبل رہے تھے
 اور سننے والے ایک کیف میں سُننے جا رہے تھے۔ آخر وہی ہوا، ابن زیاد کو زبان کاٹ
 ڈالنے کا حکم دینا پڑا اور اہل کوفہ نے دیکھ لیا کہ علیؑ تو علیؑ ان کے شیدائی بھی کتنے معجز
 بیان ہوتے ہیں۔۔۔ مگر خدا نے ان کے قلوب پر مہریں لگا دی تھیں یا وہ طبع
 دنیا میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ حق کی روشنی دیکھ ہی نہ سکے۔

کوفہ کے ان حالات میں قتلِ امام کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں اور خیلہ میں
 فوجوں پر فوجیں جمع ہوتی جا رہی تھیں جس کے احکام روز دمشق سے صادر ہو رہے تھے۔

مدینے سے کربلا کی طرف

امام کو ردکنے والوں میں دوسرے بڑگوں کے ساتھ عبداللہ ابن عمر بھی تھے۔ انہوں نے بھی کہا۔

”کونے والے اعتبار کے قابل نہیں ہیں۔“

محمد حنفیہ اور عبداللہ ابن جعفر نے رائے دی

”اچھا آپ نہیں رکتے تو عورتوں اور بچوں کو نہ لے جائیے۔“

مشورہ بڑا معقول تھا لیکن امام حسین لڑنے کو تو جا نہیں رہے تھے، انہیں تو ہدایت کرنا تھی اہل کوفہ کی بھی، یزید اور اس کے عمال کی بھی، اس لئے عورتوں اور بچوں کی موجودگی آپ کے منصب میں حائل نہ ہو سکتی۔ خود آنحضرت امیر المومنین اور امام حسن کی سیرتیں مشعلِ راہ تھیں۔ آپ کی زندگی اسلام اور صرف اسلام کے لئے تھی اس کے لئے کوئی تشویش ہو نہ سکتی اور گئے گزرے حالات میں بھی آپ کے بھائی عورتیں اور بچے مسلمانوں کے لئے ان کے پیغمبر کی امانت تھیں لہذا وہ کسی بدتمیازات کا تصور بھی نہ کر سکتے اور اگر کچھ خطرہ ممکن تھا تو ان کی عدم موجودگی میں زیادہ ہو سکتا مردان کی روش آپ دیکھ چکے تھے۔ اس لئے سب کو ساتھ لے جانا ہی مناسب تھا۔ اہل بیت رسول کی ذمہ داری آپ پر تھی جس کو کسی دوسرے کے سپرد بھی نہ کیا جاسکتا۔ اس کے ماسوا خود جناب زینب اور ام کلثوم بھی بھائی کے چھوڑنے پر تیار نہ تھیں۔ مدینے میں جب عبداللہ ابن عباس نے یہی بات کہی تھی تو جناب زینب نے پس پردہ سے انہیں ٹوکا تھا۔

”اے حسین کو مجھ سے جدا کرنا چاہتے ہیں، ہم تو نہ چھوڑیں گے اپنے بھائی کو۔“

حالات پر ایک اُٹھتی نظر ڈالی جائے تو امام حسین کے بر محل اقدام کی ضرورت سمجھ میں آجاتی ہے۔ یقیناً اودار خلافت میں بعض ناروا باتیں وقوع میں آئیں اور بہت کچھ ایسا ہوا جو نہ بڑا چاہیئے تھا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے جب پورے مصلوب دین کے نفاذ کی کوشش کی تو لوگ اسلام میں لچک کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے

پابندیوں کی سختی انھیں ناگوار گزری۔ ایسے میں حضرت معاویہ کی ریشہ دوانیاں اپنا کام کر گئیں اور حضرت علی کا عہد نامہ کا میوں کا شکار ہو گیا۔ پھر معاویہ کا زمانہ ستم رانی شروع ہو گیا۔ سابقہ دور خلافت میں اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ روح اسلام کسی نہ کسی حد تک باقی تھی تبخیری ہمت میں اکثر مقامات پر چنگیزی کے مظاہرے ضرور ہوئے لیکن ان کی ذمہ داری خلیفہ وقت پر ڈالی نہیں جاسکتی۔ مرکزِ مدینہ سے جو ہدایات جاری ہوتی ہیں ان میں مفتوحین سے انسانیت کا سلوک کرنے کی ہدایت کی جاتی۔ بعض جرنیلوں نے ایامِ جاہلیت کا کردار ادا کیا تو قصور وار وہ ہیں۔

لیکن حضرت معاویہ نے خلافت کو پوری طرح ملوکیت میں بدل دیا اور فتحِ حماک میں ایک خونخوار جرنیل کی سیرت کا مظاہرہ کیا۔ اندرونی نظم و نسق اور استقرارِ حکومت کے لئے اس مقدس خون کے دریا بہا دیئے جو پوری قوم کے لئے ان کے رسول کی امانت تھا پھر بھی کہیں کہیں پر اسلام کی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں اور حکومت کو اسلامی تو نہ کہا جاسکتا تو اس پر اسلامی حکومت کا شبہ ضرور ہو سکتا تھا۔

یزید بن معاویہ نے یہ شبہ بھی دور کر دیا تھا۔ شراب عام تھی، فراز و اعرات سے ہم بستری کرتا تو دوسروں کے لئے بھی اس کا جواز تھا۔ نماز عالم سکود جنابت میں بھی ادا کر لی جاتی۔ اظہارِ رائے کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو، مگر دنِ زہنی تھا۔ سادات اور مجتہدانِ علی کا خون مباح تھا اور بعثتِ رسول کا مذاق اڑانا ان سب پر سزا تھا۔ مفتیانِ دین اور علمائے کرام کے منہ سی دیئے گئے تھے کسی کی زبان حرکت کرتی تو کاٹ دی جاتی۔

اس نظام کا نام اسلام رکھا گیا تھا جس کی توثیقِ امامِ وقت سے کر لی جارہی تھی۔ امام کا منصبی فرض تھا کہ وہ اس کی حقیقت واضح کر دیں اور دُنیائے سامنے صحیح اسلام کی تصویر پیش کر دیں۔ خود یزید کو سمجھانا بھی آپ کے فرائض میں شامل تھا۔ اسی لئے آپ نے کربلا میں عمر سعد سے کہا تھا کہ انہیں یزید کے پاس بھیج دیا جا اور شاید یزید بھی سمجھتا تھا کہ امام آگئے تو اس کو اپنے اعمال کی تادیل بن نہ پڑے گی

لہذا اس نے ایسی ہدایات دی تھیں کہ بیعت یا سر — !
 دوسرے لوگ ان خفائے کو نہ سمجھتے لہذا ہر ایک خلوص نیت سے اپنا مشورہ
 رہا تھا۔ امام نے بڑے ملائم الفاظ میں مجبوری کا اظہار فرمایا اور خلیل کے کبے سے
 رخصت ہو کر اسماعیل ذبیح اللہ کی ہم پر روانہ ہو گئے۔

عباس ابن علی منتظم قافلہ تھے۔ عرصہ صفین نے امام حسین کے ساتھ ایک
 چھوٹے سے شیش رزن کو دیکھا تھا، وہ اب ایک پیکر جمال و جلال بن چکا تھا۔ گھوڑا اُڑا
 کر قافلے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا اور واپس آکر امام کی سواری
 کے برابر چلنے لگتا۔ اس کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ جیسے علی کا روانہ رسول کا طواف

کہے ہیں۔ امام علیہ السلام کے قاصد

جناب مسلم کا خط امام حسین کو مل چکا تھا مگر آپ نے ابھی اس کا جواب نہ دیا
 تھا۔ قافلہ ٹھوڑی دُور گیا ہو گا کہ عرب کے مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔
 فرزدق نے بھی حالات کے نامساعد ہونے کی خبر سنائی۔ اہل بیت کی محبت میں سرشار
 شاعر نے بعض فی البدیہہ شعر بھی پڑھے۔ لوگوں کے دل آپ کی طرف ہیں، تلواریں
 بنی اُمیہ کے ساتھ ہیں مگر حضرت نے ارادہ ملتوی نہ کیا۔ تین میل پہنچے تھے کہ منزل تمام
 پر عبداللہ ابن جعفر اپنی قائم مقامی کے لئے زینب کے دونوں بچوں عون و محمد کو لے
 کر پہنچے، وہ خود بیماری کی وجہ سے ساتھ نہ جاسکتے۔ بڑی رقت انگیز ملاقات تھی۔
 عبداللہ اور امام حسین کی۔ عبداللہ بھی محسوس کرتے کہ امام حسین، علی اور حسن کے بتلیغ
 کا تسلسلہ ختم کرنے جارہے ہیں۔ دونوں کئی بار بغل گیر ہوئے پھر عبداللہ مدینے
 کی طرف واپس ہو گئے۔

منزل عاجز میں عبداللہ ابن مطیع نے بھی ایسا ہی کچھ کہا لیکن آپ آگے بڑھتے
 رہے۔ منزل ذات العرق میں بشیر بن غالب نے کوفیوں کی غداری کا تذکرہ کیا مگر آپ
 کا اندازہ بتا رہا تھا گویا آپ یہ سب کچھ جانتے ہوں۔

پیغمبر اسلام نے جب دین کا آغاز کیا تھا تو انہیں آسانی سے عربوں کے راہِ راست پر آجانے کی امید تو نہ تھی۔ آج پیغمبر کا نواسہ تجدید اسلام کے لئے جا رہا تھا تو وہ کیوں توقع کرتا کہ ہیکے دوسرے کوئی ایک دم آپ کا پیغام سن لیں گے اور جاہِ حکومت کی طرف سے ان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ آپ منزلوں پر منزلیں کرتے رہے اور ایک روایت کے مطابق بطنِ رمہ پر اہلِ کوفہ کے خطوط کا جواب لکھا، جس میں اپنے پیچھے کی اطلاع دی۔ اس خط کو آپ نے قیس بن مسہر حیدرادی اور عبدالرحمن بن یقطر کے ہاتھ کو دے دیا۔ وہاں کوٹنے کی مکمل ناکہ بندی تھی۔ ہر طرف ایک جنگی ماحول تھا۔ فوجوں کی مسلسل نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ حیثیت کے قاصد قادیسیہ میں حسین ابن نمیر کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور ابن زیاد کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ قیس نے ان کے سامنے پہنچتے ہی مام کا خطرہ پرز پرزے کر ڈالا اور ابن زیاد کے پوچھنے پر بتا دیا۔

”یہ خط جن کو لکھا گیا تھا، ان کے نام تو کبھی معلوم نہ کر سکے گا۔“

ابن زیاد کو علی کے سرفروشنوں کا کردار معلوم تھا، تاہم اس نے دھمکیوں سے کام لیا اور جب کوئی امید افزا جواب نہ ملا تو کہنا۔

”مکتوبِ الہم کے نام بتا دو یا منبر پر جا کر حسین اور ان کے باپؑ لعنت کر دو۔“

”پہلی خواہش پوری ہونا تو ناممکن ہے۔ ہاں دوسری ہو سکتی ہے۔“

یہ کہتے ہی قیس منبر پر پہنچ گئے اور حمد الہی و نعت رسالتِ پناہی کے بعد زیاد بن سمیہ یزید بن معاویہ اور دوسرے بنی امیہ پر تبرا کر ناشروع کر دیا۔ قیس کی زبان بڑی اتنی سے چل رہی تھی، انہوں نے کوفہ والوں کو بتایا۔

”امام تمہارے بلانے پر فلاں منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ تمہاری شرافت کا تقاضا ہے کہ ان کی نصرت کر دو۔“

وہ اور کچھ کہتے کہ ابن زیاد کے آدمیوں نے پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا قیس اپنے آقا کے نام پر قربان ہو گئے۔ عبدالملک بن عمیر لمحی نے ان کا سترن سے جدا کر دیا۔ اب عبداللہ بن یقطر کی باری تھی۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ پیش آیا۔ اسخوں نے

بھی قبیلے کے سے جوابات دیئے اور انھیں بھی بالا خانے سے پھینک کر شہید کر دیا گیا

سفر: ایک مسلک ہدایت

امام حسین ان واقعات سے بے خبر اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے کہ منزل خویمہ پر زہیر ابن قین کا خیرہ نصب دیکھا جو قبیلہ بجلہ کے رئیس اور کوفہ کے بزرگ گردہ سے تعلق رکھتے تھے۔ امام حسین نے انھیں بلا بھیجا۔ زہیر حاضر خدمت ہو گئے اور خیمے سے باہر آئے تو آپ کی دنیا بدل چکی تھی۔ آپ نے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ بلند مرتبہ زوجہ ساتھ دینے پر مہر ہو گئی اور اٹام کے قافلے میں ایک سرفروش کا اضافہ ہو گیا جس نے تاریخ کو بلا میں اپنے خون سے ایک نمایاں عنوان لکھا ہے۔

زہیر کا تعلق یمن کے قبیلہ بجلہ سے تھا مگر پیدائش مکہ کی ہے۔ امام حسین سے بچپن کا ربط تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اٹام کی خاک پاؤںکھوں سے نکالتے تھے۔ آپ کے باپ قین نے رسول کا زمانہ دیکھا تھا۔ آپ نسوں سے محبت اہلیت تھے۔ منقول ہے کہ امام ۹ رزی الحج کو کسی منزل پر فروکش تھے کہ اچانک اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور باواز بلند فرمایا۔

”علیکم السلام یا مسلم!“

جناب زینب نے جو کچھ پوچھا اور آپ نے جو جوابات دیئے وہ روایت کا حصہ ہیں منزل ذبالہ پر محمد بن کثیر، عبداللہ بن یقطر، ہانی بن عروہ اور جناب مسلم کی شہادتوں کی تصدیق ہوئی۔ امام حسین جب مکے سے نکلے تھے تو ۸۲-۸۳ ہجری آپ کے ہمراہ تھے۔ راستے میں بہت سے لوگ مال غنیمت کی طمع میں ہمرکاب ہو گئے تھے لیکن جب آپ نے خطبہ دیا کہ آپ جنگ کے لئے نہیں جا رہے ہیں بلکہ آپ کا قتل یقینی ہے تو مجمع آہستہ آہستہ چھٹنے لگا اور صرت حق کے دانے باقی رہ گئے۔

قصر بنی مقاتل میں عبداللہ بن جرحفی آکر ملے۔ منزل تعلیبہ میں حصوہ کو خراب میں دیکھا اور آپ کو اپنی شہادت کا یقین ہو گیا۔ حضرت علی اکبر نے کہا

”بایا۔ ہم حق پر ہیں تو موت سے ڈرنا کیا۔“

آپ نے بڑے پیار سے بیٹے کو دیکھا اور بڑے صبر و شکر کے ساتھ خدا کو یاد کیا۔ شرافت یا عزیز الہیات کی منزل میں حُر بن زید الریاحی کا شکر سدا رہا ہوا، اور آپ نے اس کے پورے لشکر کو میراب کیا جو مارے پیاس کے جاں بلب ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہی آپ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا جو حالات پر پوری روشنی ڈالتا ہے۔

”لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے ظالم، محرمات الہی کو حلال کرنے والے، خدا کے عہد کو توڑنے والے، خدا اور رسول کے مخالف، اور خدا کے بندوں پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ حکومت کرنے والے بادشاہ کو دیکھا اور قولا و عملا اس میں غیرت نہ آئی، تو خدا کو حق ہے کہ اس کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کرے

لوگو۔ خبردار ہو جاؤ۔ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار

کی اور رحمن کی اطاعت چھوڑ دی ہے، ملک میں فساد پھیلایا ہے

حدود الہی کو معطل کر دیا ہے، مال غنیمت میں اپنا حصہ زیادہ لیتے

ہیں، خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزوں

کو حرام کر دیا ہے، اس لئے مجھ کو غیرت آنے کا زیادہ حق ہے“ (۸۸)

شاہ معین الدین ندوی نے ان عوامل کے ایک رخ کو واضح کر دیا ہے جنہوں

نے امام حسین کو اس اقدام پر مجبور کر دیا تھا۔

آپ کا ارادہ کوفے کی طرف جانے کا تھا لیکن حر کو گرفتاری کا حکم ملا تھا۔ اس

کے گستاخانہ انداز پر حضرت عباسؓ کا ہاتھ قبضہ شمشیر پر پڑ گیا مگر امام نے روک دیا

یہاں سے علی کے شیر کا امتحان ضبط مشرور ہوا۔ آخر بحث و تمحیث کے بعد آپ نے

راستہ بدلا اور اس سرزمین پر وارد ہوئے جو ازل سے آپ کے نام لکھی ہوئی تھی۔

جنگی نقطہ نظر سے زہیر بن قین کی رائے سچی کہ حر کا دو ہزار کاٹ کر کسی گتھی میں

نہیں ہے۔ اس کے بعد فوجوں کی تعداد بڑھتی جائے گی مگر امام حسنؓ کا چھوٹا بھائی

لڑنے کے لئے تو آیا نہیں تھا۔ اس نے پہل کر اپنی شان کے خلاف سمجھا، اس راستے

پر چل پڑا جو نہ آپ کا مجوزہ تھا اور نہ حر کا۔

۲ محرم کو آپ وارد کربلا ہوئے، آسمان پر چلکے ہوئے چاند پر آپ کی نظر پڑی پھر آپ نے زمین کی طرف دیکھا جس سے ایک زرد غبار بلند ہو رہا تھا۔ ایک انجانا ہولناک منظر جس سے عورتوں کو دہشت اور بچوں کو وحشت ہو رہی تھی مگر آپ نے سامنے بہتی ہوئی نہر فرات کے کنارے خیمے لگانے کا حکم دے دیا۔

راستے میں امام حسینؑ نے کئی خطبے دیئے تھے جن کو حوادر اس کے شکریوں نے بھی سنا تھا اور ان سے کافی تاثر تھے۔ اس لئے کربلا پہنچے تک حوادر کا رویہ بہت نرم رہا اور وہاں پہنچے پر بھی اس کی طرف سے خلاف ادب کوئی مظاہرہ نہیں ہوا لیکن جب ابن ابی اسحاق کا تاکید حکم پہنچا تو حوادر مجبور ہو گیا اور اس نے ساحل نہر پر خیموں کی تنصیب روک دی۔ حضرت عباسؑ کے تحمل کی یہ دوسری آزمائش تھی۔ آپ کے پیوروں پر بل پڑ گئے مگر رسولؐ کے جانشین نے پھر نرمی سے سمجھا دیا اور خیمے وہاں سے ہٹا کر تپتی ہوئی ریت پر لگا دیئے گئے۔ جو اس کسی چاکر کو کمتر کی طرح سر جھکائے تھے مگر چہرہ فرط غیظ سے تھم رہا تھا۔ اصحاب کا بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ نہ میرے پھر رہا نہ گیا۔ ادب کے ساتھ عرض پیرا ہو گئے۔

”مولیٰ! ابھی دقت ہے۔ انہیں سزا دی جاسکتی ہے۔“

”نہیں نہ میرے صبر کے سامنے اس عمل کی کوئی حقیقت نہیں۔“ امام نے اپنی منہمی بلند پر کھڑے ہو کر کہا اور نہ میرے ساتھ دوسرے اصحاب بھی مجبور ہو گئے۔ امام حسینؑ کی یہ روش فہم انسانی سے بالاتر ہے۔ دشمن کی بڑھنے والی قوت کو اسی منزل پر کچل سکتے تھے اور اس کے بعد جو فوجیں آئیں ایک ایک کر کے وہ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن ان کا مقصد کشت و خون نہ تھا۔ وہ سروں کو کاٹ دیئے کے قابل نہ تھے بلکہ دلوں کو جھکانے کے لئے آئے تھے جس کے بعد بند آنکھوں کو کھول دینا آپ کا نصب العین تھا اور ظلم کے سامنے عدل کی شمع روشن کر کے شامیوں اور کوفیوں کو اس منزل پر لے آنا تھا جہاں وہ عہد رسالت میں کھڑے ہوئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کی صراحت فرماتے ہیں۔

”فی الحقیقت یہ حق و صداقت، آزادی و حریت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان قربانی تھی جو صرف اس لئے ہوئی تاکہ پیروانِ اسلام کے لئے ایک اسوۂ پیش کرے اور اس طرح حق جہاد و عدالت اور ثبات و استقامت کی ہمیشہ کے لئے ایک کامل ترین مثال پیش کر دے۔ پس جو بے خبر ہیں، اُن کو ردنا چاہیئے۔
 اور جو روتے ہیں، اُن کو روکنے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے۔ ان کے سامنے اللہ شہداء نے اپنی قربانی کا اسوۂ حسنہ پیش کر دیا ہے اور کسی روح کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ محبتِ حسین کی مدعی ہو، جب تک کہ اسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے۔

دُنیا کی ہر چیز مرجاتی ہے کہ فانی ہے مگر خونِ شہادت کے ان قطروں کے لئے، جو اپنے اندر حیاتِ الہیہ کی روح رکھتے ہیں کبھی بھی فنا نہیں۔
 حضرت سید الشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے مظالم بنی امیہ کے خلاف جہاد حق کی بنیاد رکھی اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو، جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارتگر ہو۔“ (۸۹)

یہ فتویٰ اُس اہلِ سنّت و الجماعت کے لئے ہے جن کو حضرت معاویہ نے تشکیل دیا تھا مگر یہ نام قبول عام حاصل نہ کر سکا اور معاویہ کے پیرو شیعانِ معاویہ ہی کہے جاتے رہے۔ ماموں رشید کی مساعی سے امام ابو یوسف کی قیادت میں جب اس نام کا پرچم بلند کیا گیا تو اس نے اتنی شہرت حاصل کی کہ آج تک مسلمانوں کی اکثریت اہلسنّت و الجماعت کے عنوان سے موسوم ہے لیکن فی زمانہ تو اس کی اتنی شاخیں ہو گئی ہیں کہ ان کی تعداد درجنوں سے زائد ہے۔ بریلوی گروہ جس کی تولا د سب سے زائد ہے دیوبند دہلوی، اہل حدیث وغیرہ وغیرہ۔ ان کے عقائد میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ اگر ان

کا تجزیہ کیا جائے تو رسول کی حیثیت اتنی مختلف نظر آتی ہے کہ اس کے خدو خال پہچانے نہیں جاسکتے۔ نظریاتِ توحید میں بھی کہیں کہیں ٹکراؤ اور قرآن کی معنی آفرینی میں تو انفرکاک افکار کی کار فرمائی ہے۔ ان سب کے مقابل شیعوں کا ایک موقف جو کبھی تھا، وہ آج بھی ہے کیونکہ ہمارا مسک رسول اور ان کے گھر تک محدود ہے۔ کوئی ناراض ہو یا آمادہ قتل ہو جائے، ہم کسی کی اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کرتے جس کی تصدیق ہمارے آئمہ کے اقوال سے نہ ہوتی ہو۔

اس مقام پر ایک بات تو صریح طلب ہے کہ کسی کو ہم سے برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا ایک راستہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے، ہم اس پر قائم ہیں، کسی کے نظریے سے وہ غلط ہے تو ہم اس کی تصدیق نہیں کرتے اور نہ کسی سے کہتے ہیں کہ آپ غلط ہیں پھر ہمیں کیوں چیخڑا جاتا ہے۔ بیٹھے ہیں رہ گزر یہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں! بات سچی مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں ایسر کر بلا کے اقدام کی تو مولانا سبحان اللہ باتوں کے بعد تصریح فرماتے ہیں۔

”مقابلے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے پاس قوت و شوکت مادی کا وہ تمام ساز و سامان بھی موجود ہو، جو ظالموں کے پاس ہے کیونکہ حسین ابن علیؑ کے ساتھ ضعفاء و مساکین کی جمعیت قبیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ نتائج کی فکر سے بے پڑا ہوتی ہے نتائج کا مرتب کرنا تمہارا کام نہیں۔ یہ اس قوتِ قادرِ عاقلِ الہیہ کا کام ہے جو حق کو باوجود ضعف و فقدانِ انصار کے کامیاب و فتح مند کرتی اور ظلم کو باوجود جمیعت و عظمت و نیروی کے نامراد و ننگوں سار کرتی ہے۔“

خیمہ گاہِ کربلا

یزید کو خود اپنے ظلم و ستم اور افعالِ شنیعہ کا احساس تھا مگر وہ ان کو ترک نہ کر سکا لہذا ان کا جواز ڈھونڈ ڈھونڈنے میں کوشاں تھا۔ سامنے کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی توہینِ چند مقدس لوگوں سے کرا لیتا جس کے بعد کوئی اس پر انگلی اٹھانے کے قابل نہ رہتا۔ ایسے لوگوں میں میر فہرستِ حسین ابن علیؑ تھے، جن کی طرف سے ہر دستِ کبھی جنگی مخالفت کا دھڑکا

نہ تھا مگر نہ جانے کیوں راہ کے اس کانٹے کو صاف کر لینے کی بڑی الجھن تھی۔

حسین کے مدینے سے پرج نکلے پراس نے کوتاہی کی یاداش میں عاقل مدینہ کو معزول کر دیا اور کے میں تین سوشامی حاجیوں کے لباس میں بھیج دیئے کہ حج کرتے وقت رسول کے نواسے کو قتل کر دیں مگر حسین نے اس کی نوبت نہ آنے دی اور ۲ رذی الحج ۶۱ھ کو مکہ چھوڑ دیا۔ — یزید اس خبر پر اچھل پڑا اور عبید اللہ ابن زیاد کو اس نئے حکم دے دیا کہ اب حسین بچنے نہ پائیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے نواح کو ذہیں میدان خیمہ فوجوں سے بھر گیا۔ حُر ابن یزید الریاحی دو ہزار کے لشکر کے ساتھ رسول کے نواسے کو گھیر کر میدان کر بلا میں لے آیا۔ سعد ابن ابی وقاص کے بیٹے عمر کو ابن زیاد نے رے کی جاگیر دینے کا وعدہ کر کے امیر لشکر بنا دیا اور اس پر انفرادی لشکر کر بلا کی طرف بھیجا شروع کر دیئے۔

ادھر قیام کر بلا میں امام نے بنی اسد سے کر بلا کی زمین خرید کر ان کو ہبہ کر دی حالت مستقبل کا اشاریہ تھے۔ اپنی یقینی شہادت کے پیش نظر آپ نے بنی اسد سے لاشوں کی تدفین کا وعدہ لیا اور رشد و ہدایت کے آخری فرائض کی انجام دہی میں لگ گئے۔

امام جانتے تھے کہ حُر الریاحی نے عمال یزید کو آپ کے پہنچنے کی اطلاع ضرور دی ہوگی اور جلد ہی لشکر آنا شروع ہو جائیں گے لیکن آپ ذہنوں کو بد لنے کے لئے آئے تھے لہذا آپ بے خوف و خطر روز کے خطبات میں آنے والے خطرات کو بیان کرتے رہے تاکہ جس کو جانا ہے، وہ اب بھی چلا جائے اور وہ رہ جائیں جو صداقت کے لئے موت کو گلے لگانے پر تیار ہوں۔ جانے والوں کے لئے آپ نے اپنی بیعت اٹھالی تھی اور کہہ دیا تھا۔

وہ اپنی جان بچا لینے پر کسی سے باز پرس نہ کریں گے۔ اس کے بعد آپ نے جتنی بھی تقریریں فرمائیں، وہ فوج یزید کے سامنے اور حقیقت یہ ہے کہ جن کے پاس ضمیر مردہ بھی تھا، اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بے ضمیروں پر اس وقت تو کوئی اثر نہ ہوا، بعد میں انہیں پچھتا نا پڑا۔

اہل حرم میں ۲۰ بچے، بنی ہاشم کے اٹھارہ یا انیس مرد، اسی قدر عورتیں اور صحابہ میں ستر اسی مرد تھے، جن میں اسی پچاسی سال کے بوڑھے بھی شامل تھے۔ عزیر ذاتاؓ اور اصحاب کا تو یہ حال تھا کہ امام حسینؑ کی ہر تقریر کے بعد اپنی وفاداری کا یقین لاتے اور تھے بھی وہ ایسے وفادار، انسانی تاریخ میں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ خواتین میں زینبؓ، ام کلثومؓ، عقیلہؓ، جناب شہربانوؓ، جناب ام لیثیؓ، جناب فضہؓ، جناب ام فروہؓ اور دیگر محذرات شامل تھیں، جن کے ثباتِ عزم میں لغزش آنے کا امکان ہی نہ تھا۔ تاہم قلوب میں ایک دہشت پیدا ہو رہی تھی۔ اسی لئے جناب زینبؓ نے امامؑ سے فرمایا۔

”بھائی! آپ بھی اپنے دوستوں کو خط لکھیں۔۔۔“

امامؑ نے یکے بعد دیگرے کئی خط لکھے۔ ان میں سے ایک خط یحییٰ بن علیؑ کے دوست حبیبؑ ابن مظاہر کے نام، دوسرا مسیبؑ بن نجبه کے نام تھا۔

حبیبؑ خط ملتے ہی اپنے غلام کو لے کر بیٹے بچاتے کوٹے سے نکل آئے اور اسے

یا آٹھ محرم کو واردِ کربلا ہوئے۔

مسیبؑ گھر میں صرف تہہ بند باندھے بیٹھے تھے۔ امامؑ کا خط ملتے ہی اسی عالم میں نکل پڑے اور اپنے قبیلے میں پہنچ کر اعلان کرنے لگے۔ ”بھائیو چلو، فاطمہؓ کا لال دشمنوں میں گھر گیا ہے، اس کی نصرت کرو۔“ مسیبؑ نے بہت جلدی کی مگر لوگوں کو جمع کرنے میں وقت لگ گیا اور جب وہ کربلا کے قریب پہنچے تو روزِ عاشور گزر چکا تھا۔ مسیبؑ اسی مقام سے پلٹ پڑے اور اب ان کی زندگی کا مقصد قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینا رہ گیا تھا۔

دوسرے خطوط جو امام حسینؑ نے تحریر فرمائے تھے، وہ بھی مکتوبِ الیم کہ پہنچے لوگ جانوں کو قربان کرنے کے لئے روانہ ہوئے مگر کچھ تو گرفتار ہو کر قید خانوں میں ڈال دیئے گئے، کچھ قتل ہو گئے، کوئی ہسپتال گیا اور بعض وہ سرفروش بھی آگئے جنہیں بگایا نہیں گیا تھا۔ انہوں نے سنا تھا کہ فوجیں سبطِ پیغمبرؐ کے قتل کے لئے جمع ہو رہی ہیں۔ ترقیقات الہی نے انہیں دشمنوں کی نگاہوں سے بچ کر نکل جانے کا موقع دیا اور کربلا

پہنچ کر انہوں نے دادِ شجاعت دی۔

دورانِ سفر ایک ابنوہ کثیر امام حسین کے ساتھ ہو گیا تھا مگر راستے میں امام کی تقریدوں نے انہیں یالوس کر دیا اور سب اہمستہ اہمستہ چھوڑتے رہے مگر بلا پہنچنے والوں میں بہت تھوڑے لوگ تھے۔ پھر ان میں ایک ایک دو دو کا اضافہ ہوتا رہا اور محنتی کچھ بڑھ گئی مگر کسی روایت کی رو سے وہ نو دس دہائیوں سے زائد نہ تھی۔

شکر پریشکر

حزبنِ یزید الریاحی کے ساتھ دو تین ہزار فوج تھی جس کے مقابلے کے لئے اسی نوے نفوس کافی تھے بلکہ ان میں سے کوئی ایک یا دو چار ان کو بھگا سکتے تھے مگر سرِ محرم کے بعد فوجوں کا تانا بانہہ کیا۔ شہید ابنِ ربیع، حصین ابنِ نمیر، شمر ذی الجوشن، عاتر بن خزیمہ، حوئی ابھی، سنان بن انس، عرقہ بن قیس، ابوذر ابی بکر بن کعب، کتنے ہی سردار اپنے اپنے لشکر لے کر پہنچتے رہے۔ ۳۰ محرم کو عمر بن سعد نو ہزار فوج لے کر پہنچا۔ جو کربلا کے پورے یزیدی لشکر کا سپہ سالار تھا۔

فوجوں کی تعداد جتنی بڑھ رہی تھی، مخدرات عصمت کو اتنی ہی ہول ہو رہی تھی اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ جب کوئی نیا لشکر آتا تو حجام آلِ رسول کے قریب پہنچتے ہی گھوڑوں کو اتنی تیزی سے دوڑاتا کہ بچے دہل دہل کر ماؤں کی گود میں جا چھپتے۔ اب حالات اور اس کے نتائج بالکل روشنی میں آچکے تھے مگر مردوں اور عورتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ کسی نے امام کو چھوڑ دینے کا خیال تک کیا ہو۔

روایات کی کثرت نے جس طرح اسلام کے ہر کردار میں جو یقینی پہلو پیدا کر دیئے ہیں۔ ویسا ہی کچھ کربلا میں بھی ملتا ہے کیونکہ اس عظیم سانحہ کے بارے میں ہر بیان دشمنوں ہی کا ہے۔ سچے لوگوں میں جنہوں نے دیکھا تھا وہ موت کی آغوش میں سو چکے تھے۔ امام زین العابدین بیماری کے بستر پر بیہوش تھے اور خواتین پر دے کے اندر تھیں لہذا مورخین کو جو کچھ معلوم ہو سکا، وہ قاتلانہ حسین کی زبان سے فوجوں کی تعداد چالیس ہزار سے ۹ لاکھ تک بتائی گئی ہے۔ یہ نواکھ تو قابلِ فہم نہیں ہیں

مگر چالیس ہزار زیندی کر بلا میں مزدور موجود تھے کیونکہ حد نظر تک فوجیں پھیلی ہوئی تھیں جن کے مقابلے میں ایک طرف چند خیمے لگے ہوئے تھے۔

کوہ کر بلا سے اڑتالیس میل پر واقع ہے۔ فوجوں کی تعداد کا تعین چالیس ہزار سے زائد اس تقویت پر کیا جاسکتا ہے کہ بعض بہادروں کے حملوں میں دشمن کی فوجیں بھاگتی ہوئی کوہ کے سرحدوں تک پہنچ گئیں۔ یہ کوئی بمبالغہ نہیں ہے۔ مقابل اور تذکروں میں اس کو تو اترا اور صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے عالس ابن ابی شیبہ شاکری، زہیر ابن قین اور بریر ہمدانی کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ شروع میں صرف حر سے پنٹ لیا جاتا پھر جو فوج آتی جاتی اُس کو باری باری کاٹ کر رکھ دیا جاتا مگر یہ جنگ نقطہ نظر تھا اور فتح کا یقینی راستہ، امام حسینؑ تو پیغمبر اسلام کی سطح ہدایت سے دیکھ رہے تھے، آپ کو تسخیرِ قلوب کرنا تھی، اس لئے فوج کی تعداد بڑھتے ہی آپ نے وہ روش اختیار کی جو ایک مُرسَل کی ہو سکتی۔

عمر سعد کا درشت اور تند مزاج فرسادہ، کثیر ابن عبداللہ جب ملنے آیا تو انوما صاندی سے تسخیرِ کلامی کے بعد واپس چلا گیا۔ وہ امام کے روبرو پہنچ جاتا تو آپ کی نرمی سے متاثر ضرور ہوتا۔ دوبارہ قرقر بن قیس حنظلی باریاب ہوا تو آپ نے فرمایا:۔ ”میں عوام کی دعوت پر رہ رہا ہوں، تمہیں گواہ نہیں تو واپس چلا جاؤں گا“ بات اتنی واضح تھی کہ اس کے بعد جنگ کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ حجت تمام ہو گئی تھی۔ ایک فرقہ لڑنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ دشمن کے لئے خاموشی کے سوا چارہ ہی کیا تھا لیکن ابن زیاد کو شام سے کھٹے ہوئے احکام مل چکے تھے۔ بیعت یا قتل؟ لہذا ابن زیاد نے عمر سعد کو زید الریاحی کی طرح، سرزنش کی مگر اس سے قبل امام حسینؑ نے خود عمر سعد کو بلوایا۔ ایک علیحدہ خیمے میں گفتگو ہوئی اور طے ہو گیا کہ حضرت عرب چھوڑ کر کسی دور دراز مقام پر چلے جائیں گے۔

امید پیدا ہوئی تھی کہ خونی واقعہ عمل میں نہ آئے گا مگر غلی اُٹھی اور شمر زیدی الجوش

نے ابن زیاد کو عمر سعد کی نرمی سے آگاہ کر دیا، وہاں سے تاکید فرماں جاری ہو گیا جس میں بندش آب کا حکم بھی تھا۔ چنانچہ عمر سعد نے عمران حجاج کو پانچ سو سواروں کے ساتھ فرات پر تعینات کر دیا۔

یہ عمل مستقبل کے عزائم کا ائینہ دار تھا جس کو آلِ محمد سے عناد پر تعبیر کیا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ امام حسینؑ کے ساتھ جو گنتی کے سرفروش تھے، تاریخِ عرب کی شہادت میں ہر ایک کا ایک مقام تھا اور عرب و عراق کے ذریعے ان کی تلواروں سے ٹپکے ہوئے لہو کو چاٹ چکے تھے۔ عابس شاکری، مید القراء، یزید ابن خنیسہ، ہمدانی، زہیر ابن قسین، مروقیہ حبیب، ابن مظاہر اسدی کے سے مردانِ جنگ آزما کے تصور سے یزیدی سواروں کے خوابوں میں کسکی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کا علم ابن زیاد کو بھی تھا۔ شجاعتِ علی کے وارثوں سے خواب میں بھی اس کو دہشت ہونے لگتی تھی۔ خود مسلم بن عقیل کی جنگ وہ دیکھ چکا تھا۔ آج بھی دارالامارہ کو ذہ کے دردِ دیوار میں مسلم کے نعروں کی آواز باز گشتِ سانی دیتی، اس لئے حکم دے دیا کہ ساتی کوڑے بچوں پر پانی بند کر دیا جائے تاکہ مانے ہوئے بہادر پاپس کی شدت سے اتنے کمزور پڑ جائیں کہ کل جیب لڑائی ہو تو وہ اس طرح نہ لڑ سکیں جس کی روایت ان سے وابستہ ہے

خونخوار مگر بزدل بھیڑیے کو معلوم نہ تھا کہ شیر بھوکا اور پیاسا ہو تو زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے اہلِ کوفہ کی طبیعتوں کی طرح کہ بلا کے حالات بھی ہر لمحہ بدل رہے تھے۔ ایک طرف ستم رانی کے جواز کے لئے بے قصوروں میں تصور ڈھونڈے جا رہے تھے، دوسری طرف اتمامِ حجت سے ظلم کا ہر دروازہ بند کیا جا رہا تھا۔ امام نے یہاں تک کہہ دیا۔ ”اور کوئی صورت ممکن نہیں تو مجھے شام لے چلو“ آپ یوں بھی ایک بار یزید کو سمجھانا چاہتے تھے کہ سچا مسلمان نہیں بن سکتا تو اسلام کی لاج رکھنے کی کوشش ہی کرے، اس لئے آپ نے عمر سعد سے کہہ دیا کہ انہیں یزید کے پاس لے چلے یا پھر ہمدان کی طرف چلا جانے دے مگر ہٹ دھرم یزیدیوں نے ہر پیش کش مسترد کر دی۔

ہمدانستان کا نام آپ نے یقیناً تبلیغِ اسلام کے لئے لیا تھا اور مستقبل کے کسی

معین الدین اجمیری اور لعل شہباز قلندر کی رہنمائی کی تھی لیکن آپ کا ایک تعلق بھی ہندوستان سے تھا۔ کمران و سندھ کے بعض علاقے حضرت علیؑ کے دورِ خلافت میں اسلام اور آلِ محمدؐ سے آشنا ہو چکے تھے۔ ایک تعلق جناب شہر بانو سے بھی ہندوستان کا تھا۔ — مورخین نے اس سلسلے میں بھی تاریخ کا خون کیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ایران کے بعد اس کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ ان میں ایک شہر بانو دوسری یکہبان بانو تھیں جو غلط ہے۔ یزدجرد چار ہزار سپاہ کے ساتھ مع اہل خیال بھاگ نکلا تھا اور مرد میں اقامت پذیر ہو گیا تھا۔

”سلسلہ دور عثمانی میں یزدجرد مارا جا چکا تھا۔ اس کے عیال مرد میں موجود رہے۔ حضرت علیؑ کے عہد میں خلید بن قزویری نے ایک مختصر سی جنگ کے بعد ان کو برآمد کیا اور دیگر امیروں کے ساتھ دونوں شہزادیوں کو بھی خدمتِ امام میں ارسال کیا جو ۳۲ھ میں جنگِ جمل کے بعد مدینہ پہنچیں۔ حضرت علیؑ نے جناب شہر بانو امام حسینؑ کو اور یکہبان بانو حضرت محمد بن ابی بکر کو عطا کر دیں۔ حضرت امام زین العابدینؑ یکشنبہ ۳۸ھ میں جناب شہر بانو کے بطن سے پیدا ہوئے اور قاسم بن محمد جناب یکہبان بانو کے بطن سے“ (۹۰)

ان دونوں بہنوں کی ایک تیسری بڑی بہن بھی تھیں جو اودے پور میں مہارانا پرتاپ کی اولاد میں بیاہی تھیں جن کا پتہ اودے پور کی روایتی تاریخ سے چلتا ہے۔

ایک اور رشتہ بھی امام کا ہندوستان سے تھا وہ یہ کہ امام زین العابدینؑ کی ایک بیوی سندھی تھیں جن سے جناب زید شہید پیدا ہوئے۔ (۹۱)

ایک ضعیف سی روایت یہ بھی ہے کہ جو ناگرٹھ کے موجودہ حسینی برہمنوں کے اجدادِ اعلیٰ میں سے کوئی فرد جس کے نام کے آگے ”دست“ لگا تھا وہ بھی کر بلا کے شہیدوں

میں شامل ہے ممکن ہے کہ اس نے امام علیہ السلام کو ہندوستان چلنے کی دعوت دی ہو جس طرح طراح بن عدی نے اپنے آبائی وطن یمن کی استدعا کی تھی جہاں آج بھی کے دادا حاتم کا نام در و دیوار میں گونجتا تھا۔

تشنگانِ فرات

یزیدیوں کا پہلا حربہ بندشِ آب تھا جو بہت کارگر ہوا، خلیفہِ حسینی میں تہلکہ پڑ گیا اور بچے بکتنے لگے۔

۴۔ محرم تک پانی کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ صفین میں حضرت علیؑ ایک نظر پیش کر چکے تھے کہ پانی دشمنوں پر بھی بند نہیں کیا جاتا۔ اس لئے عام خیال یہ ہو گیا کہ اب شاید پیروانِ معاویہ ایسا نہ کریں لیکن جب عمر بن حجاج نے دریا کو اپنے قبضے میں لے لیا تو امام حسینؑ کو زیادہ استعجاب نہیں ہوا۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہو گا کہ خیالِ اہل بیت میں پانی موجود ہی نہ تھا لیکن قبضہ، چونکہ، اچانک کیا گیا تھا۔ اس لئے پہلے سے کسی ذخیرہ آب کا التزام نہ تھا، جو پانی موجود ہو گا وہ ۸ محرم تک ختم ہو گیا ہو گا اس کی تقسیم میں بھی بچے مقدم رہے ہوں گے اور اس کا امکان ہے کہ بڑوں کا دورانِ تشنگی شبِ شتم ہی سے شروع ہو گیا ہو۔

دشمنانِ اسلام نے کہ بلا سے متعلق بھی آن گنت جھوٹی روایتوں کے انبار لگائے ہیں مگر کسی ناصبی نے بھی یہ نہیں کہا کہ مردوں یا عورتوں میں سے کسی نے پانی کی تسکین کی ہو، البتہ ناسمجھ بچوں نے اکبر و عباسؑ سے بار بار فریاد کی۔ العطش، العطش اور اسی کو دیکھ کر امامؑ نے عباسؑ سے فرمایا:

”بھائی! پانی کی کچھ سبیل کرو۔“

کئی مورخین نے لکھا ہے کہ اکبر و عباسؑ، نافع بن ہلال اور بعض دوسرے اصحاب کو لے کر نہرِ ریحلہ آدر ہوئے تھے اور کئی مشکِ پانی لائے تھے مگر ان مشکوں سے بکتے بچے اور کھتے بڑے اپنے حلق ترک کر سکے ہوں گے، اسی رعایت سے ۸ محرم منقلے حرم سے منسوب ہے اور آپ کے نام پر جس جگہ پانی یا شربت پلایا جاتا ہے

اس کو سبیل کہتے ہیں۔

یہ چیز خشکیں جلتے تو بے پر پھینٹوں کا کام کو گئی ہوں گی اور پھر وہی طفلان کم سن کی العطش العطش کی آوازیں خیمہ گاہ سے بلند ہونے لگیں۔ کہا جاتا ہے کہ علی کے میٹر نے یکے بعد دیگرے کئی کنوئیں کھودے مگر ان سے پانی برآمد نہیں ہوا اور بعض میں پانی نکلنے کے آثار پائے گئے تو دشمنوں نے ان کو جھٹک کر کے بند کر دیا۔

شب عاشور حصولِ آب کے لئے جریر ہمدانی کا نام تاج کے افق پر درخشاں ہے۔ آپ امام کی اجازت سے اصحاب کی ایک جماعت لے کر دریا پر پہنچے۔ عمر بن حجاج نے پانی پینے کی اجازت دی۔ بریر دریا میں اترے۔ ساتھی قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر دے کھڑے رہے۔ بریر نے مشک بھری۔ اس کے دہانے کو باندھ لیا۔ دُور تک بہتے ہوئے پانی کو کھا مگر امیر المؤمنین کا بوڑھا صحابی پیاسا ہی گیا تھا، پیاسا ہی نکل آیا۔ عمر بن حجاج نے ٹوکا۔ ”تم خود جتنا چاہے پی لو، مگر پانی لے کر نہیں جا سکتے۔“

بریر نے نعرہ بلند کیا۔

”صفین کا مجاہد ہوں۔ روک سکتا ہے تو مجھے۔“

صرف چند ہمراہیوں کے ساتھ بڑی احتیاط سے بریر آئے تھے مگر تھے سب یگانہ روزگار۔ ایک بار جنتی تلواریں چمکیں، اتنے ہی سرزمین پر آگرے۔ چند لمحوں میں کچھ زخمی، کچھ صحیح و سالم بھاگنے لگے۔ بریر مشک لے کر تبجیل خیمہ گاہ میں پہنچ گئے اور آواز دی۔

”بچو! ہتھار ا بوڑھا غلام پانی لے آیا۔“

حشیں کی چستی بیٹی سکینہ دوسرے بچوں کو لے کر دوڑ پڑی۔ پیاسے بچے پانی تو پانی، پانی کی تری کو بھی تر سے ہوئے تھے۔ انہوں نے منہ مشک پر رکھ دیئے اور اس افراق فراق میں مشک کا دہانہ کھل گیا۔

مشیت کی طرف سے اس اتفاقی آزمائش کو تسلیم نہ کیا جائے تو بھی اس پانی نے لہجہ کے لئے مشک کو بھجوا دیا ہو گا اور پھر وہی قحط آب اور پیاس۔

عیسوی حساب سے اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ ریگزار عرب کی گرمی۔ پھر شہت خیاں پر خندق کھود کر اس میں آگ روشن کر دی گئی تھی تاکہ دشمن اس طرف سے حملہ نہ کر سکیں۔ اس آگ نے پیاس کی شدت کو اور بڑھا دیا تھا۔ پانی لانے کے یہ دونوں مواقع مسلم لیکن ان سے دو مرتبہ بچوں کو سکون میسر آیا تھا۔ عورتیں اور مرد تو ۸ مرحرم سے پیاسے ہی تھے۔۔۔ اس پیاس میں ظالم یزیدیوں کی دھمکیاں اضافہ کر رہی تھیں۔ اصحاب ان کے طعن و طنز پر غصے میں بے قابو ہو جاتے مگر امام کا منشاء دیکھ کر غصے کو پنیٹڑتا جس سے تشنگی بڑھ ہی تھی۔

۸ مرحرم کو پانی پر پہرے بیٹھ جانے کے بعد امام حسین نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں حضور اکرم سے اپنے رشتے کو واضح فرمایا اور پانی کو شہیت یاری کے فیض عام سے تعبیر کیا مگر یہ اہ قلوب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

۸ مرحرم کو لشکر اسلام میں پانی پہنچ جانے کی اطلاع پر عمر سعد نے نہر پر چند ہزار سواروں کا مزید لشکر متعین کر دیا۔ شب میں عمر سعد اور امام کی ملاقات ہوئی حضرت عباسؓ اور حضرت علی اکبرؓ بھی موجود تھے۔ امام نے پھر ہر طرح سمجھایا اور کسی ایک شرط کو مان لینے پر زور دیا مگر ابن سعد جاہ و منصب کی طمع میں مبتلا تھا۔ اس نے ابن زیاد کو لکھا۔ اس اثناء میں شمر ذی الجوشن بھی کوفہ پہنچ گیا۔ اس نے ابن زیاد کو عمر سعد کی طرف سے بھڑکایا اور ابن زیاد کا حکم عمر سعد کو پہنچ گیا کہ اگر تو حملہ نہیں کرتا تو لشکروں کا چارج شمر کے حوالے کر دے۔ مجبوراً عمر سعد نے لشکر کو تیار ہونے کا حکم دے دیا۔

کر بلا کا خانوادہ رسالت

امام حسینؓ نجبت کی آخری فرد تھے اور پیغمبر اسلامؐ شریک کار رسالت فاطمہؓ زہراؓ نائب برحق حضرت علیؓ اور رسولؐ کے سبط اکبر امام حسنؓ کے جانشین تھے۔ جنگ صفین میں بھرپور حصہ تو نہیں لیا تھا مگر موجودگی مسلم ہے۔

آپ کی پہلی شادی شہر بانہ بنت یزیدؓ سے ہوئی تھی جن کی یادگار علی بن الحسین یعنی زین العابدین تھے۔ یہ خاتون بچے کی ولادت کے بعد ہی انتقال فرما گئی تھیں۔

دوسری شادی یحییٰ بنت ابی مرہ سے ہوئی۔ جس کو علمائے انساب نے یزید کی بیوی بھی
 زاد بہن بتایا ہے۔ حضرت علی اکبر آپ ہی کے بیٹے تھے۔

تیسری بیوی رباب بنت امر القیس تھیں جو شیر خوار شہید شہزادہ علی صغر کی ماں تھیں۔
 چوتھی ام اسحق بنت طلحہ تھیں۔ فاطمہ کبریٰ بنت الحسین اور جعفر بن الحسین
 آپ ہی کے بطن سے تھے۔

پانچویں بیوی کا بھی تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ ممکن ہے، فاطمہ بنت الحسین انہیں
 کے بطن سے ہوں۔

کینزین ان کے علاوہ تھیں۔ اریتب نام کی ایک خاتون کا ذکر بھی تذکرہ نگاروں
 نے کیا ہے کہ انھوں نے خود امام حسین کو پسند فرمایا تھا۔ یہی صورت ہند و وجہ یزید کی
 بھی ہے کہ اس کا عقد پہلے امام حسینؑ کے ساتھ ہوا تھا۔

ان واقعات سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ صورت و سیرت اور رسول اسلام
 کا نسلی رابطہ اتنا دقیق تھا کہ تحت حکومت بھی اس کے سامنے بیچ سمجھا جاتا تھا اور بلاشبہ
 جاہ و ثروت نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کو ایک قابل رشک امتیاز حاصل تھا۔

پیغمبر سے نسبت، علی کا عدل و شجاعت، زہد و سخا، حسن کا حلم و صلح پسندی اور
 ماہ کی عصمت و طہارت حسین کو درشے میں ملی تھی۔ کئی آیات آپ کی شان میں آئیں
 اور رسول کی بہت سی احادیث آپ سے متعلق ہیں۔ انبیاء آپ کی حرمت کے معترف اور یہ
 ملائکہ آپ کی فضیلت و شرف کے قائل۔ ان گنت معجزات آپ سے ظاہر ہوئے اور یہ
 کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ آپ تھے بھی تو بیٹے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
 کے۔ اس دعوے کی دودلیں ہیں۔ اول یہ کہ نواسہ بجائے بیٹے کے ہوتا ہے۔ اسی جہت سے
 عیسیٰ بنی اسرائیل کہلائے۔ دوسری دلیل یہ کہ حضرت نے دونوں کو منبئی کیا تھا۔

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حسن اور حسین
 سردار ہیں بہشتی جوانوں کے — اس آئینہ محمدی ہونے کا اثر یہ ہے کہ

محبت حسینؑ محبت رسولؐ خدا ہے اور عداوت ان کی حضرت محمد صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی عداوت“ (۹۲)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ان تمام احادیث کو نقل کیا ہے جو عام طور سے مشہور ہیں اور ان پر ہر توثیق ثبت کی ہے مگر نہ جانے کیسے عالم تھے کہ بلا میں شکرِ بزرگ کے ساتھ کرب کے ساتھ کچھ جانتے ہوئے بھی انہوں نے قتلِ حسینؑ کے فتوے دے دیئے تھے۔ تئیر میں پڑ جاتی ہے عقلِ انسانی، جب انس بن مالک جیسے بزرگ صحابی ایک روایت کے مطابق شکرِ بزرگ کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ اہام نے انہیں مخاطب کر کے کہا تھا۔ ”تم تو جانتے ہو، نانا نے میرے لئے کیا فرمایا تھا۔“

”بڑھا ہو گیا ہوں، حافظہ کچھ کام نہیں کرتا۔“ انسؓ نے جواب تو دیا مگر فردا ہی لوگوں کی آڑ میں ہو گئے تاکہ رسولؐ کا نواسہ پھر ان سے کوئی سوال نہ کر سکے، اس کے بعد وہ کربلا سے چلے گئے۔ تئیر خیر ہے انسؓ جیسے بزرگ صحابی کی کربلا میں موجودگی، پھر یہ خیال آئے کہ جس طرح انہوں نے قتلِ حسینؑ کا فتویٰ بزرگ کی مروت یا دباؤ میں دے دیا تھا، ویسے ہی شاید ہمت بڑھانے کے لئے چلے بھی آئے ہوں، خدا کرے یہ روایت غلط ہو!

امام کے بعد دوسری معظمہ جناب زینبؑ تھیں جو ۵۰ جمادی الاول ۶۱ھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ علیہ منزلتِ مال کی عظیم مٹی کربلا سے قبل چادر اور چہار دیواری کی اثر تھیں۔ آپ عمر میں دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھیں مگر بھائی آپ کو ماں کا قائم مقام قرار دیتے۔ خود باپ کی نظر میں بھی آپ کا بڑا درجہ تھا۔ مرنے سے قبل کئی وصیتیں کی تھیں اور آپ کے بازو بھی چومے تھے۔

آپ کی شادی عبداللہ بن جعفر طیار سے ہوئی تھی۔ شوہر کی اجازت سے آپ امام علیہ السلام کے ساتھ آئی تھیں اور عبداللہ خود دونوں بیٹوں عون و محمد کو ماموں کی فداکاری کے لئے دورانِ سفر اگر پہنچا گئے تھے۔

آپ کی چھوٹی بہن جناب ام کلثومؑ تھیں جو ۵۱ھ میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا عقد عبداللہ

کے چھوٹے بھائی محمد بن جعفر کے ساتھ ہوا تھا۔ محمد کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپ لاؤلد بھتیجی بڑی بہن کی طرح آپ بھی بھائی کو بہت چاہتی تھیں اور اس سفر میں ساتھ آئی تھیں۔ حفظ مراتب میں آپ کے بعد حضرت عباسؓ تھے۔ علیؓ کے بہادر بیٹے آپ کا شمار شجاعانِ عصر میں ہوتا تھا۔

۴ شعبان ۲۶ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ روایات معتبرہ کی رو سے حضرت امیر المؤمنین نے خاندان کی شجاعت دیکھ کر آپ کی والدہ گرامی فاطمہ بنت خزام کلابیہ سے شادی کی تھی کہ بہادر بیٹے پیدا ہوں، چنانچہ حضرت عباسؓ، جاب عبد اللہؓ، جاب عثمانؓ، جاب جعفرؓ، چار بیٹوں کی ماں کی حیثیت سے آپ کی کنیت ام البنین پڑ گئی۔ چاروں بیٹے اس لحاظ سے نجیب الطرفین تھے۔ شجاعت کا خون ان کی رگوں میں تھا اور بہادری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ والدین کے مطیع، خالوادۃ رسالت میں ہوتے ہوئے بھی اولاد فاطمہؓ کے فرماں بردار تھے۔ خدا اور رسولؐ کی معرفت اس سچے سچی کہ عبد الصالح کہے جاتے ہیں۔ عبد اللہ ابن عباسؓ کی بیٹی ذکیہ عرف لبابہ آپ کی شریکِ حیات تھیں جن سے دو بیٹے پیدا ہوئے فضل اور عبید اللہ۔ یہ ام البنین کا کچھ تھا کہ اپنی ساری کائنات امام حسینؓ کے ساتھ کر دی تھی اور اس کو حضرت ام البنین کی پرورش کا اثر ہی کہنا چاہیے کہ شمر ذی الجوشن نے جب شب عاشور آپ کو امان پیش کیا تو آپ نے اس کو نہایت حقارت کے ساتھ پھینک دیا۔

آپ شکل و صورت میں علیؓ سے بہت مشابہ تھے مگر لبتہ قد نہ تھے بلکہ لائے تڑنگے، پاؤں رکاب سے باہر نکل جاتے اور ہاتھ اتنے لمبے کہ ہاتھ سمیٹ کر گھوڑے کی لگام پکڑتے۔ عرب و عراق کے شجاعانِ روزگار میں شمار ہوتا۔ خوب صورتی کا یہ عالم کہ قمر بنی ہاشم کہے جاتے اور دل درد مند ایسا رکھتے کہ بچے بوڑھے سب آپ کے گرد رہتے اور شجاعت ایسی کہ ہر ایک کی امیدوں کا مرکز تھے۔ صحیح معنی میں مشکل کشا کہے بیٹے۔ حضرت امام حسینؓ کو بھی عباسؓ پر اتنا اعتماد تھا جتنا پیغمبر اسلامؐ علیؓ پر کیا کرتے تھے۔ حضرت عباسؓ کے بعد حضرت علیؓ اکبر کا نام آتا ہے جو حضرت ام لیلیٰ کے بطن سے

۸۱۳ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ شکل و صورت اور رفتار و گفتار میں آنحضرت سے بہت مشابہ تھے۔ اس لئے شبیہ رسول کہے جاتے۔ آپ کو جناب زینب نے پالا تھا مگر اپنے حسن اخلاق میں ہر دلعزیز تھے اور بہادر لیسے کہ میدان جنگ کی ہر اہمیدار سے وابستہ کی جاسکتی تھی۔ عمر سعد نے ماں کے رشتے سے آپ کو امان کی پیش کش کی تھی مگر آپ نے چچا عباس کی طرح اس کو ٹھکرا دیا۔

امام حسین کے سب سے بڑے بیٹے کا نام بھی علی تھا مگر آپ سید سجاد کے نام سے پکارے جاتے۔ زہد و عبادت میں اتنے مشغول رہتے کہ زین العابدین بھی کہے جاتے۔ یزدجرد کے ذرا سے تھے مگر شان فقیرانہ رکھتے۔ کربلا پہنچنے تک اچھے خاصے تھے جن کی ماحول کو دیکھ کر ہتھیار منگوائے کہ اپنے کو میدان کے لئے تیار کریں کیونکہ ایک عرصے سے زرہ لٹکانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ سب سے پہلے زرہ پہنی چونکہ ہو گئی تھی۔ آپ نے اتارنے کی کوشش کی تو آڑ نہ سکی۔ آپ نے جوش شجاعت میں اس کو پھاڑ ڈالا۔ زرہ تو پھٹ گئی مگر آپ پر اس کا اتنا اثر پڑا کہ اسی وقت تب چڑھ آئی اور یہ تب عصر عاشور تک برہتی ہی رہی۔

آپ کی ولادت جمادی الاول ۳۳ھ میں جناب شہر بانو کے بطن سے مدینہ میں ہوئی۔ ولادت کے بعد ہی والدہ گرامی چل بسیں۔

شکل و صورت میں آپ علی بن ابی طالب سے اور کردار و گفتار میں آنحضرت سے ملتے جلتے تھے۔ بشاش چہرہ، بلند بینی، سفید گردن، فراخ سینہ، پنڈلیاں پتلی تھیں مگر ہاتھ مضبوط تھے۔ جو ہر شجاعت میں نسلی وراثت کے حامل لیکن اس کے مظاہر کے موقع ہی نہیں آیا۔

ان شخصیتوں کے ساتھ امام حسین کے کئی بھائی، امام حسن اور حضرت مسلم کے بچے اور دیگر بنی ہاشم تھے۔ ان میں ایک معظمہ جناب فضا بھی تھیں۔

جناب فضا ایک حبشی خاتون تھیں۔ آپ کا سلسلہ نسب شاہان حبش سے ملتا ہے نام نامی میمونہ تھا مگر امیر المومنین نے فضا کہہ کر پکارا کیونکہ فن کیمیا کی ماہر تھیں فاطمہ زہرا

کے گھر میں آپ کا درجہ کمینہ کا تھا لیکن حقیقتاً برابری کی حیثیت حاصل تھی۔ گھر کا کام ایک دن جناب فاطمہ کرتیں، دوسرے دن جناب فقیہ حسنین آپ کو ماں سے کم نہ سمجھتے۔

جناب فاطمہ کی زندگی تک آپ نے شادی نہیں کی۔ پھر امیر المومنین نے آپ کو ثقلیدہ جنتی کے عقد میں دے دیا۔ ابو ثعلبہ کے انتقال پر ابوسلیک، عطفانی سے آپ کا نکاح ہوا۔ عملی طور پر آپ اہل بیت میں شامل تھیں جس کا سلسلہ ہر در میں جاری رہا اور کربلا میں تو آپ نے وہ کردار ادا کیا کہ سر آپ کی عظمت کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ کربلا کے بعد آپ نے زیادہ گفتگو کرنا بند کر دیا تھا۔ جب بات کرتیں تو آیات قرآنی میں جس سے قرآن پر آپ کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

علیؑ کے گھر کی کمینہوں کا جب یہ عالم تھا تو گھروالوں سے قرآن کا کیا ربط رہا ہو گا یا اب اس کو امت کی نفسی ہی کہنا چاہیئے کہ وہ اس گھر کو چھوڑ کر تفسیر قرآن کے لئے پاس بیٹھے والوں کے دروں کی خاک چھانتی رہی اور ہر در سے ایک نیا مفہوم پا کر آج تک بھٹک ہی ہے۔ اسے نہ کو اختلاف کی ضرورت محسوس ہوتی کہ ہم نے رسول و قرآن دونوں کو علی سے سمجھا ہے۔ ان نے مجتہدہ مطالب کے سوا کوئی کچھ اور کہتا ہے تو ہم اس کو صحیح نہیں مانتے۔

آغاز جنگ

امام حسینؑ اور آپ کے انصار سب سمجھ چکے تھے کہ ہٹ دھرم بنی امیہ اپنے ارادوں سے باز نہ آئیں گے۔ حالانکہ امام نے اپنی طرف سے صلح و دوستی کا ہر دروازہ کھول دیا تھا۔ نسلی سیادت اور ذاتی شرافت کا ہر مظاہرہ آپ کی طرف سے ہوا تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف خُرا بن یزید الریاحی بلکہ بہت سے دوسرے لوگوں کے تلوہب میں ایک پلچل مچ گئی تھی، ذہنوں میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ انہوں نے شتاکچہ اور تھما، اور دیکھا کچھ اور۔ رسول کا نواسہ جس منزل پر کھڑا تھا، وہاں ان کو انبیاء کے پیرونگا تے دکھائی دے رہے تھے۔ محسوسات کی شدت میں اندر سے ایک آواز آ رہی تھی۔ جان بوجھ کر بھی حق کا ساتھ نہ دینا بزدلی ہے مگر یقینی موت کے منہ میں پھانڈ پڑنا بھی کچھ آسان نہ تھا پھر عواقب بھی پیش نظر تھے۔ یہ ظالم متعلقین کو تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔

بے شمار لوگ ایک ذہنی کرب اور شعوری کش مکش میں مبتلا تھے کہ ابن زیاد کا خط آتے ہی اور شمر ذی الجوشن کے کوفہ سے کربلا پہنچتے ہی عمر سعد نے وقتِ عصر حملے کا حکم دیا۔ اکثریت کا زعم باطل بھیڑیوں کو بھی شیر نبائے ہوئے تھا۔ یزیدی سپاہ ایک طوفان کی طرح اُمَندِ سی اور کالی گٹھا کی طرح خیامِ عترتِ اطہار کی طرف بڑھنے لگی۔ امامِ حالات سے بے نیاز اپنے خیمے میں فروکش تھے مگر شہزادی زینبؓ ہر وقت چوکنہ رہتیں۔ شاید آپ وقتاً فوقتاً پردے کے پیچھے سے جھانکتی رہتیں کہ دشمن کے ارادوں کا اندازہ ہو سکے۔ آپ فوراً بھائی کے خیمے کی طرف دوڑ پڑیں اور کہنے لگیں

”بھیا فوجیں حملے کے لئے بڑھ رہی ہیں۔“

اتنے میں حضرت عباسؓ بھی یہی خبر لے کر آگئے۔ امام جیسے اس خبر کے توتن ہی تھے۔ آپ نے بغیر توقف کئے حضرت عباسؓ سے کہہ دیا۔

”بھیا! ان سے ایک شب کی مہلت لے لو۔“

حضرت عباسؓ نے عمر سعد کو پیغام پہنچایا۔ عمر سعد خاموش تھا مگر شمر نے مخالفت کی۔ حضرت عباسؓ کا جلال ایک بار پھر ضبط کی زنجیروں سے جکڑ دیا گیا۔ عمر سعد نے عمرو بن حجاج سے مشورہ کیا۔ اس نے مہلت کے حق میں رائے دی اور عمر سعد نے جنگ کو اگلے دن پر ملتوی کر دیا۔

بنی اُمیہ کے کینہ جو افسر یہ سمجھ رہے تھے کہ حسینؑ نے مزید غور و فکر کے لئے ایک رات کی مہلت لی ہے مگر امام نے خود انہیں سوچنے کا موقع دیا تھا اور تلاطمِ زدہ قلوب کی کیسوئی کے لئے بارہ چودہ ساعتیں فراہم کی تھیں۔ انہیں حُر الریاحی اور دُرّی لوگوں کی ذہنی کش مکش کا بظاہر کوئی علم نہ تھا مگر اتنا جانتے تھے کہ ہزاروں کے اس مجمع میں سب بھیڑیے تو نہیں ہو سکتے، کچھ انسان تو ضرور ہوں گے اور صداقت پذیر یہی انسان کے خیمے میں داخل ہے ہو سکتا ہے کہ کسی دل میں ایمان کا کوئی شعلہ چھپا ہو اور وہ عینِ وقت پر پھوٹ پڑے۔

شبِ عاشور

انسانیت کی ضمیر شناسی کا یہ مکمل انام کا حصہ تھی۔ آپ عفو و درگزر کا دواۓ کھول کر بیٹھ گئے کہ کوئی آنے والا مایوس ہو کر پلٹ نہ جائے — دیہی ہوا کہ حُرسے پہلے اور حُرسے بعد حق شناس آتے رہے اور مرز میں کربلا پر حریت کے پرچم لہراتے رہے۔ امام کا ایک زاویہ نگاہ یہ بھی تھا کہ انصار میں اگر کوئی بادلِ سخاوتہ محض شرماء حضورِ ی میں جگ گیا ہو تو اسے نکل جانے کا موقع دیں، چنانچہ آپ نے شب میں سب کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا۔

”یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں کسی جانے والے کا راستہ نہ روکیں گے جنگ کا انجام ڈھکا چھپا نہیں۔ میں اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں، ہر ایک کو آزاد کرتا ہوں، جو اپنی جان بچانا چاہے، وہ چلا جائے“

آپ نے چراغِ گل کر دیا تاکہ آنکھ کی مروت جانے میں مانع نہ ہو — لیکن جب روشنی ہوئی تو سب موجود تھے کسی کا چہرہ تہمتار ہا تھا، کسی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اصحاب نے اتفاق کہا۔

”مولا! آپ کو اب تک ہماری وفا کا اعتبار نہیں — آپ فرمائیے تو اپنی گردنوں کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ لیں“

بعض نے تلواریں میانوں سے نکال لیں۔ امام نے ان کے لئے کلماتِ خیر استعمل کئے۔ آپ کی آنکھیں بھرا آئی تھیں۔ آنسو پیتے ہوئے آپ حضرت ابوالفضل العباس اور دوسرے بنی ہاشم سے مخاطب ہو گئے۔

”تم لوگ میرے پارہ ہائے جگر ہو۔ یہ عورتیں میرے پاس رسول کی امانت ہیں تم ایک ایک کر کے کسی عورت اور بچوں کو نکال لے جاؤ تاکہ وہ ان موزیوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں —“

حضرت عباس جیسا جبری ڈار ہیں مار مار کر رونے لگا۔ آپ کی آواز انام کے کان میں پڑی۔

”آقا! کیا آپ نے ہمیں اسی دن کے لئے پالا تھا کہ آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں

”مام کے آنسو خساروں پر بہہ رہے تھے، آپ نے ان کو پونچھ ڈالا اور سر جھکا لیا عورتوں کو لے جانے کی بات آپ نے صرف اتمامِ حجت کے لئے کہی تھی ورنہ شریک کار امامت کے کربلا سے ہٹ جانے کا سوال ہی کیا تھا۔ بغیر جناب زینبؓ شہادتِ عظمیٰ مکمل ہی نہ ہو سکتی۔۔۔۔۔ پھر تمام اصحاب اپنے اپنے خیوں میں چلے گئے۔ بعض ہتھیار پر صیقل کرنے لگے، بعض سجادہٴ عبادت پر جا بیٹھے۔

اسی رات بربر ابنِ خضیر سمدانی فرات سے لڑ کر پانی لائے۔ اسی رات ہلال ابنِ نافع نے امام علیہ السلام کے پیچھے پیچھے جا کر وہ مقام دیکھا جہاں امام حسینؓ کی قبر پہلے سے کھدی کھدائی تیار تھی اور جس پر بیٹھی ہوئی جناب فاطمہ زہراؓ صلوٰۃ اللہ علیہا بیٹے کی زندگی میں اس کا ماتم کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ ہمارا زخمہ و شیدون اسی کی تاسی ہے۔ مزار نہیں ملتا تو ہم نقلِ مزار کے قریب بیٹھ کر رو لیتے ہیں۔

تمام رات ہر خیمے میں شعیب جلتی رہیں کیونکہ اس کے بعد رسول کی عمرت کو اندھیرے ہی میں بیٹھا تھا۔ امام ایک خیمے سے دوسرے میں جا کر صبر و شکر کی یقین فرما رہے لیکن جہاں گئے وہاں ایک ہی منظر دیکھا کہ ہر عورت اپنے بچوں کو سرفروشی پر اکسا رہی تھی۔ جناب زینبؓ عون و محمد سے کہہ رہی تھیں۔

”جعفر کے پوتے اور علی کے نواسے ہو، دادا اور نانا کی لاج رکھ لینا۔ ماں کو رسوا

نہ کرنا۔“

”اُم فروہ کے خیمے میں پہنچے تو آپؐ کا ٹم کو شجاعت دلا رہی تھیں۔

”علیؑ کا خون تمہاری رگوں میں ہے۔ علی اکبرؑ پر سبقت کرنا۔“

”اُم لیلیٰ، علی اکبرؑ کے سر پر ہاتھ بیٹھی ہوئی جوان بیٹے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں اور سمجھاتی جاتی تھیں۔

”رسولؐ کی شبیہ ہو، دین کی حرمت رکھنے کے لئے جان کو عزیز نہ کرنا اور

پھوپھی کی نظر میں ماں کو مُرخِ زور رکھنا،

اُم کلثوم اپنے خیمے میں رو رہی تھیں کہ کوئی ادلا دہوتی تو نصرتِ امام کرتی حضرت عباسؓ نے پہنچ کر تسکین دی۔

”بنتِ رسول! غم نہ کریں۔ غلامِ آپ کی طرف سے نصرت کرے گا۔“

امام ہر خیمے میں جاتے رہے اور بی بیوں کو تسکین دیتے رہے۔ ربابؓ کے خیمے میں جا کر حبیبی سکینہ کو سینے سے لگایا اور تسلی دیتے رہے۔

”میں نہ ہوں تو پھوپھی کے سینے پر سر رکھ کر سو جانا۔“

تین چار سال کی بچی کیا سمجھتی کہ بابا کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے کہا

”مجھے بھی لیتے چلیں۔۔۔!“

امام حج کر دوپٹے مگر ضبط کیا اور بولے۔

”پھر بلالوں گا۔۔۔“

سکینہ کی دلہری تو ہو گئی مگر سمجھی کچھ نہیں۔ پھر آپ زین العابدین کے خیمے میں گئے۔ جہاں زینبؓ تیمار داری میں مصروف تھیں۔ آپ دیر تک جناب زینبؓ سے باتیں کرتے رہے۔ کیا کہا اور جناب زینبؓ نے کیا جواب دیا؟ اس کا پتہ تو نہ چل سکا۔ البتہ دیکھا یہ گیا کہ جناب زینبؓ رو پڑتی تھیں پھر آنسو خشک کر لیتیں۔ اس طرح کافی وقت گزار کر آپ نے اصحاب و انصار کے خیموں کا دورہ کیا۔ بعض کو دنیا کی بے تباقی کی تلقین کی، بعض کو رموز شہادت سمجھائے اور اپنے خیمے میں آ گئے۔

یہ رات انصار و اصحابِ حبشین کی آخری رات تھی۔ اس کا ایک ایک لمحہ ہر ایک نے عبادت میں گزارا۔ اسی عالم میں نمازِ فجر ادا کی۔ اُدھر مزید کی فوج میں کچھ لوگ بڑے کرب و اضطراب میں جاگ رہے تھے۔ امام حسینؓ نے پہلے خطبے سے جو بے ضمیروں کو جھجھوڑنا شروع کیا تھا تو اپنے ہر عمل سے چوٹ لگاتے ہی رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ تو صدرات کی ضرب سے تلملا کر، محرم کو امام کی پناہ میں آ گئے۔ کچھ اس کے بعد اور بچے کچھ آج کی رات ایک بے چینی میں کاٹ رہے تھے۔ آئے تو وہ یزید کے لشکر کے ساتھ تھے۔ قتلِ حسین

گیا تو تازہ خون جادی ہو گیا لہذا رومال کو اسی طرح باندھ کر لاش دفن کر دی گئی۔
 تازہ واردان بساط شہادت میں قربان یزید الریاحی کا نام ہمیشہ درخشاں رہے گا
 اس کے ساتھ عمر سعد کی فوج سے آنے والوں میں اس کا بیٹا علی بن حرب، بھائی
 مصعب ابن یزید، غلام عردہ بن کبوش اور دوسرے سرفروشان مسلک حریت
 بھی ہیں جن میں جوین بن مالک تیمی۔ حارث بن امرأ القیس کنزی۔ ظہیر بن حسان
 اسدی، حلاس بن عمر اسدی، زہیر بن سلیم ازدی، جابر بن حجاج تیمی، عبدالرحمن بن
 مسعود تیمی، عبداللہ بن بشر خثعمی، عمرو بن صبیعہ تیمی، قاسم بن حبیب ازدی اور
 مسعود بن حجاج تیمی شامل ہیں جو کربلا میں یزیدی بن کر آئے تھے لیکن جنت کی طرف
 حسین بن کر سدھار گئے۔

روز عاشور

اس دن کے سورج نے طلوع ہو کر جنگ و جدل کا جو منظر دیکھا، ویسے کہتے
 ہی مناظر وہ دیکھ چکا تھا۔ کفر و توحید کی لڑائیاں، حق و باطل کے معرکے، انبیاء و پیغمبر
 کے محاربے اس کی نظروں سے گزرتے ہی رہے تھے لیکن غروب ہونے سے پہلے
 کچھ ایسا دیکھا کہ خلاق عالم سے فریادی ہو گیا: ”پیدا کرنے والے! تساوت و شقاوت
 کا یہ نظارہ اب کبھی نہ کرنا اور نہ اپنا وجود خود مجھ پر بوجھ بن جائے گا۔“ مشیت کا جواب
 خود دی جانتی ہے لیکن اس کے بعد سے آج تک نہ کبھی ایسے بے رحم پیدا ہوئے
 اور نہ اتنے صابر و جری کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کے لشکر کے سامنے ٹھہریں پھر نفوس
 اپنی فوج کی صف بندی کریں۔

امام حسین نے جمل و صفین کے معرکے دیکھے ضرور تھے، تلوار کے جوہر بھی
 دکھائے تھے مگر کانداری کا یہ پہلا موقع تھا۔ صاحبِ ذوالفقار نے جنتی لڑائیاں
 بھی لڑیں ان میں فوجوں کا یہ تناسب نہ تھا کہ ایک اور کم سے کم پانچ سو ورنہ کم سے
 کم دو ہزار!

داد دینا پڑتی ہے ان شجاعانِ روزگار کو جن کی ہمتوں نے اس موقع پر بھی

ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ ہر ایک کا حوصلہ یہ تھا کہ ان سب کو کاٹتے ہوئے کوئی تک پہنچ جائے اور تختہ کوٹہ کو الٹ دے۔

تعداد لشکر کی یوں تو بہت سی روایتیں ہیں۔ دو لاکھ ممکن ہے لیکن مبالغے سے خالی نہیں۔ البتہ چالیس ہزار اور اکثر ہزار اس دور کی آبادی کو دیکھتے ہوئے قزین عقل ہے۔

اس لشکر کی ترتیب میں میمنہ پر عمرو بن جراح، میسرہ کے سواروں پر شمر ذی الجوشن اور عروہ ابن قیس، پیدلوں پر شیش ربیع افسر تھے۔ قلب میں خود سردار افواج عمر ابن سعد تھا اور فوج کا علم اس کے غلام درید کے ہاتھ میں تھا۔

اس کے مقابلے پر امام حسین کے پاس بتیس سوار اور چالیس تربیت یافتہ پیادے تھے۔ باقی عام شہری جو جذبہ جہاد یا شوق شہادت میں آگئے تھے مگر تھے سب تیغ زن اور فن حرب میں جہارت رکھنے والے۔ امام حسین علیہ السلام نے قلیل فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ دیکھنے میں تعداد زیادہ معلوم ہو اور بڑی سے بڑی یلغار کو بھی روک سکے۔

میمنہ آپ نے ذہیر ابن قین کو دیا۔ میسرے پر حبیب ابن مظاہر کو متعین کیا۔ قلب میں قمر بنی ہاشم حضرت ابو الفضل العباس کو ایستادہ کیا۔ جن کے دوش پر سردار کائنات کا وہ علم لہرا رہا تھا جو کبھی حمزہ و جعفرؓ اور کبھی علیؓ کے ہاتھ میں رہا تھا۔ عباس کے بعد اسلام کا یہ علم کسی دوش پر نہیں ملا اسی لئے آج تک عباس سے منسوب ہے۔

اسی اثنار میں عمر سعد نے اپنی کمان سے پہلا تیر چھوڑا۔ اس کے ساتھ ہی تیس ہزار کمائیں کر ٹکیں اور تیس ہزار تیروں کو حسینی سر فرودشوں نے ڈھالوں پر روک لیا۔ امامؑ آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ سید القراء بریر ابن خضیر مہدانی امام کی اجازت سے آگے بڑھے۔ کوٹہ کا بیچہ بیچہ انہی برس کے اس مجاہد کو جانتا تھا جس نے لشکر کی ہونی جھوٹ کو پٹی سے باندھ لیا تھا اور خمیدہ کمر کو اس طرح کس لیا تھا

کرسیدھا کھڑا ہو سکے۔ بری نے خطاب کرنا شروع کیا مگر انہیں ہر بات کا جواب تلخ کلامی سے ملا۔ آخر امام حسین نے انہیں واپس بلایا اور خود ایک ناقہ پر آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے اور ابتدائی تمہید کے بعد فرمایا۔

”میرے قتل میں عجلت نہ کرو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں، سن لو۔“

آپ نے رسول و قرآن کے احکام پر توجہ دلائی۔ اپنا حرب و نسب بتایا

اور پوچھا۔

”میرا جرم کیا ہے۔؟“

آپ کی اُدا ذاتی بلند تھی کہ کوئی نہ سننے کا عذر نہ کر سکے۔ ہر طرف ایک سناٹا طاری تھا۔ آپ نے اپنے مشرف کی تائید کے لئے بعض صحابہ کے نام لئے، اس پر شمر نے جواب دیا۔

”خدا مجھے بت پرستوں اور کافروں میں مشور کرنے آگے میں نے آپ کا ایک لفظ بھی سمجھا ہو۔“

جدید ابنِ مظاہر نے کہا

”سیاہ کار! تو نے خدا کی خالص عبادت ہی کب کی۔ بت پرستی اور کفر تیرے بزرگوں کا شعار رہا ہے۔ تیرا حشر بھی ان ہی کا سا ہوگا!“

حضرت نے اپنا خطبہ جاری رکھا

”تم میری فضیلت نہیں مانتے تو اتنا ہی بتا دو کہ میں نے کسی کا قتل کیا ہے جو مجھ سے قصاص لینا چاہتے ہو۔“

اس سلسلے میں آپ نے شیت، حجاج، قیس اور یزید ابنِ حارث کے نام

لے کر کہا۔

”کیا تم نے مجھے خطوط لکھ کر نہیں بلایا اور مجھ پر شرعی ذمہ داریاں نہیں ڈالیں؟“
 ”کلام کو طول نہ دیں۔ ہم نے کچھ نہیں لکھا۔“ آپ کو یزید کی بیعت کرنا پڑے گی۔“ شیت ابنِ ربیع نے جواب دے دیا اور آپ نے ناقہ کو اپنے شکر کی

واپس پھیر لیا اور اس سے اتر کر ذوالجناح پر سوار ہو گئے۔ اس کے بعد برہنہ نے مخصوصین کو ذوالجناح کے ایک تقریر اور کی جس کا جواب نوک پیکاں سے دیا گیا اور امام نے برہنہ کو واپس بلایا۔ پھر آپ نے دوسرا خطہ دیا اور بہت سی باتیں کہنے کے بعد فرمایا۔

”میرے سر پر جو عمامہ ہے، وہ رسول کا ہے یا نہیں، جس گھوڑے پر میں سوار ہوں، وہ رسول کا ہے یا نہیں؟“

”کسی بات سے انکار نہیں مگر ہم آپ کو قتل ضرور کریں گے“ بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں اور زہیر بن قین اپنی سی کرنے کے لئے بڑھ کر آگئے۔

”اگر تم ان کی بات نہیں مانتے تو انہیں قتل تو نہ کرو، اور ان کا مسئلہ براہِ راست بیزید پر چھوڑ دو۔“

”ہم تمہارے بہکانے میں آنے والے نہیں۔ تمہارا اور تمہارے سردار کا سر کاٹ کر انعام حاصل کریں گے!“ شمر حلاک بولا اور ایک تیر زہیر پر مارا جس کو زہیر نے خالی دیا اور ڈانٹ کر لو لے۔

”ملعون تو سمجھتا ہے کہ اس طرح ہم رسول کے بیٹے کو چھوڑ دیں گے۔ بخدا ہم نے ایک ساتھ مرنے کا عزم کر رکھا ہے۔“

امام نے زہیر کی آواز سن کر انہیں واپس بلایا۔ پھر امام نے تیسرا خطہ ارشاد فرمایا۔

”تم وہ قوم ہو جو ایمان لا کر کافر ہو گئی ہے۔ افسوس ہے تمہاری جفا اور تم پر پی پوری فوج سر جھیکائے کھڑی تھی۔ امام کے شخصی تقدس اور معجز بیانی نے ذہن کے بند دریچوں کو کھول دیا تھا۔ عمر سعد کو بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کی آواز نے طلسمی سکوت کو توڑ دیا۔“

”لوگو! یہ حسین ہیں ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ ان کے پاس زبان ہی زبان رہ گئی ہے۔ بڑھو اور اپنا وعدہ پورا کر کے انعام لو۔“

یزید کے نمک خوار آگے بڑھے اور امام کو ایک بڑے گھیرے میں لے لیا۔ امام فرماتے رہے۔

”اہل کوفہ و شام! نبیؐ کا نواسہ اتمامِ محبت کر رہا ہے اور تم سرکشی پر آمادہ ہو۔“
 — مالِ حرام کے شعلے تمہارے شکم کے دوزخ میں بھر چکے ہیں۔ جہالت و
 ضلالت کی جہریں تمہارے قلوب پر ثبت ہیں۔“

امام کی آواز پر جو جہاں تھا وہیں رگ گیا۔ جنگ سے قبل آپؐ نے آخری
 اور یادگار خطبہ دیا۔ جس سے لوگوں کے دل ہل گئے۔ اس خطبے کے آخر میں آپؐ نے
 عمر سعد کو انتباہ دیا کہ وہ جس لالچ میں سب کچھ کر رہا ہے، اس کو وہ شے میسر نہ
 گی، کوئی میں اس کا سر ایک نیزے پر نصب ہو گا اور لڑکے اس پر پتھر باریں گے۔
 عمر سعد غصے میں ہونٹ چبانا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور اس نے جنگ شروع کرنے
 کا حکم دے دیا۔

فوجیں مہنگا مہ خیز شور و غل کے ساتھ آگے بڑھی ہی تھیں کہ آپؐ نے ہاتھ
 بلند کر کے انہیں روکا۔ امام کا جاہ و جلال عطیۂ خداوندی تھا۔ کوفہ و شام
 کے صحرائی بھیڑیے رعب میں آکر رک گئے اور امام نے ایک بار پھر انہیں دوزخ
 کی آگ سے بچانے کی کوشش کی مگر عمر سعد کو جلدی تھی۔ اس نے لٹکار کر آگے
 بڑھایا اور نہایت پاک کی آخری شمع بجھانے کے لئے خود بھی سبقت کی۔

بات یہ تھی کہ امام حسینؑ پر فوج کشی کا اودادہ عراق و شام سے نکل کر مکہ و مدینہ
 تک گوج رہا تھا۔ عمر سعد جانتا تھا کہ حیثیت کتنی ہی نا طاقت ہوں لیکن پیغمبرِ اسلام
 کی شخصیت و حیثیت ان کے ساتھ ہے اس کو خطرہ تھا کہ کسی طرف سے کمک پہنچ
 گئی تو جنگ کو بلا میں ختم نہ ہوگی۔ بنی اُمیہ کے مظالم کا ردِ عمل آنا طول پکڑے گا کہ
 کوفہ و دمشق اس کی پٹی میں آجائیں گے۔ ابھی تو صرف چند نفوس ہیں جو شیر بھی
 مگر انہیں گھیرے میں لیا جاسکتا ہے اور جال پھینک کر گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے لیکن
 وقت گزر گیا تو یہ ممکن نہ ہوگا، اس لئے اس نے ممکن تعجیل کی اور یزیدی کے ساتھ جنگ شروع کر

صحرائی بھڑپیئے اور مدینے کے شیر

یہی وہ لمحات ہیں جب تر الیامی خدمتِ امام میں حاضر ہوئے اور معافی مل جانے پر سب سے پہلے میدان میں جانے کی اجازت چاہی۔

مہمان کو اس طرح موت کے منہ میں جانے کی اجازت دینا خاندانِ رسالت کے شایانِ شان نہ تھا مگر حُر بے بند ہو گئے۔ آخر امام کو اجازت دینا پڑی۔ حُر نے میدان میں پہنچ کر ایک ایمان افروز تقریر کی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اسی لشکر میں تھے لوگ تو جس سے سننے لگے مگر عمر سعد نے تیروں کی بارش کرادی۔ باپ کو تنہا دیکھ کر علی بن حُر جا پڑا اور تیر اندازوں پر حملہ آور ہو گیا۔ اس نے چوبیس بھڑپیوں کو تلوار سے کاٹ ڈالا اور تیروں سے چھلنی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ یہ بارگاہِ امامت میں حُر غازی کی پہلی قربانی تھی۔

بیٹے کے بعد بھائی نے حُر کا ساتھ دیا۔ مصعب ابن یزید نے بھی حُر کی طرح شیرازہ حملہ کیا اور ایک سلسلے سے یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں کو خاک و خون میں لتھڑا ڈالا پھر خود بھی درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ اب غلام کی باری تھی۔ عردہ شروع ہی سے قتال کرتا ہوا چلا اور کئی آدمیوں کو جہنمِ واصل کر کے جنت کو سدھا دیا۔

حُر جنگِ آزمودہ سپاہی اور شکر یزید کے مانے ہوئے تیغ زن تھے۔ دہجوں آدمی زمین پر گرے جن میں زخمی بھی ہوں گے اور مردہ بھی۔ انجام کار حُر بھی گر گئے۔ دُور سے امام کی زیارت کی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے بعد عمر سعد نے ازدی پہلوان سام آہن پوش کو میدان میں بھیجا جس کے مقابلے کے لئے شکر امام سے ظہیر بن حسان اسدی نکلے۔

ظہیر شکر عمر سعد کے ساتھ کوفہ آئے تھے امام کے خطبات نے انہیں راہِ حق دکھائی اور وہ اس طرف سے نکل کر چھوٹی سی سپاہِ اسلام سے آئے۔ سام ظہیر کی

شجاعت سے واقف تھا۔ وہ دیکھتے ہی پریشان ہو گیا اور ظہیر نے نیزے کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

سام کی جگہ نصرین کعب نے لی جو سو پہلوانوں پر بھاری سمجھا جاتا تھا اس نے بھی ظہیر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ادھر آ کر کیوں اپنے کو خطرے میں ڈالا۔ ظہیر نے زیادہ بات کرنے کی مہلت نہ دی اور ایک ہی نیزے میں اس کو بھی ٹھکانے لگا دیا پھر اس کے بیٹے کو مارا۔ اس طرح ۲۷ کو فیوں کو جہنم رسید کیا۔

اب ان کے مقابلے کے لئے حجر الاحجار کو بھیجا گیا جو تین سو آدمیوں کو ایک کس گاہ میں چھپا آیا تھا۔ اس نے بھاگنے کا فریب کیا اور جب ظہیر تقاب میں کس گاہ کے قریب پہنچے تو چھ آدمیوں نے تیروں اور نیزوں سے ظہیر کا جسم چھلنی کر دیا۔

اس دوران زیادہ ابن زیاد کے غلام یسار و سالم میدان میں آکر مبارز طلب ہوئے۔ حبیب و بریر ثکراماٹم سے نکلنا چاہتے تھے مگر عبداللہ ابن عمر کلبی دست بستہ خدمت انام میں حاضر ہو گئے۔

عبداللہ ابن عمر محرم کی ابتدائی تاریخوں میں نخیلہ کے قریب معہ اپنی بیوی کے مقیم تھے کہ لشکروں کا اجتماع دیکھا اور دریافت کرنے پر انہیں معلوم ہوا کہ یہ تیاریاں قتل حسین کے لئے کی جا رہی ہیں۔ محبت اہل بیت نے انہیں نصرت پر آمادہ کیا۔ مومنہ رفیقہ حیات نے اس موقع پر ساتھ نہ چھوڑا اور آپ نظروں سے بچ کر خدمت انام میں حاضر ہو گئے۔ گنگھا ہوا جسم، کشادہ سینہ، چوڑی پیشانی، ہلکا سیاہ رنگ، بلند قامت مولانا نے ایک نظر دیکھ کر فرمایا :-

”مرد جنگ آزما معلوم ہوتا ہے۔“

اجازت پا کر آپ میدان میں آئے۔ یسار و سالم دونوں ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔ آپ نے ایک طرف ہٹ کر پہلے یسار پر نیزے کا وار کیا۔ وہ زمین پر گر گیا اتنے میں سالم اپنی تلوار بلند کر چکا تھا۔ آپ نے اس کی ضرب کو خالی دیا اور تلوار کا بھلہ وار داریکا تو سالم بھی اپنے بھائی کے پاس پہنچ گیا۔

عبداللہ کے رجز کی آواز خیمے میں پہنچی تو اس کی زوجہ عمود خیمہ ہاتھ میں لے کر باہر نکل آئی۔

”لوٹے جا عبداللہ نصرت امام میں — خاک دھون میں لتھڑ دے دشمنوں کو!“
امام اس کی آواز سن کر بڑھ آئے اور فرمایا۔

”جہاد عورتوں پر ساقط ہے، مومنہ“

ام دہب خیمے میں واپس چلی گئی۔ اس اثناء میں عمرو بن ججاج نے میمنہ کی پوری طاقت سے حملہ کر دیا۔ دفاع کرنے والوں میں عبداللہ ابن عمر بھی تھے۔ آپ نے کئی اشتیاق کو داخل دارالبرار کیا اور زخمی ہو کر اپنی صفت میں واپس آئے۔

روایت ہے کہ جنگ مغلوبہ میں مسلم ابن عوسجہ کے بعد عبداللہ ابن عمر کی شہادت ہوئی تو ام دہب شوہر کی لاش پر پہنچی۔ چہرے سے خون پر نکھیتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی
”مجھے خبر ہے کہ تم نے نصرت امام کا حق ادا کر دیا مگر جنت میں داخل ہوتے وقت مجھے بھول نہ جانا۔“

شہر اپنے غلام ستم کو لے کر آیا اور ستم نے اس زور کا گز اس کے سر پر مارا کہ وہ دب شوہر کی لاش پر گر پڑی اور روح پرداز ہو گئی۔

ام دہب کی داخل جنت ہونے کی آرزو منہ سے نکلے ہی پوری ہو گئی۔ سیدہ کونین نے یقیناً آگے بڑھ کر اس کو سینے سے لگایا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ عمار یا سر کی والدہ سمیٹ، شہادت اول کا تاج پہنے، عرش کی بلندیوں سے پکار اٹھی ہوں :-

”خودوں کا تقدس قربان تجھ پر، اے نعرہ شہادت، امیرے قریب ام، میں تیری بلائیں لے لوں، تو نے مومنات عالم کی لاج رکھ لی“

وہ شاید کچھ اور کہتیں لیکن وقت اس سے زائد کا نہ تھا کہ بلا کی تپتی ہوئی ریت کے ذرے شہیدوں کے تازے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔

عمرو بن ججاج کا حملہ جاری تھا۔ دین کے سرفروش نالیوں کو منہ ترڑ بولا دے

دہے تھے۔ انہوں نے سیکڑوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا مگر خود ان کے بھی کئی ساتھی کم ہو گئے تھے۔ جن کے نام محضر شہادت میں ہمیشہ روشن رہیں گے۔

یزید بن زیاد کندی، ۲۸ مہرم ۳۳ھ کو مکے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا قبیلہ عرب کے معزز و معروف قبائل میں تھا۔ نام آپ کا یزید تھا مگر محبتِ اہل بیت تھی۔ عمر سعد کی افواج میں کونے سے شامل ہوئے تھے۔ صبح عاشورِ تحر سے پہلے خدمت میں باریا ہوئے۔ عرب کے مشہور تیر انداز تھے، بہادر اور جنگ آزمہ۔ صرف ۸ تیر آپ کے ترکش میں تھے۔ جن میں تین تیروں نے خطا کی۔ پانچ تیروں سے پانچ موزیوں کو ہلاک کیا۔ امام نے آپ کو دُعا دی تھی۔ تیر ختم ہونے پر دست بدست جنگ کی اور شہادت کا شرف حاصل کیا۔ بعض روایات کی رو سے آپ نے بعد نماز انفرادی جنگ کی۔

منہج بن سہم، امام حسن کے غلام تھے آپ نے ایک کینز سے ان کی شادی کر دی تھی۔ حسان بن بکر حنظل کے ہاتھوں پہلے حملے میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔

عمرو بن خالد ازوی اشرف کوفہ میں سے تھے، روپوش ہو کر غیر معروف راستے سے عذیب کے قیام میں امام سے آکر ملے۔ کربلا میں ایمان افروز اور عقیدت آفریں رجز پڑھتے ہوئے کئی دوزخیوں کو قتل کیا، پھر شہادت کے درجے پر فائز ہوئے آپ کے غلام سعد نے بھی آپ کے ہمراہ جہاد و شہادت کا شرف حاصل کیا۔

مجمع بن عبداللہ صحابی امیر المؤمنین تھے۔ عبداللہ کو رسول کی صحابیت کا شرف حاصل تھا۔ جنگ صفین کے تیغ آزمہ اور منزلتِ اہلبیت کے عارف تھے۔ عذیب ^{الہیات} میں امام کی خدمت میں بیٹے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ پہلے حملے میں مجمع اور عاذین مجمع دونوں نے شجاعت آفریں جنگ کر کے اپنی جانیں امام پر بچھا در کیں۔

جنادہ بن حارث سلمانی، کونے کے باشندے اور صفین کے مجاہد تھے آپ بھی مقام عذیب سے امام کے ہمراہ ہوئے۔ ۱۶ روہا ہوں کو قتل کر کے شہید ہوئے۔ جندب بن حجر کندی، کونے کے شریف زادے اور صفین کے افسر فوج تھے، تحر کے آنے سے قبل امام کے محافظوں میں شامل ہوئے۔ شایان شان جنگ کی اور

شہادت پائی — ایک روایت کی رو سے آپ کا بیٹا حمیر بن جذب بھی آپ کے ساتھ شہید ہوا۔

یران شہیدوں کا کارنامہ ہے کہ یزیدی لشکر ہزاروں زخمی چھوڑ کر بھاگا۔ بربر ہمدانی ان کا پیچھا کر رہے تھے اور رجز پڑھتے جا رہے تھے۔

”میں خفیر کا بیٹا ہوں۔ میری تلوار خون بہاتی بھی ہے اور پتی بھی ہے۔ یہ قہر خداوندی کا ایک نمونہ ہے۔ اس کا خراج تمہاری گردنیں ہیں!“

بربر اعظم نو سال قبل ہجرت بمقام جدہ پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی قبیلہ ہمدان ہے۔ کوفہ کے متوطن تھے۔ پیغمبر اسلام کو دیکھ چکے تھے مگر آپ کا شمار امیر المومنین کے اکابر اصحاب میں ہوتا ہے، عالم و فاضل، زاہد و عابد، امر بالمعروف نہی عن المنکر کے عامل تھے۔ حافظ قرآن تھے اور کوفہ کی مسجد میں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عرف عام میں سید القراء کہے جاتے تھے، کئی دینی معرکے آپ سے منسوب ہیں، ایک محترم روایت کے مطابق کوفہ سے چل کر راستے میں امام حسین سے ملے اور ۶۹ سال کے بجاہر کی حیثیت سے جنگ کو بلایں شرکت کی۔

امام کی اجازت سے میدان میں ٹھہر کر اشفیاء کو لٹکایا۔
”مقابلہ پر ایک ایک آدمی نہ آیا تو ایک ہی حملے میں اس دل بادل کو پارہ پارہ کر دوں گا!“

صف مخالف سے یزید بن معقل نکلا۔ دونوں کے درمیان تلوار چلنے لگی۔ یزید نے موقع پا کر ضرب لگائی، بربر نے ایک طرف جھک کر وار خالی دیا، پھر اتنی بھر پور ضرب لگائی کہ یزید کے دماغ میں دراڑ آئی اور وہ جہنم واصل ہو گیا۔
بربر اس نابکار کو ٹھکانے لگا کر سیدھے ہوئے تھے کہ سیمی بن اوس نے کہیں گناہ سے نکل کر تلوار کا دار کر دیا اور بربر گھوڑے سے گر کر رہا ہی بن جائے ہو گئے۔

عمرو بن حجاج کا پہلا حملہ ناکام ہو چکا تھا اور انفرادی لڑائی شروع ہو رہی تھی اس پر اس نے کہا:۔

”یہ تو فوج! جان لو کہ کن سے لڑ رہے ہو۔ یہ لوگ جان پر کھیلے ہوئے ہیں۔ تم اس طرح ایک ایک کر کے قتل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہ کرو۔ یہ مٹھی بھر بی۔ پتھروں سے انہیں مار سکتے ہو۔“

عمر سعد نے یہ رائے پسند کی اور حکم دیا کہ بھر پور حملہ کیا جائے۔

(۹۳)

اب کی دشمن کا میمنہ، میسرہ اور قلب ایک ساتھ حملہ آور ہوا۔ گنتی کے لوگ جن کے مقابل تھے ان میں بھی کئی بوڑھے اور کئی زخمی۔ درندوں کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے تیس شہسواروں نے نیزوں کو تان کر ان سے ٹکری اور پردوں میں رخنہ ڈال دیئے۔ ان کے پیچھے فوج حسینی کے پیدل مجاہد ایک گھٹنا زمین پر خرم کر کے بیٹھ گئے۔ تنے ہوئے نیزوں کی نوکوں پر انہوں نے دشمنوں کو دھریا۔ سواروں نے نے فوج میں تھکے ڈال دیا۔ سیکڑوں زمین پر لڑھکے لگے۔ سیکڑوں زخمی گھوڑوں سے گر کر گرچھنے لگے۔ فوجیں مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار پر مجبور ہو گئیں۔ عین اسی وقت دشمنانِ دین نے تیروں کی بارش کر دی۔ جس سے سواروں اور میدانوں سے تیر خانی دے کو یا ڈھالوں کو استعمال کر کے اپنے کو بچالیا مگر گھوڑے سب گئے۔ سب زخمی ہو گئے اور دوبارہ جنگ میں جانے کے قابل نہ رہے۔

اس شدید یلغار میں بھی یزیدی فوج کو غنہ کی کھانا پڑی۔ ان کے گشتوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ وہ ہتھیار پھینک پھینک کر جانیں بچالے گئے مگر حسینی فوج کی اکثریت بھی قتل ہو گئی۔ جن میں امیر المؤمنین کے سن رسیدہ صحابی مسلم بن عوف بھی تھے۔ بعض روایات کے مطابق مسلم بن عوف نے پہلے حملے میں شہادت پائی۔ مسلم بن عوف شہادت کو فہم منفرد، عابد و زاہد، صحابی رسول اور مقربِ جناب امیر المؤمنین تھے۔ جنابِ مسلم کی حمایت میں آپ نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا مگر اپنی مسلم کی شہادت کے بعد اپنے کو کربلا کے لئے محفوظ کر لیا اور بیچ بچا کر بال بچوں سمیت خدمتِ امام میں حاضر ہو گئے۔ آپ کا شمار ان افراد میں تھا جو امام کا محورِ اعتماد تھے۔

بڑھاپے کی جنگ میں آپ نے جوانی کی یاد تازہ کر دی اور پچاس اشقیا کو داخل جہنم کیا۔ مسلم بن عبد اللہ اور عبد اللہ بن ختہ کارہ نے دو طرف سے وار کر کے شہید کیا۔ یوں تو امام حسینؑ ہر شہید کے پاس پہنچتے رہے مگر مسلم بن عوسجہ کی لاش پر جبیبؑ ابن مظاہر کو لے کر گئے۔ بازار کو ذہن میں مسلمؑ و جبیبؑ نے اپنی ڈاڑھیاں خون سے خضاب کرنے کا عہد کیا تھا۔ مسلمؑ نے پہل کی، اور اپنے عزم میں کامیاب ہوئے جبیبؑ نے کہا:۔

”یہاں ہی مسلمؑ زندہ رہنے کا حوصلہ ہوتا تو کوئی وصیت کرنے کو کہتا۔۔۔“
مسلم بن عوسجہ نے ایک تقاضے سے جبیب کی طرف دیکھا اور پھر امام کے چہرے پر نظر ڈالی اور آہستہ سے کہا:۔
”هَذَا سِرُّ جَبَلٍ —!“

مطلب یہ تھا کہ اس شخص کا ساتھ نہ چھوڑنا۔۔۔ یہ بات جبیبؑ سے کہنے کی نہ تھی مگر کربلا کے شہید اول کے ان جذبات کی ترجمان ہے کہ خود اپنی جان تو قربان ہی کر دی تھی، اب چلتے چلتے دوست کو بھی وصیت کر رہے تھے کہ حق رفاقت میں کوتاہی نہ کرنا۔

کامیاب کر دیکھے ہوں گے دنیا نے ایسے دفا دار جو نبی کے نواسے کو ملے تھے۔
جنگ مغلوبہ کے شہید

جنگ مغلوبہ کے شہداء کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کچھ مؤرخین نے پچاس لکھی ہے، کچھ نے اس سے کم مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد گئے جنے، جاں نثار امام حسینؑ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ جانے والوں میں کوئی نامور ہو یا گناہ مگر کربلا کی تاریخ سب نے اپنے مشترک خون سے لکھی ہے۔

ادہم بن امیہ عبدی بصرے کے ساکن تھے۔ آب و جد کا مسلک حبیبیت تھا۔ امام کی روانگی کی خبر سن کر کچھ آدمیوں کے ساتھ مقام ابطح پر جا کر ملے مگر بلا تک ساتھ ساتھ رہے اور داد شجاعت دے کر شہید ہوئے۔

امیر بن سعد طائی، ساکن کوفہ، بہادر، جنگ آزما، مجاہد صغین تھے۔ ۸ محرم کو
مکہ بلا پہنچے۔ کئی دشمنوں کو تلوار کا لوہا چٹا کر شہید ہوئے۔

جابر بن حجاج تیمی کوفہ کے باشندے تھے، خدمتِ امام میں پہنچا تھا لہذا
یزیدی فوج میں شامل ہوئے اور موقع تلاش کر کے امام کی پناہ میں آ گئے، بے
جلگرمی سے لڑے اور شہادت کا درجہ حاصل کیا۔

جید بن علی شیبانی، ساکن کوفہ، شجاع اور جنگ صغین کے سورما تھے۔ چھپ
چھپا کر کہلا پہنچے اور نصرتِ امام کر کے شہادت پائی۔
جنادہ بن کعب انصاری کا وطنی تعلق یمن کے قبیلہ اوس سے تھا۔ مکہ سے
امام کے ہمراہ رہے۔ جنگ کر کے شہید ہوئے۔

جوین بن مالک تیمی کوفہ کی فوج میں شامل تھے۔ صلح کا امکان ختم ہو جانے
پر نصرتِ امام پر آمادہ ہوئے اور مظلوم کی حمایت میں جنگ کر کے شہادت پائی
حارث بن امرار القیس گندی، غابہ و زاہد شجاع تھے۔ امام کے خطبات سے
متاثر ہو کر جابروں کی صف سے نکل کر مجبور سے آئے اور جوہر شمشیر دکھا کر شہید ہوئے
حارث بن نبہان حضرت حمزہ کے غلام تھے۔ بڑے بہادر اور شہسوار حضرت
علی اور امام حسن دونوں کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔ مدینہ سے امام کے ساتھ
آئے تھے۔ حق رفاقت ادا کر کے شہید ہوئے۔

جباب بن حارث ثعلبی کی تفصیل کسی تذکرے میں نہیں ملتی۔ آپ نے جنگ مغلوبہ
میں شہادت کی فضیلت حاصل کی۔ ممکن ہے کہ فوج یزیدی کی طرف سے آئے ہوں۔

جباب بن عامر تیمی کوفہ کے شیعیان علی کی نمایاں فرد تھے۔ ابن زیاد کے ظلم و
ستم کے باعث قبیلہ میں ردپوش رہے پھر کسی طرح خدمتِ امام میں آ گئے اور شہید
ہونے کی سعادت حاصل کی۔

جشن بن قیس نہمی راوی حدیث اور علم دوست بزرگ تھے۔ جنگ مغلوبہ کے
شہیدوں میں آپ کا نام ملتا ہے۔

حجاج بن زید بصرہ والوں کے نامہ برین کو خدمتِ امام میں بھیج گئے تھے۔ زمانہ بدل گیا تب بھی ساتھ نہیں چھوڑا اور لڑ کر شہید ہوئے۔

حلاس بن عمر راسبی، امیر المومنین کے دور میں پولیس افسر تھے۔ یزیدی فوج میں شامل ہو کر بلا آئے تھے مگر حسینی فوج سے اُٹلے اور حق جہاد ادا کر کے شہادتِ یاب ہوئے۔ آپ کے بھائی نعمان بھی ساتھ ساتھ رہے اور دونوں یکے بعد دیگرے جنت کو مدھار گئے۔

حنظلہ بن عمر شیبانی جنگِ مغلوبہ میں شہید ہوئے۔

زاہر بن عمر کندی صحابی رسول تھے۔ آپ کو بیعتِ رضوان کا شرف حاصل تھا جنگِ خیبر میں علی کے ساتھ تھے۔ زیاد نے انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی مگر آپ مکہ پہنچ گئے۔ امام کے ساتھ کربلا آئے اور فداکاری کر کے شہید ہوئے۔

زہیر بن بشر خثعمی نے رفاقتِ امام میں شہادت کا مرتبہ حاصل کیا۔ زہیر بن سلیم ازدمی آئے تھے یزیدی فوج کے ساتھ مگر شبِ عاشور اہل حق کی فوج میں آکر شامل ہو گئے اور درجہ شہادت حاصل کیا۔

سلیم غلام تھے امام حسین کے حق و فدا ادا کر کے شہید ہوئے۔ سوار ابن ابی عمیر نبی امام کا حق رفاقت ادا کرتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے قبیلے کے لوگ اٹھالے گئے تھے مگر جان نہ ہو سکے۔

سیدف بن مالک عبدی بصرے کے باشندے تھے۔ مقامِ ابطح پر امام سے آکر ملے۔ کربلا کی جنگِ مغلوبہ میں فوجوں کی یلغار زدکنے میں شہید ہوئے۔

شبيب بن عبد اللہ، حارث بن سرہج ہمدانی کے غلام اور صحابی رسول تھے جنگِ جمل، صفین اور نہروان کے مجاہد اور حضرت علی کے فدائی تھے۔ جنگِ آزموہ اور بلا کے تیغ زن تھے، اپنا جوہر انفرادی جنگ میں دکھانے کے پھر بھی نیزہ بازی کا حق ادا کیا اور شہادت کا شرف حاصل کیا۔

شبيب بن عبد اللہ عتشی محبتِ اہل بیت میں امتیاز رکھتے۔ مدینے سے امام

کے ساتھ آئے تھے۔ امیر المؤمنین کی تینوں جنگوں کا تجربہ رکھتے تھے۔ لڑے اور خوب لڑے مگر آدمیوں کے طوفان نے اپنی پلیٹ میں لے لیا اور زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہوئے۔
 ضرغام بن مالک ثعلبی کوفے کے ساکن تھے۔ راستے بند ہونے کے سبب فوج یزید میں بھرتی ہوئے اور کربلا پہنچ کر امام سے جا ملے اور دوسرے حملے میں شہادت پائی۔
 عامر بن مسلم جمدی بصرے کے حجاج آل رسول میں سے تھے۔ مقام البطحہ پر آ کر امام کی حضور کی کاشف حاصل کیا اور کربلا میں بہادری کے جوہر دکھا کر شہادت پائی۔
 آپ کے ساتھ آپ کے غلام سالم بھی تھے وہ بھی شہید ہوئے۔
 عباد بن مہاجر جہنی اہل بیت کے دیرینہ خادم تھے۔ امام کے ساتھ کربلا آئے۔
 مرتبہ شہادت کا امتیاز حاصل کیا۔

عبدالرحمن بن عبدالرب انصاری صحابی رسول تھے، اعلان غدیر کے شاہد اور رادی تھے۔ کوفے سے آکر امام کی نصرت کی اور شہید ہوئے۔
 عبدالرحمن بن عبداللہ ارجی بڑے بہادر اور جنگ آزما تھے، کسی طرح کوفے سے نکل کر کربلا پہنچے، جنگ کی اور شہید ہوئے۔

عبدالرحمن بن مسعود تیمی اپنے پدر محترم کے ساتھ یزیدی لشکر میں شامل تھے۔ باپ بیٹے دونوں بہت بہادر تھے۔ ساتویں محرم کو عمر سعد کا ساتھ چھوڑ کر امام کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عبدالرحمن و مسعود دونوں نصرت امام کرتے شہید ہوئے۔
 عبداللہ بن بشر خثعمی مشاہیر کوفہ میں تھے۔ یزید کے لشکر میں شامل ہو کر امام حسین سے لڑنے آئے تھے لیکن توفیق الہی دشگیر ہوئی۔ امام کی طرف آ گئے اور شہادت پاک راہی جہاں ہوئے۔

عبداللہ بن یزید قیس اور عبداللہ بن یزید قیس بصرے سے اپنے پدر عالمیتام کے ہمراہ نصرت امام کے لئے آئے تھے اور البطحہ سے کربلا تک سہرا کا رہے۔ کربلا میں اپنے باپ یزید بن ثبیط کے ساتھ تلوار کے جوہر دکھائے اور دونوں سبھا ئی جنگ مغلوبہ میں شہید ہوئے۔

عقبہ بن صلت جہنی صحابی رسول اور علم قیادہ کے ماہر تھے۔ امام کی نصرت میں شہید ہوئے۔

عمار بن سلامہ والافی، جنگ جمل اور صفین دہروان کے معرکے جھیلے ہوئے بزرگ، رسول کا دور بھی دیکھے ہوئے تھے۔ لڑنے کی عمر گزر چکی تھی مگر نصرت امام اس طرح کی کہ چھکے چھڑا دیئے۔ آخر شرف شہادت حاصل کیا۔

عمار بن حسان طائی شجاع و صف شکن تھے۔ کتے سے امام حسین کے ہمراہ کربلا آئے تھے۔ کئی دشمنوں کو فی النار کیا اور شہادت پائی۔

عمرو بن ضبیہ تمیمی بہادران عرب میں شمار کئے جاتے تھے۔ فہم و فراست سے کام لے کر آپ دشمنوں کی فوج میں بھرتی ہوئے اور کربلا اگر امام کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ جہاد کا حق ادا کیا اور شہادت کا مرتبہ پایا۔

عمران بن کعب اشجعی کا نام جنگ مغلوبہ کے شہیدوں میں ملتا ہے۔ قارب بن عبد اللہ جناب رباب کی کینز کے بیٹے تھے۔ مدینے سے امام کے ہمراہ آئے تھے نام جنگ مغلوبہ کے شہیدوں میں ملتا ہے۔

قاسط بن زمیر تغلیبی، مقسط بن زمیر، کردوس بن زمیر، امیر المومنین کے اصحاب میں تھے۔ بالخصوص کردوس لمبے ترنگے اور تہمند تھے۔ امام حسن کی خدمت میں بھی حاضر رہے۔ جہاد میں شریک رہے اور کونے میں قیام پذیر ہو گئے۔ امام حسین کے وارڈ کربلا ہونے پر دشمنوں سے بچ بچا کر کربلا پہنچے۔ جنگ آزمودہ اور تجربہ کا تھے تینوں نے تلواروں کے جوہر دکھائے۔ دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا پھر شہید ہوئے قاسم بن حبیب ازدی کوفے کے مجاہد علی میں سے تھے، بہادر اور شہسوار تھے۔ کربلا پہنچنے کے لئے عمر سعد کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ موقع پاتے ہی سپاہ اسلام میں آکر شامل ہو گئے تھے۔ شمشیر زنی کا حق ادا کیا اور شہید ہو کر زندہ جاوید ہو گئے۔

کنان بن عتیق تغلیبی زہد و تقویٰ اور عبادت میں منہر تھے۔ حافظ قرآن بھی تھے۔

شجاع ایسے کہ اعداء کی یلغار میں سامنے کی دیوار بن گئے اور آب و جد کے نام کو روشن کیا۔ آپ کے شیرازہ حملوں میں دشمنوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ آخر آپ بھی زخموں کی شدت سے جاں بحق ہو گئے۔

مسلم بن کثیر از دی کی ایک ٹانگ جنگِ جمل میں تیر لگنے سے بیکار ہو گئی تھی مگر امام پر اعداء کی یلغار دیکھ کر بے چین ہو گئے اور کوفے سے کربلا پہنچ گئے نصرتِ امام کا جذبہ لے کر آئے تھے۔ مرتبہ شہادت پا کر جنت کی طرف چلے گئے۔
منہج بن یزید کے بارے میں پتہ نہ چل سکا کہ کون تھے مگر امام کی طرف سے لڑے اور شہید ہوئے۔

نصر بن ابی نضر نجاشی شاہِ حبش یا شاہِ عجم کی اولاد میں تھے۔ ابو نضر صحابیِ نبویؐ بھی تھے اور صحابیِ امیر المومنین بھی۔ نصر نے بچپن اور جوانی امیر المومنین اور امام حسن کی خدمت میں گزاری تھی۔ امام حسین نے جب عزم سفر کیا تو نصر آپ کے ساتھ روانہ ہوئے، کربلا میں حقِ جہاد ادا کیا اور لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

نعیم بن عجلان انصاری صحابیِ امیر المومنین تھے۔ آپ نے جنگِ صفین میں کارگزاری دکھائی تھی۔ کوفے میں یزید گردی ہونے پر چھپ گئے، پھر کئی طرح کربلا جا پہنچے اور دشمنوں کو مار کر شہید ہوئے۔

یہ ہیں امام مظلوم کے وہ سرفروشن جنہوں نے جنگِ معلومہ میں دشمنوں کی لاشوں کے انبار لگا دیئے اور تاریخِ عالم میں اکثریت اور غیر متناسب اقلیت کے مقابلے کی ایک نظیر قائم کر دی۔ ایسے وفاداروں کی مثال آج کل اقوامِ عالم کے لئے ایک للکار ہے کہ انہوں نے تیر، نیزہ و تلوار کا ہر حربہ اپنے سینوں پر لیا مگر خارِ رسالت کے کسی بچے کو خراش تک لگنے نہ دی لیکن اب بہت تھوڑے سے لوگ بچے تھے، باقی بنی ہاشم تھے۔ بچے ہوئے لوگوں کا فیصلہ اب بھی یہی تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں اُس وقت تک آلِ رسولؐ پر آپس نہیں اُسکتی۔

بعض مورخین نے اس حملے کو حملہٴ اولیٰ لکھا ہے۔ یہ حملہٴ اولیٰ اجتماعی یلغار کے

کے لحاظ سے حملہ آخر ہی تھا کیونکہ اس کے بعد انفرادی لڑائیاں ہی ہوتی رہیں۔
عراق و شام کے بھیرٹوں نے اس یلغار کے پسپا ہوتے ہی خیام اہل بیت
کو گھیر لیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی نقشہ کشی کی ہے۔

”لڑائی اپنی پوری ہولناکی سے جاری تھی۔ اب بعد دوپہر
ہو گئی مگر کوئی فوج غلبہ حاصل نہ کر سکی۔ وجہ یہ تھی کہ حسینی فوج نے
تمام خیمے ایک جگہ کر دیئے تھے اور دشمن صرف ایک ہی رخ سے
حملہ کر سکتا تھا۔ عمر سعد نے یہ دیکھا تو خیمے اکھاڑ ڈالنے کے لئے
آدمی بھیجے۔ حسینی فوج کے صرف چار یا پانچ آدمی یہاں مقابلے
کے لئے کافی ثابت ہوئے۔ خیموں کی آڑ سے دشمن کے آدمی نکلتے
ہی قتل ہو گئے۔ جب یہ صورت بھی ناکام رہی تو عمر سعد نے خیمے
جلا ڈالنے کا حکم دیا۔ سپاہی آگ لے کر دوڑے۔ حسینی فوج نے یہ
دیکھا تو مضطرب ہو گئی مگر حسین نے فرمایا: ”کچھ پرواہ نہیں“
جلانے دو۔ یہ ہمارے لئے اور بھی زیادہ بہتر ہے۔ اب وہ پیچھے سے

حملہ نہیں کر سکیں گے اور ہوا بھی یہی ————— “ (۹۴)
ایسے میں نماز ظہر کا وقت آ گیا۔ ابو ثمامہ صاندی نے عرض کیا۔
”تمنا ہے کہ آخری نماز آپ کے پیچھے ادا کر لیں“

”خدا تمہیں نماز گزاروں میں محشور کرے“ امام نے دعا دی اور کہا۔ ”ان
ملعونوں سے کہو کہ جنگ روک دیں، ہم بھی نماز ادا کر لیں اور وہ بھی پڑھ لیں“
امام کا یہ پیغام پہنچا یا گیا۔ اس کا جواب حصین ابن نمیر نے دیا۔
”کتنی ہی نمازیں پڑھ لو، قبول نہ ہوں گی۔ —————“

سبط رسول کی نماز کو اس طرح کہنے والا بھی مسلمان اور اس کا ولی نعمت
بھی رحمۃ اللہ علیہ! اگر یہی اسلام ہے تو یقیناً یہ ابوسفیان اور اس کی اولاد کا اسلام
ہوگا۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسلام تو نہیں ہو سکتا۔

اسی سال کے بوڑھے صحابی حبیبؒ ابن مظاہر اس جواب کو برداشت نہ کر سکے
آپ نے عرض کیا:۔

”مولیٰ۔ اب یہ بوڑھا غلام آپ کے نانا کے پیچھے نماز ادا کرے گا۔۔۔“

حبیبؒ ابن مظاہر کی اہل بیت سے عقیدت مورخین کے رشحات قلم کا موضوع
رہی ہے۔ بچپن ہی سے آپ امام حسینؑ کے گرد پروانے کی طرح چکر لگاتے رہتے۔ امامؑ کی
خاک پا کر آنکھوں سے لگاتے اور اہل بیتؑ کو سبھی آپ سے آنا لگاؤ تھا کہ جب آپ
کو بلا پہنچے تو زینبؑ کبریٰ نے درخیم کے پیچھے کھڑے ہو کر حبیبؒ کو سلام کہہ دیا تھا۔
حبیبؒ نے اپنا منہ پیٹ لیا تھا کہ اب یہ وقت آگیا ہے کہ شہزادیاں غلاموں کو سلام
کہہ لواتی ہیں!

حبیبؒ کی باری اُجانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انصارِ امامؑ میں کتنے قلیل جاں
نثار باقی تھے۔۔۔ عرض حبیبؒ نے شکتے ہوئے ابرو مٹاتے پرکھینچ کر باندھے، مگر
کو دوسرے شکے سے محفوظ کیا، امامؑ سے اجازت لے کر گھوڑے کو ایڑ دی اور فاسقوں
کی آہنی دیوار کے سامنے پسپہ کر لے گا۔

”میدان شجاعت کا شہسوار حبیبؒ آیا ہے۔“

آپ کی نگاہیں حصین ابن نمیرؓ پر جمی ہوئی تھیں۔ آپ نے بڑھ کر کہا۔

”فاسق و فاجر کے بیٹے! تیری نماز قبول اور فرزندِ رسولؐ کی نماز قبول نہیں۔!“

اس کے ساتھ ہی آپ نے حصین پر تلوار کا وار کیا۔ حصین پیچھے ہٹ گیا اور اس
کے بجائے بنی امیہ کی بھیڑ میں کھنس گئیں۔

حبیبؒ کی تلوار بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ تین روز کے پیاسے تھے مگر غصے

میں منہ سے کف جاری ہونے کی کیفیت تھی۔ گھوڑے کو جس صف پر ڈال دیتے۔ ثبوت

اس طرح بھاگنے لگتے، جیسے شیر کے سامنے سے جنگل کے جانور بھاگتے ہیں

پیرانہ سالی اور شدتِ عطش میں زیادہ دیر لڑنے کی سکت نہ تھی مگر آپ کے جسم

میں نہ جانے کہاں کی پھرتی آگئی تھی کہ آج جنگِ صفین سے زیادہ سرعت کے ساتھ آپ

کا ہاتھ چل رہا تھا۔ ساتھ نابکاروں کو آپ نے قید ہستی سے آزاد کیا اور جو زنجی ہو کر
بھاگ گئے ان کی گنتی نہیں۔ یہ جنگ جاری رہتی کہ ایک بزدل نے پیچھے سے نیزے کا
دار کر دیا اور رسول کا صحابی، امیر المؤمنین کا سرفروش گھوڑے سے گر کر جنت کو ہار گیا۔
امام نماز سے فارغ ہو کر تشریف لائے تو آپ خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

عاشور کی نماز

حبیب کا عزم بظاہر رائے جنگ تھا لیکن حقیقتاً وہ تھوڑی دیر کے لئے پڑی
فوج کا بار اٹھانے کے لئے میدان میں آئے تھے۔ ان کا یہ مقصد پورا ہوا۔ سید ابن عبد
حنیفی اور زہیر ابن قین ڈھالوں کو لے کر کھڑے ہو گئے۔ مجاہدوں نے امام کے
پیچھے صفیں باندھ لیں۔ ادھر دشمنوں نے تیر برسانا شروع کر دیئے۔ دونوں سرفروش
تیروں کو ڈھالوں پر یا اپنے جسموں پر لیتے رہے یا تلوار سے کاٹتے رہے۔ نماز ختم ہوئی
تو سعید کا جسم تیروں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ ایک سہ پہلو تیر سینے کو توڑ گیا تھا اور تیر ۱۳
تیر مختلف جگہوں پر پوسٹ تھے۔

امام میدان سے حبیب ابن مظاہر اسدی کی لاش لے کر پلٹے تو سعید کی روح
نفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

ابو ثمامہ عمرو بن عبد اللہ صاندی عرب کے نامور شہسوار، جنگ جمل، صفین و
نہروان کے مجاہد تھے۔ کونے سے خفیہ طور پر نکل کر نافع بن ہلال کے ساتھ کربلا آئے تھے
آپ بھی اسی ظہر کے ہنگامے میں شہادت یاب ہوئے۔

نماز ظہر کے بعد

امام کا سینہ اوپر سر ہر چکا تھا۔ آپ نے بڑی حسرت کے ساتھ اپنے
اور بایں دیکھا اور ایک عبرت انگیز اور ایمان افروز خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں شہداء
کے درجاتِ عالیہ پانے کی توثیق تھی۔ ہر ایک نے جواباً عرض کیا۔

”ہمارا یقین اس منزل پر ہے کہ پر دے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں تب بھی

ان میں کوئی اضافہ نہ ہو گا“

اس کے بعد ہر فردش آگے جلنے میں پیش قدمی کرنے لگا۔ سب سے پہلے زہیرؒ ابن قین بجلی نے اجازت لی۔

آپ بڑے زاہد و دیندار، عبادت گزار و بہادر تھے۔ ایمان کی روشنی دیکھ کر راستے سے امام کے ساتھ ہو لئے تھے۔ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں آئے اور مقابل طلب کیا تو اس قدر ضعیف آدمی کا سامنا کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ ایک سبب زہیرؒ کی سماجی منزلت بھی ہو سکتی ہے۔ ایک عجیب بات تھی ناہرانِ حسینؑ میں کہ دیکھنے میں کتنے ہی کمزور و ناتواں ہوں مگر زمرگاہ میں آتے ہی شیر نیبتاں بن جاتے تھے۔ زہیرؒ سے لڑنے کے لئے جب کوئی نہیں آیا تو زہیرؒ نے خود گھوڑے کو اشارہ کیا اور مینے پر حملہ آور ہو گئے۔ پھر میسرے پر یلغار کی۔ تلوار اس سرعت کے ساتھ گردش میں تھی کہ سامنے والے کو نگاہ جانے کا یا رازہ ہوتا اور چشمِ زدن میں اس کا سراٹھانا نظر آتا۔ یا گھوڑے سے گر کر زمین پر لوٹے لگتا۔ آپ خود بھی زخم کھانے سے بچ نہ سکے۔ مگر ذرا سی دیر میں ایک سو بیس آدمی خاک و خون میں غلطاں کر دیئے۔ پھر آپ بھی گھوڑے سے گر کر کوثر کے راہی ہوئے۔

امام حسینؑ آپ کی آواز پر دوڑ پڑے۔ سر اٹے بیٹھ کر منہ پر منہ رکھ دیا۔ جنت کی بشارت دی اور لاش اٹھوا کر خیمہ گاہ میں لے آئے۔

اب غلام ابوذر غفاریؒ جو بن حوی اجازت طلب ہوئے۔ امام حسینؑ نے فرمایا۔ ”خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہو گئے ہو۔ تم کو مبتلائے مصیبت نہیں کر سکتا۔“ شاید اس لئے کہ میرا حسب و نسب پلٹ ہے۔ میرا خون آپ کے خون میں مل جائے گا۔“ قدموں پر سر رکھ کر جوئے ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگے امام نے اٹھا کر گلے لگایا اور میدان کی اجازت دی۔

بوڑھے جوئے نے بھی ایک یادگار جنگ لڑی۔ پروں کے پرے اٹھ دیئے آخر گھوڑے سے گر کر امام کو آواز دی۔
”مولیٰ۔ میں آپ پر قربان ہو گیا!“

امام علیہ السلام پہنچے۔ جوُن کا سر اٹھا کر زانو پر رکھا اور دُعادی۔
روایت ہے کہ جب بنی اسد نے شہداء کو دفن کرنے کے لئے لاشیں کیجا کیں
تو جوُن کے چہرے پر ایسا نور تھا جو اس سے قبل دیکھا نہیں گیا اور آپ کی لاش سے
مشک وغنیر کی خوشبو اُڑ رہی تھی۔

حفظہ بن اسود شامی اس کے بعد لڑنے آئے۔ حافظ قرآن اور زاہد شریف زادہ
تھے، ہر وقت امام کے آگے آگے رہتے تھے۔ پہلے سے کافی زخمی تھے، پھر بھی کئی
آدمیوں کو جہنم واصل کیا اور لڑتے ہوئے مارے گئے۔
حجاج بن مسروق کوئی بلال کے جانشین تھے۔ ظہر کی اذان آپ ہی نے دی
تھی، میدان میں آکر آپ نے حبسز پڑھا۔

”پنجتن کی محبت میں نامردوں سے لڑنے آیا ہوں۔“

آئے ہی آپ شکر یرید میں در آئے جس طرف رخ کیا، لاشیں ہی لاشیں
گرا دیں۔ ایک سو سے زائد کافروں کو قتل کیا، پھر درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔

عائشؓ قبیلہ مہدان کی ایک شاخ بنی شاکر کی بزرگ ترین فرد تھیں۔ ۲۱ سوال
۹۹ کو مکہ میں پیدا ہوئے مگر کوفہ کے متوطن ہو گئے تھے۔ ابو شیبہ صحابی امیر المومنین میں
سے تھے۔ ممکن ہے امیر المومنین ہی کے ساتھ کوفہ آئے ہوں۔ عائشؓ جنابؐ کے پر جوش
حامیوں میں تھے مگر خط لے کر امام حسینؑ کی خدمت میں جانا پڑا اور پھر قدم قدم
پر امامؑ کے ہمرکاب رہے۔ عاشور کو بہت دیر تک امام کی حفاظت کی۔ وقت آیا
تو اپنے غلام شوزب بن عبد اللہ کے ساتھ میدان میں آ گئے۔ عابد و زاہد، جنگ صغیر
کے سورما، اتنے معتمد اور ذی عزت کہ مسلم بن عویجر، زعمیر قنن اور حبیب ابن مظاہر
کے ساتھ آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ امیر المومنین نے فرمایا تھا کہ بنو شاکر کے ایک ہزار
آدمی ہوں تو دنیا میں اسلام کے سوا کوئی مذہب نہ رہے!

میدان میں آکر آپ نے حبسز پڑھا۔

حضرت کے قدموں پر مرنے کی قسم کھا کر آیا ہوں مگر مردوں کا اُسی وقت جب تمہارا

سیکڑوں عورتیں بیوہ اور یتیم ہو جائیں۔“

ایسا ہی نعرہ شہزاد بن عبداللہ نے بھی مارا۔ لوگ شمشیر عابس کی شعلہ فشاںی دیکھ چکے تھے جانتے تھے کہ جو بھی جائے گا، جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ کسی کی ہمت نہ پڑی دُور سے پتھر مارنے لگے۔ شوق شہادت میں عابس نے زرہ اُتار کر پھینک دی اور پھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ کیا۔ شہزاد ساتھ ساتھ تھے۔ دونوں نے ایسی تلوار چلائی کہ دوسو سے زائد کوفیوں کی لاشیں گر آئیں، پھر دونوں نے یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کیا۔

عروہ بن حراق انصاری کے چودہ پندرہ سالہ بچے نصرت امام کے لئے کربلا آئے تھے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ امام نے اس کو دہشتِ جنگ پر معمول کیا اور ان سے کہا کہ وہ بچ کر نکل جائیں۔ اس پر وہ رونے لگے اور بولے: ”ہیں آپ کی بے کسی پر رونا آ رہا ہے“ پھر دونوں نے ہاتھ جوڑ کر اجازت لی۔ میدان میں جا کر متواروں کے جوہر دکھائے اور موت کی آغوش میں سو گئے۔

حضرت زین العابدین کے ترکی غلام نے بھی میدان میں جا کر جہاد کیا، کئی ماری دوزخ کے حوالے کئے اور خود جنت کی راہ لی۔

جنادہ ابن حارث اصحابِ امیر المومنین میں سے تھے۔ کونے سے چل کر غزیت ^{الجمانا} میں آکر امام سے ملے تھے۔ میدان میں آکر آپ نے رجز پڑھا۔

”دشمن کے سامنے کمزور پڑنے والا نہیں ہوں۔“

آپ نے بھی بہت سے دشمنوں کو تلوار کا لوہا چٹایا اور موت کو لبیک کہا۔ معالیٰ بن محل اسے شجاع تھے کہ آپ کی تیغ زنی پر دشمن بھی دنگ رہ گئے۔ ۶۴۔ نابکار آپ کی تلوار سے قتل ہوئے پھر آپ گرفتار ہو گئے۔ عمر سعد نے شرط اطاعت پر علاج معالجے کا لالچ دیا مگر آپ نے جواب تلوار کھینچ لینے کی کوشش کی آخر قتل کر دیئے گئے۔

طراح بن عدی بن حاتم طائی دونوں سے محبتِ اہل بیت تھے۔ امام کو

قبیلہ طے میں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ نہیں گئے تو ہرکاب رہے اور دشمنوں سے جنگ کی
 ستر کو قیوں کو موت کے غمہ میں پہنچایا اور زخموں سے چوڑ ہو کر گھوڑے سے گر گئے
 بعض روایات کے مطابق عصر کے وقت تک زندہ تھے پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔
 سلمان بن مضارب زہیر بن قین کے چچیرے بھائی تھے۔ بعد ازاں جنگ کی کئی کڑیوں
 کو موت کا مزہ چکھایا اور شہید ہو گئے۔

عمرو بن قرقظ انصاری کے والد امیر المؤمنین کے عہد میں حاکم کوفہ تھے۔ عمرو دام
 حسین کی نصرت کے لئے کربلا پہنچ گئے مگر ان کا بھائی علی شکرین مدین میں رہا جو نافع
 بن ہلال کے ہاتھوں مارا گیا۔ عمرو نے شجاع باپ کی لاج رکھی، شایان شان جنگ
 کی اور شہادت پائی۔

نافع بن ہلال جملی، شریف النفس، سردار قوم، شجاع، قاری قرآن، راوی حدیث
 اور صحابی امیر المؤمنین تھے۔ آپ کوفہ سے آکر شکر امام میں شامل ہوئے۔ اپنے
 وقت کے بے خطا قیر انداز تھے۔ میدان میں آکر اپنے فن کے جوہر دکھائے اور بارہ
 مویلوں کو جہنم رسید کیا۔ تیر ختم ہو گئے تو تلوار نکال لی۔ جفا کاروں نے ان کی لڑائی
 کے مناظر دیکھے تھے، کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی، دور سے ان کو تیروں کی
 زد پرے لیا۔ اور ان کے بازو شکستہ کر دیئے۔ پھر گرفتار کر کے عمرو مسجد کے سامنے لے
 گئے۔ پھر انہیں قتل کر دیا۔

سیف بن حادث اور مالک بن عبد اللہ آپس میں چچیرے بھائی تھے۔ امام کی
 بے چارگی پر روتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اجازت لے کر میدان میں گئے اور
 مبارز طلب ہوئے مگر کوئی مقابلے پر نہ آیا بلکہ پوری فوج نے گھیر لیا۔ دونوں نے غضب
 کی شمشیر زنی کی۔ کہتے ہی کافروں کو قتل کر ڈالا اور زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔
 ہلال بن نافع کی پرورش امیر المؤمنین نے کی تھی۔ مانی و سلم کی شہادت کے بعد
 آپ کوفہ سے آکر راہ میں امام حسین سے ملحق ہوئے تھے۔ آپ کی عمر پچیس سال تھی
 بیوی کو لے کر نصرت کے لئے آئے تھے۔ بلا کے تیر انداز اور تیغ زن تھے۔ امام کے ساتھ

ساتھ رہنے کی کوشش کرتے۔ فوج حسینی میں ایک نمایاں عہدے پر فائز کئے گئے تھے میدان میں اکراپ نے رجز پڑھا۔

”یمن کے قبیلہ بجلی کا جوان ہوں حسین ابن علی کی تعلیم میرا مذہب ہے — تم پر حملے سے باز نہ رہو گاجب تک مجھے موت نہ آجائے“

فولاد کا خود سر پر گول ڈھال پشت پر، تیروں سے بھرا ہوا ترکش کمر میں جن کے پر زمر دی تھے اور سواروں پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔ یمنی تلوار جمائل کئے تیز تیز دوڑتے ہوئے سر میدان پہنچے اور تاک تاک کر تیر مارنے لگے۔ ہر تیر پر ایک آواز بلند ہوتی تھی۔ پتہ نہ چل سکا کہ کتنے ترے، کتنے زخمی ہوئے۔ ترکش خالی ہو جانے پر تلوار بے نیام کی اور سرگنا شروع کر دیئے، مگر خود ان کا جسم بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ آخو زمین پر گر کر موت کی آغوش میں آنکھیں بند کر لیں۔

الن بن حارث اسدی نے آنحضرت سے شہادت حسین کی خبر سنی تھی اور نصرت کے لئے جی رہے تھے۔ کتنے بوڑھے ہوں گے۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے مگر امام کے ساتھ آئے تھے۔ ناتوانی میں موت سے بے نیاز ہو کر لڑے۔ مارے تو کم زخمی زیادہ کئے اور شہادت کی آرزو پوری کر کے موت کی آغوش میں سو گئے۔ زیاد بن عمر ہمدانی، عابد و زاہد، شجاع اور تہجد گزار تھے۔ آپ نے بہت سخت جنگ کی پھر مراد شہادت حاصل کی۔

اسلم بن عمرو امام حسین کے ترکی النسل غلام تھے۔ میدان میں بڑی سرفروشی دکھائی۔ کئی کوئیوں کو مارا اور شہید ہوئے۔

سالم بن عمرو کوفہ کے قبیلہ بنی المدینہ کے غلام تھے۔ رفاقتِ مسلم میں گرفتار ہو گئے مگر موقع پا کر بھاگ نکلے اور روز عاشورا ایک ہولناک جنگ کر کے مارے گئے۔ سعد بن حارث امیر المومنین کے غلام تھے۔ مدینہ سے امام حسین کے ساتھ آئے تھے۔ میدان میں دادِ شجاعت دی اور شہید ہوئے۔

عماد بن جندب حضرمی جنگ صفین و جمل کے سورما اور حجت امیر المومنین میں

مشرار تھے۔ شہادتِ مسلم کے بعد کسی طرح امام کی خدمت میں پہنچے اور جہاد و شہادت کا شرف حاصل کیا۔

قنبر بن عمرو غمری بصرے سے آئے تھے، مقصد نصرتِ امام تھا جو میدان میں پورا کیا، کئی آدمیوں کو دوزخ دکھا کر شہید ہوئے۔

یزید بن ثمر بن عبدی بصرے سے اپنے دو بیٹوں عبداللہ اور عبید اللہ کو لے کر آئے تھے، صرف نصرتِ امام کے لئے، کس طرح لڑے ہوں گے؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تینوں نے بل کر ایک یادگار جنگ کی اور شہادت پائی۔

یزید بن مغفل جعفری جنگِ صفین کے بہادر تھے۔ باپ کے وقت سے آلِ رسول کے شہدا تھے، بڑی فداکاری دکھائی اور شہید ہوئے۔

رافع بن عبداللہ مسلم بن کثیر اعراج کے غلام تھے۔ بعد ظہر جنگ کر کے شہید ہوئے۔ سوید بن عمرو کندلی، حضرموت کے متوطن، کوفہ میں بنی کندہ کے مقیم تھے چھپ چھپا کر بلا پہنچے۔ نصرتِ امام کا حق ادا کیا اور شہید ہوئے۔

سوید بن عمرو خثعمی بڑے عابد و زاہد تھے، اتنے ضعیف کہ تلوار اٹھانا مشکل تھا میدان میں آگے دیڑوں کو بہت سمجھایا کہ مجھے قتل کر دو مگر نبیؐ کے نواسے کو چھوڑ دو جواب وہی ملا جو دوسروں کو ملتا رہا تھا۔ شیر بوڑھا ہو گیا تھا مگر تھا شیریں، ایک غضبناک حملہ کیا اور جو سامنے پڑا اس کو گرادیا۔ آخر میں خود بھی گر گئے۔ دشمنوں نے اسی وقت آپ کا سر کاٹ لیا۔

بائیس چوبیس نام اور ملتے ہیں جن کے بارے میں جہاد و شہادت کی روایات پائی جاتی ہیں مگر انہیں معتبر نہیں کہا جاسکتا۔ بعض آدمی وہ بھی ہیں جو سخت زخمی ہوئے تھے، لوگ اٹھا لے گئے، کچھ بچ گئے اور کچھ جنت کو سدھار گئے۔

بنی ہاشم رزم گاہِ شہادت میں

اب صرف حسینؑ رہ گئے تھے اور رسولؐ کی اولاد۔ دو پہر ڈھل رہی تھی بخارِ فتنہ سیدانوں کو لمحے لمحے کی خبر پہنچا رہی تھیں اور عترتِ اطہار کے خیوں میں ایک

قیامت برپا تھی۔ یادیوں کے اس اندھیرے میں جناب زینبؓ بھی پریشان ہو رہی تھیں
بھائی نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر بھی عورت ذات کے کمزور پاؤں ڈنگا رہے
تھے۔ بالآخر ان کی سخت آزمائش کا وقت آ ہی گیا اور علی اکبرؑ ہاتھ جوڑ کر سامنے آ کر
کھڑے ہو گئے۔

”پھوپھی جان، جانے کی اجازت چاہتا ہوں؟“

اکثر مؤرخین اور علماء نے حضرت علی اکبرؑ کو آخری شہید لکھا ہے مگر بعض اس
سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان میں سید العلماء سید علی نقی اور علامہ رشید ترائی اعلیٰ اللہ
مقاہمہ سرفہرست ہیں اور اس خیال کو کیسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ امام علیہ السلام
نے بارگاہِ احدیت میں پہلی قربانی اپنے چہیتے بیٹے کی دی ہوگی۔ جس طرح اصحاب
میں حضرت مسلمؓ بن عوسجہ کو مقدمہ شہداء ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کی ایک توجہ
یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شبیہ رسولؐ کو بھیج کر ایک بار پھر بانی دین کی یاد تازہ کرادیں کہ
شاید ان میں کوئی صاحب ایمان رہ گیا ہو جو اس منزل پر بھی سنبھل جائے اور آپ
کسی اور کو قصر مذلت سے نکال لائیں۔

اول وقت ظہر سے آخر عصر تک کا دورانیہ ایک قیاس کے مطابق پانچ گھنٹے
کا ہو سکتا ہے اس میں بارہ چودہ بنی ہاشم کی انفرادی خشک کو دیکھتے ہوئے وقت
کی تقسیم قدرے مشکل نظر آتی ہے کیونکہ اس میں امام حسینؓ کے خطبات بھی شامل
ہیں لیکن شہداء کی لڑائی کی تفصیل کا زیادہ اختلاف بھی نہیں ہے۔ لہذا یہ نتیجہ اخذ
کرنا پڑتا ہے کہ اشعیا کی یلفار کو روکنے کے لئے ایک سرخروش کی شہادت کے فوراً
بعد دوسرا میدان میں پہنچ گیا اور اس نے اپنی تلوار پر پورے لشکر کو روک لیا جس
میں پہل شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ نے کی۔

پھوپھی کے دل کو پہلے سے دھڑکا لگا ہوا تھا مگر بے کس عورت کرتی بھی تو کیا
کرتی، خود اس کی مہم کا وقت سر پر آ رہا تھا۔ حسینؓ کی ماں جانی نے درد آمیز مکالمہ
کے بعد علی اکبرؑ کو اجازت دے دی۔ پھر علی اکبرؑ نے ماں کا مرحلہ سر کیا۔ امامؑ کی رفیقہ جا

قیاساً سب کچھ سمجھ چکی تھیں بسیدہ نہرا کی بہوتھیں۔ دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے بھی بیٹے کی بلا میں لیں اور رخصت کر دیا۔ پورے خاندان کا ہر دلعزیز نوجوان میدان کو جارا تھا اور جانے والوں کا انجام ہر ایک دیکھ چکا تھا۔ علی اکبر عورتوں اور بچوں کے جھڑپ میں گھبرے ہوئے تھے۔ ایک ایک سے گلے ملے۔ سب کے آخر میں دادی فاضلہ کو سلام کیا۔ سکینہ کو گود میں لے کر پیار کیا اور پردہ اٹھا کر باہر جانے کا عزم کیا مگر کسی نہ کسی نے روک لیا۔ آخر کئی بار ٹھہرنے کے بعد وہ باہر آ سکے۔

امام حسین نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا۔ علی کی تلوار حائل کی، زرہ پہنائی رسول کے گھوڑے عقاب پر سوار کیا اور ہاتھ اُپر اٹھا دیئے۔

”بارالہا! اب میں نانا کی زیارت سے محروم ہو جاؤں گا۔ تو اس کی حفاظت کرنا۔“
 علی اکبر کا جانا عورتوں ہی کے لئے نہیں، مردوں کیلئے بھی حشر انگیز تھا۔ ہر ایک نے ان کو روک کر پہل کرنے کی کوشش کی۔ بالخصوص حضرت عباسؓ تو اپنے ہوتے کسی کے بھی جانے کے قائل نہ تھے اور اکبر تو ان کی آنکھوں کی روشنی تھے مگر حکم انام سے مجبور ہو گئے۔ اکبر سب سے باری باری گلے مل چکے تھے۔ چلتے وقت پھر سب کو سلام کیا اور گھوم گھوم کر دیکھتے ہوئے میدان میں جا پہنچے۔
 ”علی کا پوتا اور حسین کا بیٹا ہوں — وہ تیغ زنی کروں گا کہ دادا کی یاد تازہ ہو جائے!“

بار بار بازت پر بھی کوئی مقابلے پر آنے کی ہمت نہ کر سکا تو علی اکبر نے خود قلب پر حملہ کر دیا۔ صفین کے بھاگے ہوئے لوگ پھر بھاگنے لگے۔

دادا کے بعد پوتے کو پیٹھ دکھاتے کسی کو شرم نہ آئی۔ تین دن کے بھوکے اور پیاسے نے ایک سو بیس آدمیوں کو تہ تیغ کیا اور انام کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپ نے پیاس کم کرنے کے لئے منہ میں ایک انگوٹھی دے دی اور علی اکبر سحر رزم گاہ میں پلٹ گئے۔ ابن سعد نے لالچ دے کر مشکل ایک نامور پہلوان طارق بن شہیت کو مقابلے کے لئے بھیجا مگر یہ ایک لحظے کی بات تھی۔ نیزے کا پہلا ہی وار طارق کی پشت توڑ کر

نکل گیا۔ اس کے بعد اس کے دو بیٹے عمر طارق اور طلحہ طارق اگر مقابل ہوئے۔ اکبر نے عمر کو قتل کر دیا اور طلحہ کا گریبان پکڑ کر پچھاڑ دیا۔ یہ دیکھ کر عمر سعد نے مصراح بن غالب کو حکم دیا، وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔

شکریہ میں پہل پڑ گئی۔ اب محکم بن طفیل اور ابن نوفل دو ہزار کے شکر سے حملہ آور ہوئے۔ اکبر نے اس شکر کو سبھی الٹ دیا اور پیاس کی تاب نہ لا کر پھر پاپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ امام نے فرمایا۔
”جاؤ، ساقی کو ڈرتھیں سیراب کریں گے۔“

امام کا جواب ہر دریدہ دہن موڑخ کا منہ بند کر دیتا ہے اور پانی کے ہر امکان کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ ایک قطرہ بھی ہو سکتا تو فوراً نظر سے عزیز کرتے اور صرف انہیں پر موقوف نہیں، کسی کا امکان بھی ہوتا تو علی اکبر کے لئے کچھ اٹھانہ رکھتا۔

علی اکبر پھر واپس ہوئے اور کسی صنیم گرسنہ کی طرح حملہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ۸۰ بے دیوں کو راہی جہنم کیا۔ اس اتنا میں منقذ بن مرہ اور ابن نمیر نے ایک طرف چھپ کر نیزے مارے اور ایک نیزے کی آنی سینے کو توڑ کر پار بکلی گئی۔ عثمان فوس آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ آپ نے گھوڑے کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے اور آزاد دی۔

”بابا میری خبر لیجئے۔“

دنیا امام کی آنکھ میں اندھیر ہو چکی تھی۔ آپ ٹھوکرین کھاتے ہوئے چلے۔ قریب پہنچ کر گر پڑے اور گھٹنیوں کے بل چل کر بیٹے کی لاش پر پہنچے۔ ۸ سالہ جوان کا لاشہ خیمے میں لایا گیا تو محسوس ہو رہا تھا کہ گویا پیغمبر اسلام سینے پر نیزے کا زخم کھاتے پڑے ہوئے تھے۔

امام کی پہلی قربانی بارگاہِ احدیت میں قبول ہو چکی تو عبد اللہ بن مسلم، جو امام کی بہن رقیہ کے بیٹے تھے، آگے یڑھے۔ ۱۲ سالہ بچے کا پہلا محاربہ تھا مگر عقیل کا پوتا علی کا نواسہ بے خطر ہو کر فوجوں پر ٹوٹ پڑا اور آنکھ جھپکتے ہی لاشیں گرا دیں۔ کوئی سپاہ

شفالان عرب کی طرح بھاگے لگی۔

مقابلے پر ٹھہرنے کی ہمت کسی میں نہ رہی تھی۔ دُور سے تیر رہنے لگے۔ ذفقاً البوہم اور یقیط بن ایاس نے پہلو میں آکر سر پر مسلسل تلواریں ماریں اور شہزادہ گھوڑے سے گر گیا۔

جعفر بن عقیل فوراً بھتیجے کی مدد کے لئے پہنچے مگر اس کا رشتہ جیات منقطع ہو چکا تھا۔ جعفر جز پڑھ رہے تھے۔

”تم میں کچھ بھی ہمت اور بہادری کا دعویٰ ہو تو اُمّ کی طرف رخ کر کے بچو۔“
بزدل ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے لگے۔ شرمسار منے پڑ گیا۔ جعفر نے اس پر حملہ کیا۔ وہ سپاہیوں کی اڑنے کریتے میں جا چھپا۔ جعفر نے میسرے پر ہلہ بول دیا۔ جو سامنے پڑا، اس کو کھیرے لکڑی کی طرح کاٹ ڈالا۔ میسرے میں کمی محسوس کر کے عمر سعد نے مہینے کو بڑھایا۔ جعفر کی تلوار چمک رہی تھی کہ شیر نامی طعون نے پہلو سے وار کر دیا۔ جعفر زمین پر آ رہے۔ اُمّ جب تک پہنچیں اشقیاء انہیں قتل کر چکے تھے۔

عبدالرحمن بن عقیل نے اُمّ کی اجازت سے بھائی کی جگہ لی۔ آپ کے حملے نے جنگِ مسلم کی یاد تازہ کر دی۔ چند حملوں میں سترہ سوار اور کئی پیادوں کو مار گرایا اور فوج بھاگنے لگی مگر عثمان بن خالد نے پیچھے سے نیزہ مار دیا جو دل میں اتر گیا اور عبدالرحمن گھوڑے ہی پر شہید ہو گئے۔

اب حضرت عقیلؓ کے بیٹے موسیٰ بھائی کے جہاد کو مکمل کرنے کے لئے میدان میں آئے تو لشکرِ امی کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹنے لگے تاہم تیروں کی باڑھ سے آپ کا استقبال کیا گیا مگر آپ رکنے والے نہ تھے۔ اتفاق سے گھوڑا اٹھو کر کھا کر گر گیا۔ پھر تلواروں کی پے درپے ضربوں سے آپ بے جان ہو گئے۔

عبداللہ بن جعفر نے دونوں بیٹوں کو اسی دن کے لئے بھیجا تھا۔ بچے احساسِ ذمہ داری میں بڑوں سے کم نہ تھے۔ ماں کی اجازت سے ماموں کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اُمّ نے تامل کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے گھوڑوں پر بٹھایا اور شہزادے میدان میں

پہنچ کر جز خواں ہو گئے۔

”عمر و شرمینہ اور میرہ سنبھال لیں جس کو شجاعت پر ناز ہو، وہ سامنے آجائے!“
ابن سعد نے خیمے سے نکل کر دیکھا تو فوجی جوان خیموں کی آڑ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے للکارا۔

”دو کم سن بچوں سے بھاگ رہے ہو، شرم نہیں آتی تمہیں۔“

ابن سعد کے غیرت دلانے پر وہ پٹے لگ کر مقابلے پر آنے کے بجائے تیرے سامنے لگے
عون و محمد تیروں کو خاطر میں نہیں لائے اور نیچوں کو بلند کر کے ٹوٹ پڑے۔ ان کے
ہاتھوں میں چھوٹے بڑے نیچے، ایسے دشمنوں سے لڑنے کے لئے چھوٹے پڑتے تھے
لہذا بچے خم ہو کر دار کرتے تھے۔ لڑتے لڑتے عمر سعد کے خیمے تک پہنچ گئے۔ ان کا ارادہ
تھا کہ اس تم شعار کو قتل کر دیں مگر یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ — مجموعی طور پر انہوں نے
چوبیس سو اردوں اور بارہ پیادوں کو قتل کیا پھر عامر بن نہشل نے محمد پر پہلو سے وار
کیا۔ انہوں نے گرتے ہوئے بھائی کو آواز دی۔ عون پہنچنے کی سعی میں تھے کہ نیزوں کی
اینوں سے گرادیئے گئے۔

حضرت سید الشہداء ادا زین سُن کر دوڑ پڑے۔ حضرت عباس نے حملہ کر کے
بزدلوں کو بھگا دیا مگر زینب کے لال ماموں کا حق ادا کر کے خاموش ہو چکے تھے۔

عبداللہ بن امام حسن بہت حسین و جمیل تھے۔ جنگ کا پہلا اتفاق تھا مگر شیر
کے بچے چھوٹی عمر سے شکار کرنے لگے ہیں۔ شہزادہ چچا سے اجازت پا کر ہو کر میدان
میں آیا تو علی کا پوتا ہی معلوم ہوتا تھا۔ رجز پڑھ کر کھلی کی طرح قلب لشکر پر کوندنے لگا
اور سردوں کو کاٹ کاٹ کر پھینکنے لگا۔

شمر سامنے نظر پڑا تو شہزادے نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ وہ بے تحاشا
بھاگا تو طنابِ خیمہ سے الجھ کر گر گیا۔ اس کو بچانے کے لئے لشکر کی سیچ میں آ گئے
اور شہزادے نے اکیس جوانوں کو خون میں نہلا دیا۔ عمر سعد نے یوسف بن الاحجار کو
غیرت دلا کر بھیجا جو سامنے آتے ہی واصل جہنم ہوا۔ باپ کے بعد اس کے بیٹے طارق

نے مقابلہ کیا عبداللہ نے پہلی ہی ضرب شمشیر میں اس کو قتل کر دیا۔ طادق کی جگہ اس کے چھیرے بھائی بدرک بن ہبیل نے لی۔ اس کا حشر بھی پہلوں جیسا ہوا۔ اس کے بعد کسی کو سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔

مجبور ہو کر خود عبداللہ نے لشکر کے میمنہ پر حملہ کر دیا۔ نتیجے میں فوج کے گھیرے میں آگئے۔ چہار جانب سے تیروں اور نیزوں کے وار ہونے لگے۔ ہانی ابن ثبیت نے ایک ایسا تیر مارا جو پشت سے سینے پر در آیا۔ اس کے ساتھ ہی عبداللہ بن عقبہ نے پیشانی پر گرز لگایا اور عبداللہ زمین پر گر گئے۔

قاسم بن حسنؓ، تیرہ سال کے بچے اور ام فروہ کی یادگار تھے۔ امام ایسے کسی بچے کو اذن جہاد دینا نہ چاہتے تھے مگر روز قربانی معین ہو چکا تھا۔ پھر حضرت قاسمؓ کو بیوہ حسنؓ حضرت ام فروہ خود لے کر آئی تھیں اور بڑے بھائی کی وصیت بھی موجود تھی۔ امام مجبور ہو گئے۔

فاطمہ کبریٰ سے حضرت قاسمؓ کا عقد کتنا ہی اختلافی کیوں نہ ہو لیکن قرین عقل ہے آل رسولؐ سے امت کا غناذ یقیناً امام حسینؓ کے پیش نظر ہوگا لہذا آپؐ نے کسی بچی کو ناکتہ نہیں چھوڑا۔ قاسمؓ کو دہلانا کہ فاطمہ سے منسلک کر دیا، پھر ایک رات کے سایے کو میدان میں بھیج دیا۔

امامؓ کی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ کسی دد شیرہ کو وہ اس طرح چھوڑ گئے تو رسولؐ کے دشمن نہ جانے کس کس طرح مطعون کریں — وہی ہوا کہ کچھ اور نہیں ملا تو سکینہؓ بت حبشین کا افسانہ گھڑ لیا گیا اور نام کی مماثلت کا فائدہ اٹھا کر تین چار سال کی بچی کو افسانوں کی پلٹی میں لے لیا گیا۔

قاسمؓ در و قدامت کے لحاظ سے بھی چھوٹے تھے۔ امامؓ نے امام حسنؓ کا علم سر پر باندھا۔ فاطمہؓ زہراؓ کے رد مال کا بازو بند بنایا اور گود میں اٹھا کر خود گھوڑے پر بٹھایا — یہ ایک طنز تھا شجاعان روزگار پر کہ وقت پڑنے پر پیغمبر اسلامؐ کی اولاد اس طرح بھی رزم گاہ میں جاتی ہے اور میدان میں پہنچ کر بساط شجاعت پر

جھنڈے گاڑ دیتی ہے۔ قاسم کے رجز میں ایک انفرادیت ہے۔
 ”وہ اُسے مقابلے پر جس کو اپنی بہادری کا زعم ہو۔۔۔ آج کی فتح و شکست
 حق و باطل کی میزان ہے!“

کس نے اپنے نے خود لڑنا تو درکنار، دُور سے کسی جنگ کا منظر بھی نہ دیکھا تھا۔
 مگر بھڑیلوں کے اس جنگل میں اس کے تیور بتا رہے کہ وہ اسد اللہ کا پوتا ہے
 ارزق شامی مقابلے پر آیا، اس اعلان کے ساتھ کہ بازو پکڑ کر گھوڑے سے اُتار لے
 گا لیکن خیر مشکن کی روایات قاسم کے ساتھ تھیں۔ ایک ہزار سواروں پر بھاری شہو
 مقابلے کو غار سمجھتا تھا، اس نے اپنے بیٹے کو آگے بڑھا دیا۔ نیزہ بازی کے رد و بدل
 میں اس کا خود سر سے گر گیا۔ قاسم نے سر کے بال پکڑ کر اس کو گھوڑے سے کھینچ لیا اور
 زمین پر پٹک دیا۔

ارزق نے دعویٰ کیا، قاسم نے کر دکھایا اور ارزق کے دوسرے بیٹے کی طرف متوجہ
 ہو گئے جو بھائی کا بدلہ لینے کے لئے آگیا تھا۔ قاسم نے نیزے کے پہلے ہی دار میں اس
 کو بھی فی النار کیا۔ تیسرا بھائی مقابل ہوا تو قاسم نے اس کے پیٹ میں نیزہ گھونپ دیا۔
 اسی طرح چوتھے کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور ارزق کی طرف دیکھ کر اس کو سامنے آنے
 کی دعوت دی۔

چار بیٹوں کی موت نے نیا ارزق کی لٹکا ہوں میں تیرہ دن کر دی تھی وہ غصے میں
 پاگل ہو رہا تھا۔ گینڈے کی طرح دوڑ کر قاسم پر حملہ آور ہوا۔ تین روز کا بھوکا پیاسا
 بچہ، ابھی چار آدمیوں سے لڑ چکا تھا، کچھ پیچھے ہٹا مگر ارزق کا نیزہ گھوڑے کے پیٹ
 میں گھس گیا۔ قاسم بڑی تیزی سے زمین پر کود پڑے۔

حضرت عباس ابن علیؓ دُور سے دیکھ رہے تھے آپ بسرعت دوسرا گھوڑا لے
 کر پہنچ گئے اور مقابلہ پھر شروع ہو گیا۔ جہانمیدہ اور جنگ آزمودہ ارزق یا تو
 مقابلے کو اپنے لئے ننگ سمجھتا تھا یا اس کو جان بچانا مشکل ہو گیا اور آخر تلوار کے
 ایک اُڑے وار سے اس کا سر گردن سے کٹ کر دُور جا گیا۔ قاسم اس سر کو لے کر فاتحانہ

واپس ہوئے اور ماں اور چھو بھئیوں سے مل کر پھر میدان میں آگئے۔
اب کی دہی ہوا جو دوسروں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ کوئی مقابلے کے لئے نہیں نکلا
شہزادے کو خود حملہ کرنا پڑا اور آپ کی تیغ برق رفتار نے ستر بہتر لاشیں گرا دیں مگر
خود بھی جسم پر تائیس زخم کھائے۔ آپ فوج میں گھستے چلے جا رہے تھے کہ شیف بن
سعد نے پشت سے نیزہ مارا، آپ منہ کے بل زمین پر آ رہے اور آواز دی۔

”چچا — خبر لیجئے!“

امام حسین حضرت عباسؓ کو لے کر چھپے۔ سوار بھاگے اور قائم کی لاش کھوڑوں
کے سموں سے پامال ہو گئی۔ امامؓ نے جسم کے ٹکڑوں کو ایک چادر میں سمیٹا اور ایک
چھوٹا سا گھوڑے پر چلے۔ اُم فروہ نے دیکھا تو چیخ مار کر گر پڑیں۔
”میرا قائم اتنا چھوٹا تو نہ تھا —!“

احمد بن حسن باپ کی شبیہ تھے۔ آپ نے میدان میں پہنچ کر جڑ پڑھا اور
پڑھتے پڑھتے حملہ کر دیا۔ کبھی میمنے پر کبھی میسرے پر حملہ آور ہوئے۔ انہی بہادروں
کو موت کے گھاٹ اتار کر شکر کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور پکا کر پھر جڑ پڑھا۔
”جس کے دل میں حوصلہ ہو وہ آجائے، ورنہ میرے بعد لاف زنی کیگڑ کی
آواز ہوگی —!“

لیکن کون مقابلے پر آتا۔ اب تک جو بھی آیا تھا۔ زندہ سلامت واپس نہیں گیا تھا
جواب میں ہمیشہ پھیلوں کی یلغار ہوتی تھی۔ شہزادے پر دو ہزار سواروں نے حملہ کر
دیا۔ آپ نے مزید ساٹھ سواروں کو جنہم کا راستہ دکھا دیا اور خود زخموں سے چور چور
ہو گئے۔ تیروں کی بوجھدار اس پر مستزاد تھی۔ انجام کار گھوڑے سے گر گئے۔ امامؓ آواز
سن کر آئے اور لاش اٹھالے گئے۔

ابوبکر بن حسن کی والدہ گرامی کا نام اُم اسحق تھا۔ آپ کو شاید لڑنے کی مہلت ہی
نہیں ملی۔ عبداللہ بن عقبہ نے دُور ہی سے زہر آلود تیر کا نشانہ بنایا اور آپ شہید ہو
گئے۔ — ایک اور نام بشیر بن حسن کا بھی مقابلے میں ملتا ہے۔

حسن شنی بن حسن نے بھی رزم گاہ میں پہنچتے ہی شیرازہ حملہ کیا۔ نیکتر کو فیر کر قتل کیا
 اٹھارہ زخم کھائے مگر خون زیادہ نکل جانے کے سبب گر کر بیہوش ہو گئے۔ امام حسین آپ
 کو مردہ سمجھ کر اٹھالے گئے اور شہدار میں لٹا دیا۔ اس دن اتنی جہالت نہ تھی کہ کوئی کسی پر توجہ
 کر سکتا۔ دو مسکند جب شہیدوں کے سر کاٹے جانے لگے تو آپ کو زندہ پایا گیا اور آپ
 کے ماموں اسماعیل بن خارجہ نے عمر سعد سے کہہ کر آپ کو بچا لیا۔

کہا جاتا ہے کہ امام حسن کے سات بیٹے کربلا میں موجود تھے۔ ساتویں کا نام عمر
 بن حسن تھا جو امیروں میں شامل ہوئے۔ شہیدوں کی تفصیل میں ایک ترتیب
 سے مسلم، عقیل، عبداللہ بن جعفر اور حسن کی اولاد ملتی ہے مجسوس ہوتا ہے کہ نسلوں کے
 اعتبار سے یہ افراد لڑنے گئے۔ عقیدے کی آنکھ سے دیکھا جائے تو کوئی استعجاب
 باقی نہیں رہتا۔ قربانی اہل رسول کا دن تھا۔ بارگاہِ احدیت میں جانوں کا تذکرہ پیش
 کرنا ہی تھا اور کسی کو بچ کر جانا نہیں تھا تو آپ وجد کے آہنگ کو ملحوظ رکھ کر میدان
 داری کی گئی اور شہادت کے درجات پیش کئے گئے۔ امام حسن کی اولاد کے بعد علی
 کے بیٹوں کی باری آئی اور بچوں کو بھیج کر بڑے اپنی جانوں کی پیش کش کے لئے آگے
 بڑھے۔ تقدیم ابو بکر بن علی نے کی۔

ابو بکر بن علی کا حملہ بھی یاد گار عصر ہے۔ آپ جس طرف جاتے سپاہِ شام بھیروں
 اور بکریوں کی طرح بھاگنے لگتی۔ وہ لاشوں پر لاشیں گراتے ہوئے بڑھتے رہے۔ عبداللہ
 بن عقبہ اور زجر بن بدر لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے موقع پاکر نیزے کھینچ مارے اور
 آپ شہادت پر فائز ہو گئے۔

عبداللہ بن علی، ام البنین کے ۲۵ سالہ بیٹے تھے۔ آپ نے رزم گاہ میں جا کر
 صفوفِ اشقیاء کے سامنے نیزہ گاڑ دیا اور رتبہ پڑھا۔

”ماں اور باپ دونوں طرف سے شجاعت کا وارث ہوں۔ کوئی ہے
 جس کو اپنی شجاعت پر ناز ہو؟“

لیکن جان کس کو عزیز نہیں تھی جو مطالبے پر اتنا۔ عبداللہ نے گھوڑا دوڑایا اور

”عمر سعد، ہوشیار — عمرو بن عبدود کے قاتل کا بیٹا آرہا ہے!“
 شکر میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ عبداللہ نے حملہ کیا اور اس میدان تک پہنچ گئے جہاں عمرو بن سعد کا خیمہ نصب تھا۔ یزیدی لشکر سیراہ ہو گیا کہ آپ کو عمر تک پہنچنے نہ دے۔ عبداللہ کی خارا شکاف شمشیر بجلی کی طرح کوٹک کوٹک کر گرتی رہی اور سر ہوائیں اڑاؤ کر زمین پر آتے رہے۔ ایک سو چوالیس لاشیں چہار جانب بکھر گئیں عمر سعد پشت خیمہ چاک کر کے نکلا کہ راہ فرار اختیار کرے۔ اس اٹار میں ہانی بن شہیت نے آپ پر نیزے کا وار کر دیا۔ اُن گنت زخم پہلے ہی کھا چکے تھے۔ گھوڑے سے گر گئے اور شہدِ ارحم میں ایک گراں قدر اضافہ ہو گیا۔

عثمان بن علی، حضرت عباسؓ کے ۴۳ سالہ بھائی تھے۔ آپ کے مقابلے پر کبھی کو آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آپ نے دشمن کے میمنے پر حملہ کر دیا۔ علیؓ کے بیٹے تھے تلوار آپ سے مانوس تھی۔ اشارے پر کام کر رہی تھی۔ دشمن بھاگ رہے تھے اور کٹ کٹ کر گرتے جا رہے تھے۔ حضرت عباسؓ آپ کو پکار کر کہہ رہے تھے۔
 ”فوجوں میں گھسنے چلے جاؤ۔“

مقصد شاید فتح نہیں تھا بلکہ صرف شامیوں کا خون بہانا تھا۔ آپ بڑے بھائی کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے، جدھر بڑھتے تھے، دونوں جانب لاشیں بکھرتے چلے جا رہے تھے۔ جسم تیروں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ ہانی کا ایک تیر بنیانی پر آکر لگا اور آپ سنبھلا نہ گیا۔ گھوڑے سے گرے اور لاشِ امام اٹھا کر لے گئے۔

جعفر بن علی کی عمر ۲۱ سال تھی۔ حضرت عباسؓ کے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ آپ نے میدان میں آتے ہی عثمانؓ کے قاتل کو لٹکایا۔
 ”کہاں ہے ہانی، دھوکے سے میرے بھائی کو مارا۔“ خفہ می کے صحیح نطق سے ہے تو اگر مقابلہ کر۔“

فوجِ دہشت میں کانپ رہی تھی۔ ہانی چھپتا پھر رہا تھا۔ لوگوں نے اس کو دھکیل

کر مقابلے پر بھیج دیا مگر وہ سانس بھی نہ لے سکا؟ ایک ہی داریں جہنم واصل ہو گیا۔ اس سے فرغت پا کر عباس کے بھائی نے قلب پر لیٹا رکھی۔ ایک آدمی سیکڑوں پر موت کے طوفان کی طرح چھا گیا۔ خولی کے تیرنے آپ کے لئے ملک الموت کا کام کیا اور آپ زمین پر گر گئے۔

عون بن علی، اسماء بنت عیس کے لطن سے تھے۔ آپ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔ ”صبح سے اب تک جو تم نے نہیں دیکھا ہوگا، وہ دکھانے آیا ہوں۔“ اُسے ہی آپ گھوڑا اڑا کر قلب لشکر میں دھس گئے پھر مہینے اور میرے دونوں کو درہم بہم کر دیا۔ اس اثناء میں دو ہزار آہن پوشوں کی دیوار آپ کے چاروں طرف کھڑی ہو گئی، مگر علی کا بیٹا تو ایک دفعہ موت کے گھرے کو بھی توڑ سکتا تھا۔ آپ نے اس دیوار سیاہ کے پرچے اڑا دیئے۔ زخمی دور دور تک پڑے ہوئے تھے۔ بعض خاموش تھے۔ بعض کراہ رہے تھے۔

عون سلام آخر کے لئے خدمت امام میں حاضر ہوئے۔ شاید پوچھنے آئے ہوں۔ ”مولیٰ کیسی جنگ کی میں نے۔“ مولیٰ کا جواب یہی ہو سکتا۔ ”بیٹے کس کے ہو۔ تم سے اسی کی توقع تھی؟“ قدم بوی کر کے آپ پھر بیٹے۔

ابن زیاد نے یزید کے حکم پر بڑا التزام کیا تھا۔ بصرہ، عراق و شام ہر جگہ شہزاد پہلوان اور تیغ زن اکٹھا کر کے کربلا بھیجے تھے۔ ان میں صالح بن سیار اور بدر بن سیار بھی تھے۔ عمر سعد نے پہلے بڑے بھائی صالح کو بھیجا جو سامنے پہنچتے ہی موت کا نوالہ بن گیا، پھر بدر مقابلے پر آیا۔ فاتح بدر و حنین کے بیٹے کے لئے یہ سب نرم چارہ تھے کٹ کر رہ گئے اور عون کی تلوار پھر فوجوں کے پروں کو پرانگندہ کرنے لگی مگر تاباں کے؟ آخر وہی شاطر نے بساط پچھ گئی۔ کہیں گاہوں سے تیر، نیزہ اور تلوار کے دار، خون کے فوارے عون کے جسم سے نکل رہے تھے اور سر کٹ کٹ کر گر رہے تھے شاید میوں کے۔ ایسے میں خالد بن طلحہ نے پہلو سے وار کیا اور عون کا رمی ضرب کی تاب نہ لا سکے۔ گھوڑے سے گرے اور سید الشہداء لاش اٹھا کر لے گئے۔

عمر بن علی بڑے شجاع عابد و زاہد تھے۔ میدان میں آئے تو انفرادی مقابلہ کسی نے نہیں کیا۔ آپ خود فوج پر حملہ آور ہوئے۔ دیکھنے والوں کو شبہ ہو رہا تھا کہ علی صفین میں لڑ رہے ہیں۔ فوج بھاگی تو اکثر سواروں کی جنگ میں تھی مگر عمر کی جنگ میں بھاگتی چلی گئی اور آپ نے تعاقب نہ چھوڑا کسی مقام پر شاید گھوڑے سے گر گئے۔ سید الشہداء آپ کی لاش اٹھانہ سکے۔

حضرت ابو الفضل العباس کا نام ہی اپنا تعارف ہے۔ آپ کی ذات گرامی زہد تقویٰ و فادہ شجاعت کا علامہ ہے، عبد الصالح، ستائے حرم اور فاتح فرات کے القاب کے ساتھ پرچم اسلام کی دوامی نسبت آپ کا طرہ امتیاز ہے۔ یوں تو تاریخ کربلا میں سپاہ اسلام کا ہر نام حشر تک درخشاں و تابندہ رہے گا لیکن رسول کے نواسے کے بعد جس سوار کے کردار پر ہمیشہ کی مہر لگی ہے وہ ابو الفضل العباس ابن امیر المؤمنین قافۃ اہل بیت کے مدینے سے کربلا پہنچنے تک ہر قدم پر عباس، نشیب و فراز کے مراحل میں ہر موڑ پر عباس، صلح و جنگ کی ہر مشورت میں عباس، خلوت کے اسرار اور جلوت کے افکار میں عباس، رسول کی زندگی میں جو حیثیت علی کی تھی، کربلا میں اس اسی منصب پر فائز تھے۔

بس چلتا تو عباس جنگ کربلا کا افتتاح اپنی تیغ آبدار سے کرتے مگر امام حسین نے علمداری کی زنجیر ڈال دی تھی۔ آپ ایسے ہر موقع پر ہمک ہمک کر رہتے اور مرضی امام دیکھ کر سسک سسک کر خاموش ہو جاتے لیکن شہادت النصار کا خون باب بند ہو جانے کے بعد، جب اقدام بنی ہاشم کا آغاز ہوا اور اولاد رسول کی قربانی شروع ہونے کا وقت آیا تو امام نے حضرت علی اکبر سے فرمایا۔

”تقدم ولدی“ — ”بڑھو میرے لال اور میدان میں سبقت کرو“

اس موقع پر عباس اپنے کور وک نہ سکے — اب تک تو اصحاب موجود تھے مسلم ابن عسجر، بریر ابن خضیر، عباس ابن شیبہ شاکری اور حبیب ابن مظاہر جن کی عمریں سو سال کو چھوڑ دی تھیں اور جنہوں نے رسول اکرم، امیر المؤمنین اور امام حسین

سب کے درباروں میں عزت پائی تھی۔ عباس ان کے سامنے کھڑے بھی ہوتے تو نہایت ادب سے، بات کرتے تو نگاہیں جھکا کر مگر اب امام عالی مقام کے علاوہ سب ہی تو چھوٹے تھے، عباس کی گودوں کے کھلائے ہوئے دین حرب سکھائے ہوئے اور ان میں بھی امام اس سے جانے کو کہہ رہے تھے جو عباس کی آنکھوں کا نور اور دل کی روشنی تھا۔

گستاخی کا سوال تو عباس کے لئے پیدا ہی نہیں ہوتا، وہ تو جہاد بھی نہ کر سکتے البتہ آپ نے ابدیدہ ہو کر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”غلام موجود ہے — اور شہزادہ رزم گاہ میں جائے!“

”نہیں، عباس — اکبر کو نانا کی نمائندگی کرنے دو۔“ امام چند لفظوں میں سب کچھ کہ گئے۔ عباس امام تو نہ تھے مگر نصیحت شناس امامت ضرور تھے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ سجادہ نشین رسالت کیا کہہ رہا ہے۔ محسوسات میں ایک تلاطم تھا۔ جذبات میں مد و جزر کی کیفیت تھی مگر شعور عباس نے ہر اندرونی طوفان کو دبایا اور بے چارگی میں سر جھکا کر رہ گئے۔

اب صرف حسین رہ گئے تھے اور عباس — اور کہا جاسکتا ہے کہ خیمہ گاہ میں کل کا امام اور شریک کار امامت جناب زینب!

خیچے کے باہر تنہا حسین تھے جو صبح سے اب تک بار شہادت اٹھائے اٹھائے تھک چکے تھے۔ عباس کا زور چلتا تو پہلے ہی سارے بنی ہاشم کو لے کر بھڑوں کے گلے پر ہل بول دیتے، کیا طاقت تھی بزدل اکثریت کی جو ان شجاعانِ روزگار کا متحدہ بار برداشت کر سکتی لیکن امام کی مرضی اور مصلحت ابتداء ہی سے یہی تھی کہ لڑائی کو طویل سے طویل تر بنایا جائے۔ شاید کسی لمحہ کوئی ٹرڈ و زخ کی آپخ سے بچ کر ادھر آجائے یا شاید اللہ ان ظالموں کو یہ توفیق و دیخت کر دے کہ نبیؐ کے نواسے کا خون کرنے سے باز آجائیں۔ اسی لئے آپ ایک ایک کو بھیجتے رہے۔ جنگی زاویہ نگاہ سے یہ طریقہ صحیح نہ تھا لیکن آپ منصب امامت پر کھڑے ہو کر سوچ رہے تھے اور عباس ایک فنکارِ حرب کی حیثیت سے۔

عباس کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ امائم کے پشتِ پناہ بن کر لڑتے اور امائم کو تنہا چھوڑ کر نہ جاتے مگر ہادیانہ لائحہ عمل کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس لئے آپ نے اس وقت اور تو کچھ نہیں کہا البتہ دستِ بستمہ اجازت خواہ ہو گئے۔

”مولیٰ، اب مجھے اجازت ہو۔۔۔“

”تم تو لشکر کے سپہ سالار ہو۔۔۔“ امائم کے پاس کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں پھر بھی کہا۔

”مگر۔۔۔ اب وہ لشکر کہاں ہے مولیٰ؟“

امائم کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آپ نے قدرے توقف سے رفیقِ بارِ شہادت کو رزم گاہ کی اجازت دے دی اور کہا۔

”ہو سکے تو بچوں کے لئے پانی کی کوئی سبیل کرنا۔۔۔“

یہ اشارہ تھا سکینہ کو راضی کرنے کا۔۔۔ بہت مانوس سخی حسین کی بیٹی اپنے چچا سے۔ امائم جانتے تھے کہ عباس اس کو روتا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ عباس سے بھی یہ حقیقت چھپی نہ تھی خیموں میں جا کر آپ ایک ایک سے ملے۔ بیوی کو پہلے ہی بچھا چکے تھے۔ اس وقت پھر الوداعی ملاقات کی۔ سب کے آخر میں جنابِ ام کلثوم اور جنابِ زینب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

بہنوں کو بڑا ناز تھا اس بھائی پر۔ وہ کسی طرح عباس کے جانے پر راضی نہ ہوتیں لیکن صبح سے اب تک جو کچھ دیکھا تھا اس سے تقدیر کا نوشتہ سمجھ میں آ گیا تھا، پھر عباس کے بادوں کی طاقت سے یالوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن پھوٹی کہ شاید عباس کے جانے سے حسین بچ جائیں۔

یزید کا شکر اُدھا نہیں تو ایک تہائی ضرور کٹ چکا تھا۔ ایک تن تنہا سے باقی لشکر کو شکست کھا جانے کا یقین تو نہیں کیا جاسکتا لیکن خیرِ شکن کے بیٹے سے کچھ بعید بھی نہ تھا لہذا ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ملا اور زینب نے گرفتہ آواز میں کہا۔

”جاؤ بھیا، تم بھی جاؤ۔۔۔ بہن اپنے مقدر پر شاکر ہے؟“

سیکنہ قریب کھڑی ہوئی تھی۔ عباسؑ نے اس کو گود میں اٹھایا اور پیار کرتے ہوئے کہا
”جاؤ اپنی مشک لے آؤ۔۔۔ پانی لانے کی کوشش کروں گا!“

سیکنہ کو تکلف تھا مگر پیاس کی شدت نے سہارا دلایا کہ شاید چچا پانی لے ہی آئیں
دنیا کا کوئی آدمی جو کام نہ کر سکتا، سیکنہ کے نزدیک چچا عباسؑ وہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ
۸ محرم کو تھوڑا پانی لے ہی آئے تھے۔۔۔ سیکنہ نے مشک لا کر دے دی اور عباسؑ
اس کو گود میں لئے ہوئے باہر آ گئے۔

عقیدے کی روشنی میں یہ بات صرف نظر نہیں کی جاسکتی کہ عباسؑ کو لڑنے کے بجائے
صرف پانی لانے کے لئے بھیجا گیا تھا کیونکہ عباسؑ کی شجاعت پر بے شک کو شک تھینے
کی ضمانت بن سکتی۔ امام کا یہ انداز فکر اپنی جگہ پر ہے کیونکہ آپؑ نے انصارِ دینی ہاشم کو
لے کر ایک ساتھ حملہ نہیں کیا کہ اُمت کٹ نہ جائے یہ مصلحت بھی قرین تیاں ہے کہ
عباسؑ پانی لانے میں کامیاب ہو جائیں تو کچھ وقت ان ملائین کو سوچنے کا اور مل
جائے۔ امام دراصل ان بچے ہوئے لوگوں کے ذہنوں اور ضمیروں سے جنگ کر رہے
تھے۔ وہ ایک ایسی لڑائی لڑ رہے تھے جو دلوں کو سحر کر لیتی ہے۔ تلوار تو ضرورت کے
تحت نیچ میں آگئی تھی۔

عون بن علیؑ کی شہادت کے بعد کوئی لڑنے کے لئے نہیں کیا گیا تو عمر سعدؑ اور
اس کے بد باطن ساتھیوں نے اس کو کمزوری پر حملہ کیا اور خیمہ گاہ حسینیؑ کی طرف بڑھ گئے
ابو الفضل العباسؑ نے سیکنہ کو گود سے اتار کر خیمے میں بھیجا اور تعجیل گھوڑے
پر سوار ہو کر ایک نعرہ شہر انداز کیا۔

”بے دینو! میری زندگی میں اتنی جسارت۔۔۔!“

آپؑ نے گھوڑے کو اتنا تیز دوڑایا کہ بزدلوں کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ گئیں
وہ بے تحاشا بھاگنے لگے۔ عباسؑ ان کے تعاقب میں دوڑ تک چلے گئے۔ عمر سعدؑ نے
ایک نامی پہلوان مارِ دین صلیف کو آگے بڑھایا۔ اس نے غرور میں لشکریوں کو پیچھے
ہٹا دیا۔ عباسؑ کے مقابل آگیا اور بولا۔

”میں ماردا بن حدیف ہوں —“

”میں علی ابن ابی طالب کا بیٹا ہوں —“ عباس نے پورے جاہ و جلال کے ساتھ جواب دیا۔ تلوار آپ کے ہاتھ میں تھی۔ ماردا بولا ”اصول حرب کے لحاظ سے پہلے نیزہ بازی کروں گا۔“

آپ نے تلوار نیام میں رکھ لی اور خالی ہاتھ کھڑے ہو گئے۔ ماردا نے نیزہ مارا آپ نے ایک طرف ہٹ کر نیزے کو خالی دیا۔ پھر بڑی سرعت سے پہلو میں آئے نیزہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور گھوڑے پر دار کیا۔ وہ اچھلا اور ماردا زمین پر گر گیا۔ اس کا جمشی غلام شمر کے اشارے پر دوسرا گھوڑا لے کر آیا۔ حضرت عباس نے نیزے سے غلام کو ہلاک کر کے خود اس کے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور فوراً نیزے کا دار کر کے ماردا کو جہنم پہنچا دیا۔

ماردا کے پانچ سو آدمی حضرت عباس پر ٹوٹ پڑے۔ آپ نے ۲۱ کو قتل کر دیا، ۸۰ بھاگ گئے پھر آپ اسی گھوڑے کو لے کر امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ وہی گھوڑا تھا جس کو بد بختوں نے مدائن میں امام حسن سے چھینا تھا۔

ابوالفضل العباس ایک بار پھر رخصت کے لئے خیمے تشریف لے گئے۔ اس وقفے میں ناری امام کو تنہا پا کر حملہ آور ہو گئے۔ حضرت عباس آواز سن کر باہر آ گئے اور تلوار کھینچ کر پل پڑے۔ اس مرتبہ بھی آپ نے ۳۸ آدمی مارے، باقی فرار ہو گئے اب حضرت عباس اپنی آخری مہم پر روانہ ہوئے۔ صبح سے اب تک

ہر قدم پر امام کے ساتھ رہے تھے لیکن احساسِ فرض کی شدت کے باعث چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہ تھے۔ آپ دیسے ہی مردانہ تیوروں سے بڑھ رہے تھے جو فرزندِ علیؑ کے شایانِ شان تھے۔ آپ کا رخ نہر کی طرف تھا۔ فوجیں راستے میں حائل ہوئیں مگر کس میں دم تھا جو راستہ روکتا۔ دوچار جگہ کچھ رکاوٹ ہوئی تو شمشیرِ خارا شگاف نے دور کر دی اور آپ نہر پہنچ گئے۔ عمرو بن جراح محافظِ فرات سے آپ کا سخت کالمہ ہوا اور آپ گھوڑے کو اڑا کر شکر پر گرے گیا ان پر تہر الہی ٹوٹ پڑا۔ ساحلِ فرات

پر عباس غازی کی جنگ ہر دور کے بہادروں کے لئے ایک للکار رہے گی کہ اکیلا مرد ایسی بھی جنگ کرتا ہے کہ دریا کنارے خون کی ندیاں بہا دے اور سروں کو گیندوں کی طرح اڑا اڑا کر زمین پر بکھرا دے۔ تین سو سوار موت کے گھاٹ اتر گئے۔ باقی اس طرح بھاگے کہ دریا پر پہرہ داروں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

اب موجیں مارتا ہوا دریا نے فرات تھا اور عباس غازی۔ آپ نے چلوں پانی لے کر اچھالا۔ پیاسے شہید ضرور یاد آئے ہوں گے اور شاید انہیں کے ناموں کا پانی عباس نے دریا سے لے کر دریا ہی میں پھینک دیا، پھر سکیٹہ کی مشک بھری اور پیاسے ہی دریا سے نکل آئے۔

اس دوران عمر سعد نے فوجوں کو سمیٹ کر راستہ بند کر دیا۔ آپ کے دوست پر پانی سے بھری ہوئی مشک، بایں ہاتھ میں علم، دلہنے ہاتھ میں آبی ہوئی تلوار تھی اور مرکب صبار و فتاریزی سے دوڑ رہا تھا۔ شام کے بڑی دل روباہ دیوار بنے کھڑے تھے مگر ان میں شکاف پڑ گیا۔ گھوڑا آگے بڑھتا ہوا شیر اس دقت سخت آزمائش میں تھا۔ نیزوں اور تلواروں کا جواب دے یا ان تیروں کو تلوار سے کاٹے جو چاروں طرف سے نگاتا رہا برس رہے تھے۔ ایسے میں درارہ نامی ملعون نے ایک طرف سے دار کیا اور آپ کا دامن ہاتھ کٹ کر گر گیا۔ آپ نے مشک دوسرے کا ہڈے پر لے لی اور علم کو قائم رکھا لیکن نوفل ابن ارقم نے دوسرا ہاتھ قطع کر دیا، اب غازی نے مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا اور جھک کر اس کی حفاظت کرتا ہوا کہ ایک گزند آہنی سر پر پڑا۔ اسی اشارے میں ایک تیر مشک پر آکر لگا اور ستھائے سکیٹہ گھوڑے سے زمین پر آ رہا۔

اس جنگ سے یہ حقیقت اُمنہ ہو جاتی ہے کہ امام نے اپنے شیر کو پانی میں لے لیا تھا اور جتنا کہ وہ آزاد ہو کر جنگ نہ کر سکے۔

ایک نکتہ اور بھی ارباب دانش کو دعوت فکر دیتا ہے کہ اگر کہ بلا کی جنگ کا انجام حسین کے حق میں ہوتا تو اس کا نتیجہ اتنا ہی نکل سکتا تھا کہ فاتحین عالم میں ایک جلی نام

کا اضافہ ہو جاتا لیکن حسین کی خدا شناس امامت کی دھجیاں بکھر جاتیں۔ ظالم اگر مظلوم نہ بن سکتا تو اس کے ظلم پر پردے ضرور پڑ جاتے بلکہ سیح تویہ ہے کہ یزداں اور اہرمن ایک سطح پر آ جاتے مگر حسین کی عظمت کو ہزاروں سلام۔ آپ نے حفاظت جان و آبرو کا شرعی فریضہ تو انجام دیا لیکن مادیت اور روحانیت کی جنگ کا امتیاز قیامت تک کے لئے باقی رکھا۔

عباسؑ کی شہادت دوسرے بہادروں کی شہادت نہ تھی بلکہ اتنی اہم تھی کہ اس کے بعد فاطمہؑ کا لال بالکل اکیلا رہ گیا — امام حسینؑ عباسؑ کی لاش پر پہنچے ضرور مگر اب ان میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ ۳۵ سالہ بھائی کی میت تنہا اٹھا سکتے۔ آپ ستھوڑی دیر تک تو عباسؑ کے سر ہلنے بیٹھے روتے رہے پھر شرک و ظلم لے کر خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

چہیتی بھتیجی چچا کو نہ پا کر یک یک کر روئی لیکن امامؑ نے اس کو سینے سے لگا کر اور تیلیاں دے کر وقتی طور پر چپ کر دیا کیونکہ اس کے بعد تو رونا ہی رونا تھا۔

مظلوم کر بلا

اب اکیلے امامؑ تھے اور جو طرہ مصیبتوں کی یلغار، پھر بھی آپؑ نے فرائضِ امامت انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ ایک بلند ناقہ پر سوار ہو کر شکر کے سامنے آئے اور آوازِ استغاثہ بلند کی۔

”ہے کوئی تم میں سے جو میری نصرت کرے — ہے کوئی جو حرمِ رسولؐ کی خدمت کرے“

کوئی جواب نہ پایا کہ آپؑ خیمے میں واپس آئے حضرت زین العابدینؑ آپؑ کے استغاثہ پر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور تلوارِ میک کر باہر جانے کو تیار تھے۔ آپؑ نے انہیں روک کر ٹٹا دیا اور بہت دیر تک دھیرے دھیرے کچھ کہتے رہے پھر آپؑ نے جنابِ زینبؑ سے وہ کمر تالپ کیا جو غمِ رسیدہ ماں نے آج کے لئے سی کر رکھا تھا۔ آپؑ نے اُسے زینبؑ تن کیا اور اوپر سے زرہ پہن لی، پھر تمام بیبیوں کو درخیمہ تک دو روہی کھڑا کیا اور آپؑ ایک ایک سے ملتے ہوئے باہر تک آ گئے — جنابِ فاطمہؑ نے اس موقع پر گرش کر لیا۔

”اصغر نے آپ کی آواز پر اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے۔“
 امام نے چھ ماہ کے بچے کو منگوایا اور ایک بلندی پر پہنچ کر فوجِ اشتیاق کو مخاطب کیا۔
 ”بچے کی ماں کا دودھ پیاس میں خشک ہو گیا ہے۔ تم بھی صاحبِ اولاد ہو
 اس کو ایک گھونٹ پانی پلا دو!“

آپ نے بچے کا منہ ظالموں کی طرف کر دیا تاکہ وہ بھی اس کی حالت کو دیکھ لیں
 امام کے معصوم بچے نے زبان خشک ہونٹوں پر پھرائی اور اپنی پیاس کا یقین دلایا۔
 اس پر بے رحم سے بے رحم آدمی آنکھوں میں آنسو بھر لایا مگر نہ جانتے کس قدر سنگ دل
 تھا عمر ابن سعد، اس نے حرمہ کو اشارہ کیا کہ حسین کی بات کو کاٹ دے۔

یزید کے تیز انداز نے جلدی میں ایک تیز نکالاجوڑے پھل کا تھا۔ ظالم حرمہ
 نے بچے کی عمر کا لحاظ کئے بغیر تیرکیاں میں جوڑ کر چھوڑ دیا جو بچے کے گلو کو توڑتا ہوا
 سبطِ رسول کے بازو میں پیوست ہو گیا اور بچہ آپ کے ہاتھوں میں اُلٹ گیا۔

امام حسین کی یہ آخری قربانی تھی۔ آپ نے تیر بچے کے گلے سے نکال لیا۔ خون
 کا ایک فوارہ جاری ہوا۔ امام نے اس کو چلو میں لے کر منہ پر مل لیا۔ بچے کی لاش کو
 خیمہ گاہ کے قریب ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

اب امام ایک بار پھر سب سے ملے اور گھوڑے پر بیٹھنے کے لئے باہر نکلے تو ماں کی
 قائم مقام خبابِ فہمہ گھوڑے کی نگام تھامے تھیں اور سیکٹہ گھوڑے کے اگلے پاؤں سے
 لپٹی کہہ رہی تھی۔

”گھوڑے، میرے بابا کو میدان میں نہ لے جا۔“

آپ نے بڑے پیار سے سیکٹہ کو الگ کیا تو سیکٹہ نے دامن تنہا لیا۔

”جو بھی گیا، پلٹ کر نہیں آیا، میں آپ کو جانے نہ دوں گی۔“

امام نے بہت سمجھایا، مگر سیکٹہ نے دامن نہ چھوڑا۔ بائے رے ایک باپ کی بیچاریگی
 فرض اپنی طرف بگڑ رہا تھا اور بیٹی دامن چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ علی نے ایک ہاتھ
 سے خیمہ اکھاڑ لیا تھا مگر بیٹی کے ہاتھ سے دامن چھڑانا صرف حسین کا کام تھا۔ اس

کے لئے حسین کی ہمت اور حسین کا کلیجہ درکار تھا۔ آپ نے بچی کو گود میں اٹھالیا دیر تک پیار کرتے رہے بچی نے کہا۔

”آپ جاتے ہیں تو مجھے بھی لے چلیں۔“

”پہنچتے ہی بلوالوں کا ہتھیں۔“ امام نے وعدہ کر لیا۔ بچی کو تسکین ہو گئی اور وہ پھوپھی کی گود میں چلی گئی۔

امام علیہ السلام نے ایک آخری بار اہل بیت اطہار اور اماں فتنہ کو سلام کیا اور گھوڑے کو میدان کی طرف بڑھا دیا۔

”تیس رسول کا نواسہ ہوں، علی کا بیٹا ہوں اور وقت کا امام ہوں۔“
 رجز پڑھتے ہوئے آپ صفوف اعداء کے مقابل پہنچے اور ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس کے آخر میں کہا

”میرا سمتہ چھوڑ دو، میں ناموس رسول، یواؤں اور تیریں کو لے کر نانا کے مزار پر چلا جاؤں۔“

جواب طعن و طنز سے ملا اور امام نے فرمایا۔

”اچھا ایک ایک آدمی مجھ سے آکر مقابلہ کرے۔“

پھر وہی مہلت دینے کی بات تھی ورنہ ایسے انصار اور اکبر و عباس کے بعد کس کے دل میں جینے کی تمنا ہوگی۔ عمر سعد نے اس کو منظور کر لیا اور شام کے مشہور جنگ آزما متیم بن قحطیہ کو مقابلے کے لئے بھیج دیا۔ امام نے سامنے پہنچتے ہی تلوار کا وار کیا اور اس کا سر درود جاگرا۔

جابر بن قاسم نے اس کی جگہ لینے کو تیار تھا۔ وہ لاف و کراف کرتا ہوا مقابلے پر آگیا اور آپ نے اس کو نیزے کی نوک پر دھریا۔ پیغمبر اسلام کا جانشین اور علی کی شجاعت کا موروثی حقدار ان گیدڑوں کو کب خاطر میں لانے والا تھا، اس نے تنواری ایک ضرب جو لگائی تو ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا۔ دوسرے وار نے اس کا کام تمام کر دیا۔

عمر سعد نے کئی پہلوؤں کو اسی وقت کے لئے محفوظ رکھا تھا۔ ان میں بدر نامی فنونِ حرب کا ماہر تھا۔ بدر نے اپنے ایک بیٹے کو اشارہ کیا۔ اٹام نے اس کے آتے ہی نیزے سے گر دیا۔ بیٹے کے قتل ہونے پر بدر خود بل کھاتا ہوا چلا۔ امام علیہ السلام نے اس کو موقع دیا اور وہ پے در پے نیزے کے وار کرتا رہا۔ اٹام نے ایک وار کو ٹھال پر روکتے ہوئے ڈھال کو جھٹکا دیا تو نیزے کی آئی ٹوٹ گئی۔ بدر نے تلوار ماری اٹام نے ڈھال کی حرکت سے تلوار کی دھار توڑ ڈالی۔ آخر اس بے حیائے ترکش سنبھالا، مگر امام کی تلوار سے سر سے ذینِ فرس تک دو ٹکڑے ہو گیا۔

فوج پر ایک دہشت طاری تھی۔ اب ایک کے بجائے دو دہل کر مقابلے پر آئے مگر ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ اس کے بعد دس دس کی ٹولیاں سامنے آئیں لیکن وہ بھی بے سر ہو گئیں۔ مجموعی طور پر ۹۵۰ آدمی علی کے بیٹے نے جہنم واصل کئے۔ شہر حلا اٹھا۔ ”عمر سعد کیا مصر و شام، عراق و عرب کے سب بہادروں کو کوٹا دے گا۔؟“ آخر عمر سعد نے بد عہدی کر کے پورے لشکر کو ٹوٹ پڑنے کا اشارہ کیا۔ اٹام نے ہاتھ سے سب کو روک کر عاشور کا دوسرا خطبہ دینا شروع کر دیا۔

”ایہا الناس! میں نے ایک ایک سے لڑنے کی پیش کش صرف اس لئے کی تھی کہ تمہیں اپنے سردار کی بد عہدی دکھا سکوں۔“

تقریر کے تسلسل میں آپ نے پھر اپنے تعارفی الفاظ استعمال کئے اور کہا۔

”اب تک تم نے میری مظلومیت دیکھی ہے، آدمیری شجاعت بھی دیکھ لو!“

کہاں ہیں روایتی اور افسانوی تاریخ کے ہیرو — کہاں ہیں ہندوستان کے ارجن، کہاں ہیں یورپ کے ہرکولیس، کہاں ہیں ایران کے رستم — ایں ادیکھیں کہ پیغمبرِ عرب کا نواسہ، تین روز کا بھوکا اور پیاسا، فرزدانِ شمشیر کے داغ اٹھائے دل پر بہتر زخم کھائے — ۵۶ سال کی عمر میں تین تنہا عراق و شام کی چالیس ہزار منتخب سپاہ کو لٹکار رہا ہے۔

کہاں ہیں قبلِ تاریخ کے شہرہ آفاق ہادی، بندر ابن کے کرشن گنہیا، اجودھیا کے

رام چندر، گی کے مہاتما گوتم، چین کے کنفیوشس، ایران کے سائرس، یونان کے سقراط — آئیں اور دیکھیں کہ اسماعیل ذبیح اللہ کا پوتا، شجاعان عصر انصار کا خون کرنے والوں — بادشاہ عیسیٰ اور کریل جوان بیٹے کے قاتلوں کو بھی معاف کرنے پر آمادہ ہے اور اس انسان نما درندے سے بھی درگزر کرنے پر تیار ہے جس نے چھ ماہ کے بچے پر تنہی دھار کا تیر چلایا تھا!

شرط صرف اتنی ہے کہ وہ انسانیت کا صحیح راستہ اختیار کر لیں — ہدایت کا یہ معیار دبیان عالم کو سکے میں ڈال دے گا اور وہ حیرت میں رہ جائیں گے کہ صبر و رضا کی کوئی منزل ایسی بھی ہوتی ہے!

یقیناً یہ رہنما رسول اسلام کے نائب برحق پر عقیدے کے پھول نچا کر کریں گے لیکن یزید کے لشکر میں شاید درندگی کی سطح سے بھی گر گئے تھے کہ ایک کمزور و ناتواں پر چالیس ہزار فوج نے دھاوا بول دیا۔ اٹام مظلوم نے آسمان کی طرف دیکھا پھر دایں بایں نظر ڈالی اور آواز دی۔

”کہاں ہیں حبیب ابن مظاہر، کہاں ہیں برہمہ دانی، کہاں ہیں زمہ ترین آئیں اور ایک پیاسے کی لڑائی دیکھیں!“

آپ نے ایک ایک کا نام لے کر پکارا، پھر نہر کی طرف نگاہ اٹھائی۔
 ”عباس! تم نے جیتے جی مجھے تلوار اٹھانے نہ دی — آج حیدر کی تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ آؤ، دیکھو، اس کی کاٹ میں کوئی فرق تو نہیں آیا —!“
 پھر آپ پھرے ہوئے شیر کی طرح لشکر اعدا پر ٹوٹ پڑے۔ علی کے ہاتھوں میں یہ تلوار جن حالات میں چلی تھی، وہ آج سے بالکل مختلف تھے — شاید اسی لئے اس کی برق رفتاری آج کچھ زائد ہو گئی تھی۔ تب ہی تو تھوڑی دیر میں ایک ہزار سو پچاس بے دینوں کی لاشیں گرادیں۔

فوج کئی بار بھاگتے بھاگتے گرنے کی سرحدوں سے جا ٹکرائی اور پھر دائرہ بناتی ہوئی واپس آگئی — چشم فلک نے ایسا رن کبھی دیکھا نہ ہو گا کہ تین روز کا پیاسا

اتنے بڑے لشکر پر حملہ کرے اور الامان والمحفوظ کی آوازیں بلند ہو جائیں۔ رٹتے رٹتے امام دریا تک پہنچ گئے۔ شہر ناہنجار کو گمانِ باطل ہوا کہ حسین پانی پی لیں گے اس نے ایک مکارانہ نعرہ لگایا۔
 ”حسین تمہارے خیمے لٹ رہے ہیں۔۔۔“

آپ نے اپنا رخ خیمہ گاہ کی طرف کر دیا۔ سپاہِ آپ کو دیکھتے ہی بھاگنے لگی۔ آپ نے خیمے میں جا کر رشد و ہدایت کے آخری فرائض انجام دیئے اور باہر آکر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ ابوالفضل العباس ہمیشہ لحامِ فرس تھام کر آپ کو گھوڑے پر بٹھاتے تھے۔ آج اماں فقہ اور بہن زینب نے رخصت کیا اور آپ اس عالم میں چلے جیسے ہوا کے دوش پر آپ کا جنازہ جارہا ہو۔

زینب ایک بلندی پر آکر کھڑی ہو گئیں وہ دیکھ رہی تھیں کہ آپ ایک سوار کو نیزے سے اٹھاتے اور دوسرے پر پھینک دیتے۔ تلوار داہنے ہاتھ میں آگ کے شعلے کی طرح گردش کر رہی تھی اور ناری ہر طرف جلتے جارہے تھے۔ جانوں کی امان کے لئے اکبر و عباس کا واسطہ دیتے مگر دشمنی سے باز نہ آتے۔

عصر عاشور

آخری بار فوج کے بھاگنے میں بہت زیادہ دیر نہ تھی کہ ہاتھ غیبی کی آواز کان میں پڑی۔

”اے نفسِ مطمئنہ! اپنے رب کی رضا سے رجوع کر۔۔۔“

آپ نے تلوار روک کر نیام میں رکھ لی۔۔۔ پھر کیا تھا، تیروں کی بارش ہونے لگی، نیزہ و شمشیر کے وار پڑنے لگے۔ گھوڑا آپ کو ایک نیشب کی طرف لے آیا۔ امام کے بعد گھوڑے کی جنگ بھی اوراقِ تاریخ کا ایک خونی باب ہے۔ گھوڑے کو جیسے کسی خاص جگہ کا علم تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس نے چاہا کہ امام کو آہستہ سے زمین پر اتار دے کہ صالح ملعون نے تلوار ماری اور آپ اس طرح زمین پر گر گئے گویا حالتِ سجدہ میں ہوں۔

بہن عالم اضطراب میں عمر سعد کو آواز دے رہی تھی کہ بھائی کو قتل ہونے سے بچالے۔ اتنے میں امام حسن کا ایک بچہ دوڑتا ہوا چچا کے پاس آگیا۔ بحر ابن کعب کی تنوار امام کو قتل کرنے کے لئے بلند ہو چکی تھی۔ بچے نے چچا کو بچانے کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اس کے دونوں ہاتھ کٹ کر گر گئے۔ حرملہ بن کاہل کا تیرا اس بچے کو بھی لگا اور اس نے چچا سے پیٹ کر جان دے دی — اس بچے کو رادیوں نے امام حسن کا بچہ تحریر کیا ہے لیکن وہ درحقیقت امام کا پوتا تھا۔

امام سجدہ شکر میں تھے کہ شمر ذی الجوشن پشت پر سوار ہو گیا۔ امام نے اس وقت بھی اُسے راہ ہدایت دکھائی اور جب وہ نہیں مانا تو نماز عصر بجالانے کی اجازت لی لیکن آپ نے پہلے سجدے سے بھی سمر نہ اٹھایا تھا کہ شمر نے پس گردن نیچے کر لیا۔ ظالموں نے خیموں میں آگ لگا دی۔ بیبیاں بدحواس ہو کر بھاگنے لگیں باغرم اندوہ اب جناب زینب کے کا نہرے پر تھا۔ آپ نے خیمے میں جا کر امام زین العابدین کو ہوشیار کیا اور ان سے اجازت لے کر تمام عورتوں اور بچوں کو ایک خیمے میں جمع کیا۔ خود امام زین العابدین کو بھی اسی خیمے میں لے آئیں۔

اس وقفے میں سب کچھ لٹ چکا تھا۔ جناب زینب کے سر سے چادر بھی اُڑ چکی تھی سکینہ کے کانوں کے گوشوارے نوچے جا چکے تھے۔ شمر کے طمانچوں پر وہ چچا عباس کو مارا پکار چکی تھی مگر اب اس کے لئے یہی قیمت کا نوشتہ تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ اس کو بولالیں گے ممکن ہے، سکینہ کو اس کا انتظار ہو مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔

بنی امیہ کی دشمنی قتلِ حسین اور عترتِ رسول کی ٹوٹ کھسٹ پر ختم نہیں ہوئی۔ پہلے شہدار کے سروں کو تن سے جدا کیا گیا، پھر لاشوں کو ایک سلسلے سے لٹایا گیا کہ انہیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا جائے۔ شہدار میں جولا شیں ان قبیلوں سے متعلق تھیں جو لشکرِ یزید میں شامل تھے وہ سب علیحدہ کر لی گئیں مگر آلِ رسول کا کوئی سفارش نہ تھا۔ ان کو پامال کر دیا گیا اور سروں کو نیزوں پر بلند کر دیا گیا۔ (۹۵)

جناب شہر بانو کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے نہر فرات میں گر کر جان دے دی۔ یہ روایت کسی ناہسی کی ہے۔ امام کی بیوی اور امام کی ماں حرام موت نہیں مر سکتی۔ دوسری روایت یہ کہ آپ اہل حرم میں موجود تھیں اور اسیر ہو کر شام گئیں۔ مگر زیادہ صحیح روایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ امام زین العابدین کی ولادت کے بعد ہی آپ کا انتقال ہو گیا تھا لیکن تیسری روایت بھی یکسر نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ بعد قتل امام حسین گھوڑا خیمہ گاہ میں آیا۔ ایک نقاب پوش بی بی خیمے سے نکلیں۔ گھوڑے پر سوار ہوئیں اور گھوڑا فرار لے بھڑنا ہوا انہیں لے کر چلا گیا۔ دشمن کی نظر ان پر نہیں پڑی جس طرح شب ہجرت حصو قریش کے سامنے سے گزر گئے تھے مگر کوئی انہیں دیکھ نہ سکا تھا۔ یہ بی بی شہر بانو تھیں یا کوئی اور بانو مگر تھیں نقاب پوش۔ گھوڑا رے کی ایک پہاڑی کے قریب اُگر رکا۔ آپ دامن کوہ میں داخل ہوئیں اور دہانہ بند ہو گیا۔ آپ کا اچھل مدتوں اس جگہ لہراتا رہا، جس کو دور سے دیکھنے کی سعادت بعض راویوں کو حاصل ہوئی۔ یہ جگہ شہزادہ عبد العظیم کے مزار کے قریب واقع ہے۔

ہندوستان کے بعض حصوں میں ناپید بی بی کی نذر کی جاتی ہے اور مومنین کی مُرادیں برآتی ہیں — ناپید بی بی سے مُراد جناب شہر بانو ہیں۔

تاہم جناب شہر بانو کے اسیر ہونے یا نہ ہونے سے نتائج یا کوئیوں کی ردش پر کوئی اثر نہیں پڑتا —

بلاشبہ جناب شہر بانو ایران کی شہزادی تھیں لیکن اُس سے زائد عزت کی بات یہ تھی کہ آپ رسالت مآب کی بہو تھیں۔ مسلمانوں نے جب رسول کے بیٹے کو قتل کر دیا تو یہودی تکمیل کیا کرتے۔ ان کے لشکر میں خوشیوں کے شادیانے ضرور بجاتے جو اس وقت بھی بچ رہے تھے اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف مسرت کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ ان کے ہزاروں آدمی کھیت رہے تھے۔ اس کا انہیں کوئی غم نہ تھا، خوشی تھی تو بس اپنی فتح کی لیکن درحقیقت یہ ان کی بھول تھی۔ جیت یزید کے بجائے حسین ابن علیؑ کی ہوئی تھی۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔

”فتح اس کی تھی اور فیروز مندی اور کامرانی کا تاج صرف اسی کے
 زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹا، پر
 اپنے اس خون کے ایک ایک قطرے سے، جو عالم اضطراب میں اس کے
 زخموں سے ریگ و سنگ پر بہا تھا، انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب بنے
 آتش پیدا کر دیئے، جن کو نہ مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی، نہ حجاج
 کی بے امان خونخواری اور نہ عبدالملک کی تدبیر و سیاست۔ وہ بڑھتے
 اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا یانی تیل بن کر ان کے شعلوں کی پرورش
 کرتا رہا اور حکومت و تسلط کا عزم و ہوا بن کر ان کی ایک ایک چنگاری
 کو آتش کدہ سوزاں بناتا رہا۔“ (۹۶)

یہ تو تھے امام

امیر المومنین حضرت امام زین العابدین علیہ السلام

۱۱ محرم ۶۱ھ تا ۲۵ محرم ۹۵ھ

آغازِ امامت

۳۳ سال کی عمر میں غم داندہ کے طوفان سے آپ نے دورِ امامت کا آغاز کیا
ایوبؑ عیسیٰ کی سیرت آپ کا ابتدائیہ تھی اور چلے ہوئے خیبروں کا خاکستر تختِ امامت
زینبؑ نے بھائی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کو وہ پورا کرتی رہیں۔ بچوں
کو کیجا کیا۔ عورتوں کی ڈھاکس بندھائی اور بیمار بھتیجے کو سہارا دیا۔ کتنی دل شکستہ اور
تھکی ماندی تھیں زینبؑ، مگر بڑے تحمل اور استقلال کا مظاہرہ کیا آپ نے، جس کو پیغمبرؐ
کردار کے سوا کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

کلیجہ پھٹ جاتا کسی اور کا جب وہ یہ سوچتا کہ کل اسی وقت خیمہ گاہ میں کتنی
چہل پہل تھی۔ اکبرؑ و قاسمؑ تھے اور عباسؑ، گھر سے باہر تک ہر ایک کا مرجعِ امید آج
ایک طرف پامال شدہ لاشیں پڑی تھیں، دوسری طرف زینبؑ اپنے وجود کی بساط پھیلا
سب کو تاریکی کی چھاؤں میں لئے بیٹھی تھیں اور اللہ کو یاد کر رہی تھیں۔

حُر کی بیوہ کاٹنا پانی لے کر آئی تو زینبؑ کا نہ رونا فطرتِ انسانی کے خلاف تھا مگر
آپ نے حواس کھو کر دوسروں کو بد حواس ہونے نہیں دیا اور اسی عالم میں رات گزار دی
صبح کو فائدہ روائی کے لئے ترتیب دیا گیا تو کل چوراسیؑ افراد تھے۔ امام زین العابدینؑ

امام محمد باقر، محمد بن امام حسین، عمر بن امام حسین، زید بن امام حسن، عمر بن امام حسن
حضرت زینب، حضرت ام کلثوم، فاطمہ بنت امام حسین، سکینہ بنت حسین۔ فاطمہ بنت علی
رقیہ زوجہ حضرت مسلم، ام لثانی بنت ابی طالب، ربیعہ والدہ علی الصغیر، ام لیلیٰ والدہ
علی اکبر، عائکہ زوجہ امام حسین، رقیہ بنت مسلم، نضاعہ زوجہ امام حسین، ام اسمیٰ مادرِ فاطمہ
ام عبد اللہ زوجہ امام زین العابدین، جناب فطمہ، زوجہ حضرت عباس، عائکہ بنت مسلم
زوجہ امام حسن، زوجہ عثمان بن علی، دختر عثمان بن علی، زوجہ عون بن علی، زوجہ
جعفر بن عقیل، زوجہ موسیٰ بن عقیل، زوجہ سعد غلام امیر المومنین، زوجہ زہیر ابن قین
زوجہ مسلم بن عوسجہ، زوجہ بربرہدانی، زوجہ جادہ بن کعب، مادرِ قاریب بن عبد اللہ
رفدِ سلسلی بنت حجر بن عدی۔

ان ناموں میں کئی نام شبہ سے خالی نہیں، باقی تعداد میں دو چار غلام اور بچے تھے
جن کی تفصیل کا ملنا ممکن ہی نہیں، کیونکہ کوفہ و شام کے جلا دحب قافلے کو لے کر چلے
تو اکثر مقامات پر ناقوں کو اس تیزی سے دوڑاتے رہے کہ بچے رسن بستہ عورتوں کے
ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ کر گر گئے۔ بذلصیب عورتیں چیختی رہیں مگر ظالموں نے
ایک نہ سنی۔ ان بچوں کی قبور کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام کے راستوں پر جا بجا پائی
جاتی ہیں جنہیں ارد گرد کے باشندوں نے دفن کر دیا لیکن کوئی بتا نہیں سکتا کہ کس قبر
میں کس کا بچہ دفن ہے؟

قافلے کو اس انداز پر ترتیب دیا گیا تھا کہ آگے آگے نیزوں پر سر تھے۔ پیچھے حضرت
زین العابدین آہنی طوق و زنجیر پہنے ایک اوٹ پر سوار، اس کے عقب میں جناب
زینب، جناب ام کلثوم اور دوسری خواتین اُدنٹوں کی منگی میٹھوں پر رسن بستہ بیٹھی
ہوئیں اور سب کے پیچھے افسران فوج اپنے اپنے دستوں کے ساتھ، شتر ایک سرے
سے دوسرے سرے تک چکر لگاتا۔ اس کی نظر خاص طور پر امام کی چہیتی بیٹی سکینہ پر رہتی
جو جناب زینب کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی اور جس کو سزا دینے کے لئے وہ قصور ڈھونڈتا
رہتا تھا۔

کربلا کے اسیر کو فے میں

اہل بیت کی دشمنی کا جو چراغ سیفہ بنی ساعدہ میں جلا یا گیا تھا — اس کی کو معاویہ نے بہت تیز کر دی تھی اور یزید نے تو چراغ کی بتی کو اتنا اونچا کر دیا کہ اس کی کو بھر پڑے گی۔ یزید کا مقصد اولیں قبل حسین تھا لیکن اس قتل کے عواقب میں بغاوت کے جو امکانات مضمر تھے وہ اس سے چھپے نہ تھے لہذا وہ اہل رسول کو اتنا ذلیل کرنا چاہتا تھا کہ کسی کی نظریں ان کی کوئی وقعت باقی ہی نہ رہے، اسی لئے اس نے پورا منصوبہ پہلے ہی سے ابن زیاد کو بھیج دیا تھا کہ قتل کے بعد اسیروں کی زائد سے زائد قہر کی جائے اور اس راستے سے نہ لایا جائے جس پر شیطان علی کی بستیاں پڑتی ہیں۔

یزید کے حمایتی کہتے ہیں کہ یزید اہل بیت کو دیکھ کر رو پڑا تھا اور اس نے چند روز کے اندر سب کو مار کر دیا۔ مگر چھ کے یہ انسان اس نرستے کو دھو نہیں سکتے جو اس نے ابن زیاد کو بھیجا تھا بلکہ سب سے پہلے حاکم مدینہ ولید کو لکھا تھا کہ بیعت یا قتل پھر یہی حکم ابن زیاد کو دیا گیا۔ اموی سیاست داں کا مکار بیٹا بیعت یا گرفتاری بھی لکھ سکتا تھا مگر روایات گڑھے والوں کے ذہن میں شاید یہ بات نہیں آئی در نہ یہ کہنا سچ ہی ہو جاتا کہ جو کچھ کیا ابن زیاد نے کیا، ابن معاویہ کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا۔

پھر بعد قتل حسین وہ عزت و ابر کے ساتھ اہل بیت کو بھیجے گا حکم بھی بھیج سکتا تھا جو اہل بیت کے قیام کو فہمیں کبوتر کے ذریعہ یا آسانی ابن زیاد تک پہنچ جاتا — اور خانوادہ رسالت کی وہ رسوائی نہ ہوتی جو دربارِ شام میں اس تک پہنچنے میں ہوئی۔

رونا تو اسی کا ہے کہ ظلم پر پردہ ڈالنے کیلئے ظالم کی بغائری میں محاسن کو نکھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کوشش میں حق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اندھی طرف داری میں باطل پرستی کا از رکاب ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگوں سے سچا تو عمر سعد تھا۔ صاف لفظوں میں امام حسین سے کہہ دیا تھا کہ وہ دین کے لئے دنیا کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اسی پردہ عمل پر اربابِ اور حکم کے مطابق اسیر

کو کربلا سے کوفہ لے آیا۔

۳۸ میل کا فاصلہ اگرچہ رواروی میں طے کیا گیا تھا پھر بھی رات ہو گئی، لہذا قافلے کو شہر کے باہر ہی ٹھہرا دیا گیا۔ دوسرے دن صبح کو بازار آراستہ کیا گیا اور گروہ بہتہ بیبیوں کو بھرے بازار سے گزارا گیا۔

یہی کوفہ امیر المؤمنین کا دار الخلافہ رہا تھا۔ زینبؓ وام کلثومؓ یہاں بنات رسول کی حرمت کے ساتھ رہی تھیں۔ آج اس حال میں گزرناسی پغیمبرانہ آزمائش سے کم نہ تھا مگر حسینؑ کی بہن نے پورے صبر و تحمل سے عزت نفس کا مظاہرہ کیا۔ تماشا فانی دور وہ کھڑے ہوئے تھے۔ عورتیں بالا خانوں سے اسیروں کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ باؤ ہزار سپاہی بازار میں پھیلے ہوئے کسی ممکن بغاوت کے نگران تھے۔ شہزادی زینبؓ کا سر حجب کا ہوا تھا۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہؐ کے اہل بیت ہیں تو وہ بے اختیار رونے لگے۔

خوشی کے باجے بج رہے تھے اتنا شور و غل تھا کہ ایک دوسرے کی آواز سن نہ سکتا مگر اللہؑ نے زینبؓ کا رعب و جلال کہ آپؐ نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو ایک دم سناٹا چھا گیا اور زینبؓ کی آواز گونجنے لگی۔

”کوفہ والو! تم ہماری حالت پر روتے ہو۔۔۔ تمہاری مثال اس ہری گھاس کی سی ہے جو کوڑے پر لہلہا رہی ہو، اس چاندی کی سی ہے جو کسی قبر پر چڑھائی گئی ہو۔۔۔ چند روزہ مہلت پر مغرور نہ ہو کیونکہ اللہ جلد باز نہیں۔ اس کو نہ توقع بھل جانے کا خوف ہے اور نہ جہنم کی عدول حکمی کا اندیشہ!“

قسی القلب افسرانِ فوج بھی سن رہے تھے اور سنگدل سپاہی بھی۔ زینبؓ علیؑ کے لہجے میں بولتی رہیں اور وہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ کسی عورت کی زبان سے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ امام زین العابدینؑ نے روک کر خاموش کر دیا۔

”آپ عالمہ غیر معلمہ ہیں: (وہ عالم، وہ کسی کا شاگرد نہ رہا ہو)

اس کے بعد فاطمہؓ بنت حسینؑ اور حضرت ام کلثومؓ نے خطابت کے جوہر دکھائے

پھر امام زین العابدین نے حق امامت ادا کیا۔

”میں علیؑ ابن الحسین ہوں! وہ حسین جو ساحل فرات پر بے جرم و خطا قتل کیا گیا
کیا جواب دو گے رسول اللہؐ کو، جب وہ پوچھیں گے۔“ لوگ ڈھارس مارتے
کر دو رہے تھے۔ قافلہ بڑھتا چلا گیا اور راستہ دیرامتہ دربار میں ابن زیاد کے سامنے
لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔

رسیوں سے بندھے ہوئے قیدی اعیان سلطنت کے سامنے ایستادہ کئے گئے
ابن زیاد علیؑ کی کرسی پر فروکش تھا۔ امامؑ کا سر ایک پشت میں نیچے رکھا ہوا تھا اور وہ
ایک چھڑی سے آپ کے دانتوں کو چھیڑ رہا تھا۔ زید بن ارقم صحابی رسولؐ کو تاب نہ رہی
انہوں نے ٹوک دیا۔

”کیا کرتا ہے، ابن مرجانہ۔ رسول ان ہونٹوں کے بوسے لیتے تھے!“
”خاموش بڑھے۔ تیری عقل جاتی رہی ہے۔“ ابن زیاد نے ڈانٹ
دیا اور زید روتے ہوئے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اب ابن زیاد جناب زینبؑ کی طرف
متوجہ ہوا اور امام حسینؑ کی شان میں گستاخی کی۔ جناب زینبؑ نے منہ توڑ جوابات
دیئے۔ پھر اس نے بیحد سجاد کے بارے میں پوچھا۔

”یہ کون ہے۔۔۔؟“

لوگوں نے بتایا تو اس نے امام زین العابدینؑ سے بھی تبلیغ کلامی کی اور دندان
شکن جواب پاکر قتل کا حکم دے دیا۔ امامؑ نے فرمایا۔

”موت سے کیا ڈرتا ہے۔ قتل ہونا ہماری عادت اور شہادت ہمارا شرف ہے!“
جناب زینبؑ بے چہن ہو گئی تھیں مگر امامؑ وقت کے چہرے سے ایک اطمینان
ٹپک رہا تھا۔ آپ کی بے خوفی نے ابن زیاد کے حوصلوں کو پست کر دیا۔ اس نے سوچ
سمجھ کر حکم قتل واپس لے لیا اور اسیروں کو قید خانے بھیج دیا۔ پھر سر امامؑ کو نیزے پر
بلند کر کے بازاروں میں تشہیر کرایا گیا۔

”یہ ابنِ فاطمہؑ کا سر ہے جو محمدؐ کی بیٹی تھی۔۔۔“

اعلان کا مقصد یہ تھا کہ ہر ایک کو قتلِ حسین کی اطلاع ہو جائے۔ یہ مقصد تو پورا ہو گیا اور بے ضمیر کوفہ والوں پر رسول اور آلِ رسول کی بے حرمتی کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا، پھر بھی دین کے استہزار اور ارکانِ دین کی تضحیک پر بعض دلوں میں ایک دبی ہوئی چنگاری سلگ اُٹھی۔ — حبانِ اہل بیت سب کے سب قید تھے جن میں مختار بن ابی عبیدہ ثقفی بھی تھے۔ — ابن زیاد نے اسیروں کی موجودگی میں مختار کو قید خانے سے طلب کیا اور حسین اور ان کے خاندان کی بربادی کا حال دکھایا۔ ظاہر ہے کہ مختار کا کیا حال ہوا ہو گا مگر ابن زیاد کو مختار سے وہ جوابات ملے جن کی وہ توقع بھی نہ کر سکتا۔ نتیجتاً مختار کے مصائبِ زندان میں اضافہ ہو گیا مگر مختار یا علیؑ کے کسی سرفروش کے جذبہٴ ایمان میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ جوشِ انتقام کچھ زیادہ ہو گیا۔

اسی دن ابن زیاد نے اہل کوفہ کو مسجد میں جمع کیا اور اعلان کیا :-
 ”خدا کا شکر ہے کہ امیر المومنین یزید اور ان کے گردہ کو فتح حاصل ہوئی اور کذاب قتل ہوا۔“
 عبداللہ ابن عقیف نابینا صحابی برداشت نہ کر سکے، اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

”کذاب تُراوِ تیرا باپ، پسیرِ مر جانہ۔ — وہ اور اس کا باپ کذاب، جس نے تجھ کو حاکم بنایا۔“
 ابن زیاد نے غصے میں انہیں قتل کر دیا اور جسم کو دار پر لٹکوا دیا۔ خبابؓ کے بعد یہ دوسری لاش تھی جو لٹکوائی گئی۔

کونے میں سرِ اٹم نے سورہ کہف کی تلاوت فرمائی۔ — سرِ اٹم کے ایک قطرہٴ خون سے ابن زیاد کی ران میں ناسور ہو گیا جو پھر اچھانہ ہو سکا اور اسی طرح کے کئی اور معجزے رونما ہوئے، پھر، ارمِ رسالہؐ کو اسیرانِ بلا شام کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔

کوفے سے شام تک

کوفہ سے شام جانے کے تین راستے تھے۔ پہلا راستہ صرف ساڑھے پانچ سو میل کا تھا لیکن وہ غیر آباد و صحرائی تھا۔ اس راستے سے ایسر جاتے تو نہ فتح کر بلا کو شہرت ہوتی اور نہ خاندانہ رسالت کی ذلت اس لئے اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔

دوسرا راستہ اگرچہ سات سو میل کا تھا لیکن اس پر جو بستیاں پڑتی تھیں ان میں مہمان علی کی تعداد زیادہ پائی جاتی، خطرہ تھا صحاح فطین قافلہ پر حملہ ہونے کا۔ لہذا اس کو بھی ترک کر دیا گیا۔

تیسرا راستہ طویل ترین تھا بارہ تیرہ سو میل لمبا۔ جو مقصد تشہیر کو بھی پورا کرتا اور اس کی آبادیاں بھی علی دشمن تھیں، اس لئے اس کو ترجیح دی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ منصوبہ بھی دمشق سے آیا ہو کہ اس پر ایسر شام کی سطوت و جبروت کے ڈٹکے بجائے جائیں اور اعلان کیا جائے کہ جو حکومت سے بغاوت کرتا ہے اس کا یہ انجام ہوتا ہے، خواہ وہ پیغمبر ہو یا پیغمبر زادہ!

سرہانے شہداء پہلے کی طرح نیزوں پر آگے آگے جو گویا فتح و ظفر کے نشان تھے ان کے پیچھے نبی زادیاں رکن بستہ، شتران بے کجاہ پر سوار، جن کے ہراول بیمارام طوق و زنجیر ان میں جکڑے ہوئے، دونوں طرف نگرانی کے لئے سوار، سب کے پیچھے عمر سعد، شمر، شیت بن ربیع، عمرو بن حجاج اور بعض دوسرے ایک ہزار فوج جلدی میں لئے ہوئے، گونے سے روانہ ہوئے۔

طویل راستے کی مسافت کا توڑ بد بختوں نے یہ کیا تھا کہ دو منزلہ اور سہ منزل کرتے ہوئے جائیں تاکہ جلد پہنچیں اور تیز رفتاری کے سبب قیدیوں کو تکلیف بھی ہو۔ بچوں سے ان بے رحموں کو خاص عداوت تھی۔ اونٹوں کو تیز دوڑاتے کیونکہ اس طرح بچوں کے ناقوس سے گر جانے کا امکان تھا۔ جب کوئی بچہ گر جاتا تو ملاعین کی اکثریت قہقہے لگاتی اور عورتوں کے چیخنے کے باوجود اونٹوں کو دوڑاتی رہتی تھی۔

شام کے راستے میں بھی ایسے تمام بچوں کو اہل قریات نے دفن کیا جن کے بے نام

نہیں اب بھی جا بجا پائی جاتی ہیں۔

کونے سے چالیس میل پر تادسیہ کے قیام میں شب میں ایک ہاتھ بڑا مرد ہوا جس نے دیوار پر خون تازہ سے دوشعر لکھے۔ ان شعروں کا مفہوم تھا۔

”وہ اُمت، جس نے حسین کو قتل کیا، قیامت میں شفاعت کی امید نہ رکھے، وہ یقیناً عذابِ جہنم سے بچ نہیں سکتی۔“

بعض ملعونوں نے ہاتھ کو پکڑنے کی کوشش کی، مگر وہ غائب ہو گیا اور انھیں دہشت میں مبتلا کر گیا۔

دوسری منزل۔ ۱۵ میل پر حصار میں ہوئی۔ وہاں سے چل کر ۱۱۲ میل پر قافلہ نمکریٹ پہنچا تو بازار خیر مقدم کے لئے آراستہ تھا اور مشہور کیا گیا تھا کہ ایک خارجی نے خردج کیا تھا جو قتل کر دیا گیا لیکن ایک نصرانی کونے سے آیا تھا اس نے بتا دیا کہ حسین ابن علی کا ہے۔ اس خبر سے ہر طرف شورش پھیل گئی۔ قافلہ کو کچھ فاصلہ سے دارلودہ میں ٹھہرایا گیا اور صبح ہوتے ہی کوچ کر دیا گیا۔

دادئی نخل کے لوگوں نے ان پر نصیری کی اور وہ شہر ”لینا“ پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے یزید دشمن پر لعنت بھیجی۔ شمر نے ان پر حملہ کیا اور غازی مگر کی کر کے آگے بڑھ گیا۔ اگلی صف ذل کیل تھی مگر وہاں بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے اس لئے اسیروں کا قافلہ بغیر آرام کئے آگے بڑھ گیا۔

موصل کی صورت حال بہت زیادہ خراب تھی۔ اس دُخیز راج کے ہزاروں آدمی مسروں کو چھین لینے اور اہل بیت کو آزاد کرالینے پر تیار تھے لیکن عمر سعد نے کچھ دُور پہلے ہی قیام کر لیا اور صبح ہوتے ہی جبلِ سنجا کی طرف چل پڑا۔

اگلی منزل نصیبین تھی۔ یہ واحد مقام تھا جہاں ملائین حب منشاء عترتِ پیغمبر کی تذلیل کر سکے۔ جنابِ زینبؓ نے شہر کو بددعا دی۔ ایک بجلی گری اور تقریباً نصف شہر جل کر خاک ہو گیا۔ پھر بد نصیبوں کا قافلہ عین الورد ہوتا ہوا دعوات پہنچا۔

یہ دوسرا شہر تھا جہاں بنی اُمیہ کی پذیرائی کی گئی۔ وسط شہر میں امام کا سر نصب

کیا گیا اور محض سرود و جام گرم ہوئی، تاہم سر کے بارے بتایا گیا کہ ایک خارجی کا ہے۔ اس کے بعد حوران میں منزل کی گئی۔ عراق کا یہ قدیم ترین شہر ہے۔ بحرین میں ایک کلیسا کے نیچے سے گزرا تو اس کے لبوں سے تلاوت کلام پاک ہو رہی تھی۔ کلیسا کا پادری کبھی خزاہی بڑے تئیر میں سر کو دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا کہ کس کا سر ہے؟ کسی نے اس کو بتایا اور سر کے معجزے سے صداقت اسلام اس کے دل پر متم ہو گئی۔ اس نے فی الفور کلمہ طیبہ زبان پر جاری کیا اور مخدرات عصمت کو چادر میں پیش کی۔ شاہیوں نے مزاحمت کی تو اہل کلیسا نے مقابلہ کیا۔ یحییٰ شہید ہو گیا اور قافلہ اسی وقت آگے بڑھ گیا۔

منزل کلیسہ پرستیدانوں کو ایک دیر کے قریب بٹھرایا گیا۔ جس کی دیوار پر عربی میں کسی زمانے کا ایک شعر لکھا ہوا تھا۔ اُس کے بارے میں معلوم ہوا کہ جناب شیث کی اولاد نے لکھا تھا۔ شعر کا مفہوم تھا۔

”جس اُمت نے حسین کو قتل کیا، وہ قیامت میں ان کے جد کی شفاعت سے محروم رہے گی؟“

شعر میں اُٹھ کی کوئی صراحت نہ تھی کیونکہ حسین تو اس کے بعد شیر اودار میں قتل کئے گئے اور آج بھی سسل ان کے نکلے پر چھریاں پھیری جا رہی ہیں۔ کیا آج کے قاتل اُس تعریف میں نہیں آتے؟ مزدرا تے ہیں اور یقیناً وہ لوگ شفاعت سے مایوس ہیں تب ہی تو سرے سے شفاعت کے منکر ہو گئے ہیں۔

قنسرین اس کے بعد کی منزل تھی۔ اہل شہر نے قافلے کو اندر داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ قاتلوں پر لعنت کی اور پتھر مار مار کر بھگا دیا۔

معرة النعمان میں قافلے نے رات گزاری، پھر شیرز آیا۔ وہاں بھی قنسرین کی سی صورت پیش آئی اور قافلہ کفر تاب پہنچا۔

یہ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ قلعہ والوں نے انہیں پانی تک نہیں دیا اور قافلہ اڑی سیبور کی طرف چل پڑا۔

اس مقام پر شاہی لشکر کا اہل شہر سے سخت مقابلہ ہوا۔ شہر کے چھ سو آدمی مار

گئے اور شہر والے صرف پانچ شہید ہوئے۔ حضرت ام کلثومؓ نے شہر کو دُعا دی۔
 ”خداوند! یہاں کے چشموں کو شیریں بنا دے!“

شہزادی کی دُعا کا اثر ہے کہ آج تک ارضِ سینور سے زائد شاداب علاقہ دُور دُور تک پایا نہیں جاتا۔

حماۃ کے باشندوں نے بھی شامیوں کو ٹھہرنے نہ دیا۔ حاکم حمص نے شکر کا استقبال کیا مگر شہر میں داخل ہوتے ہی اس پر اتنی اینٹیں اور پتھر برسے کہ ۲۶ آدمی مر گئے۔ وہ لوگ تو امامؑ کا سر بھی چھین لیتے مگر عمر سعد نے چلا کی سے کوچ کر دیا۔ بعلبک کے آراستہ شہر میں اولادِ رسولؐ کا مضحکہ اُڑایا گیا اور حضرت ام کلثومؓ نے اس شہر کے لئے بد دُعا فرمائی۔

وہاں سے عسقلان کی طرف بڑھتے ہوئے عیسائیوں کی ایک عبادت گاہ پڑی جہاں سرِ مظلوم سے ایک معجزہ ظاہر ہوا۔ وہاں کے راہب نے دس ہزار دینار دے کر ایک رات کے لئے سر کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ سر جیسے ہی صومعہ کے اندر پہنچا، ہر طرف سے نور ہی نور ساطع ہونے لگا۔ راہب کی گردیدگی کا اثر ہو یا دُعا کی قبولیت کہ سر سے آواز آئی۔

”کیا چاہتا ہے تو — ۶“

”اپنا پورا تعارف کرا دیں —“ راہب مُلتحیانہ لہجے میں بولا اور امامؑ کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

”حسینؑ شہید کر بلا — علیؑ کا بیٹا — فاطمہؑ کا پارہ جگر — رسولؐ کا نواسہ!“
 راہب ڈھاٹیں مار مار کر روئے لگا اور بولا

”مجھے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی۔ آپ سے شفاعت کا امیدوار ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے اور تمام اہلِ کلیسا نے اسلام قبول کر لیا۔
 قافلہ اگلی منزل پر ٹھہرا تو عمر سعد نے راہب کی دی ہوئی تھیلی کھولی۔ اس کی تمام اشرفیاں ٹھیکریوں میں بدل چکی تھیں۔

عسقلان کا حاکم جنگ کر بلا میں شریک تھا۔ اس نے لشکر والوں کی بڑی خدمت کی مگر اس مقام پر زیر نامی مرد حق میں کوجب معلوم ہوا کہ عترت پیغمبر اس حال میں گرفتار ہے تو وہ امام زین العابدین کے قریب آیا، دیر تک روتا رہا پھر آپ کے حسب ارشاد سواروں کو کچھ رقوم دے کر خواتین مطہر کے قریب سے ہٹایا۔ کچھ چادریں منگو کر ان میں تقسیم کیں اور شکر کو بہت سخت دھست کہا۔ اس پر اسے زد و کوب کیا گیا اور وہ قافلے کی آٹھی تک بے ہوش رہا۔

اب دمشق کوئی سو اسو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس لئے فائدہ بڑے اہتمام سے چلتا ہوا شہر کے باہر پہنچ کر مقیم ہو گیا۔

کر بلا سے کوفہ، کونے سے دمشق کا طویل فاصلہ، ۱۱ محرم ۳۶ھ سے ۶ صفر ۳۶ھ تک چھتیس روز کا وقفہ، ذہنوں پر بھرے گھر کی بنا ہی اور کسیری کے احساس کا غلبہ، نہ جانے کیسے برداشت کیا ان بلا نصیبوں نے۔ اس پر مستزاد تھی گلی کو چوں اور بھرے دربار کی رسوائی۔ زین العابدین تو خیر امام تھے اور زینب عظمیٰ شریک کارِ امامت، مگر راستے میں جو شدائدِ اہلیت کو پیش آئے، ان کا نشانہ اول وہ چھوٹی سی بچی تھی جو باپ کی پیاری اور بچاکی لاڈلی تھی۔

شکر کوجب سے معلوم ہو گیا تھا کہ حسین سکینہ کو بہت چاہتے تھے، اس وقت سے وہ چار سال کی اس بچی کا اتنا دشمن ہو گیا تھا کہ موقع ملتے ہی اس کو سزا دینے کو آجاتا سکینہ ہر طمانچے پر بچا کو آواز دیتی، ہر دُورے پر باپ کو پکارتی اور جب کوئی فریاد سن کر نہ آتا تو پھوپھی کے سینے میں سر چھپا لیتی۔ اس کے بعد سکینہ پر پڑنے والا ہر دُورہ بنتِ علی کی پشت پر پڑتا۔ فتنہ رستیوں میں بندھی نہ ہوتی تو بڑھ کر ہر دُورے کی چوٹ اپنے اوپر لے لیتی مگر کرتی کیا، وہ جنبش بھی تو نہ کر سکتی تھیں پھر بھی چیخ کر کہتیں۔

”ظالم! ہشترادی کو نہ مار، مارنا ہے تو مجھے مارے۔“

خود امام زین العابدین بھی اس مشقِ ستم سے محفوظ نہ تھے۔ ملائین کوجب کوئی بات جناب زینب سے منوانا ہوتی تو پہلے امام کے پاس آتے اور دو چار دُورے لگا کر کہتے

”بھوپھی سے کہو، دربار میں چلیں —“

”تمہارے باپ کا سر ایک جگہ دُک گیا ہے، چٹا کیوں نہیں ہے۔“

امام سر کے بتائے پر سیکینہ کو ڈھونڈھواتے اور جب وہ مل جاتی تب ان کی جان اس تشدد سے چھوٹی — اتنے مصائب پر بھی یہ سخت جان زندہ تھے۔ شاید حسین کے کام کو پورا کرنے کی خاطر یا اس ہم کو سر کرنے کے لئے جو بغیر کسی تحریک کے شروع ہو گئی تھی حسین کی شہادت حقیقتاً رسولؐ کی شہادت تھی، کیونکہ اہل بیت کی جس قدر شہیر ہوتی، مقصد شہادت اتنا ہی واضح ہو جاتا۔ بالفاظ دیگر حسین جہاں جہاں جاتا، کربلا میں بنی اسد کے ہاتھوں دفن کئے ہوئے جسم سے اس کا رشتہ قائم ہو جاتا۔ یہ رشتہ غیر مرنی طور پر ایک طوفان کی لکیر ہوتا جس سے سُرُخ شعلوں کی طرح وہ الفاظ روشن ہو جاتے جو امام نے اپنے خطبات میں کربلا کے بے دھرم اور شقی القلب بیزیریوں کے سامنے پیش کئے تھے۔ اس طرح وہ الفاظ کربلا سے کوئہ، کوئہ سے ان مقامات تک جہاں جہاں قافلہ قیام پذیر ہوا تھا، پہنچے اور سب جگہوں سے گزر کر دمشق کی فصیلوں پر دستکبیسے گئے

دمشق کا بازار

دمشق معاویہ کا دار الخلافہ رہا تھا۔ علیؑ اور اولاد علیؑ پر لعنت کرنے کا رواج جہاں سے چل کر ستر ہزار مندروں تک پہنچا تھا۔ اجنبی سوچتے ضرور ہوں گے کہ کتنے بُرے تھے یہ دُک جن سے برأت کا اعلان صبح و شام کیا جاتا ہے اور اکثریت ایسی تھی جو صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ عرب میں اسلام کا پیغمبر گزرا تھا جس کے براہِ راست وارث بنی امیہ ہیں اور جس کا مذہب دی ہے جو فرمانروایانِ شام کے زیرِ عمل رہا ہے۔ ایک تعداد البتہ ایسی تھی جو حقیقت آشنا تھی، مگر ان سب کے لبِ سونے کی جہروں سے سی دیئے گئے تھے۔ پرانے آدمیوں کی اکثریت مرکبِ چکی تھی۔ نام کو اگر کوئی باقی تھا تو زبان کھول کر شمشیر کی چھاؤں میں بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔

ان ہی حالات میں علماء سے قتلِ حسین کا فتویٰ لیا گیا تھا اور ایسی ہی باتوں کو نہایت دے کر شام کے بازار سجائے جا رہے تھے اور در و دیوار کی آئینہ بندی ہو رہی تھی

تاکہ جشن کے اس ماحول میں باغیوں کے سر اور ان کے رسن بستہ خاندان کو گزارا جائے اور یزید کی فتح پر اظہارِ مسرت کیا جائے۔

اُم کلثوم نے شتر سے غماش کی سختی کہ ہم کو اس راستے سے لے چل جدھر تماثلی کم سے کم ہوں، شتر لایا اس طرف جہاں کھوئے سے کھوا چھل رہا تھا۔

ایک انجان بوڑھے نے میر بازار امام زین العابدین سے کہا کہ تم لوگوں کو خدائے بغاوت کی سزا دی۔ اس پر امام نے آیاتِ قرآنی کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا اور بڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ امام نے اس کو تسلی دی کہ نادانستگی میں اس نے جو کچھ کیا یا جو کہا، اس سے تائب ہو جائے، پروردگار اس کی توبہ قبول کرے گا۔

جلوس کی ترتیب میں ایک شخص سورہ کہف کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب وہ ہی جگہ پہنچا۔

”اصحاب و رفیق ہماری نشانوں میں سے تھے۔“

تو امام کے مرے آواز آئی

”میرا قتل اصحاب کہف کے واقعے سے زیادہ ہے“

اور یہ حقیقت ہے کہ اصحاب کہف پر تو کفار نے ظلم کیا تھا لیکن امام کو تو اُمت نے مہمان بلا کر شہید کیا تھا۔

کئی واقعات امام زین العابدین، جناب زینب، اور جناب اُم کلثوم کو پیش آئے آپ نے اپنی اصلیت بنا کر بے خبر لوگوں کی آنکھیں کھولیں۔ اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے دربار تک پہنچے تو ان پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔

دریائے یزید

بات صرف بد حالی کی نہ تھی۔ اس کی تو مخدرات عصمت اور خود اُمام سبھی کسی حد تک عادی ہو چکے تھے، مسئلہ تھا عورتوں کے لئے غیر مردوں کے سامنے جانے کا اور امام کے لئے نائبِ رسول کے وقار کا۔ عورتیں بازاروں میں ہو کر آئی تھیں۔ کوفے کے بازار اور دربارِ کوفہ میں جناب زینب اور اُم کلثوم نے خطبات دیئے تھے تو نگاہوں

کو بچا کر، لیکن یزید کا دربار ایک طرح پر بین الاقوامی تھا۔ اسی لئے جب کسی نے امام زین العابدین سے سوال کیا۔

”سب سے بڑی مصیبت آپ پر کہاں پڑی —؟“

تو آپ نے فرمایا۔

”انشام — انشام!“

چنانچہ شمر جب اسیروں کو لے کر دربار میں جانے کے لئے چھ دروازوں سے گزر چکا اور جناب زینب کی نظر دُور سے نامحرموں کے بے پناہ ہجوم پر پڑی تو آپ کہنے لگیں۔

”کس کی مجال ہے جو مجھے لے جائے —؟“

شمر کا تازیانہ امام کا خون چاٹنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ امام کے قریب آگیا۔

”کہو اپنی پھوپھی سے کہ دربار کی طرف قدم بڑھائیں —“

امام علیہ السلام نے پھوپھی کو بابا کے سر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کر دیا۔

جناب زینب نے سراٹھا کر دیکھا تو امام کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ منشاء یہ تھا کہ بہن چلی جاؤ، یہ بھی میرے محضر شہادت میں لکھا ہے اور اسی سے تکمیل شہادت ہوتی ہے۔

زینب امام زین العابدین کے پیچھے پیچھے مرجھ کاے بڑھنے لگیں۔

یزید اپنے پورے جاہ و شہ کے ساتھ تخت طلائی پر متمکن تھا۔ اس کے دوش پر تعمیر اسلام کی وہ چادر پڑی ہوئی جو فتح مکہ کے دن آنحضرت نے ابوسفیان کو اڑھائی تھی۔

سید الشہداء کا سراپا ایک سونے کے طشت میں یزید کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ باقی

سراسر کے بعد قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ مردوں کے اس طرح سجانے کی نظیر ماضی کی تاریخ

میں بھی مشکل سے ملے گی۔ ہاں آگے چل کر چنگیز خان نے اس کی تقلید کی اور مردوں کا ایک

چبوترہ بنوایا۔ اس طرح یزید اور یزیدیوں کا موازنہ اگر ہو سکتا ہے تو چنگیز اور اس کے

درندہ صفت ساتھیوں سے۔ مگر چنگیزی تو وضع قطع میں بھی درندے معلوم ہوتے

تھے۔ بنی امیہ نے تور دم دایران کی تہذیب اپنالی تھی۔ دیکھنے میں متمردان اور اندر

سے خوشخوار بھیڑیے جن کی مثال چنگیز خان سے بھی نہ دی جاسکتی۔ سات سو کسی نشیں دربار کی زینت تھے۔ غلام چمکیلے لباس زیب تن کئے چاروں طرف کھڑے تھے۔ یزید ایک چوب زریں سے سرانام کے لبوں کو چھو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

کاش بدر واحد کے بزرگ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ کیسا بدلہ لیا میں نے بنی ہاشم سے۔ بنی ہاشم نے جاہ و مملکت کے لئے پیغمبری کا ڈھکوسلا بنایا تھا۔ در نہ کوئی فرشتہ آیاتِ تعجاز وحی نازل ہوئی۔“

باقیات الصالحات میں ایک صحابی رسول ابو بکر بنی ہاشم سے موجود تھے۔ اُن سے برداشت نہ ہو سکا۔

”یزید! یہ سردارِ بہشت کے ہونٹ ہیں حضور انھیں چوما کرتے تھے۔ خدا لعنت کرے تیرے قاتلین پر۔“

ابو بکرؓ دھکے دے کر نکلا دیئے گئے۔ دوسری آواز سمرہ بن جنادہ کی بلند ہوئی ان کا بھی وہی حشر ہوا مگر سمرہ نے جاتے جاتے لوگوں سے کہہ دیا۔

”یہ محمد مصطفیٰؐ کے نواسے کا سر ہے۔“ وہ محمدؐ جن کا تم کلمہ پڑھتے ہو!“

اہلِ دربار کی آنکھیں کھل گئیں اور سفیرِ روم نے یزیدؓ سے سوال کر دیا۔

”کیا حسینؑ تمہارے رسولؐ کے نواسے تھے؟“

یزیدؓ انکار نہ کر سکا اور سفیرِ روم دُکھ سے بولا۔

”لعنت ہے تجھ پر اور تیرے دین پر۔“ مجھ سے جنابِ داؤدؑ کا کئی پشتوں کا

واسطہ ہے مگر نصاریٰ میری اتنی عزت کرتے ہیں۔ تو نے اپنے پیغمبرؐ کا نواسہ مار ڈالا اور اس کی خوشیاں منا رہا ہے۔“

یزیدؓ اس گستاخی پر اُگ بگولا ہو گیا۔ اس نے سفیر کے قتل کا حکم دے دیا۔ سفیر نے حرمین کو اٹھا کر سینے سے لٹکایا پھر اس کو بوسہ دے کر کہنے لگا۔

”گوہارِ بہن! میں مسلمان ہوتا ہوں۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ

واشہد ان محمدؐ رسول اللہ!۔“

جلادوں نے باہر لے جا کر اس کا ستر قلم کر دیا۔ ایسا ہی واقعہ یہودی عالم راس الجالت کا بھی ہوا۔ اس کا سر بھی اتار لیا گیا۔

ان واقعات سے یزید کی طبیعت کچھ مکدر ہو گئی تھی مگر وہ آدمیوں کا خون اس کے لئے کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتا۔ دو جام چڑھا کر شراب کی تلخی سے اس نے اس تلخی کو دور کر لیا اور اہل بیت کی ریتاں کھلو کر ان کو قریب آنے کا اشارہ کر دیا۔ سب سے پہلے جناب سکینہ آگے بڑھیں اور یزید آپ کے بھوپلین سے متاثر ہو کر خوش مزاجی سے بات کرنے لگا۔ شمر کی سختیوں اور گھڑکیوں کی شوگر بھی یزید کو مہربان پا کر بڑے میٹھے لہجے میں جوابات دیتی رہی پھر یزید نے جناب زینب کی طرف توجہ کی تو جہر کی جو عورتوں کے جھڑپیں کھڑی ہوئی تھیں کسی نے بتایا کہ علیؑ کی بڑی بیٹی ہیں۔ جناب زینب بھرے دربار میں بات کرنا پسند نہ کرتیں اور جناب فضہؑ بی بی کی سینہ پر سرتھیں مگر بھائی جو منصب سوچ گئے تھے، ہم کو اُسے بنا ہنا تھا، اس لئے زینب یزید سے ہم کلام ہو گئیں۔

یزید امام حسینؑ کو مٹھون کر رہا تھا آپ اس کو برجستہ جواب دینے لگیں، پھر آپ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”بہت برا ہو گا ان کا انجام، جنھوں نے آیاتِ الہی کو جھٹلایا۔ یزید! جانا ہے تو نے کیا کیا اور کیا کر رہا ہے۔“

فضاحت کا ایک دریا بہنے لگا اور محسوس ہونے لگا کہ علیؑ مسجد کوفہ میں دنیا کی بے ثباتی پر تقریر کر رہے ہیں اور لوگوں کو بدکرداری اور بد اعمالی سے ڈرا رہے ہیں پورے دربار میں سناٹا تھا۔ سانس لینے کی آواز بھی مدہم پڑ گئی تھی، صرف بنتِ فاطمہؑ کی آواز دُور دُور تک سُنانی دے رہی تھی۔

”یہ صرف انقلابِ روزگار ہے کہ علیؑ کی بیٹی تجھ سے ہم کلام ہے۔ یزید! ہم رسولؐ کی اولاد ہیں۔ تو نے ہم کو مالِ غنیمت سمجھ رکھا ہے مگر اس کا خیمہ آہ تجھ کو جھگٹتا پڑے گا۔ تیری رائے ناقص، تیری زندگی کے دن طویل اور تیری جماعت پر آگندہ ہونے والی ہے۔“

”تمام حمد اس کے لئے سزاوار ہے جس نے ہمارے اول کو سعادت دی اور آخر کو رحمت کی شہادت عطا کی۔“

تقریب ختم ہونے کے بعد دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر یزید کی آواز نے اس سکوت کو توڑا۔

”جس کا دل جلا ہو، اس سے ایسی باتیں کچھ بعید نہیں۔“

یزید اور کہتا بھی کیا؟ قتلِ حسین کے جو نتائج نکلے تھے اور مختلف مقامات پر جو مظاہرے ہوئے تھے، وہ اس کے علم میں تھے۔ خود اس کے دربار میں رسول کے دو صحابوں کا احتجاج، نصرانی سفیر اور یہودی عالم کے انجام اس کے پیشِ نظر تھے ایسے میں اگر وہ علی کی بیٹی کو قتل کر دیتا تو سب سے پہلے اس کو فضیلت کی نسل کے حبشیوں کی بنیاد کا سامنا کرنا پڑتا پھر اتنے کھلے ہوئے ظلم پر بعض دوسرے لوگوں کے اٹھ کھڑے ہونے کا بھی اندیشہ تھا لہذا اس موقع پر اس نے معاویہ کی حکمتِ عملی سے کام لیا اور جنابِ زینب کی شعلہ بیانی کو بُردباری سے برداشت کر لے گیا اور جنابِ زین العابدین سے مخاطب ہو گیا۔

امام اس کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ وہ امام حسین کی توہین کو ناچاہتا تھا مگر ہر سوال پر اس کو مٹنے کی کھانا پڑی — کہا جاتا ہے کہ یزید نے امام کے قتل کا حکم دے دیا تھا مگر ایک غیبی ہاتھ نے خود جلا د کا قتل کر دیا۔ یزید ڈر گیا کہ کہیں یہ ہاتھ خود اس کی گردن نہ دلوچ لے۔ اس لئے اس نے قتل کے خیال کو ملتوی کر دیا۔

ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شامی نے جنابِ فاطمہ بنتِ الحسین کو کینز کی لئے مانگا اور یزید (نعت اللہ علیہ) نے اقتدار کے زعم میں فاطمہؓ زہرا کی پوتی اس کو بخش دی۔ اس نے فاطمہ کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو جنابِ ام کلثوم نے بددعا کی اور اس کا ہاتھ خشک ہو گیا — مسلمان اگر اپنے پیغمبر کی معجز نمائی کے قائل ہیں تو ان کی نواسی کا اعجاز ماننا پڑے گا۔

اگلے دن یزید نے مسجد میں ایک اجتماع کرایا، جس میں امام کو بھی طلب کیا۔

خطیب مسجد منبر پر گیا۔ اس نے پہلے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے، پھر معاویہ و یزید کی تقریفوں کے پل باندھ دیئے، جس سے سُننے والوں میں وہی غلط فہمی پیدا ہوئی جس کی تہنیر برسوں سے کی جا رہی تھی۔ امام کو اس لئے بلوایا گیا تھا کہ اُن کی خاموشی حقائق کی تصدیق قرار دی جائے۔ امام نے جس کو محسوس کیا اور یزید سے کہا۔

”میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

یزید نے انکار کر دیا لیکن دوسرے ملکوں کے جو لوگ تھے اور بعض عمائدین نے کہا۔

”ایک مجبور اور قیدی کہہ ہی کیا سکتا ہے۔“

یزید بنی ہاشم کی فصاحت سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ امام کیا کہیں گے لیکن اجازت نہ دیتے بھی بن نہ پڑا۔ بادلِ خواستہ اس نے اجازت دے دی اور وہی ہوا جس کا یزید کو خدشہ تھا۔ امام نے منبر پر پہنچتے ہی وہ تقریر شروع کی کہ ساتھیں دم بخود رہ گئے۔

خلاق مطلق کی حمد اور ہادی برحق کی ثناء کے بعد آپ نے فرمایا۔

”ایہا الناس! ہم اہل بیت رسالت کو خدا نے چھ خصوصیات اور سات

فضیلتیں عطا فرمائی ہیں جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔“

”میں مکہ و مدینہ کا فرزند ہوں، زعم و صفا کا بیٹا ہوں، اس کا جانشین ہوں جس نے حجر اسود کو اپنی ردا میں اٹھایا۔“ علی ابن ابی طالب میرے دادا تھے، سیدۃ النساء العالمین میری دادی۔“

امام اپنا تعارف کرا ہی رہے تھے کہ مجمع میں ایک ہلچل مچ گئی۔ یزید (عنت علیہ) نے مؤذن کو اذان دینے کا اشارہ کر دیا اور امام احتراماً خاموش ہو گئے۔

مؤذن نے جیسے ہی ”أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدَ الرَّسُولَ اللَّهُ“ کہا، امام نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا اور یزید سے سوال کر دیا۔

”یہ مُحَمَّد بن کا نام اتنے احترام سے لیا گیا ہے، تیرے جد تھے یا میرے؟
اگر تو کہتا ہے کہ تیرے جد تھے تو جھوٹا ہے تو اور کافر ہو جائے گا۔ اور اگر
کہتا ہے کہ میرے جد تھے تو پھر تو نے اُن کی عزت کو کیوں قتل کیا۔؟“
اُپ نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا، عمامہ زمین پر پھینک دیا اور مقابلہ بلند
آواز میں فرمایا۔

”یٰ یزید! قیامت کے دن معلوم ہوگا، جب میرے نانا تیرے خلاف مدعی ہونگے۔“
مسجد میں شور گریہ و بکا بلند ہو گیا۔ یزید اس قدر حواس باختہ ہوا کہ بغیر نماز ادا
کئے تیز قدموں سے چلتا ہوا محل کی طرف چلا گیا۔

امام کی اُواز جیسے مہن مسجد میں اب تک گونج رہی تھی۔ اُن دیکھے منظام کے
نقشے لوگوں کے ذہنوں میں ابھرتے جا رہے تھے اور دلوں سے غیر محسوس طریقے
پر کسی انقلاب کی آواز اُٹھ رہی تھی۔ پھر وقت نے یہ بھی دیکھا کہ حسین خطبات
کی آواز باز گشتِ زندانِ شام سے فکرا کر دمشق کے در و دیوار سے گونجنے لگی۔

زندانِ شام

دورِ حاضر کے یزید کہتے ہیں کہ ”امیرِ یزید نے عزت اور احترام کے ساتھ اِل
رسول کو رکھا اور رخصت کر دیا“ ذرا ابن طاووس کی آنکھ سے اس قید خانے کو
اُکر دیکھیں تو وہ ایسی بلند و بالا دیواروں سے محدود نظر آئے گا جو اتنی بوسیدہ تھیں
کہ آندھی کے کسی جھکڑے سے گر سکتی تھیں۔ ستم زدوں نے دس محرم کے ہولناک دن
کے بعد جو رات گزار دی تھی، زندانِ شام کی راتیں بالکل ویسی ہی تھیں اور دن میں
تمازتِ آفتاب سے چہروں کو بچانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی شکل نہ تھی کہ خواتین
اپنے بالوں سے مُتہ کو چھپا لیتیں

سچ تو یہ ہے کہ قتلِ حسین کے بعد ان کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔
ہاں قید خانے میں اتنا آرام تھا کہ بچے شمر کے جور و ظلم سے بچے ہوئے تھے لیکن اب
بچے رہ ہی کتے گئے تھے۔ سب تو اذیتوں سے گر گر کر جنت کو سدھار چکے تھے۔

سخت جان تھی سکینہ اور چند بچے جو زندہ تھے کراچی بھی یہ حالت تھی کہ کھڑے کھڑے اذیت لگنے لگے جسم ٹوکھ کر کاٹا ہو گئے تھے، چہروں کی کھال جھلس گئی تھی — کبھی کے برگ نوشکفتہ اتنے خزاں دیدہ ہو گئے تھے گویا پت جھڑ کے موسم کا انتظار کر رہے ہوں۔

خواتین کا بھی لگ بھگ یہی عالم تھا۔ پچھلے چند روز سے شام کی کوئی عورت کسی کسی وقت آجاتی تو زینب و ام کلثوم کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا پھر بھی وہ کچھ اور نہ کہتیں، تذکرہ کرتیں حسین کا، عباس کا اور علی اکبر کا اور پوچھنے پر سرگزشت کو بلا بیان کر دیتیں۔ یہی صورت حسین کی لاڈلی بیٹی کی بھی تھی۔ کسی بچے کے ساتھ کھیلنے کی اُمنگ تو اس کے دل میں رہی نہ تھی۔ بچے آتے تو اُس ناز و نعم کا تذکرہ کرتی جس میں اُس نے پرورش پائی تھی، اور اس ظلم و ستم کو بیان کرتی جو شہر نے اس پر ڈھائے تھے۔

یہ عورتیں اور بچے گھر واپس پہنچ کر آپس میں پھر جھلے میں تمام باتوں کو دہراتے — اس طرح دھیرے دھیرے عسرت اظہار کی تباہی کی داستان دمشق میں عام ہو گئی۔ اس کا آوازہ یزید کے کانوں میں بھی گونجنے لگا اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔

معاذیہ کا رند مشرب بٹیا، ہوا دہوس کا دیوانہ، حن و شباب کا سودا لی، جس کے لئے اس نے ماں بہن کے رشتوں کا امتیاز بھی ختم کر دیا تھا مگر اب کسی بات میں اس کا جی نہ لگتا، سوتے سوتے چونک پڑتا اور کہہ اٹھتا۔

”کیا ہو گیا تھا مجھے، جو میں نے حسین کو قتل کر دیا!“

ہند زوجہ یزید کے قید خانے پہنچنے کی روایت بھی اسی زمانے کی ہے۔ — اور یہ قرین عقل بھی ہے کہ ہند امام حسین کی زوجیت میں رہی ہوں یا آزاد کردہ کینہ زانیہ ہند کو خاندان رسالت سے ایک ربط تھا اور قتل حسین کی خبر نے ان کو پریشان کر دیا تھا۔ یزید نے اپنی غلطی کا احساس ہونے پر ان کو اجازت دے دی ہوگی اور ہند نے زندان پہنچ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہوگا مگر روایات کے تضاد میں کوئی قطعی نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے پھر بھی یہ مسلم ہے کہ ملکہ یزید کی اجازت سے قید خانے گئی

اس نے بعض سہولتیں بھی ہم پہنچائیں مگر یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اہل بیت اپنی رہائی تک اسی قید خانے میں رہے۔

تشدد کا دور کچھ ہلکا پڑ گیا تھا۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ یزید کے مزاج میں کوئی تبدیلی آئی تھی بلکہ سبب یہ تھا کہ قتل حسین اور شہر اہل بیت کے عواقب نے یزید کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ خود اس کے مرکز حکومت دمشق میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ آخر حسین کا قصور کیا تھا؟ خود اسی دمشق میں معاویہ نے رسول کے صحابیوں کو دار پر چڑھایا تھا مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رہی تھی اور چند روز کے چرچے کے بعد فضا ساکت ہو گئی تھی۔ اسی طرح یزید اگر حسین کو قتل کر دیتا اور بنی اسد کے بجائے خود لاشوں کو دفن کر دیتا تو حجام اہل بیت کی طرف سے انتقام کا آواز ہر روز بلند ہوتا لیکن یہ صورت پیدا نہ ہوتی کہ جبرہ پر سیدانوں کا فائدہ گزرا تھا، خاندان رسالت کی بے حرمتی اور مطلوبوں کی بے بسی پر لوگوں کے دلوں میں شعلے اٹھنے لگے تھے اور انہیں خاندان معاویہ سے دشمنی ہو گئی تھی۔

یزید اگر مصلحت اور سیاست سے کام لیتا تو وہی کرتا جیسا دورِ حاضر کے یزیدی کہتے ہیں کہ یزید نے اولاد رسول کو فوراً ہار کے مدینے بھیج دیا تھا۔ دراصل یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ ایک سیاسی ذہن کو یہ کرنا چاہیے تھا کہ قتل کا الزام دوسروں پر ڈال دیتا اور خود بری الزمہ ہو کر دور جا کھڑا ہوتا اور بنی حمالو کا کردار ادا کرتا۔ اس مشورے کو کچھ لوگوں نے واقعہ بنا کر لکھ دیا، زمانہ مابعد میں جس کی سند دی جانے لگی۔

لیکن ان حقائق و شواہد کو مٹایا نہ جاسکا جو آج بھی عترت پیغمبر کے قید کئے جانے کا ثبوت ہیں۔ دمشق میں حسین کی معصوم بچی کی قبر، جناب زینب کا سفر شام وغیرہ وغیرہ جناب سکینہ کی قبر دمشق میں رقیہ کی قبر بھی جاتی ہے کیونکہ بنی امیہ نے اپنے ظلم پر پردہ ڈالنے کے لئے مشہور کر دیا تھا کہ علی کی بیٹی کی قبر ہے حالانکہ وہ بھول گئے مگر علی کا دمشق پہنچنا کیونکہ ثابت ہو گا، اگر کوئی لڑکی تھی تو نام بدل دینا لا حاصل ہے۔ اہل بیت کے قیام دمشق کو تیسرا ہفتہ تھا۔ اس مدت میں حالات کچھ بدل چکے

تھے مگر جو سختیاں وہ جھیل کر آئے تھے، ان کے نقوش ذہن تو ذہن جموں پر بھی موجود تھے۔
عباس کی چیمٹی اب چاہنے والوں کی گود میں رہتی مگر وہ اتنی خاموش ہو گئی تھی کہ جیسے تصویر
اندوہ غم بن کر رہ گئی ہو، ہمہ وقت کھڑی کھڑی سی، زینب دُام کلثوم تسلی دینے کی کوشش
کرتیں تو کبھی بابا کا نام لے کر روتی، کبھی کہتی کہ چپانے آئے کو کہا تھا، پلٹ کر نہیں آئے
۵۔ ربیع الاول ۱۱۳۷ھ کو روتے روتے سوئی تو تھوڑی ہی دیر بعد چو تک پڑی۔

”بابا — کہہ کر گئے بابا؟“

پھر بھی چیخ چیخ کر رونے لگی۔ زینب دُام کلثوم نے بہلانے کی بہت کوشش کی
مگر اس کی چیمٹی نہڑکیں اور آواز یزید کے محل تک پہنچ گئی۔ اس نے دریافت کر لیا تو خواب
زینب نے کہا کہ اگر بھائی کا سر بھجوا دیا جائے تو شاید اس کی تسکین ہو جائے، سکینہ نے سر
کو دیکھتے ہی گود میں اٹھا لیا اور سینے سے لگا لیا۔

”بہت دیر کی آپ نے آئے میں بابا —“، امّ نے بیٹی سے کہا تھا کہ جلد بلوالیں
گئے اس کو۔ سکینہ دل ہی دل میں انتظار کرتی رہی ہوگی اور امّ جب خواب میں نظر آئے
تو وہ سمجھی کہ بابا اس کو لینے آئے ہیں۔

سر کو سینے سے لگا کر وہ بے ہوش ہو گئی، کچھ دیر بعد خواب زینب کو اس کی سس
محسوس نہیں ہوئی تو انہوں نے چھو کر دیکھا۔ سارے گھر کی لاٹلی بیٹی بابا سے جا ملتی تھی،
امام زین العابدین بہن کو قبرستان میں دفن کرنا چاہتے تھے مگر یزید کو خطرہ پیدا ہوا
کہ لاش قید خانے سے باہر گئی تو قیامت ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے امام سے کہہ
دیا کہ بچی کو زندان ہی میں دفن کر دیا جائے۔ صابر امّ نے یزید کا بھیجا ہوا کفن تو نہیں
لیا مگر دھڑاکی پوتی کو تلوار سے قبر کھود کر انھیں کپڑوں میں دفن کر دیا جو وہ پہنے ہوئے تھے۔
سکینہ کی قبر آج بھی مرجع خلافت ہے — مولف منہج البلاغہ سید محمد رضی کے
شہرہ آفاق بھائی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے روایت ہے کہ ایک شب آپ نے چھوٹی
شہزادی کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا: ”نہر کا پانی میری قبر کے اندر تک آگیا ہے
حاکم دمشق کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ قبر کو پھر سے بنادے، تم میری میت کو ہاتھوں میں لئے

رہنا اور قبرود بارہ بن جانے پر اس میں لٹا دینا۔“

یہ مرتضیٰ کا قیام ان دنوں دمشق ہی میں تھا حاکم کا آدمی صبح ہوتے ہی سید مرتضیٰ کو لینے آگیا۔ شہزادی نے اس کو بھی یہی تاکید کی تھی۔ چنانچہ سید مرتضیٰ قبر مطہر پر حاضر ہوئے قبر کھولی گئی اور اس کی مرمت کی گئی۔ اتنی دیر سید مرتضیٰ لاش کو اپنے ہاتھوں پر لئے رہے یہ مرتضیٰ نے دیکھا، شہزادی کے رخساروں پر اب بھی انگلیوں کے ہلکے ہلکے نشان تھے جو ٹخنوں کے ٹھاپوں سے پڑے تھے، بازوؤں اور کھانٹوں پر رسی کی برتیں بنی ہوئی تھیں جو پیٹھے ہوئے کرتے سے نمایاں ہو رہی تھیں مجھکوس ہوتا کہ گویا، ابھی آپ کو دفن کیا گیا ہے۔

یہ مرتضیٰ پچھاڑیں کھانے لگے لیکن انہوں نے فرض کی ادائیگی کے لئے اپنے کو سنبھال لیا اور شہزادی کو اسی طرح دفن کر دیا۔

نہ جانے ظالموں کو کتنی دشمنی ہے حسنین کی بیٹی سے کہ مرنے کے بعد بھی اس کو معاف نہیں کیا اور مطعون کرنے سے باز نہیں رہے۔ اندھوں کو عداوت میں یہ بھی نظر نہیں آیا کہ جس سیکینہ کا یہ ذکر کرتے ہیں، وہ سیکینہ بنت حسین بن علی بن ابی طالب نہیں تھی بلکہ سیکینہ بنت حسین بن علی بن عبد الرحمن بن عامر بن حکم بن عاص تھی۔ اور عبد الرحمن بن عامر بن حکم کا بھائی تھا۔ یہ سیکینہ شاعر بھی تھی، فن موسیقی اور علم کلام کی ماہر بھی تھی۔ اس سیکینہ کو بہ باطنوں نے سیکینہ بنت حسین بنا دیا۔

شام کے قیدی

یہ سید کا مقصد آل محمد کو عوام کی نظروں سے گرانے تھا اور خود ان کی عزت نفس کو مجروح کرنا تھا کہ اس کے بعد وہ کسی سے نگاہ چار نہ کر سکیں لیکن جو کچھ اس نے کیا تھا وہ خاندان رسالت کے لئے سنت پیغمبری تھا۔ یہ سید کی باطنی سیاست کا یہ پالسنہ الٹا پڑا اور اس کی شہرت کو اتنا دھچکا پہنچا کہ محتاط علماء کو اس کے اسلام پر شک ہونے لگا۔ اکثر اس نے سوچا کہ عزت رسول کو آزاد کر کے مدینے بھیج دے لیکن اقتدار کے غرور اور طاقت کے زعم نے از خود یہ قدم اٹھانے نہ دیا۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ عابد بیمار خود ختم ہو کر ربانی کی درخواست کریں مگر وہ اس باپ کے بیٹے تھے جس نے سرکٹو دیا تھا لیکن جھکا یا

نہیں ظلم و ستم کی حد اس سے آگے بڑھ کر ختم ہوتی تب بھی ایوبؑ کا قائم مقام آف نہ کرنا لہذا آپؐ اسی طرح زندان کی سختیاں جھیلنے رہے۔

آخر ایک دن اس نے اپنے حاشیہ نشینوں سے کہہ دیا کہ علیؑ کے بیٹے نے خواب میں مجھ کو ڈرایا ہے کہ اہل بیت کو چھوڑ دے۔

عقیدے کی روشنی میں یزیدؓ کے اس خواب کو صحیح قرار دیا جاتا ہے لیکن اس وقت کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو یزیدؓ کے لئے اہل نبیؐ کی رہائی کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ رہ گیا تھا۔ مدینے میں قتل حسینؑ کی خبر پہنچ چکی تھی اور یزیدؓ سے نفرت کی چنگاری بڑھتے بڑھتے شعلہ بن چکی تھی جس کی اطلاع مروان نے یزیدؓ کو دی تھی۔ خود دمشق کے بزرگوں کی ایک جماعت بھی یزیدؓ سے کہہ چکی تھی کہ عترتِ رسولؐ کو کیوں زندان میں رکھا ہے؟ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کسی دن میدان میں نہ آجائیں تو جوان بھی ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔

کے میں عبداللہؑ ابن زبیر اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے۔ معصبؑ ابن زبیر اپنے بھائی کی حمایت میں ایک بڑی فوج کے ساتھ عراق آچکا تھا۔ ان حالات میں یزیدؓ اپنے لئے مزید دشواریاں پیدا کرنا نہ چاہتا تھا، لہذا ایک دن اس نے امام زین العابدینؑ کو بلا کر کہہ دیا کہ انہیں رہا کیا جاتا ہے، خواہ وہ دمشق میں رہیں یا مدینے چلے جائیں۔ امامؑ نے چھو بھی کے مشورے سے مدینے جانے کا اظہار کر دیا۔

یزیدؓ نے خباب زہیبؓ کی خواہش کے مطابق ایک مکان خالی کر دیا، اور ان کے ٹوٹے ہوئے تبرکات بھی واپس کر دیئے۔ شہداء کے سر بھی بھیج دیئے۔ دمشق کی عورتیں تعزیت کے لئے آئیں۔ زہیبؓ و ام کلثومؓ اور دوسری خواتین کے بیانات سے شور ماتم بلند ہو گیا۔ درودیلوار سے اے حسینؑ کی صدائیں آنے لگیں — اور اس کی آواز بازگشتِ دمشق کے گلی کوچوں میں سنائی دینے لگیں۔

یزیدؓ کو پھر خدشات نے گھیر لیا اور اس نے فوراً کربلا کے اہل بیتؑ کے ساتھ روانہ کر دیا۔ بشیر بن جہلم پانچ سو سوار لے کر حفاظت کے لئے ساتھ کیا گیا اور اونٹوں کا

یہ قافلہ یزید کے حکم کے مطابق ساڑھے پانچ سو میل کے مسان راستے سے چلا اور ۲۰ صفر ۶۲ھ کو وارد کر بلا ہوا۔

یزید کے ہوا خواہ مدت اسیری کو چند روز بتاتے ہیں بعض عقیدت مندوں کا بھی یہی خیال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حیثین کی خبر شہادت جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ حیثین کوئی معمولی انسان نہ تھے لیکن اس متشدد ماحول میں خبر سننے ہی حیثین کی نیا ت کے لئے چل پڑنا اتنی آسان بات تو نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر جلد سے جلد مدینہ پہنچی ہوگی تو محرم کے آخر میں اور ہر ایک نے اک دم اس کا یقین بھی نہ کیا ہو گا کیونکہ یہ بنی امیہ کی چال بھی ہو سکتی تھی۔ خبر کی تصدیق میں کچھ وقت لگا ہو گا اور اس میں ماہِ صفر گزر جانا ناممکن نہیں۔ پھر جو کچھ ہوا، اس کا یزید کی نادانستگی میں ہونا، اس کے عقیدت مند تو مان لیں گے ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حیثین سے دشمنی یزید کو تھی۔ ابن زیاد، مردان بن حکم تو دشمن یزید کی حیثیت سے امام کے خلاف تھے۔ جیسا کہ عمر بن سعد نے کہا تھا وہ تو حیثین کو حکومت کے لئے قتل کر رہا ہے۔ رہ گئے جابر بن عبد اللہ انصاری اور ان کے ہمراہ چند بنی ہاشم کا۔ صفر ۶۲ھ کو کر بلا میں ہونا، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ بے خطر حالات کا اطمینان کر لینے کے بعد مدینے سے روانہ ہوئے ہوں گے اس کے سوا کر بلا سے کونے کا سفر، پانچ چھ روز کو فے میں قیام، کونے سے ساڑھے بارہ سو میل طے کر کے دمشق پہنچنا، دمشق میں کسی مدت تک قیام اور دمشق سے کر بلا تک واپسی ۳۶ روز کے اندر اونٹوں کی سواری سے تو ممکن نہیں اور اونٹوں کے علاوہ کوئی اور سواری استعمال نہیں کی گئی۔ اس لئے اسیری کی مدت کسی طرح ایک سال سے کم نہیں ہو سکتی اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر سیاسی عوامل یزید کو گھبراہ دینے تو ایک سال بعد بھی اہل حرم کی رہائی نہ ہوتی۔

بہر طور جب شام کا قافلہ کر بلا پہنچا تو جابر بن عبد اللہ انصاری دلاں موجود تھے مگر کون سی قیصر کی ہے؟ یہ جابر کو معلوم نہ تھا۔ یہی دشواری بنی اسد کو بھی پیش آئی وہ ۱۲ محرم کو حسبِ وعدہ آؤ گئے تھے لیکن جلد ہائے بے سرکشاخت کیونکر کرتے؟ چنانچہ ایک طرف سے گرد آؤ قی نظر آئی۔ بنی اسد سمجھے کہ فوج یزید کا کوئی سوار آ رہا ہے وہ پیش

ہونے ہی کو تھے کہ سوار نزدیک آگیا جو امام زین العابدین تھے — آپ با اعجاز امامت
کونے کی قیام گاہ سے کربلا آگئے تھے۔ بنی اسد نے آپ کو پہچان لیا۔

آپ نے گھوڑے سے اتر کر پہلے بابا کا لاشہ ان کی قبل سے تیار قبر میں اتار ا حضرت
علی اکبر کی قبر پائیں یا نوائی حضرت عباسؓ کو اس مقام پر سپرد لحد کیا جہاں بحالت موجود
آپ کا مقبرہ بنا ہوا ہے۔ حبیب ابن مظاہر کو علیہ دُفن کیا۔ اطلاق علی اور حضرت عقیل کو
یکجا خاک میں چھپایا۔ باقیوں کے لئے گنج شہیداں تیار کر لیا۔ امام کے تشریف لانے کی
غایت نظر ہو تو یہ تھی کہ آپ نے جموں کو پہچان کر بتایا کہ کس شہید کی لاش ہے۔ اس سے
زائد ضرورت یہ تھی کہ امام کی میت کو غیر امام دفن نہ کر سکتا تھا۔ ان کاموں سے فارغ ہو
کر امام جس طرح آئے تھے، اُسی طرح واپس چلے گئے۔ کوفیوں کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ کیا آپ
تشریف لے گئے اور کب پلٹ کر آگئے۔ یہ بھی ویسا ہی معجزہ تھا جیسا شبِ ہجرت آنحضرت
نے دکھایا تھا۔

اس وقت قافلے کے آجانے سے جابر کی مشکل حل ہو گئی تھی۔ پیغمبر کے یہ صحابی
نابینا تھے۔ زینب بازار کو فروشام میں کھلے سرگشت کر کے آئی تھیں، گمراہ وہ مجبورہ تھیں
آپ نے جابر کو دُور ہٹوا دیا کیونکہ جابر انہیں دیکھ نہ سکتے تھے۔ توجاہ کو دیکھ سکتی تھیں۔
میدیاں حملوں میں بیٹھی ہوئی تھیں مگر قتل گاہ پہنچتے ہی سب نے اپنے کواؤں
سے گرا دیا اور وارثوں کی قبر پر وہ بیٹھ کر پچھاڑیں کھانے لگیں۔ جناب زینب بھائی کی قبر
پر جا بیٹھیں اور کیا کہتی رہیں، یہ انھیں خود معلوم نہ تھا۔
تین روز تک کربلا میں شہیدوں کا ماتم ہوتا رہا۔ پھر قافلہ بشیر بن جذلم کی سرکردگی
میں مدینے روانہ ہوا۔

دریائے مدینہ

اُٹھتا قافلہ مدینے کے قریب پہنچ کر آبادی سے باہر خمیہ زن ہو گیا اور حضرت امام
زین العابدین نے بشیر بن جذلم سے فرمایا کہ پہلے مدینے میں جا کر اطلاع کرے بشیر نے
مسجد نبوی میں پہنچ کر اعلان کیا۔

”یثرب والو حسین کو بلا میں قتل ہو گئے۔ مدینہ اب تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔“
مرد عورتیں، چھوٹے بڑے، سب خبر سنتے ہی گھروں سے نکل پڑے، سروں پر خاک
اڑا اڑا کر رونے لگے اور چشمِ زدن میں پورا شہر ماتم کدہ بن گیا۔

مدینے کی عورتیں بیٹتی ہوئی چلیں اور جاتے ہی زیب و ام کلثوم سے پٹ گئیں،
مرد امام زین العابدین کے خیمے کے باہر جمع ہو گئے اور جب امام باہر آئے تو اس طرح
رونے لگے جیسے میت کے گرد کھڑے ہو کر روتے ہیں۔ امام نے ایک بلیغ خطبہ دیا اور فرمایا۔
”ہمیں طرح طرح سے رسوا کیا گیا، ترک و دلیم کے غلاموں کی طرح دردِ در پھر لایا۔“

پھر محمد حنفیہ، عبداللہ ابن جعفر، بنی ہاشم اور اکابرِ قریش ماتمی جلوس کی شکل میں
عسرتِ اطہار کو شہر میں لائے، روضہ رسول اور قبرِ خبابِ فاطمہ پر ایسے ایسے بین کئے
کئے کہ فرشتوں کے بھی آنسو نکل آئے ہوں گے۔

حبیبِ اسلام کی آمد اور مدینے کا وقار تھے۔ ان کی شہادت اتنی آسانی سے
سجلائی نہ جاسکتی لہذا زید سے نفرت عام ہو گئی۔ وہ لوگ بھی مشتعل ہو گئے جو خاندانِ
علی سے کوئی خلوص نہ رکھتے لیکن یہ واقعہ ایسا تھا جس سے ہر ایک کو جذبات پر قابو رکھنا
مشکل ہو گیا اور بغاوت کا عنصر غیر محسوس طریقے پر پردش پاتا رہا۔

فاطمہ کی بیٹیاں وطن واپس آ گئی تھیں اور اسی ماحول میں سانس لے رہی تھیں
جس میں انہوں نے عمریں گزاری تھیں لیکن کربلا میں جو کچھ ہوا تھا اور کوفہ و شام میں جس
طرح ذہنی اور جسمانی تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں، ان کو وہ فراموش نہ کر سکتیں۔ مدینے کی
عورتیں ردِ جمع ہوئیں، ڈھنگ کی بیٹیاں ان میں بیٹھ جاتیں، کبھی حسین کے واقعات
کبھی عباس کی سرگزشت اور کبھی زندانِ شام کی آپ بیتی بیان کرتیں۔ عورتیں مردوں سے
جا کر کہتیں اور اموی حکومت کے خلاف دلوں کی آگ بڑھتی رہتی۔

دونوں پہنوں کا اس کے سوا کوئی کام ہی نہ رہ گیا تھا کہ یا تو سوچتی رہتیں یا منظم
کی تفصیلات لوگوں کے گوش گزار کرتیں۔ دو چلتی پھرتی لاشیں تھیں، جن میں سانس
باقی تھی اور ان لاشوں کے منہ سے رودادِ کربلا کے سوا کوئی لفظ نکلتا ہی نہ تھا۔

یہ تھائیہ الشہداء کی مجلس کا آغاز جن کا اعادہ ہم ہر سال کرتے ہیں اور سہارن پور
شہزادوں کی تاسی میں پُرسوز لہجے میں منظوم مرثیے پڑھتی ہیں۔ زینب دُام کلثوم دونوں
کا حال یکساں تھا مگر حضرت اُم کلثوم زیادہ دن چل نہ سکیں۔ مدینہ پہنچنے کے بعد چالیس
روز کے اندر آپ کا انتقال ہو گیا۔

اب جناب زینب اور بھی تنہا ہو گئیں مگر وہ حقیقتاً غمِ حسین کے سہارے زندہ تھیں
اور آخری سانس تک ان مصیبتوں کو بیان کرتی رہیں جن کا تصور آج بھی سنگِ دل سے
سنگِ دل انسان کی آنکھ میں آنسو لے آتا ہے۔

حضرت اُم کلثوم کی وفات بادی النظر میں صرف رسول کی چھوٹی نواسی کی وفات
تھی لیکن دراصل حسین کی پہلی ذاکرہ کی وفات تھی اور اُم دہب زوجہ عبداللہ ابن عمر
کے بعد دوسری خاتون کی شہادت جس کا خون ہمیشہ بنی اُمیہ پر قرض رہے گا۔

جناب زینب کی یہ زندگی دراصل زندگی کی تعریف میں نہ تھی پھر بھی آپ نے اپنے
معمولات جاری رکھے لیکن بنی اُمیہ کا عاملِ مدینہ اس کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے یزید
کے حکم پر زور ڈالا کہ ان بیانات کو بند کر دیں یا مدینہ چھوڑ دیں۔ بیانات کافی دنوں سے
چل رہی تھی مگر زینب کو چھوٹی بہن کا بڑا سہارا تھا۔ اب وہ سہارا بھی نہیں رہا تھا، لہذا آپ
نے مدینہ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ہی حضرت اُم سلمہ اور حضرت اُم البنین دونوں کا
انتقال ہو گیا۔

اب زینب کا مقصد حیاتِ صرف اُس سانحہ کی تشہیر تھا جس نے رسول کے چمن کو
اس طرح اجڑا تھا کہ وہ پھر کبھی آباد نہ ہو سکا۔ اس تشہیر کے لئے اور قبرِ حسین کی زیارت
کی خاطر لوں بھی انھیں نکلنا ہی تھا۔ اس لئے پہلے آپ عازمِ کربلا ہوئیں، پھر مصر گئیں
اور کئی شہروں میں پھرتی رہیں۔ ان مقامات پر بھی آپ نے واقعاتِ شہادت اور حالاتِ
اسیری بیان فرمائے۔ اسی لئے ان کی وفات بھی دہاں کسی جگہ سے منسوب کی جاتی ہے
شام میں آپ کا جانا دو مرتبہ ضرور ہوا اور کربلا بھی دو ہی دفعہ تشریف لے گئیں۔ فرات کے
کنارے بھی گئیں اور عباسی و علی اکبر کے مزاروں پر بھی۔ اصحابِ حسین کو بھی وفادار شجاعت

کی داد دی۔

آخری بار شام پہنچ کر طاقت بالکل جواب دے گئی۔ اس کا ایک سبب بھائی سے آپ کی محبت بھی ہو سکتی ہے چونکہ حسنین یزید کے نژاد نے میں محفوظ کر لیا گیا تھا لہذا چاہئے والی بہن نے بھی اسی سرزمین کدوائی آرام گاہ بنالیا۔ اس طرح دمشق نے حسنین کا پورا سرمایہ محبت اپنی آغوش میں چھپا لیا، لاڈلی بیٹی پہلے ہی ہمیشہ کی نیند سوچ گئی تھی۔ اب بہن نے بھی کچھ سال کی عمر میں تیار بخم اربعہ موت کو لبیک کہہ دیا۔ یہ کربلا کی آئین میں تیسری عورت کی شہادت تھی جو یزید کے نامہ اعمال میں لکھی گئی۔

یزید کے اقتدار کا یہ کھیل نظر اہرامی سیاست کا ایک رخ تھا۔ کربلا کا واقعہ دنیا کی بڑی جنگوں میں شامل بھی نہ ہوتا اور اہل بیت کی اسیری بھی ایک شکست خوردہ اور مفتوح خاندان کی داستان بن کر رہ جاتی لیکن صورت حال کچھ ایسی آپڑی تھی کہ طاقت اور نا طاقتی نے حق و باطل کے قالب اختیار کر لئے تھے گویا کربلا کی قیمتی ہوئی زمین پر اہرمین نے یزداں کو کھچاڑ دیا تھا۔

یہ جنگ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کوئی دنیا کی پہلی جنگ نہیں تھی۔ صدق و کذب کے حق و باطل کے تصادم کا آغاز باہل و قابل سے ہو چکا تھا اور دنیا آئے دن اس کی نظیریں پیش کرتی آئی تھی لیکن کربلا کو دوسری لڑائیوں کے مقابلے میں جو امتیاز حاصل تھا وہ یہ کہ وہاں ایک ہی تصویر کے دو پہلو آپس میں ٹکرا رہے تھے۔

۲۸ صفر ۶۱ھ کو عرب کا مشہور آفاق پیغمبر دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ ایک نے اس کی زندگی کو رسالت قرار دیا، دوسرے نے بادشاہت۔ رسالت کے جانشینوں نے اپنا عہد قبر رسول سے شروع کیا اور بادشاہت کے تاجداروں نے اپنے دور کا آغاز صقیفہ بنی ساعدہ سے کیا۔ ایک کا سلسلہ حسنین ابن علیؑ تک پہنچا، دوسرے کا یزید ابن معاویہ تک حسنین کا کہنا تھا کہ میرے نام صرف اللہ کے آخری نبیؐ تھے۔ یزید کا قول کہ نہ کوئی وحی آئی نہ فرشتہ، نبوت صرف بنی ہاشم کا ڈھونگ تھا اور حکومت اپنے باپ اور دادا کے

الفاظ میں اس کا حق تھی جو اس نے لے لی۔

بعض حق پسند کہتے رہے ہیں کہ حسینؑ کربلا میں نہیں بلکہ سقیفہ ہی میں قتل کر دیئے گئے تھے، جنہیں کربلا میں حسینؑ نے اپنا خون دے کر زندہ کیا۔

سقیفہ سے کربلا کا رشتہ ہمارے تحت الشعاع ہے لیکن ہم نے ملت مسلمہ کے قمرِ امینؑ میں اس کے علی الاعلان اظہار میں احتیاط کی کیونکہ مسلمان یزیدؑ کو ارباب سقیفہ سے مختلف قرار دیتے تھے مگر اب ابوسفیانؑ اور یزیدؑ بلکہ بعد کے سارے خلفائے بنی امیہؑ اس عقیدہ مسلمان، عاشقِ رسولؐ اور نیک نفس قرار دیئے جاتے ہیں اور نقطہ آغاز سے سیرتِ کردار کے ایک خط مستقیم کی صورت میں آگے بڑھا دیئے جاتے ہیں، جس کے برعکس چادرِ تطہیر میں جڑے ہوئے ستاروں کو رنگ آلود بنایا جاتا ہے تو ایک طرح پر خود اس حقیقت کی تائید ہو جاتی ہے جس کی فریادِ فاطمہؑ زہراؑ نے اپنے پدرِ عظیم المرتبت کی روح سے کی تھی ”بابا! آپ کے بعد اُمت نے مجھ پر وہ ستم توڑے اور اتنی مصیبتیں ڈھائیں کہ وہ دونوں پر پڑتیں تو دن کالے پڑ جاتے!“

اور ان مصیبتوں کا اختتام یہ تھی اہل بیتؑ رسولؐ کی اسیری جو رسولؐ کی دنیوی و دینی نیابت میں سے ایک نیابت کا خون ہو جانے کا نتیجہ تھی مگر اس اسیری نے رزمگاہ سے باہر نکل کر ظالم کو مفتوح اور مظلوم کو فاتح بنا دیا۔ اور پھر مظلومیت کا سلسلہ جتنا آگے بڑھا، ایوانِ ظلم و جور کے در و دیوار شہیدوں کے خون سے رنگین ہوتے چلے گئے۔

واقعہ حرہ

اہل مدینہ پر شہادتِ حسینؑ اور شہیر اہل بیتؑ کا بہت اثر تھا، پھر بھی مدینے کا ایک وفد یزیدؑ کو سمجھانے کے لئے دمشق گیا مگر اس کو مایوس واپس ہونا پڑا۔ اس لئے اس وفد نے یزیدؑ کو معطل کر دیا، اس کے عامل کو مدینے سے نکال دیا اور اس کی جگہ عبداللہ بن حنظلہ کو سردار بنالیا۔ اس تبدیلی میں عبداللہ ابن زبیر کی ریشہ و دانیوں کا بھی دخل تھا جنہوں نے مکے میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔ امام زین العابدینؑ اس خلفشار میں مدینے سے باہر منبع میں جا کر مقیم ہو گئے۔

یزید اس خبر سے جل بھن کر کباب ہو گیا اور اس نے مدینے والوں کی سرکوبی کے لئے مسلم بن عقبہ کو متعین کر دیا۔ — مسلم کے لشکر سے ہتھام حرۃ اہل مدینہ کا مقابلہ ہوا، گھمسان کا رن پڑا مسلمانوں نے تعداد میں کم ہونے کے باوجود بڑی مردانگی دکھائی مگر وہ لڑنے والے پیاہی تو تھے نہیں۔ حافظان قرآن، علماء و صلحاء اور محدث، اور سنا تھا خونخوار مسلم بن عقبہ کا، جس کا ہر فوجی اپنے سردار ہی کا ساتھ تھا۔ اہل مدینہ کو شکست ہوئی اور ۲۰ رذی الحج ۶۲ھ کو مسلم بن عقبہ نے اپنے لشکر کو شہر کی غارتگری کے لئے چھوڑ دیا۔ جس نے تین روز تک شہر لوٹوں کا قتل عام کیا۔ باکرہ لڑکیوں کو حاملہ بنایا مسجد نبوی میں گھوڑے باندھے۔ پھر علی بن الحسین اور عبداللہ ابن عباس کے علاوہ بچے ہوئے لوگوں سے یزید کی بیعت لی۔

”مدینۃ الرسول کی تباہی یزید کا سب سے سیاہ کارنامہ ہے لیکن اس کی ذمہ داری سے اہل مدینہ بھی بری نہ تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ مخالفت کا انجام یہی ہو گا۔ اگر بتائے وہ بیعت کر لیتے تو اس کی نوبت نہ آتی“ (۹۷)

شاہ معین الدین کے اس مشورے کا مطلب یہ ہے کہ کھینچی ہوئی شمشیر سر پر ہو تو چنگیز خان کی بھی بیعت کر لینا چاہیے۔ بہر حال غلطی جس کسی کی ہو مگر نتیجہ یہ نکلا کہ :-

”وہ شہر جس نے رسول کو پناہ دی تھی، وہ شہر جو مصیبت کے وقت آنحضرت کے ساتھ رہا تھا، اب کشت و خون اور قتل عام کا آماج گاہ بن رہا تھا۔ ایسی دہشت ناک مثال یا تو فرانس کے سپاہیوں کی غدار یا پیروان لٹوہر کی روم پر تاخت و تاراج کی تباہی سے ملتی ہے۔ — اہتا یہ ہے کہ جامع مسجد کو طویلہ بنا دیا گیا۔ مزارات، زرد جواہر کی خاطر زمین کے برابر کر دیئے گئے۔ ایک بار پھر ظلم کی فتح ہوئی۔ — ایک یور وپن مورخ کے قول کے مطابق اس کا دوبارہ جنم اسلام کے لئے سخت خطرناک اور تباہی بخش ثابت ہوا۔ یہ عوض تھا بنی امیہ کی طرف سے اس لطف و کرم کا، جو فتح مکہ کے وقت ان کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔“ (۹۸)

مسلم بن عقبہ ایک سال تک مدینے کے نواح میں مقیم رہا اور عبداللہ ابن زبیر کی تیاریوں کا جائزہ لیتا رہا جو مکے میں خلیفہ رسول بن کئے تھے اور کافی علاقے پر قابض ہو گئے تھے۔ ۳۷۹ھ کے اوائل میں وہ مکے کا عازم ہوا۔

عبداللہ ابن زبیر کی خلافت

عبداللہ ابن زبیر نے امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی وفات کے بعد ہی سے اپنے کو مستحق خلافت سمجھنا شروع کر دیا تھا لیکن حضرت معاویہ کی سیاست اور طاقت سے مرعوب رہے۔ یزیدؒ نے تخت نشین ہونے پر جب مطالبہ بیعت کیا تو عبداللہ کے چلے گئے اور وہاں اعلان خلافت کر دیا۔

کچھ عجیب مفہوم ہے اس لفظ کا بھی۔ اس کو تعبیر کیا جاتا ہے نیابت رسول سے لیکن اس سے کام لیا جاتا ہے فرمانروائی، ملک گیری بلکہ جہان بینی کا جس کا کامیاب ترین اثر کار تلوار ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے تلوار کا استعمال کیا تھا مگر ثانوی درجے پر پہلے درجے پر بان تھی اور اسی کو اساسی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کے بعد پہلے تلوار پھر زبان حضرت علیؑ نے پیغمبر کی تاسی کی مگر مسلمان تلوار کے لوہے کے عادی ہو چکے تھے، زبان کی تیزی کو خاطر میں نہیں لائے اور حضرت علیؑ کے بعد صرف تلوار ہی تلوار رہ گئی عبداللہ ابن زبیر نے پہلے دن سے اس کا استعمال کیا اور اپنے ارد گرد تلواروں کی جمعیت اکٹھا کرنا شروع کر دی۔

”بشیر بن جذلم کی داپسی کے بعد حجاز میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ابن عباس

اور حضرت علیؑ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ کے علاوہ کل اہل حجاز نے

ابن زبیر کے ہاتھوں پر بیعت کر لی اور تمام اموی عمال کو مدینے سے

نکال دیا۔“ (۹۹)

اسی کے نتیجے میں مسلم بن عقبہ کا حملہ ہوا، واقعہ حرہ پیش آیا اور مسلم نے محرم ۳۷۹ھ میں مکے کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران مسلم کا انتقال ہو گیا اور حصین ابن نمیر نے فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی حصین نے شہر پر سنگ باری کرائی جس سے کعبہ کی بحر متی

بھی ہوئی۔ ابن زبیر اندر سے مدافعت کر رہے تھے لیکن ان پر دباؤ بڑھتا رہا تھا۔ اسی دوران یزید مرگیا اور ابن زبیر محاصرہ اٹھا کر واپس ہو گیا۔

مرگ یزید اور بنی مروان

یزید کی موت سے متعلق کئی روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے پیٹ اور سارے جسم میں آگ سی لگی رہتی تھی پانی پیتا اور پتیا چلا جاتا مگر پائیں نکھتی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سونے کے لئے لیٹا تو بھیجا مک خواب سے ڈر جاتا۔ مارے ڈر کے اس نے سونا چھوڑ دیا تیری یہ کہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ ایک طرف سے آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ وہ مع اپنے تمام ساتھیوں کے اٹھیں میں جل کر خاک ہو گیا۔

معاویہ بن یزید باپ کا جانشین ہوا مگر چالیس روز حکومت کر کے اس نے تخت پر بیٹھنے سے انکار کر دیا جس پر آل رسول کے خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مروان نے اس کو زندہ دفن کر دیا تھا۔ معاویہ کا آخری خطبہ آل رسول کے استحقاق اور بنی امیہ کی بددیانتی کی ایسی شہادت ہے جس کی تاب آج کے بنی امیہ بھی نہیں لا سکتے۔

معاویہ کا چھوٹا بھائی خالد بن یزید نابالغ تھا لہذا مروان نے ذی قعدہ ۶۴ھ میں عنان حکومت سنبھال لی اور ام خالد یعنی یزید کی بیوہ سے عقد کر لیا تاکہ بنی امیہ میں سے کوئی اس کی مخالفت نہ کرے۔

مروان نے سات اٹھ مہینے حکومت کی۔ اس عرصے میں اس نے ابن زبیر کی فوج کو شکست دے دی، مصر میں اپنی بیعت کرائی اور رمضان ۶۵ھ میں بغیر کسی بیماری کے مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ام خالد نے زہر دے کر یا کلا گھونٹ کر مراثی تھا کیونکہ وہ اپنے بعد خالد بن زید کے بجائے اپنے بیٹے عبدالملک کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔

عبدالملک بن مروان

مروان نے اپنے حین حیات تمام انتظامات کر لئے تھے۔ چنانچہ عبدالملک ۶۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہو گیا۔ وہ نظم سلطنت کے لئے حضرت معاویہ اور آل رسول کی دشمنی

میں باپ بیٹے دونوں کا پیرو ثابت ہوا مگر شروع میں اس کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف حجاز میں اور عراق کے ایک حصے میں عبداللہ ابن زبیر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے، دوسری طرف خونِ حسین کے انتقام کا آوازہ عراق کے درو دیوار میں گونج رہا تھا۔

عبداللہ طبعاً بہت ظالم، پخیل اور گندہ دہن تھا۔ اس نے اپنے جو عمال مقرر کئے، وہ اُسی کے سے تھے۔ حجاج بن یوسف، مہلب بن ابی سفرو، ختام بن اسمعیل، عبداللہ بن عبداللہ، موسیٰ بن نصیر، محمد بن مروان۔ ان سب نے استقرار حکومت اور توسیع مملکت میں اس کی مدد کی۔

مختار بن ابی عبیدہ ثقفی

حضرت مسلم ابتداءً کو نے میں مختار بن ابی عبیدہ ثقفی ہی کے مہمان ہوئے تھے مگر مختار کو کسی ضرورت سے باہر جانا پڑا۔ اس لئے حضرت مسلم حضرت اُمّی کے گھر منتقل ہو گئے۔ پھر دونوں ابن زیاد کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ — ابن زیاد نے کو فہ پہنچتے ہی تمام مہمان علی کو پایہ زنجیر کر دیا تھا جس میں مختار بھی تھے، وہ باہر سے واپس آتے ہی گرفتار کر لئے گئے تھے۔

ابو عبیدہ ثقفی حضور کے معزز صحابی تھے۔ ان کی بیٹی عبداللہ ابن عمر کو بیاہی تھی، مختار نے امیر المومنین کی صحبت اٹھائی تھی اور وہ روشنی دیکھی تھی جو خاندانہ رسالت سے ملتی ہے۔ پھر بھی بہن کے رشتے سے آپ نے عبداللہ ابن عمر کو اپنی اسیری کی اطلاع دی اور ان کے لکھنے پر یزید نے مختار کو رہا کر دیا۔ — ابھی اہل بیت اظہار کو کھنے ہی میں تھے کہ مختار راہو کو مسجد میں گئے تو ابن زیاد برسرِ منبر کھڑا تھا۔

”خدا کا شکر ہے کہ یزید کو عزت ملی اور حسین کو ذلت!“

مختار برداشت نہ کر سکے۔ آپ نے فرمایا:۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس نے حسین کو بہشت میں خلعت پہنائی اور یزید کے

نگے میں طوقِ لعنت ڈالا جائے گا“

ابن زیاد نے آگ بگولا ہو کر اپنا عصا مختار کی پیشانی پر مار دیا اور آپ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ اب کی مختار قید کئے گئے تو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی پہنائی گئیں اور انھیں ایک تنگ وتار یک کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔

اتفاق سے کثیر ابن عامر بھی ان ہی دنوں قید خانے لائے گئے۔ ان کا جرم بھی جُب علی تھا۔ انھوں نے قاتلانِ امام مظلوم پر لعنت بھیجی تھی جس کو سان بن انس کے بیٹے نے سن لیا اور لگائی جُبجائی کر کے گرفتار کر دیا۔ کثیر کی بھتیجی بقتان، ابن زیاد کے بچوں کی دایہ تھی۔ اس نے ابن زیاد کی بیوی سے کہہ کر کثیر کو چھڑوا دیا اور کثیر مختار کا خط لے کر قید خانے سے باہر آ گئے۔

وہ بذاتِ خود مدینہ گئے۔ عبداللہ ابن عمر سے یزید کے نام خط لیا پھر دمشق پہنچ کر وہ خط یزید کو دیا اور حکم دہائی لے کر کوفہ آ گئے۔ عبداللہ ابن عمر کی شخصیت یوں بھی موقر تھی اور رسول کے صحابیوں میں صرف ابن عمر ہی نے یزید کا ساتھ دیا تھا لہذا یزید عبداللہ کی بات کو ٹال نہ سکتا۔

ابن زیاد کسی قیمت پر مختار کو رہا کرنے پر تیار نہ تھا مگر حکم شاہی کے سامنے اس کی مجال کیا سستی مجبوراً اس نے مختار کو آزاد کر دیا۔ ایسے فرماں بردار ملازم کے لئے کون یقین کر سکتا ہے کہ امام حسین کے سلسلے میں اس نے خود رائی سے کام لیا!

مختار کے سامنے اُس وقت دو دشمن تھے۔ بنی امیہ اور عبداللہ ابن زبیر، بڑے دشمن سے بیٹنے کے لئے انھوں نے چھوٹے دشمن یعنی عبداللہ ابن زبیر کو ملانے کی کوشش کی مگر ان سے شرائط طے نہ ہو سکے۔

لیکن جب ابن نمیر ایک شکوہ گزار لے کر دوسری بار شام سے آیا تو عبداللہ ابن زبیر بدحواس ہو گئے اور انھوں نے مختار کی شرائط قبول کر لیں۔ مختار نے شکر شام کا اہتمام کیا، اس کو شکست دی اور نواح کے تمام علاقے ابن زبیر کے تابع آ گئے لیکن انہوں نے مختار سے کیا ہوا کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ پہلی شرط اہل بیت کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تھی، دوسری خود مختار کو عامل کو فربانے کی۔

اس بد عہدی سے پریشان ہو کر مختار چھپ چھپا کر مدینے پہنچے اور حضرت محمد حنفیہ سے مل کر کوفہ آگئے جہاں وہ عبداللہ ابن زبیر کے حکم سے گرفتار کر لئے گئے۔ عبداللہ ابن عمر کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے عبداللہ ابن زبیر پر زور ڈالا اور مختار پھر رہا کر دیئے گئے۔ یزید کی خبر مرگ جب کوفہ پہنچی تو ابن زیاد بصرہ گیا ہوا تھا۔ شیعان علیؑ نے اس سے فائدہ اٹھایا اور زندان توڑ کر باہر آ گئے۔ ابن زیاد کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا اور غلاموں کو قتل کر ڈالا۔

کُل ساطعہ چار ہزار قیدی تھے جن میں شیعہ تو کم ہی تھے جیسے سلیمان بن صرد خزاعی، ابراہیم بن مالک اشتر، عبداللہ بن سعد، عبداللہ بن دال، زفاعہ بن شداد اور مسیب بن نجبه وغیرہ، باقی تمام ایسے لوگ تھے جو آل رسولؐ کو افضل سمجھتے تھے ابن زیاد نے ان سب کو گرفتار کر لیا تھا، جن پر علیؑ کی دوستی کا شبہ بھی تھا۔ مسیب بن نجبه کو بعد واقعہ کربلا لوگوں کو انتقام پر ابھارنے کے الزام میں قید کیا گیا تھا۔ رہا ہوتے ہی سب سلیمان خزاعی کے مکان میں جمع ہوئے، ریل جُل کر ایک منصوبہ بنایا گیا اور قتل حسینؑ کا انتقام لینے کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔

منتقام خون حسین

تاریخ اس جماعت کو تو آئین کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے اور پرانے سب اہل کو اسی نام سے پکارتے رہے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے نہ کوئی نائب اور توآب کسی نے کوئی گناہ ہی نہ کیا تھا جس سے وہ نائب ہوتا۔ امام حسینؑ سے کوئی بیوفائی نہیں کی تھی؟ جس کا ازالہ انھیں کرنا ہوتا۔ وہ تو بڑے بلند پایہ دیندار تھے جن کے ایمان کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ آل رسولؐ کے پر دانے جو اپنے بال بچوں کو بھی خانوادہ رسالت پر قربان کر سکتے تھے۔ قصوران کا صرف اتنا تھا کہ بنی امیہؑ سے خون اہل بیت کا حساب لینے کے لئے اٹھے تھے لہذا انھیں بدنام کرنے کے لئے توآب کہہ دیا گیا۔

حالات شاہد ہیں کہ جب امام حسینؑ پر یغادر کرنے کے لئے فوجیں جمع کی جا رہی تھیں تو وہ زندان کوفہ میں تڑپ رہے تھے۔ نگرانی اتنی سخت تھی کہ کوشش کے باوجود نکل نہ

سکے اور حسین قتل ہو گئے مگر موقع ملتے ہی سر میدان آ گئے اور سروں سے کفن باندھ کر عہد کیا کہ قاتلان حسین میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اولادِ معاویہ کے خلاف یہ جسارت بددیانتی مودّخ کیونکر پسند کرتا، اس نے دل کے پھیلے پھوٹنے کے لئے انہیں مطعون کرنے کی کوشش کی اور تو ابین کہنا شروع کر دیا جس کو بغیر تحقیق کے آج تک کا مودّخ کہتا رہا ہے۔ — حالانکہ سچ یہ ہے کہ وہ تو آب نہیں منتقم تھے۔

سیلمان بن صرد خزاعی

بے محل نہ ہوگی یہ وضاحت کہ ان میں بعض لوگ بھی شامل تھے جو حبِ اہلبیت سے کوئی واسطہ نہ رکھتے اور جنہوں نے امام حسین کو بتقاضائے وقت خطوط لکھے تھے ان میں سے ایک گروہ تو فوراً روگرداں ہو گیا اور بنی امیہ کی فوج میں شامل ہو کر قاتلانِ حسین کی تعریف میں آگیا۔ ایک گروہ غیر جانبدار ہو کر خاموش تماشائی بن گیا۔

۱۰۔ ارمحرم ۱۱ھ کے بعد جب خونِ شہیداں رنگ لایا اور عترتِ رسول گرفتار ہو کر کوچہ و بازار میں پھرائی گئی تو پتھر بھی پیسے لگے، اور ان لوگوں کو احساس پیدا ہوا کہ اگر وہ امام کو خطوط لکھ کر نہ بلاتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ اپنی غلطیوں کے احساس پر انہوں نے طے کیا کہ وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کریں گے۔ وہ تھے حقیقتاً شیعیانِ معاویہ، لیکن یزیدیوں کی سفاکی اور اہل بیت کی مظلومیت نے انہیں ایک ذہنی انقلاب سے نوازا کر دیا اور وہ سیلمان بن صرد خزاعی کے علم کے نیچے آ گئے۔

ایسے لوگ یقیناً تو آب تھے اور گروہ منتقم میں ان کی اکثریت تھی مگر ان کے سہارے سب کو تو ابین کہہ دینا تاریخی خیانت ہے۔

ایسی ستم ظریفی کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

”۶۲ھ میں ایک شخص مختار بن ابی عبید قحقی خونِ حسین کے

انتقام کی دعوت لے کر اٹھا اور عراق پر قابض ہو گیا۔ یہ ایک معمول اور بے دین لیکن عالی دماغ اور حوصلہ مند شخص تھا۔ اس دور کی فطرت

اور طوائف الملوک کو دیکھ کر اسے بھی قسمت آزمائی کا حوصلہ ہوا۔“ (۱۰۰)

شاہ معین الدین ندوی نے جس انداز پر لکھا ہے، اسی طرح سارے مؤرخ کردار کشی کرتے رہے ہیں۔ واقعات کے تسلسل میں بیان کیا جاتا ہے کہ امام زین العابدین اور محمد حنفیہ کسی نے مختار کو منہ نہیں لگایا، حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ امام کشت و خون کی کمی ہم میں اپنے کو ملوث کرنا نہ چاہتے تھے جو پورے خاندان رسالت کی سیرت ہی سخی اور آئندہ بھی اس میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ پھر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ امام نے کبھی مختار کی مخالفت نہیں کی بلکہ اگے چل کر اظہارِ خوشنودی بھی کیا۔

حقائق کو مسخ کرنے کے ساتھ اسلوب بیان دل میں چھپے ہوئے عناد کا غماز ہے ایک شخص مختار بن ابی عبیدہ — ایک معمولی اور بے دین — کسی مزید صراحت سے قبل حضرت ابو عبیدہ ثقفی کی شخصیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے: بزرگ ترین صحابی، مقدس جہانیدہ اور تجربہ کار جرنیل، دورِ اولین میں جن کی برتری مسلم رہی اور جن کے نام کے ساتھ ہمیشہ حضرت اور رضہ لگایا گیا لیکن مختار کی ضد میں باپ بھی اس اعزاز سے محروم کر دیا گیا جب کہ عبداللہ اور زبیر دونوں ابو عبیدہ کے سامنے قابلِ ذکر بھی نہیں ہو سکتے، ان کے نام بغیر رضہ کے لکھے نہیں گئے۔

پھر اسلوب بیان میں ”ایک شخص، ایک معمولی اور بے دین“ قابلِ ملاحظہ ہیں۔ مختار کو بے قیمت ظاہر کرنے کی یہ بھی وجہ صرف اتنی ہے کہ وہ محمد بن ابوبکر کی سطح پر آگئے تھے اور سب سے بڑا غضب انہوں نے یہ ڈھایا تھا کہ انتقام خونِ حسین کا نعرہ لگا رہے تھے۔ وہ گئی بے دینی تو علی کی محبت ان معنی میں بے دینی ہی تھی کہ حضرت معاذ انہیں قابلِ لعنت سمجھتے تھے۔

یہ تاریخی بددیانتی کسی خاص دور سے مختص نہیں۔ شروع ہی سے اس پر عمل درآمد رہا اور آج بھی یہ سلسلہ بند نہیں — آج جو کچھ لکھا جائے گا وہ کل مستند ہوگا آج اگر شیعہ عقیدے کی ایک مسلم شخصیت محمد علی جناح کو کُشی العقیدہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اُسے دلے کل میں کسی کو اس میں کوئی شک ہی نہ ہوگا اور جھوٹ اتنی بار دہرایا جائے گا کہ سچ اس کے سامنے ماند پڑ جائے گا۔ مسلمانوں کی پوری تادیب

اسی لائحہ عمل سے ترتیب دی گئی ہے اور ہم آج جو بھی بدیہی حقیقت پیش کرتے ہیں اس کو یہ کہہ کر جھٹلایا جاتا ہے کہ راوی ثقہ نہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ثقہ کون ہے؟ وہ جو بغیر سُننے ہزاروں حدیثیں بیان کر دے یا وہ جو صرف ستھوڑی سی حدیثیں پیش کرے کہ میں نے اپنے باپ سے، باپ نے میرے داد سے اور دادا نے براہِ راست رسول اللہ سے سنا کیونکہ دادا رسول اللہ کے بیٹے تھے۔

ہٹ دھرمی شروع ہی سے اپنی انتہا پر تھی۔ رسول کی اکلوتی بیٹی جو طاهرہ بھی تھی، صدیقہ بھی جس کی شان میں آیات بھی اتری تھیں اور احادیث بھی بیان ہوئی تھیں، جس کی منزلت یہ تھی کہ خود پیغمبرِ تعظیم کے لئے اُٹھتے تھے اور مباہلہ میں عیساہوں کے مقابلے پر جو سرمایہ واحد تھی یعنی جو بھی تھے، وہ اس کے باپ، اس کے شوہر اور اس کے بچے۔ اس نے جب دعویٰ کیا تو کہا گیا کہ ثبوت لاؤ، گویا خود حضور سے ان کی صداقت کا ثبوت طلب کر لیا گیا اور آخر میں اس کو جھوٹا ٹھہرا دیا گیا — ایسے حالات میں اگر ہمارے راوی ثقہ راوی قرار نہ دیئے جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی زندگی میں اور رسول کے بعد صرف دو گروہ تھے: علیؑ کے دوست اور علیؑ کے دشمن۔ علیؑ کے دشمن زیادہ اس لئے تھے کہ میرٹھ تر قبائل کے سربراہ مردہ مشرکین کو علیؑ نے قتل کیا تھا اور ان کی اولاد مسلمانوں کی صفوں میں شامل تھی جو علیؑ سے کینہ رکھنے کی بنیاد پر آپس میں متحد تھی۔ — حسینؑ علیؑ کے بیٹے تھے۔ اور آپ کے قاتل علیؑ دشمنوں کے وارث، لہذا قاتلوں سے انتقام لینے والا قابلِ ستائش کیونکہ مرسکتا تھا۔ اس لئے پہلے گروہ کو منتقم کے بجائے ثواب اور دوسرے گروہ کے سردار مختار ابن ابی علیہ کو بہت معمولی آدمی اور بے دین مسلمان قرار دیا گیا۔ — حالانکہ مختار کی اہمیت یہ تھی کہ قید میں نہ ڈال دیئے جاتے تو کربلا میں بہتر آدمی نہ ہوتے تو اِج کوفہ کے کئی قبیلے بڑی شدت کے مقابل صفت اُرا نظر آتے — مختار کے مقابلے میں منافق ابوسفیان اور اس کا منافق پوتا یزید قابلِ احترام قرار پاتا ہے کیونکہ دونوں دشمنِ اہل بیت اور قاتلِ آلِ رسول ہیں۔

بلاشبہ خونِ حسین کا انتقام مختار کا مقصدِ حیات تھا مگر ان کی سیاسی بصیرت کا تقاضا یہ تھا کہ پوری تیاری کے بعد میدان میں آئیں۔ اس کے برعکس سلیمان خزاہی اور سید بن نجیہ وغیرہ کا خون کھول رہا تھا۔ ان میں تابِ ضبط باقی نہ رہی تھی لہذا جب مختار مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ کا دورہ کر کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے اور زمین اپنے لئے ہموار کر رہے تھے تو سلیمان خزاہی اپنے پرچم کے نیچے ایک تعداد جمع کر چکے تھے تاہم ان کو ۱۶ھ سے جمادی الآخر ۶۵ھ تک چار سال لگ گئے۔

جنگِ عین الورد

اب تقریباً دس ہزار آدمی جمع ہو چکے تھے لیکن ان میں ایک تعداد صرف شہریوں کی تھی جو تلوار چلانا تو جانتے تھے لیکن وہ میدان کے شیر نہ تھے۔ ان لوگوں نے یکم ربیع الثانی ۶۵ھ کو شام کی طرف پیش قدمی کی۔ اور قلعہ عین الورد کے قریب خیمہ زن ہو گئے شام کی فوج بھی مقابلے پر آچکی تھی۔ سرخیل ابن ذوالکلاع ان کا مقدمہ الحیش تھا۔ سلیمان خزاہی نے اس پر شب خون مارا اور شکست فاش دے کر مار بھگایا۔ دوسرے دن ان کا مقابلہ حصین ابن یمنیر سے ہوا جو بنی امیہ کی پوری طاقت کے ساتھ آیا تھا۔ فریقین نے خوب خوب دادِ شجاعت دی اور طرف دارانِ آلِ محمد کی بڑی تعداد ماری گئی مگر تین سو تیرہ آدمی جو سردوں سے کفن باندھ کر آئے تھے ان میں سے ایک نے بھی قدم پیچھے نہ ہٹاے۔

لڑتے لڑتے رات ہو گئی۔ اس وقفے میں سلیمانؒ منزلِ شہادت پر فائز ہو گئے۔ سید نے علم منہ حال لیا پھر سید بھی لہو لہاں ہو کر زمین پر گر گئے تو عبد اللہ بن دال نے ان کی جگہ لی منتقمانِ خونِ حسین گنتی میں رہ گئے تھے اس لئے بڑی تیزی سے کٹ کٹ کر گر رہے تھے مگر کوئی پیچھے نہ ہٹتا۔ گویا شہدائے کربلا کی طرح صرف مرنے ہی کے لئے آئے تھے۔ آخر عبد اللہ بن دال نے شہادت پائی تو عبد اللہ بن نفیل نے علم ہاتھ میں لے لیا اس کے بعد خالد بن سعد نے۔

شب کی تاریکی پوری طرح پھیل گئی اور خالد بھی زمین پر گر گئے تو رافع بن شداد

نے علم ہاتھ میں لیا اور گھوم کر دیکھا تو صرف چند نفوس باقی تھے وہ ان کو لے کر میدان سے نکل آئے اور کونے کے عازم ہو گئے۔

انتقام کا دوسرا پرچم

مختار اور ابراہیمؒ بن مالک اشتر کا منصوبہ سیاستِ وقت کا تابع تھا۔ ان دونوں کو میدانِ حرب کا تجربہ بھی تھا اور حالات کو سمجھنے کا شعور بھی۔ سلیمان خراسانی اور سبب دیگر وہ ایک جذبہٴ دلاور جو شہادت میں نکل پڑے تھے۔ ان کے ساتھیوں کی اکثریت جنگ کی ایجاد سے بھی واقف نہ تھی تاہم انہوں نے شہادت کا مقصد حاصل کر لیا اور عراق والوں کو بتا دیا کہ حسینؑ کے نام پر جی اٹھنے والے اس طرح جانیں بھی دے دیتے ہیں اس سے مختار کی تحریک کو بہت فائدہ ہوا اور ایک بڑی تعداد جو شہ انتقام میں مختار کے علم کے نیچے آ گئی۔

مختار دابراؒ نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی تحریک چلائی تھی۔ عبداللہ بن مطیع عابد کو فوج کو اطلاع تو ہو گئی تھی مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اتنی جمعیت ان کے ساتھ ہو گئی ہے۔ ۴ ربیع الاول ۶۵ھ شب پنجشنبہ مختار نے کونے کے یاہر سب کو جمع کیا اور پندرہ ہزار آدمی لے کر شہر کا رخ کیا۔

عبداللہ بن مطیع کو خبر ہوئی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے شیبث بن ربعی کو تین ہزار اور ارشد بن ایاس کو چار ہزار فوج کے ساتھ روکنے کا حکم دیا مگر ایک طرف مالک اشتر کا بیٹا، دوسری طرف ابو عبیدہ کا فرزند۔ ان کا مقابلہ کون کرتا۔ ارشد مارا گیا۔ دو ہزار فوج عمر بن حجاج کے تحت اور دو ہزار شمر کی ماتحتی میں روانہ ہونے کو تیار ہی تھی کہ ابراہیمؒ شہر میں داخل ہو گئے۔ نوفل بن مساحق نے پانچ ہزار مزید فوج سے روکنے کی کوشش کی مگر ابراہیمؒ کسی شیر غضبناک کی طرح ٹوٹ پڑے۔ دشمن کے پاؤں اٹھ کر گئے۔ ابن مطیع نے بھاگ کر دارالامارہ میں پناہ لی اور دروازے بند کر لئے۔ تین روز بعد ابن مطیع قمار ہوتے کا میاب ہو گیا، محصورین نے دروازہ کھول دیا اور پناہ کے طالب ٹٹ گئے۔ اب مختار امیر کو فوج تھے۔ آپ نے مختلف مقامات پر اپنے عامل مقرر کئے اور فوج

کوانعامات تقسیم کئے۔

عبداللہ کا بھائی مصعب ابن زبیر بصرہ کا حاکم تھا وہ اس خبر کے سُننے ہی میں ہزار فوج لے کر چل پڑا۔ ابراہیمؒ نے کونے سے نکل کر مقابلہ کیا۔ ابن مطیع مارا گیا اور مصعب بصرے کی طرف فرار ہو گیا۔

مصعب نے عبداللہ ابن زبیر سے مدد مانگی مگر وہ طائف و یمن کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھے۔ مجبوراً مصعب نے عبدالملک بن مروان کو لکھا — سمجھیں نہیں آتا کہ مصعب کا عبدالملک سے کیا رشتہ تھا۔ وہ تو ابن زبیر کا سب سے بڑا حریف تھا لیکن مختار کے مقابلے میں شاید دونوں میں کوئی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ تب ہی عبدالملک نے اہل بیت کے سب سے بڑے دشمن عامر بن ربیعہ کو ستر ہزار کا لشکر دے کر مصعب کی مدد کے لئے بھیج دیا۔

اس درمیان مختار کی طرف سے زید بن انس نے موصل میں ابن زیاد کو شکست دی مگر جنگ کے بعد زید کا انتقال ہو گیا۔

عامر بن ربیعہ کوفے سے دس فرسخ پر آکر مقیم ہو گیا۔ بظاہر وہ مختار کا لشکر پہنچنے کا منتظر تھا مگر دفریب بنی امیہ کے خیمہ میں پڑا تھا وہ کسی اور گھات میں تھا۔ اس نے کچھ جاسوسوں کو بھیج دیا کہ کسی طرح ابراہیمؒ اشتر کو گرفتار کر لائیں۔ جاسوسوں نے ابراہیمؒ کی فوج میں گھل مل کر رات میں ابراہیمؒ کو پکڑ لیا اور اپنے لشکر میں پہنچا دیا۔ ابراہیمؒ نے اپنے کو اس عالم میں پاکر ہوش و حواس برقرار رکھے اور کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ عامر اور اس کے افسران بھی تعاقب میں دوڑ پڑے۔ ابراہیمؒ ایک درخت پر چڑھ گئے اور انہوں نے اپنے کو پتوں کی آڑ میں چھپا لیا۔ اتفاق سے عامر اُسی درخت کے نیچے آکر ٹھہرا تو ابراہیمؒ درخت سے کود پڑے اور نیچے آتے ہی خنجر سے کام تمام کر دیا۔ افسران فوج جب تک پہنچیں پہنچیں، ابراہیمؒ عامر کے گھوڑے پر کوفے کی طرف ڈانہ ہو گئے۔ اگلے ہی دن مختار نے اموی لشکر پر حملہ کر دیا اور ۲۶ ہزار آدمی قتل کر ڈالے۔

مضر دین کی ایک تعداد صحرائیں پیاس سے ہلاک ہو گئی۔ بمشکل دس ہزار آدمی واپس

ابو عمرہ جن قاتلوں کے مکانات سے واقف تھے، ان کو انھوں نے منہدم کر دیا اور جو دشمن ہاتھ آئے، انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مختار نے معمول بنالیا تھا کہ دن بھر منجر شہر کے گلی کوچوں میں گھوم کر پتہ لگاتے، رات میں گرفتاری ہوتی اور اگلے دن وہ دربار میں پیش کئے جاتے۔ پہلے دن ابو عمرہ دو قاتلوں کو لائے۔

ابو اسما بشار بن سمیط۔ حضرت مسلم کے بیٹوں کا قاتل تھا۔ مختار کے غلام نے انہیں قتل کیا۔

نافع بن ملک نے مشک سکیٹ پر تیر چلایا تھا اور جس کے بعد حضرت عباسؓ مایوس ہو کر گر گئے تھے۔ اس نے خود بیان کیا، قتل کر کے اس کی لاش جلا دی گئی۔

عبداللہ بن کامل نے ایک ضعیف کے ذریعے تین قاتلوں کو گرفتار کیا۔
حاتث بن بشیر کسی خاص شہید کا قاتل نہ تھا مگر کربلا میں موجود تھا اس لئے قتل کر دیا گیا۔

قاسم بن جارد دشمن اہل بیت تھا مگر اس کے خلاف کربلا جانے کا ثبوت نہیں ملا لہذا وہ چھوڑ دیا گیا۔

حاتث بن نوفل نے جناب زینبؓ کو مایانہ لگایا تھا۔ مختار نے اس کو اتنے تازیانے لگوائے کہ وہ اسی جگہ ہلاک ہو گیا۔

اسحق بن اشعث سچائی تھا عبداللہ بن کامل کی بیوی کا، مگر تھا قاتلین کربلا میں مختار نے معاف نہیں کیا، قتل کر دیا۔

کوفے کے مہاجرین اہل بیت خود دن بھر قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے، ایک دن صاحبانِ ایمان کی سراغ دہی پر دس آدمی پکڑ کر لائے گئے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ لاشوں کی پامالی میں وہ شریک تھے۔ مختار نے ان سب کو زمین پر لٹا کر پہلے ان کے ہاتھوں اور پیروں میں لوہے کی میخیں ٹھکرائیں پھر ان کو جیتے جی گھوڑوں کی ٹاپوں سے کھینچ ڈالا۔

مالک بن بشیر جب پکڑا گیا تو سر باز قتل کیا گیا پھر اس کی لاش جلا دی گئی۔
کوئی قاتل جب پکڑ لایا جاتا تھا تو حضرت مختار پہلے اس کا جرم خود اس کی
زبان سے قبول لیتے تھے جس سے دربار میں ایک کھرام مچ جاتا تھا پھر قاتل کو سزا دی
جاتی۔ اس طرح مجاہد حسین ایک ایک دن میں کئی کئی مجلس سنتے اور ان کو اپنے گھر
میں بیان کرتے تو غور میں روتے روتے بے حال ہو جاتی تھیں۔ مختار کو ابھی خاص
خاص قاتلوں کی تلاش تھی، جن کے لئے وہ تاکید پتہ تاکید کئے جا رہے تھے۔ آخر ایک
دن خولی ابھی پکڑ ہی لیا گیا۔

ابو عمرؓ نے پتہ لگا کر اس کے گھر کو گھیر لیا تو وہ پاخانے گھس گیا۔ اس کی ایک بیوی
شامی سہتی عبداللہ بن کامل نے مکان میں داخل ہو کر اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ
دو ماہ سے گھر نہیں آیا۔ دوسری بیوی مومنہ تھی۔ اس نے دریافت کرنے پر زبان سے
انکار کیا مگر سر ملا کر بیت الخلا کی طرف اشارہ کر دیا۔ عبداللہ نے جا کر دیکھا تو وہ اوندھے
مٹہ پڑا ہوا تھا۔ وہ مشکیں باندھ کر لایا گیا تو مختار نے اس کی شامی بیوی کو گرفتار کر لیا۔
اس نے بتایا کہ جب خولیؓ سرانام لے کر آیا تھا تو وہ بہت خوش ہوئی تھی مختار
نے اسی وقت اس کو قتل کر دیا پھر مختار نے خولیؓ سے پوچھا۔

”بتا تو نے کیا کیا۔“

خولیؓ بتانا نہ چاہتا تھا مگر کونے میں اس کی بے رحمی کے گواہ موجود تھے لہذا اس
کو بیان کرنا پڑا۔

”امام کا سر نیزے پر لے کر نکلا تھا۔“

مختار کی تاب ضبط جواب دے چکی تھی مگر وہ اپنے کور و کے رہے اور نوکِ شمشیر
اس کے سینے پر رکھ کر پوچھا۔

”اور کیا کیا۔“

”زینبؓ کی چادر چھینی تھی۔“ سکینہؓ کے گوشوارے نوچے تھے۔

زین العابدینؓ کے نیچے سے بستر کھینچا تھا۔“

مختارؒ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگے۔ اہل دربار نے پچھاڑیں کھائیں —
پھر مختارؒ نے اشارہ کیا۔
پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر چھوڑ دیا گیا۔ وہ تڑپتا رہا پھر اس کو اسی حالت
میں جلوا دیا گیا۔

ایک روز ایک بچے کے ذریعہ سراج لگا کر عبداللہؒ کا دل چار اشیا کو پکڑ کر لائے
یزید بن نمیر نے بتایا کہ اس نے حضرت حمزہؓ کے غلام کو قتل کیا تھا۔
زیاد بن مالک نے اعتراض کیا کہ عابؓ ابن ابی شیبہؓ شاہری کو شہید کیا تھا۔
بکر بن احمد نے بیان کیا کہ اس نے ایک ضرب حبیبؓ ابن مظاہر پر لگائی تھی۔
عیسٰیؑ نے کہا کہ خیمے ٹوٹنے میں شریک تھا۔

مختارؒ نے ان سب کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد وقفہ وقفہ سے سات اٹھ آدمی
لائے گئے جو کہ بلا میں شامی فوج کے شریک تھے اور جنہوں نے شہداء کو گھیرنے اور قتل
کرنے میں مدد کی تھی۔ مختارؒ نے ان سب کی گردنیں اڑا دیں — عمر بن خالدؓ بن عبد الرحمن
بن خشارہ، عبد اللہ بن قیس، عبد اللہ بن صلیح، عبد الرحمن بن صلیح، عبد اللہ بن مہب
عمر صبادی (لعنت اللہ)

ابو عمرہ کیساؓ اور عبد اللہ بن کامل ہمہ تن قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں تھے
ان کے آدمی بھی ہر وقت گھات میں لگے ہوئے تھے۔ ان کوششوں میں مسلسل
کامیابی ہوتی رہی اور قاتل یکے بعد دیگرے لائے جاتے رہے۔
بجمل بن سلیم وہ ملعون تھا جس نے امام کی انگلی کاٹ کر انگشتی نکال تھی۔
بعض راویوں نے اس کا نام جہاں لکھا ہے۔ مختارؒ نے اس کی انگلیوں کا ایک ایک پورا
جدا کر لیا پھر اس کو قتل کر دیا۔

حکیم بن طفیلؓ ایک سرے میں جا کر چُپ گیا تھا۔ ابو عمرہ اس کو گرفتار کر کے
لائے تو اس نے بتایا کہ۔

”میں نے عباسؓ کا ایک بازو قطع کیا تھا پھر آپ کے سینے پر تیر مارا تھا۔“

مختار نے اس کو کمترک گردا دیا اور اتنے تیر برسوں کے اس نے دم توڑ دیا۔
زید بن ورقہ گرفتار کر کے لایا گیا تو اس نے کہا۔

”میں خطا وار ہوں امیر! میں نے عبداللہ بن مسلم کو تیر مارا تھا۔ اس نے گھبرا کر
پیشانی پر ہاتھ رکھا تو دوسرا تیر چلایا اور بچے کا ہاتھ پیشانی میں چھد گیا پھر میں نے ایک
تیر اس کے پیٹ پر چلایا جو اس کے شکم کے پار بھل گیا۔“
مختار صبح کو رد پڑے اور اس کو دیسی ہی سزا دلوائی۔ پہلے اس کو سنگسار کیا گیا پھر
تیر برسائے گئے اور آخر میں لاش جلائی گئی۔

سنان بن انس بھاگ کر بصرہ چلا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد قاصد یہ آیا تو مختار کے
جاسوسوں نے گرفتار کر لیا۔ خنجر گھے پر رکھ کر اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا۔
”میں حضرت کا کمر بند لینے کے لئے بڑھا تھا تو آپ نے ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے
ہاتھ توڑ کر پھینک دیا اور کمر بند لے لیا۔“

ابراہیم یمن کی ایک دیوانگی میں چپخنے لگے۔ انہوں نے اس کو چت لٹایا اور
دونوں آنکھیں نکلوا لیں پھر ناخن اکھڑوائے، دونوں ہاتھ توڑوائے۔ اس کی رانوں
کا گوشت بچوایا اور اس کے منہ میں دے کر کھانے پر مجبور کیا۔ پھر ایک ایک بند جلا
کر کے کھولتے ہوئے روغن میں ڈلوادیا۔

عمر بن صبیح تیر انداز تھا۔ وہ لایا گیا تو تیروں سے ہلاک کیا گیا۔
عبداللہ بن اسید اور مالک بن شعث نے کہا کہ انہیں زبردستی بھیجا گیا تھا مگر انہوں
نے ٹوٹ میں حصہ ضرور دیا۔ دونوں قتل کر دیئے گئے۔

قیس بن حفص عورتوں کا لباس پہن کر بھاگ رہا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا اور
اقبال جرم کے بعد داہر پر چڑھا دیا گیا۔

عبداللہ بن سعید نے خیوں کو آگ لگانے کا اعتراف کیا مگر یہ عذر کیا کہ اس
نے عمر بن سعد کے کہنے سے ایسا کیا تھا۔ مختار نے اس کو قتل کر کے جلا دیا۔

عمار بن خالد قاتل تھا عبدالرحمن بن عقیل کا۔ جس وقت یہ گرفتار کر کے لایا گیا

عین اسی وقت عبدالرحمن کا تینم پجہ دربار میں آیا جس کا گھر مسلم بن عقبہ نے مدینے میں تاراج کر دیا تھا اور وہ کسی طرح کوئے پہنچا تھا۔ مختارؒ نے عزت و احترام کے ساتھ اس کو بٹھایا، تحفے تحائف اور زر نقد پیش کیا اور غماز کو اسی کے ہاتھ سے قتل کرایا۔

عمر بن سعد کوئے سے بھاگ گیا تھا مگر چھپ کر کئی مرتبہ آیا۔ اس دفعہ پکڑ لیا گیا مختارؒ کی ایک بہن اس کو بھی بیاہی تھی۔ اس کو امید تھی کہ مختارؒ بہن کے رشتے سے اس کو چھوڑ دیں گے۔ مختارؒ نے اتنی رعایت ضرور کی کہ اس کو کچھ کہنے کا موقع دیا مگر اس کے پاس کہنے کے لئے تھا ہی کیا — مختارؒ نے رسی سے بندھوا کر پہلے اس کے انت تڑوائے، انگلیاں پور پور سے جھڑکوائیں، ناک اور کان کٹوائے پھر آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں۔ آخر وہ خود ہی ہلاک ہو گیا۔

عمر بن حجاج بھاگ کر بصرہ جا رہا تھا۔ ابو عمرؒ نے بمقام بیضہ اس کو جا کر پکڑا اس کو پاسبان ہو گئی تھی۔ اس کی شدت میں وہ گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ابو عمرؒ کو یاد آ گیا کہ اسی ظالم نے امام پر نہر فرات کا پانی بند کیا تھا اور ہنگام قتل امامؒ کے جسم اطہر پر تلوار مار دی تھی۔ ابو عمرؒ اپنے غصے پر قابو نہ پا سکے۔ انہوں نے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مار ڈالا۔

حفص بن عمر سعد، مختارؒ کا بھانجہ تھا اس نے باپ کو مشورہ دیا تھا کہ حکومت رے کا وعدہ نقد ہے اور جنت کا خیال ادھار۔ مختارؒ نے اس کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی اور جیسے ہی وہ لایا گیا اس کو قتل کرا دیا۔

مرہ بن منذر حضرت علی اکبرؒ کا قاتل تھا۔ گرفتاری سے قبل اس نے سخت مقابلہ کیا۔ آخر گرفتار ہو کر مختارؒ کے سامنے لایا گیا۔ مختارؒ نے اس کے دونوں ہاتھ اور زبان کٹوائی، پھر آنکھیں نکلوائیں اور پھر دونوں ہونٹ کٹوا کر جسم کو جلو ا دیا۔

قاضی شریح قتل حسینؒ کا فتویٰ دینے والوں میں تھا۔ اسی نے حضرت مسلمؒ اور ہانیؒ کو شہید کروایا تھا مختارؒ نے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ زبان گدی سے کھینچوا لی اور قتل کر کے لاش نذر آتش کر دی۔

سامان لوٹنے والوں کا سرخ نگا نا کچھ آسان نہ تھا مگر مختار کے آدمیوں نے ماتم کو کم کرنے اور ان کو پکڑ کر دربار میں لے آئے۔ امیر مختار نے سب کی کھال کھینچ کر قتل کر دیا۔ لاشوں پر گھوڑے دوڑانے والے بھی بڑی مشکل سے باری باری پکڑے گئے یہ اسحق بن حویرہ، رضی بن منقذ، سالم بن حشیم، صالح بن وہب، اخنس بن مرتد، خط بن ناعم، ثانی بن شیشہ تھے۔ مختار نے ان کو چت لیا کہ ہاتھوں اور پیروں میں لمبے کی کینیں ٹھنکوائیں، پھر جسموں پر گھوڑے دوڑا کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا اور ٹکڑوں کو آگ میں جھونکوا دیا۔

اس طرح مختار نے طاعین کی جستجو میں دن رات ایک کر رکھا تھا اور چن چن کر ایک ایک کو قتل کیا تھا پھر بھی ابھی جانے بوجھے کئی لوگ باقی تھے جن کے لئے ابو عمرہ اور عبداللہ بن کامل چھاپے مار رہے تھے۔ چند روز کے وقفے سے اسماعیل بن خارجہ پکڑ کر لایا گیا جو حسن مثنیٰ کا ناموں تھا اور جس نے حسن مثنیٰ کو کربلا سے لاکر علاج کرایا تھا لیکن اس نے لاشوں کی پامالی میں بھی حصہ لیا تھا اس لئے معاف کرنے کے بجائے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں جلا دیا گیا۔

محمد بن اشعث نسلی طور پر دشمن آل رسول تھا۔ بڑی مشکل سے دستياب ہوا۔ کربلا میں اس نے بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ اس کا جسم بھی چھیدا اور کاٹا گیا پھر نذر آتش کر دیا گیا۔

شیشہ بن ربیع جب گرفتار ہو کر لایا گیا تو اس نے اپنے جرائم میں امام کے چہرہ اقدس پر تلوار دنگانے کا اقبال کیا۔ ابراہیمؑ کے حکم سے اس کا گوشت کاٹا گیا اور جسم آگ میں جلا دیا گیا۔

قاتلوں میں منہرست شمر ذی الجوشن تھا وہ مسلم بن عبداللہ کے ساتھ راہ بصرہ کے ایک قریے کلبانیہ میں جا کر چھپ گیا تھا۔ ابو عمرہ تلاش کرتے ہوئے پہنچے تو وہ نیزہ بدست مقابلے پر آ گیا۔ ابو عمرہ نے دار کیا تو وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ ابو عمرہ اس کو باندھ کر مختار کے پاس لائے۔ مختار نے اس کو حد سے زائد اذیت ناگ مزادنی ایک

بڑے کڑھاؤ میں تیل گرم کر لیا اور کھولتے ہوئے تیل میں زندہ ڈلوادیا۔

حُرملہ بن کاہل اسدی وہ ملعون تھا جس نے آل محمد کے دلوں کو چھید کر رکھ دیا تھا۔ مختار کو اس کی بڑی فکر تھی۔ آخر وہ گرفتار ہو کر لایا گیا۔ مختار، ابراہیم اور اہل دیار سب اس کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ حُرملہ نے بیان کیا۔

”میرے پہلے تیر نے گلوئے علیؑ اصغر کو چھید ڈالا۔ بچے نے کچھ اس طرح ہونٹوں پر زبان پھیری تھی کہ مجھے بھی ترس آگیا تھا لیکن عمر سعد نے تاکید کی تو گھبراہٹ میں گھوڑے کو مارنے والا تیر ہاتھ آگیا۔ میں نے اسی کو کمان میں جوڑ کر چھوڑ دیا اور بچہ باپ کے ہاتھوں پر منقلب ہو گیا۔“

”دوسرا تیر میں نے مشک سکنہ پر لگایا تھا اور میرا حضرت کے دہن اقدس پر“
 کسی میں اس کا پورا بیان سننے کی طاقت نہ تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی دربار پر ایک قیامت خیز رقت طاری ہوئی۔ مختار نے اس کے ہاتھ پاؤں کو ٹکڑے کر کے پرتیل چھڑک دیا اور اس میں آگ لگوا دی۔ حُرملہ تڑپتا رہا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔
 قاتلانِ کربلا میں اب مرث ابن زیاد باقی تھا اور مختار کی دسترس سے دُور تھا پھر بھی مختار نے اس کی طرف سے بے توجہی نہ کی اور ابراہیم کو تیس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ موصل کے قریب ابن زیاد ایک بہت بڑا لشکر لے کر مقابل ہوا۔ انفرادی جنگ میں ابراہیم کے بہادروں نے کئی شایموں کو قتل کیا، پھر جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی اور صبح سے لے کر رات گئے تک جنگ ہوتی رہی۔

ابراہیم کا مقابلہ ایسے لوگوں سے تھا جو اہل بیت کو کافر اور آل مروان کو آلِ رسول سمجھتے تھے اور اس کی حمایت میں مرنے کو شہادت قرار دیتے تھے۔ ان میں سے بعض نماز اس لئے نہیں پڑھتے تھے کہ اس میں آل محمد آتا تھا اور اس نام کو وہ زبان پر لانا بھی نہ چاہتے۔

فوج کا تناسب ایک اور چار کا تھا لہذا سترہ روز تک قیامت خیز جنگ جھڑپ رہی۔ مالکِ اشتر کے بیٹے نے باپ کی بہادری کی لاج رکھی اور دلائے علیؑ کا پورا حق

ادا کیا مگر سامنے دالے قتل ہونے کو نجات آخری کی ضمانت سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ تو دودھ اس کی جگہ لے لیتے۔ تاہم ابراہیمؑ کے پیش نظر جنگ کربلا کا نقشہ تھا۔ انہوں نے قتل کرنے میں بازوؤں کو شل نہ ہونے دیا اور قتل ہونے کو مقصدِ حیات سمجھتے رہے۔ پھر تائیدِ غیبی شامل حال ہوئی۔ طوفانِ برق و باران نے شامی فوج کو نشانہ بنالیا، اتنے بڑے اولے گرے کہ ہزاروں شایموں کے سر پھٹ گئے۔ بیس ہزار سے زائد بھاگتے ہوئے دریا میں ڈوب مرے۔

سولہویں دن عمر بن ربیعہ نے ایک باغ میں ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں کو اکل و شرب کی دعوت دی۔ ابراہیمؑ کو اس کی اطلاع مل گئی۔ محفل گرم ہتی دودھ شراب چل رہا تھا کہ اچانک ابراہیمؑ نے حملہ کر دیا اور تقریباً تمام لوگوں کو تہ تیغ کر دیا۔ ابن زیاد اس رات بھی بچ نکلا مگر اس کی ہمت پست ہو چکی تھی۔ دوسرے روز وہ نہایت احتیاط کے ساتھ فرار ہوا۔ ابراہیمؑ کے ساتھی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کو بھاگتے میں قتل کر دیا اور جنابِ زینبؑ کی بددعا سے آخری قاتلِ حسینؑ کیفر کردار کو پہنچا۔

اس فتح کی خوش خبری مختار کو ملی تو آپؑ نے ہمیشہ کی طرح سجدۂ شکر ادا کیا۔ سیدہ ہکی دسویں محرم تھی۔ جنابِ مختار نے ابن زیاد کا سر بعض مخالف کے ساتھ حدِ امام زین العابدینؑ میں روانہ کیا اور ابن زیاد کے جسم کو نذر آتش کر دیا۔ امام زین العابدینؑ، محمد حنفیہ اور تمام بنی ہاشم نے اس سر کو دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا اور امامؑ نے اس کا رہنمایاں پر دعائے خیر سے مختار کو یاد فرمایا۔

مختار آل محمدؑ کی شہادت

مختار کا اصل مقصد حیات اب پورا ہو چکا تھا لہذا آپؑ نے انتظامِ حکومت پر توجہ دی اور ابراہیمؑ کو ایک بڑے شکر کے ساتھ نظم و نسق درست کرنے کی خاطر جزیرہ روانہ کر دیا۔

مضبب ابن زبیر بصرے میں بیٹھا ہوا مختار کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے

تھا۔ قاتلان حسین کے انجام سے بعد الملک کو تکلیف ہوتی تھی تو بات قابل فہم ہے لیکن مصعب کو تہ جانے کیوں ایک انجانا دکھ ہوتا تھا — بالکل ویسا ہی دکھ جیسا اس وقت کے مورخین کو ہوتا اور جیسا آج کے مورخین کو ہے اور کوئی مختار عظم کو معمولی آدمی اور کوئی باغی لکھ دیتا ہے حالانکہ حضرت علی بن ابی طالب قاتل مشرکین تھے تو مختار قاتل قاتلان کر بلا، جن لوگوں نے علی کو نہیں سچنا، وہ مختار کو کیونکر چھوڑ دیتے۔ سلسلہ آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا۔

سلطنت اور امور سلطنت سے ہادیان اسلام نے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا تو ان کے پیرو کیوں رکھیں۔ ہم تو مختار کو بنگاہ استحسان اس لئے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے آل محمد پر ستم ڈھانے والوں کو نیست و نابود کیا۔ وہ مختار سے جلتے ہیں جنہیں قاتلان کر بلا سے ہمدردی ہے۔ ان میں مصعب ابن زبیر بھی تھا۔

اس نے دیکھا کہ مختار نے بڑا شکرا براہیم کے ساتھ بھیج دیا تو وہ کوئی پرچہ ڈورالمر مختار کوئی نرم نوالہ نہیں تھے جن کو اتنی آسان سے مہم کر لیا جاتا۔

محمد بن اشعث، مصعب کی فوج کا افسر تھا۔ اس نے مختار کو دعوتِ اطاعت دی مختار کی طرف سے منہ توڑ جواب دیا گیا اور مقام مداد میں دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ مختار کی فوج مقابلہ کا فی کم تھی تاہم بڑی بے جگری سے لڑی۔ مصعب کے ان گنت آدمی قتل ہوئے۔ محمد بن اشعث بھی تہ تیغ ہوا۔ شکست مصعب کے سر پر منڈلا رہی تھی کہ کونے کے چند افسروں نے میدان چھوڑ دیا — شاید وہ پہلے ہی شہزادوں سے مل گئے تھے۔

فتح شکست میں بدل جانے کے بعد مختار نے سپاہی اختیار کی اور قلعہ کو فہ میں آکر محصور ہو گئے۔

ابراہیم اتنی دُور تھے کہ وقت پر پہنچ نہ سکتے۔ محاصرہ طویل پکڑتا جا رہا تھا فوج کو فہ کے افسر بہت ہار چکے تھے اور قلعہ میں کھانے پینے کی تنگی بھی ہو رہی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلی سکتا کہ محصورین شمشیر بکھیر رہے تھے اور فیصلہ کن جنگ کرتے مگر اس کے

برعکس ہوا یہ کہ پتہ ہمت باجے ہوئے لوگ چالیسویں دن دروازہ کھول کر نکل گئے اور غنائے
کے ساتھ تھوڑے سے وفادار باقی رہ گئے۔

دانش مندی کا تلقاض یہ تھا کہ مختار اپنے کو مصعب کے حوالے کر دیتے لیکن آل
محمد سے جو درس شجاعت انہیں ملا تھا، وہ ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح
دیتا۔ انہوں نے عزت کی موت کا راستہ اختیار کیا۔ تلوار ہاتھ میں لی اور دشمنوں پر لوٹ پڑے۔
آج مختار اس طرح لڑ رہے تھے جیسے کہ بلا میں امام حسین نے جنگ کی سچی کشتیاں
کے پشتے لگا دیئے علیؑ کے نام لیوانے اور زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ منعم خزن جیٹ
کا انجام اپنے مولیٰ سے مختلف نہ ہوا مگر اپنے مقصد کو پورا کر کے ادر کر بلا کے ظلم کا مکمل جواب دے کر
ایک جنگ سلیمان بن مردخزاعی اور متیب بن بنجہ نے کی تھی، دوسری مختار بن
ابی عبیدہ ثقفی نے۔ دونوں کا انجام یکساں ہوا۔ پھر بھی سلیمان صرف نام حسین پر قربان ہوئے
اور مختار نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تو ظالموں کو ایسا سبق دے کر جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔
مصعب کا شمار شجاعان عرب میں ہوتا تھا لیکن اس نے بڑی بزدلی کا کام کیا کہ
مختار کی بیوی کو محب آل رسول ہونے کے جرم میں قتل کرادیا۔

بربریت کا بہت بڑا ثبوت یہ دیا کہ کونے پر اقتدار حاصل ہوتے ہی پیروان
علیؑ کا قتل عام شروع کر دیا۔ پسران حجر بن عدی، عبدالرحمن اور عبدالرب کہ تہ تیغ
کیا، پھر عمران بن حذیفہ میمانی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح ایک بے پیکر کوفہ
علیؑ کے دوستوں سے خالی ہو گیا۔

ابراہیم کو شہادت مختار کی خبر ملی تو آپ سناٹے میں رہ گئے۔ ان کے لئے کچھ مشکل
نہ تھا کہ طوفان کی طرح اٹھ کر مصعب کے سر پر جا پہنچیں لیکن ان کا سب سے بڑا او
طاقتور دشمن عبدالملک بن مروان تھا جس کو وہ دوبارہ شکست دے چکے تھے تاہم
ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ پہلے مصعب سے ٹکریں پھر نبی اُمیہ سے۔

پھر علیؑ اور اولاد علیؑ پر ستر سزار منبروں سے تیرا ابراہیمؑ فراموش نہ کر سکتے جواب بھی جاری تھا۔ ان کے مقابلے پر مصعبؓ شیعان علیؑ کا دشمن بھی مگر چھوٹا اور کمزور دشمن تھا۔ اس لئے ابراہیمؑ نے مصعبؓ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اس سے آملے۔

مصعب ابن زبیر کا اختتام

عراق پر مصعبؓ کا قبضہ عبدالملک کے لئے بہت مضر تھا اس لئے —
 ”معاذ میں اس نے پوری قوت کے ساتھ عراق پر فوج کشی کر دی
 مصعب ابن زبیر بھی پوری تیاری کے ساتھ مقابلے پر آئے لیکن عین
 موقع پر عبدالملک نے مصعب کے بہت سے آدمیوں کو رشوت کے
 ذریعہ ملا لیا۔ عراق کے مردانی بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ مصعب کے
 دست راست ابراہیم بن اشتر کو بھی ملانے کی کوشش کی مگر اس میں
 کامیابی نہیں ہوئی۔“ (۱۰۱)

سازش اور رشوت بنی اُمیہ کا کارگر حملہ تھا کئی نسلوں سے وہ اس پر عامل رہے
 تھے۔ مختار کے مقابلے میں مصعب نے بھی اس کا کامیاب استعمال کیا تھا لیکن بنی
 اُمیہ استاد تھے اور مصعب شاگرد، لہذا مصعب کی طاقت کمزور پڑ گئی پھر بھی ایک مضبوط
 حلیف مصعب کے ساتھ تھا یعنی ابراہیم بن مالک اشتر جو بنی اُمیہ سے اتحاد کر رہی تھیں
 انہیں کی تقویت پر مصعب نے پہلے معرکے میں مردانیوں کو شکست دی اور ان کی
 طاقت کو پارہ پارہ کر دیا مگر جلد ہی شام سے کمک آگئی اور بنی اُمیہ پھر تازہ دم ہو گئے۔
 دیر جا شلیق ہی میں مصعب کا دوسرا مقابلہ اموی لشکر سے ہوا مگر قبیلہ ربیعہ
 کو ابراہیم سے مصعب کا اتحاد پسند نہ تھا کیونکہ وہ آلِ محمد کے طرف دار تھے۔
 یہ قبیلہ مصعب کی فوج کا روح رداں تھا۔ جنگ کے دوران اس نے لڑائی سے ہاتھ
 کھینچ لیا مگر ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں کی شجاعت نے بنی اُمیہ کے دانت کھٹے کر دیئے۔
 ابراہیم بے جگری سے لڑے مگر طاقت غیر متوازن تھی۔ شخصی بہادری کہاں تک
 کام دیتی۔ ابراہیمؑ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر گئے۔ — کہا جاتا ہے کہ ابراہیمؑ کی شہادت

میں بنی ربیعہ کا بھی ہاتھ تھا۔ لڑائی جاری تھی۔ مصعب کے بیٹے عیسیٰ نے کچھ دیر سنبھالے رکھا پھر وہ بھی قتل ہو گئے۔

جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر مصعب ایک مرد میدان تھا۔ اس نے پیٹھ نہ دکھائی پیاس کی شدت میں ایک درخت کے نیچے دم لینے کو ٹھہر گیا۔ ایک غلام اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔

”ایسی جنگ کسی نے کاہے کو کی ہوگی۔“

”نہیں حسین ابن علی کر بلا میں اس سے زیادہ بہادری سے لڑے تھے۔“
وقت پڑنے پر دشمن کو سبھی حسین کی شجاعت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس کے بعد مصعب نے زخمی شیر کی طرح حملہ کیا مگر طاقت جواب دے چکی تھی۔ ایک شامی سپاہی عبید اللہ بن ظہان نے تلوار کا وار کیا اور مصعب زمین پر آکر مداعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

ابراہیم کی شہادت پر انتقام خون حسین کا باب بند ہو گیا۔ آپ کا مصعب سے الحاق مستقبل کی تاریخ سازی کا ایک منصوبہ تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ وہ اگر مصعب کے ہاتھوں عبدالملک کا خاتمہ کرانے میں کامیاب ہو جاتے تو بنی فاطمہ کی وہ تحریک جو ابولم خراسانی کے ہاتھوں تکمیل پائی۔ ابراہیم بن اشتر سے شروع ہوتی اور اس کا انجام یہ نہ ہوتا کہ ایک جلاوٹ کا اس سے بڑا جلاوٹ سربراہے سلطنت ہو گیا۔

زبیری خلافت کا خاتمہ

عراق پر قابض ہو کر عبدالملک نے اور آخر کار حجاج بن یوسف کو عبداللہ ابن زبیر کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ مصعب کے بعد عبداللہ کی طاقت بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ حجاج کے پہنچنے ہی وہ حرم میں قلعہ بند ہو گئے۔ حجاج نے محاصرہ کر کے سبکیا کی شروع کر دی اور مسلم بن عقبہ کے اُدھورے کام کو پورا کرنے لگا۔ سنگباری سے اہل مکہ کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ کچھ کی عمارت کو نقصان پہنچا اور پردہ تک جل گیا۔ ابن زبیر نے بڑے استقلال کا مظاہرہ کیا مگر ساتھی دغا دے گئے۔ یہاں تک کہ لڑکوں

نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ بہادر ماں حضرت اسماء کے ہمت بڑھانے پر بچے کچھے لوگوں کے ساتھ عبداللہؑ یا ہر نکلے۔ اُمویوں سے بڑا سخت مقابلہ کیا اور جمادی الثانی ۳۷ھ میں لڑتے لڑتے گھوڑے سے گر گئے۔ آپ کی عمر ۷۲ سال تھی۔

حجاج نے لاش سُولی پر لٹکا دی جو کافی دنوں بعد حضرت اسماءؑ کے کفن سے عبدالملک کے حکم پر اتاری گئی۔

حجاج نے مکے کے بعد ایک بار پھر مدینے کی تاراجی کی۔ کئی بوڑھے صحابیوں کو ایذیت پہنچائی۔

بلاذری نے انساب الاشراف اور طبری نے تاریخ الامم والملوک میں اس کی صراحت کی ہے کہ حجاج نے جابر بن عبداللہ انصاری، انس بن مالک اور سہیل بن سعد کی گردنوں اور ہاتھوں پر گرم سیسے سے مہر سی لگوا دی تھیں جیسے غلاموں پر لگائی جاتی تھیں۔

اس کی تصدیق جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں بھی کی ہے۔

اسی زمانے میں امام زین العابدینؑ گرفتار کر کے شام بھیجے گئے، امام ابو بکر محمد بن مسلم المعروف بہ ذہری درباری فقیہ اور محدث تھے۔ انہوں نے عبدالملک سے کہا کہ ایک بے خطر آدمی کو کیوں گرفتار کر لیا ہے۔ عبدالملک نے امام کو چھوڑ دیا اور حجاج کو ہدایت کی کہ آئندہ آل رسول کو تنہا نہ جانے۔

خانہ کعبہ کو حجاج کے ہاتھوں جو نقصان پہنچا تھا، عبدالملک کے حکم پر اس نے اس کی تلافی کی اور از سر نو اس کی تعمیر کرائی۔ اس میں امام نے اس کی مدد کی اور حجر اسود کو اپنے ہاتھوں سے نصب کیا۔ پھر حجاج مدینے کے بجائے عراق کا حاکم بنا دیا گیا۔ چلتے دھمت اپنے آخری خطبے میں اس نے کہا

”محمد بن سعد نے واقدی سے اپنے اسناد کے تحت نقل کیا ہے کہ جب حجاج مدینے سے معزول ہو کر چلا تو اس نے کہا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس شہر سے نکال دیا جس کے رہنے والے بدبودار اور خبیث ترین ہیں۔ امیر المؤمنین کے ساتھ زیادہ

کھوٹ رکھتے ہیں اور اس کی نعمتوں پر زیادہ حسد کرنے والے ہیں۔ خدا کی قسم، اگر عبدالملک کے خطوط اہل مدینہ کے بارے میں نہ آتے رہتے تو میں ان کو گدھے کی کھال کے مانند کسی چیز میں بھرتا۔ یہ لوگ سوکھی لکڑی اور ایک بوسیدہ جسم کے پاس آکر پناہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ کا منبر ہے اور یہ رسول اللہ کی قبر ہے۔“

”اس کا یہ قول جب جابر بن عبد اللہ کے سامنے بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا یہ بُرائی اس کی نہیں ہے بلکہ اس کے امام عبد الملک کی ہے جو اس نے کہا، وہی تو فرعون نے بھی کہا تھا، پھر خداوند عالم نے اُسے جہنم دے کر اپنی گرفت میں لے لیا۔“ (۱۰۲)

یہ تنہائی اُمیہ کا اسلام، آج کے مسلمان جس کے خال و خد درست کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ مساعی لا حاصل کے بجائے کردار کی بات تو یہ ہے کہ کھل کر ایسے ہی عقائد کا اعتراف کر لیا جائے جس طرح ہم اپنے مسک کا اظہار کرتے ہیں، اس کے بعد کسی اختلاف کا کوئی سوال باقی ہی نہ رہ جائے گا۔

حجاج بن یوسف کو فتنے میں

شیعان علیؑ کے لئے ایک بار پھر کوئے میں حضرت معاویہ کا دور تازہ ہو گیا تھا خون انسانی اس حکمران کے لئے اتنا ستا تھا کہ وہ اس کو پانی کے عوض بہا دینے میں دریغ نہ کرتا جاتے ہی اس نے کوئے کے ایک بزرگ عمیر بن ضبابی کا قتل کر لیا جن پر الزام تھا کہ وہ خون عثمان میں شریک تھے۔ امیر المومنین کے غلام ہمدان کا خون بھی اس کی گردن پر ہے جن کو ایک عرصہ تک زندان میں رکھا گیا پھر قتل کر دیا گیا۔

شیعوں کے لئے اس نے خاص طور پر آدمی مقرر کر رکھے تھے کہ جو ملے اس کو پکڑ لائیں۔ ایک روز دو آدمی لائے گئے، ان سے اس نے علیؑ پر تبرا کرنے کو کہا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے انکار کیا اور دونوں قتل کر دیئے گئے۔

پھر ایک دن جعفر نامی ایک سید زادہ لایا گیا جس پر ذکر حسین کرنے کا جرم

تھا۔ اس سے حجاج نے پوچھا۔

”تو حسین کا نام کیوں لیتا ہے؟“

”ماں نے وصیت کی تھی کہ محرم میں ذکر حسین کرتے رہنا۔“ دس سال کے بچے

نے جواب دیا اور حجاج بولا۔

”باز نہ آؤ گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے!“

”ہمارے لئے یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔“

بچے کے دندان شکن جواب پر حجاج آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے حکم قتل صادر کر دیا

سید زادے نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت لی مگر آپ نے نماز شروع ہی کی

تھی کہ پتھر برسائے جانے لگے اور اتنے پتھر مارے گئے کہ بچہ ان میں دب کر شہید ہو گیا

۸۳ھ میں امیر المومنین کے صحابی کمال بن زیاد کی گرفتاری کے لئے حجاج نے

ان کے ایک ہم قبیلہ ہشیم بن اسود سے ان کا پتہ پوچھا۔ کمال اپنے قبیلے میں چھپے ہوئے

تھے۔ ہشیم نے پتہ نہیں بتایا۔ اس پر حجاج نے ان کے پورے خاندان کے وظائف بند

کر دیئے۔ کمال کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے خود اپنے کو پیش کر دیا۔ حجاج نے

انہیں دیکھتے ہی بد کلامی شروع کر دی مگر جیسا کہا دیا ہی سنا۔ کمال نے حجاج کو نصیحت

کی کہ درندگی سے باز آجائے اور اللہ سے ڈرے مگر حجاج نے نصیحت پر غور کرنے

کے بجائے کمال کو ایذا پہنچا پہنچا کر قتل کر دیا۔ کمال کی عمر ۹۰ سال تھی۔ آپ کو اس عمر

میں شہادت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس کو بھی امیر المومنین کا فیض صحبت کہنا چاہیے۔

حجاج کو معلوم تھا کہ شیعان علی محرم میں ذکر حسین کر کے کربلا کی یاد تازہ کرتے

ہیں لہذا اس نے طے کیا تھا کہ وہ بھی ان دنوں بنی امیہ کے کردار کی تصویر پیش کرے

گا اس لئے محرم شروع ہوتے ہی وہ ستم رانی میں زیادہ فعال ہو جاتا اور اس کے آدمی

ٹوہ لگاتے رہتے کہ کہاں مجلس حسین ہو رہی ہے؟ اس سے بھی کام نہ چلا تو مملکت بنی امیہ

میں یوم عاشورا کو عید منانے کا اعلان کیا گیا۔ لوگ نئے نئے کپڑے پہنتے، آنکھوں میں گھر

لگاتے اور خوشیاں مناتے تھے۔

حجاج کا عام حکم تھا کہ کوئی بچہ، بوڑھا اور جوان نام حسین زبان پر لائے گا تو اس کی زبان کاٹ لی جائے گی۔ ایک رات قاضی شہر نے ایک خاتون کو دیکھا جو بال کھولے سیاہ کپڑے پہنے واقعہ کہ بلا بیان کر رہی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے سُن رہے تھے اور روتے جاتے تھے۔ قاضی ان سب کو گرفتار کر کے حجاج کے سامنے لے آیا۔ حجاج نے ایک بچے کو ڈانٹ کر کہا۔

”اب حسین کا نام نہ لینا۔“

”پھر کس کا نام لوں گا۔“ حسین تو میرے آقا ہیں۔“ بچے نے جواب دیا اور حجاج کے اشارے پر قتل کر دیا گیا۔

دوسرے بچے سے حجاج نے پوچھا تو اُس نے بھی ویسا ہی جواب دیا اور وہ بھی بھائی کے پاس پہنچا دیا گیا۔ پھر ماں کا حال بھی بچوں ہی کا سا کیا گیا۔

یہ دو رحبانِ علیؑ کے لئے پچھلے ادوار سے زیادہ سخت تھا اور عام طور سے شیعوں نے قید اختیار کر لیا تھا پھر بھی قید خانے شیعوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی گنتی کی نہ جاسکتی کیونکہ یہ صورت صرف کوفہ ہی کی نہ تھی، جہاں جہاں کسی کے شیعہ ہونے کا راز کھل گیا، وہ قتل کر دیا گیا یا زندان میں ڈال دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق اسی ہزار مرد و زن قید خانے کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔

امام زین العابدینؑ کو ایک بار پھر دمشق بلایا گیا مگر آپ با اعجاز گئے اور اُس آگے۔ آپ سے متعلق بہت سے معجزات شہور ہیں جو ہمارے عقیدے کا حصہ ہیں۔

حضرت قنبرؑ

قنبرؑ امیر المؤمنین کے شہرہ آفاق غلام تھے۔ معرفتِ آلِ رسولؐ میں سلمانؑ و بلذرؑ مقداد و عمارؑ کے ساتھ آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ امیر المؤمنین کے جلوت کے ساتھی اور کبھی کبھی خلوت میں احکام کی بجا آوری پر ناز کئے جاتے۔ جنگ صفین کی روانگی کے وقت امیر المؤمنین نے فوج کا علم قنبر ہی کے ہاتھ میں دیا تھا۔

امیر المؤمنین کی وفات کے بعد غالباً آپ کوفہ ہی میں رہ پڑے تھے اور معاویہ

کے عہد میں قید کر دیئے گئے کیونکہ اُس دور میں کسی مقام پر آپ کا نام نہیں آتا۔ قیدیوں کے جنگل میں شاید آپ کو کوئی شناخت نہیں کر سکا۔ حجاج جب کوفے کا عامل ہوا تو آپ آزاد ہو کر پیرانہ سالی کی زندگی گزار رہے تھے کہ حجاج کے آدمیوں نے پابہ زنجیر کر کے حاضر دربار کیا، حالانکہ آپ اتنے ضعیف تھے کہ ابروؤں اور پلکوں کے بال سفید پڑ چکے تھے، چنانچہ مشکل تھا۔

حجاج سے آپ کی گفتگو ایک ناہمی اور ایک عارت امیر المومنین کی گفتگو کی طرح ہے۔ آپ نے ہر سوال کا جواب ایک غالی مشیمہ کے لب و لہجہ میں دیا اور حجاج نے آپ کے قتل کا حکم دے دیا۔ شہادت سے پہلے آپ کا طویل رجسز نہایت ایمان افروز ہے۔ ”میں اس کا غلام ہوں جس نے دو تلواروں سے جنگ کی، دو نیزوں سے نیز بازی کی، دو قبیلوں کی طرف نمانہ پڑھی — میں اس کا غلام ہوں، جو صالح المومنین، وارث انبیاء، اور بہترین اوصیا ہے —“

جو دستم کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ عبدالملک کی ہلاکت کی خبر آئی اور حجاج کی نگاہیں دمشق کے افق سلطنت پر مرکوز ہو گئیں۔

عبدالملک: ایک حکمران

اہل بیت کی دشمنی کا جہاں تک تعلق ہے، عبدالملک اپنے پیش روؤں کا مقلد تھا لیکن ایک حکمران کی حیثیت سے بنی امت کی نشاۃ الثانیہ اس کے دور سے شروع ہوئی۔ اس کا گیارہ سالہ عہد لڑتے لڑتے ہی گزر گیا۔ پہلے اس نے عبداللہ ابن زبیر کا مقابلہ کیا پھر خارجیوں کا جو حقیقتاً حضرت معادہ کے پروردہ تھے مگر اب انہی سلطنت کے لئے عذاب بن گئے تھے — بیرونی فتوحات میں کابل کے چند اضلاع اس کے زمانے میں فتح ہوئے۔ افریقیہ کے بعض علاقوں کی تسخیر اس کا کار نمایاں ہے۔ بربروں کی طاقت و رسا حوزہ اس کے عہد میں ماری گئی اور کئی دیگر فتوحات ہوئیں۔ ۵۸ھ میں وہ ۶۲ سال کی عمر پر انتقال کر گیا۔ اس نے کئی اصلاحات بھی کیں جن میں سکہ کا رواج اس کا طرہ امتیاز ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولید باپ کا جانشین

ہوا۔۔۔ ولید، بنی امیہ کے بادشاہوں میں زیادہ خوش نصیب نکلا۔ جبروت شد میں دہ اسلام سے پیچھے نہ رہا مگر تخیر ہمالک میں سب سے آگے بڑھ گیا۔ قیمت سے اس کو قتیہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، محمد بن قاسم اور سلیم بن عبدالملک جیسے جرنیل ہاتھ آگئے، جنہوں نے اموی حکومت کے ڈانڈے چینی ترکستان سے یورپ کی حدود تک ملا دیئے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کی وفات

امام واقعہ کربلا کے بعد مدینہ میں تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے، عبادت سے جو وقت بچتا، وہ گرمیہ و شادیوں میں گزرتا، کھانا سامنے آتا تو رو دیتے، پانی نظر آتا تو آنسو نکل پڑتے، گھر سے نکلتے تو صرف اُس وقت، جب کوئی ہدایت خواہ آتا یا بعض روایات کے مطابق کوئی مومن مجلسِ حائثین منعقد کرتا تو آپ ضرور جاتے عقل کے پوتوں پر زیادہ شفقت فرماتے تھے کیونکہ کربلا میں سب سے زیادہ اولادِ عقیل نے قربانیاں پیش کی تھیں۔

مصائب اپنی انتہا پر پہنچ چکے تھے جو حکومت اُئی اس نے رحم نہ کیا۔ عبداللہ ابن زبیر نے پریشان کیا، حجاج نے کینہ توڑی کی مگر صابر و شاکر امام اپنی روش پر قائم رہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ آپ نے مختار ابن ابی عبیدہ کی مخالفت کی تھی البتہ خردج کے لئے سرپرستی نہیں فرمائی کیونکہ اقتدار کے لئے تلوار اٹھانا سیرتِ علیؑ کے خلاف تھا لیکن مختار کے کارنامے خیر پر خوشنودی کا اظہار فرمایا تھا۔

آپ کی محتاط زندگی کے باوجود نسلی فضیلت کا امتیاز اور زہد و تقویٰ کا اعجاز آپ کے ساتھ تھا۔ آپ جس طرف گزر جاتے، دل بچھ جاتے، آنکھیں فرشِ راہ ہوتیں ایک مرتبہ شام بن عبدالملک اپنے باپ کے عہدِ حکومت میں حج کے لئے آیا حلیوں کی اتنی کثرت تھی کہ سیکڑوں ملازمین کی کوشش کے باوجود حجرِ سود تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ اتنے میں ایک منحنی سا انسان دور سے آنا نظر پڑا تو جمیع کافی کی طرح سچنے لگا برویہ کپڑوں میں بلوس یہ آدمی بڑھتا رہا اور لوگ اس کو راستہ دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ

نزدیک پہنچ کر تقبیل فرمانے لگے۔

ہشام آپ کو پہچانتا تھا مگر جب ایک حواری نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تو وہ انجان بن گیا۔ عرب کا مشہور شاعر فرزدق قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ کون ہیں — مجھ سے سنو۔“

فرزدق نے فی البدیہہ ایک قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

”یہ وہ ہے جس کو کتبہ بھی پہچانتا ہے اور حرم بھی جانتا ہے۔ زمین بطحی اس کے قدم کی چاپ سے مانوس ہے اور نفوس پاکو محسوس کر لیتی ہے۔ بہترین خلایق کا بیٹا ہے۔ زہد و نقاست اور پاکیزگی میں ممتاز میں محترم ہے۔“

ہشام نے اس جرم میں فرزدق کا نام درباری شاعروں کی فہرست سے نکال دیا۔ ان کو قید کر دیا۔ امام نے بارہ ہزار درہم بھیجے مگر انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ معاوضہ آخرت میں لے لیں گے۔ عبداللہ ابن جعفر کے بیٹے نے ایک پیش کش کی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ آخر امام نے چالیس ہزار درہم لے لینے پر اصرار کیا تو لے لئے اور اس کے بعد وہ چالیس سال زندہ رہے۔

ذلیل و رسوا کرنے کی ہر کوشش کے باوجود جب آپ کا قبول عام ختم نہ ہوا تو ولید بن عبدالملک نے استاد بنی امیہ حضرت معاویہ کا حربہ استعمال کیا۔ آپ کو زہر دلوایا جس سے ۲۵ محرم ۶۰ھ میں تئیس سال کی عمر میں آپ کی شہادت واقع ہو گئی اور تاریخ گم ہلا کے صبر و رضا کا آخری باب بند ہو گیا۔ آپ کی دعاؤں کا مجموعہ صحیفہ کاملہ کے نام سے موجود ہے جس کو آپ کے سجادہ عبادت کی روشنی سے عبارت لیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ نے نمازِ خازہ پڑھائی۔ جنت البقیع میں امام حسنؑ کے پہلو میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ چار لڑکیاں اور گیارہ لڑکے آپ نے یادگار چھوڑے، لڑکیوں کے نام تھے: خدیجہ، فاطمہ علیہ اور ام کلثوم۔ لڑکوں میں تھے امام محمد باقرؑ، عبداللہ، حسن، زید، حسین، عبدالرحمن، سلیمان، علی محمد اصغر اور حسین اصغر۔ ان میں جناب زید شہید اپنے جہاد کے سبب تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

پانچویں امام

امیر المومنین حضرت محمد باقر علیہ السلام

محرم ۹۵ھ تا رذی الحج ۱۱۴ھ

تعارف :-

آپ کا پورا نام محمد باقر اور کنیت ابو جعفر تھی، یکم رجب ۵۷ھ کو بمقام مدینہ منورہ پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش سے قبل وبعد بہت سے معجزات ظہور میں آئے۔ علم و فضل آپ سے مخصوص تھا لہذا باقر العلوم بھی کہے جاتے۔ آپ نے بنی اُیُبہ کے چھ بادشاہوں کا عہد دیکھا۔ معاویہ بن ابی سفیان، یزید ابن معاویہ، معاویہ بن یزید، مروان بن حکم، عبد الملک بن مروان اور اب ولید بن عبد الملک کا دور تھا، جب آپ منصب امامت پر فائز ہوئے۔ کر بلا میں آپ کی عمر تقریباً چار سال تھی مگر ایک ایک واقعہ آپ کو اچھی طرح یاد تھا، ۸ ربیع الاول ۶۲ھ کو جب قید سے چھوٹ کر مدینہ پہنچے تو مدینے کے بچوں کو آپ نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

امام زین العابدین کی المناک زندگی سے بھی آپ بہت متاثر تھے اسی لئے چھوٹے سے سن میں تحمل و بردباری کی تصویر بن گئے تھے۔

حضور نے اپنے صحابی جابر ابن عبد اللہ انصاری سے کہا تھا کہ تم سید شہاد کے بیٹے محمد باقر سے ملو گے، اس کو میرا سلام کہہ دینا۔ جابرؓ بنا بیٹھا تھے خود امام زین العابدینؓ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکتے لہذا امام ایک روز خود جابر سے ملنے گئے اور کہا: باقر! اپنے عم جابر کی پشیمانی کا بوسہ لو! آپ نے تعمیل ارشاد کی۔ جابر نے آپ کو سینے سے

لگایا اور آپ کے جد کا سلام پہنچایا۔ آپ نے جواب سلام دیا پھر جا بڑے آپ سے شفاعت کا وعدہ لیا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد جا بڑے کا انتقال ہو گیا۔

حجاج کی موت

حضرت فہرؒ حجاج کے آخری مقتول نہ تھے اس کی خونریزی ایک سلسلے سے جاری رہی اس نے شیعانِ علیؑ کی ایک فہرست بنوا رکھی تھی۔ ان میں سے عطار بن مجاہد، طلق بن یزید اور سعید بن جبیر ہاتھ نہ آئے تھے۔ ان کے بارے میں حجاج کو پتہ چلا کہ وہ حرم میں پناہ گزین ہیں۔ حجاج نے ولید کو لکھا اور ولید نے خالد بن عبداللہ قسری کو حکم دیا کہ ان کو گرفتار کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا جائے۔

اس حکم کی تعمیل کی گئی، حجاج ابن یوسف نے سعید سے پوچھا۔
”تمہارا نام شقی بن کیسر ہے؟“

”میری ماں میرے نام کی زیادہ عارف تھیں۔ انہوں نے میرا نام سعید ابن جبیر رکھا ہے“ سعید نے جواب دیا اور حجاج نے سوال کیا۔
”ابوبکر و عمر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟“

سعید نے اپنے عقیدے کے مطابق جواب دیا اور دونوں میں سخت کلامی ہوئی اور حجاج نے سعید کو قتل کر دیا جس کے بعد وہ پندرہ روز یا چالیس روز زندہ رہا۔ اس کے پیٹ میں پھوڑا نکل آیا تھا۔ سوتے سوتے وہ سعید کہہ کر چیخ پڑتا اور اسی عالم میں مر گیا۔

بخلف اشرف میں انہدام قبور حجاج کے سیاہ کارناموں میں ایک اضافہ ہے اس نے زندہ تو زندہ مردوں کو بھی چین نہ لینے دیا۔ حضرت علیؑ کی قبر کی تلاش میں اس نے کتنی ہی قبریں کھدوا لیں مگر مولیٰ کی قبر اس کو ڈھونڈھے نہ ملی۔ زیر بحث یہ سوال آتا ہے کہ قبروں میں تو عمر ما پڑیاں ہی رہ جاتی ہیں، وہ پہچاننا کیونکر ہڈیاں علیؑ کی ہیں یا کسی اور کی؟ لیکن شاید علیؑ کے اس شرف کا حجاج کو یقین تھا کہ آپ کا کفن بھی میلانا ہوا ہوگا اور وہ علیؑ کی میت کو شناخت کر لے گا۔

ولید اور نبی ہاشم

کو نہ بصرہ کبھی شیعان علیؑ کے گڑھ تھے لیکن ولید کے زمانے میں شیعہ تو درکنار شیعہ نام کی نسبت سے کوئی چیز بھی پائی نہ جاتی، اولاد رسولؐ میں بھی اکاد کا لوگ نہ گئے تھے جو کہیں چھپے ہوئے تھے، سب تقیہ کر چکے تھے ان میں سے اکثر بچوں کو اپنی حقیقت بتائے بغیر مر گئے۔ انہیں کی اولاد کو سنی سادات کی حیثیت سے پائی جاتی ہے۔ ۹۹ھ میں ولید حج بیت اللہ کے لئے آیا تو خبابِ فاطمہ کے مکان میں اس نے حسن مثنیٰ کو دیکھا اور مدینے کے والی عمر بن عبد العزیز سے کہا کہ اس مکان کو خالی کر لیا جائے مگر اولاد فاطمہ نے تخلیہ سے انکار کر دیا تو اس نے مکان کو منہدم کر دیا۔ اس واقعے سے اس کو حسن مثنیٰ سے ضد ہو گئی اور اس نے آپ کو نہ ہر دے کر ہلاک کر دیا۔ سادات کئی کے کئی اور واقعے ولید کے دور میں پائے جاتے ہیں۔ عام شیعوں کا کوئی وجود تھا ہی نہیں تو وہ ظلم کس پر کرتا۔ مدینے میں خاندان رسالت موجود تھا مگر کوئی بھی اموی حکمران ان کی طرف دیکھتا تو اس کو کر بلا یا د آ جاتی اور اس کے جسم میں ایک لہرہ پڑ جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ امام زین العابدین کے زمانے میں رشتہ داروں کو چھوڑ کر صرف پانچ مومن خالص مدینے میں پائے جاتے تھے۔

ولید کے اعمال و عقائد

ولید نے چاہ زمزم کے مقابلے پر ایک کنواں بنوایا تھا جس کے سلسلے میں اس کا قول تھا کہ ابراہیمؑ نے لوگوں کو سیراب کیا لیکن کھاری پانی سے، میں نے میٹھے پانی سے لوگوں کی پیاس بجھائی۔ کھاری پانی سے وہ آب زمزم مراد لیتا تھا۔

جوازہ الجوان از علامہ دینوری جلد ۱ ص ۵ (در تاریخ الخلفاء از جلال الدین سیوطی ص ۱۱۶) کی رو سے ولید کا کہنا تھا کہ اگر خدا نے قرآن میں لوطؑ کا ذکر نہ کیا ہوتا تو کوئی اس فعل قبیح کا مرتکب ہی نہ ہوتا، خدا نے خود مذکرہ کر کے اس طرف توجہ دلائی۔ وہ خود اس پر عامل تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی تک کو معاف نہیں کیا۔

کینیزوں میں باپ کی استعمال شدہ کینیزیں بھی اس کی درخور اعتنا رہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن رات بھر شغل جاری رکھنے کے بعد اس نے نشے کی حالت میں اپنی کینز کو حکم دیا کہ مسجد میں جا کر صبح کی نماز پڑھا دے۔ کینز ڈرتی تھی مگر اس نے زبردستی کی۔ اس کو اپنے کپڑے پہنائے اور مسجد میں بھیج دیا۔ کینز نے امام کی جگہ نماز پڑھائی اور اسی طرح حالتِ جنابت میں واپس آئی۔

لوگوں نے کینز کو پہچان کر شور و غل کیا تو ولید نے تلوار اور سونے کی مہروں سے منہ بند کرادیئے۔

یزید بن معاویہ کا کہنا تھا کہ قرآن میں خدا نے نمازیوں کے لئے دلیل استعمال کیا ہے (دلیل المصلین) لیکن شراہیوں کے لئے کہیں دلیل نہیں فرمایا۔

ولید کا قول تھا کہ خدا نے جنابِ داؤد کو موت و خلافت دونوں چیزیں عطا کی تھیں اس لئے دھمکایا۔ خلفاء کے پاس تو صرف خلافت ہے وہ کچھ بھی کریں، ان سے کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔

وضعِ احادیث کا سلسلہ اس کے دور میں بھی جاری رہا۔ روایت ہے کہ ایک روز فجر کے وقت حضورِ ارام المؤمنین عائشہ کے حجرے سے برآمد ہوئے اور نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے تو انہیں یاد آیا کہ وہ عالمِ جنابت میں ہیں لہذا واپس آئے غسل فرمایا اور بھیگے بالوں سے جا کر نماز پڑھائی۔ اس واقعے کو ولید نے اپنے لئے ایک حوالہ لکھا تھا کہ کتنا بلند کردار بنا دیا نبی کو، اُسے کچھ یاد ہی نہیں تھا اور ارام المؤمنین نے سبھی یا نہیں دلایا۔ خود آپ نے کس حالت میں نماز پڑھی اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔

علیؑ اور اولادِ علیؑ پر سب سے زیادہ اسی طرح جاری رہا، حالانکہ اب اس کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اولادِ رسول یا شیعیان علیؑ اگر کہیں تھے بھی تو ان میں کتنا دم ختم رہ گیا تھا جو انہیں رسوا کیا جاتا مگر غالباً یہ عمل داخلِ ثواب تھا اس لئے اس کا اعادہ برابر کیا جاتا رہا۔

ولید کی مسخیری مہمات

ان خرابیوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک مدبر اور باصلاحیت حکمران تھا۔ فرمانروائی

کے طور طریقے اس کو معلوم تھے۔

قتیبہ بن مسلم کو اس نے وسط ایشیا کا حاکم بنایا تھا جس نے دس سال کی جنگ جہل میں کاشغر تک کا علاقہ مسخر کر لیا اور چین کی سرحد تک اموی سلطنت کی حدود بڑھا دیں۔ مکران کے گورنر محمد بن قاسم نے موجودہ بلوچستان اور سندھ کے قبائل کی چیر و سنہر سے تنگ آ کر ہندوستان پر حملہ کیا اور سندھ، ملتان اور یاس تک اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا۔

مسلم بن عبدالملک اور عباس بن ولید نے ایشیائے کوچک کے بہت سے مقامات فتح کئے اور ان پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

عمر بن عبدالعزیز نے اپنی رہائی قابلیت سے مکہ، مدینہ اور حجاز کے کئی مقامات کی دیرانی کو قدرے دُور کر دیا تھا جس سے فائدہ اُٹھا کر امام محمد باقرؑ نے اپنے دادا کا مدرسہ پھر سے جاری کیا تھا جو برسوں سے بند پڑا ہوا تھا۔ ولید کے عہد میں وہ جلدی موسیٰ بن نصیر مملکت کے مغربی حصوں کا حکمران تھا۔ جنگ صفین میں اس نے علیؑ کے خلاف تلوار اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت معاویہؓ اس کو معاف نہ کرتے مگر اس کی صلاحیت کا دوسرا آدمی پوری سلطنت میں موجود نہ تھا پھر یہ بھی دُر تھا کہ اگر یہ ٹوٹ کر اُدھر چلا گیا تو کہیں دوسرا مالک اشتر بن جلعنؓ لہذا عرب کے مدبر نے رگزد سے کام لیا اور آج موسیٰ بن نصیر اموی سلطنت کی توسیع میں کام آیا۔

مرتضیٰ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ موسیٰ کی نظر ہسپانیہ کے حالات پر پڑی اور اس نے اپنے غلام طارق بن زیاد کی ماسحتی میں ایک فوج اس ملک کی تسخیر کے لئے روانہ کر دی۔ اسپین کی فتح طارق کی بہادری کا کارنامہ ہے مگر موسیٰ کا تدبیر بھی اس میں شامل تھا۔

۹۶ھ میں ۹ سال ۸ ماہ حکومت کر کے ولید کا انتقال ہو گیا اور سلیمان بن عبدالملک اس کا جانشین ہوا۔

ولید کا عہد اموی تاریخ کا ایک درخشاں عہد ہے مگر ”ان تمام

خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ بڑا سخت گیر تھا۔ اس سخت گیری کی وجہ سے ہزاروں آدمی قید و بند میں مبتلا ہوئے (۱۰۳)

امام محمد باقرؑ: ایک منارۂ علم و ہدایت

امام اپنے ابتدائے سن سے معجز نما تھے ایک راوی کا بیان ہے، وہ حج کے لئے جا رہا تھا کہ ایک سنسان راستے پر اندھیرے میں ایک طرف سے شمع پھوٹی۔ اس نے دیکھا تو ایک چھ سات سال کا لڑکا نمودار ہوا جس نے اسلامی طریقہ پر سلام کیا۔ راوی نے پوچھا کہ کون ہے اور کہاں جائے گا اور اس کے پاس زاد راہ ہے یا نہیں؟ لڑکے نے جواب دیا۔

”خدا کی طرف سے آ رہا ہوں، خدا کی طرف جاؤں گا، زاد راہ تقویٰ ہے، عربی اللہ قریشی النسل اور علوی نژاد ہوں، نام محمد بن علی بن حسین ہے۔“ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ میں نے ہر طرف دیکھا مگر نظر نہیں آیا۔

اس طرح کے اور بھی معجزات آپ کی ذات سے ظہور میں آئے لیکن آپ کا بڑا معجزہ علوم دین و دنیا سے آپ کی واقفیت تھی۔ آپ نے ذات باری، انسانی زندگی اور اس کی ماہیت، رموز حکمت اور اسرار مشیت، زہد و تقویٰ، روح کی حقیقت اور ماہیت، سب پر روشنی ڈالی۔ علم القرآن، علم الآثار، علم السنن کے آداب و نکات کو واضح کیا۔ آپ اپنی ذات سے ایک بحر العلوم تھے اور آنحضرت اور امیر المومنین کے جانشین نظر آتے تھے۔

خطیب مہر سلطانی سے دیاٹھے استفادہ نہیں کیا لیکن امام محمد باقرؑ سے پوچھنے والوں نے بہت کچھ پوچھا نعمان بن ثابت المعروف بہ امام ابو حنیفہؒ نے تو فقہ و حدیث کی وہ معلومات حاصل کیں کہ ان کی شخصیت بن گئی، پھر دو سال آپ نے اسی گاہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں گزارے۔

امام ابو حنیفہؒ کو امام باقرؑ نے تاکید فرمائی تھی کہ قیاس سے فتاوے نہ دیا کریں اور کئی سوالات کے جوابات دے کر سمجھایا تھا کہ اس طرح فتوے غلط ہو جاتے ہیں مگر

شاید امام ابو حنیفہ نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا کیونکہ ان کی اگلی زندگی میں اس کی نظیر ملتی ہیں۔

سلیمان بن عبد الملک

سلیمان کا عہد حکومت ۹۶ھ سے شروع ہوا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی قید خانوں کے دروازے کھلوا دیئے اور بے گناہ قیدیوں کو رہا کر دیا جو ایک اچھا کام تھا مگر خود اپنے دشمنوں کو بے دردی سے قتل کر دیا اور سلطنت کے معماروں کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا۔ جن میں قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم شامل ہیں عبد العزیز بن موسیٰ کا قتل اسی کے ایمار پر کیا گیا تاہم اس نے کچھ کارہائے خیر بھی کئے۔ ظلم و شقاوت اس کو ورثے میں ملی تھی مگر تدبیر سے خالی تھا۔ رومیوں سے اس نے شکست کھائی۔ یزید بن مہلب نے طبرستان و کوہستان کے بعض علاقے فتح ضرور کئے مگر مجموعی طور پر اس کا عہد ناکام رہا۔ آخر ۲ صفر ۹۹ھ کو دو سال پانچ ماہ حکومت کر کے فوت ہو گیا۔

بنی فاطمہ کا وہ اسلاف کی طرح دشمن تھا مگر اس کو زیادہ موقع نہیں ملا۔ ان کی حکومت میں محنتوں کا استعمال اس کے دور کی اختراع ہے۔ حضرت محمد حنفیہ کے پوتے ابو ہاشم کا اس کے دور میں بہت عروج تھا مگر اس نے کسی بات پر ناراض ہو کر انہیں دھم میں زہر دلوادیا۔

عمر بن عبد العزیز

سلیمان کے بعد عمر بن عبد العزیز ۹۹ھ میں تخت نشین ہوئے۔ ان سے امویوں میں ایک شریف النفس، مقدس اور عالی خیال خلیفہ کی نظیر قائم ہوئی۔ انہوں نے عام فریادیوں کی داد رسی کے ساتھ ساتھ باغ و فک اور لادرسوں کو واپس کر دیا۔ حضرت علیؑ پر سب دشتم بند کرایا اور خمس کا حقدار بنی ہاشم کو قرار دیا جو بنی امیہ کو ناگوار گذرا۔

بددیانت اور خائن عمال کی گرفت بھی ان کا کارنامہ ہے۔ بعض لائق لوگوں

کو بھی انہوں نے اعلیٰ عہدوں پر متعین کیا، اسحٰب بن مالک کو اسپین بھیجا۔ جس نے وہاں خاصی اصلاحات کیں۔ اس بے غرضانہ اور منصفانہ حکومت سے جابر اموی ان کے دشمن ہو گئے انہوں نے عمر کے غلام کو ملا کر رجب ۱۱۷ھ میں انہیں زہر دے دیا۔

یزید بن عبد الملک

یزید نے ۱۱۷ھ سے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ اس کے دور میں پہلی بغاوت یزید بن مہلب نے کی جو کئی مقابلوں کے بعد قتل ہوا۔ افریقیہ میں حجاج کا ایک ماتحت انصر مقرر تھا۔ وہ بھی باغی ہو گیا۔ اسپین میں بھی بدامنی ہو گئی۔ ہر طرف ایک خلفشار اور انتشار پیدا ہو گیا۔

اس نے ستم یہ ڈھایا کہ عمر بن عبدالعزیز کے سارے نظام کو الٹ کر رکھ دیا اور جہاں جانبِ بدامنی کے باوجود دادِ عیش دیتا رہا۔

جناہ نامی ایک کینز اس کی محبوبہ تھی، وہ اس کی لاش کے قریب کئی روز تک بیٹھا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دادِ عیش بھی دی اور بڑی لعنتِ ملامت ہونے پر اس کو دفن کیا۔

شعبان ۱۱۷ھ میں وہ فوت ہوا، بد مزاج، ظالم اور دشمنِ اہل بیت تھا ہشام بن عبد الملک اس کا جانشین ہوا۔

ہشام بن عبد الملک

ہشام ۱۱۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد ہی وہ حج کے لئے مکہ پہنچا۔ امام محمد باقر کو لاجواب کرنے کے لئے بعض سوالات کرانے لگا اس کو منہ کی کھانا پڑی۔ دشمن سے مکہ کی راہ میں ایک منزل پر پانی نایاب تھا۔ ہشام نے وہاں کنواں کھدوانے کا ہند کیا مگر زمین سنگلاخ تھی۔ بڑی مشکل سے کنواں کھودا گیا تو اس میں سے گرم اور جھلسا دینے والی ہوائ نکلی اور تمام مزدور مر گئے۔ دوسرے مزدور فراہم کئے گئے تو ان کا بھی یہی حال ہوا۔ ماہرینِ ارضیات سعی بسیار کے باوجود کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ہشام نے امام کو زحمت دی تو آپ موقع پر تشریف لے گئے اور فرمایا اس جگہ کو خود بند کر دیا جائے۔ قوم عاد

کے اہلِ احقاف پر یہاں عذاب نازل ہو رہا ہے پھر آپ نے ایک دوسرا مقام نشان دیا جہاں بیٹھاپانی نکل آیا۔

ایک سال ہشام حج کے لئے گیا تو امام محمد باقر اور جعفر صادق بھی موجود تھے۔ امام جعفر صادق نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا۔

”ہم زمین پر خدا کی حجت اور اس کے خلیفہ ہیں۔ ہمارا دشمن جہنم میں جائے گا اور دوست جنت میں۔“

شام میں علی پر تبر پھر شروع ہو چکا تھا۔ ہشام نے اس بات کو اپنے پرستار قرار دیا مگر مصلحتاً اس وقت خاموش رہا۔ دمشق پہنچ کر دونوں باپ بیٹے کو طلب کر لیا۔ آپ پہنچے تو تین روز تک صرمت شرمندہ کرنے کے لئے ملاقات نہیں کی چوتھے دن دربار کو خوب آراستہ کر کے بلوایا اور محمد باقر کو مقابلہ تیراندازی کی دعوت دی۔ آپ نے فرمایا۔

”میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھے معاف رکھ۔“

ہشام بھنم ہو گیا۔ سمجھتا تھا کہ یہ علمی آدمی ہیں اور اتنے بوڑھے ہیں۔ نشاء خطا کریں گے اور وہ اپنے اہلِ دربار کے ساتھ مذاق اڑائے گا۔

امام نے مجبوراً تیرکمان اٹھائی اور تیر چلے پر چڑھا کر چھوڑ دیا۔ تیر ٹھیک نشاء پر جا بیٹھا۔ امام نے فرمایا۔

”بادشاہ! ہم معدنِ رسالت ہیں۔ ہمارا مقابلہ کوئی کسی امر میں نہیں کر سکتا۔“

ہشام کو غصہ آگیا۔ منصوبے کے مطابق درباریوں نے بھی نازیبا الفاظ استعمال کئے اور امام نے فرمایا۔

”ہمیں خدا نے عزت دی ہے کسی کے ذلیل کرنے سے ہم ذلیل نہیں ہو سکتے۔“

مشغول ہو کر ہشام نے دونوں کو قید کر دیا مگر قیدیوں نے آپ کی ہم جلیبی اور گفتگو کا بہت اثر لیا اور آپ کے گن گانے لگے جس کا اثر باہر تک پہنچے لگا۔ آخر خائف ہو کر ہشام نے آپ کو رہا کر دیا مگر اس دن سے آپ کو راستے سے ہٹا دینے کی فکر میں لگ گیا۔

جناب زید شہید

زیدؓ، مظلوم و صابر امام زین العابدین کے بیٹے تھے مگر امام نہیں تھے۔ شہر میں آپ کی پیدائش ہوئی، جب واقعہ کربلا کو بیس سال گزر رہے تھے۔ آپ نے بچپن خود کھانا نہ کھا مگر عالی مرتبت باپ اور دوسرے بزرگوں کی زبان سے جو واقعات سنتے رہے تھے، اس سے خون کھول کھول کر رہ جاتا پھر آپ نے ان مظالم کو بھی دیکھا جو بنی امیہ نے اولاد رسول اور علیؓ کے ماننے والوں پر ڈھلے۔ انتہا ہو گئی تھی ظلم و ستم کی کہ کوئی چوری چھپے اپنے کسی بچے کا نام علی حسن حسین رکھ لیتا اور اس کا بیٹہ عمال حکومت کو چل جاتا تو بچہ تہ تیغ کر دیا جاتا تھا۔

جناب زیدؓ بڑے عبادت گزار، نہایت متقی اور حد درجہ شجاع تھے۔ شجاعت میں بہادری کے ساتھ ضبط و تدبیر بھی شامل ہوتا ہے مگر حد ہوتی ہے برداشت کی۔ امام تو ساری مخلوق کے لئے ہوتا ہے اور اللہ کی نیابت میں نافرمانیوں سے درگزر کرنا اس کا منصب ہے لیکن جناب زیدؓ پر ایسی کوئی ذمہ داری نہ تھی پھر بھی آپ اپنے جوش کو دباتے رہے اور اندر کے اُبال کو آپ نے باہر نہ آنے دیا۔

آخر دینے میں بنی امیہ کی زیادتیوں سے تنگ آکر آپ نے کوفے کا رخ کیا۔ یوسف بن عمر کے ستم دیکھے تو دمشق پہنچے اور ہشام سے شکایت کی۔

جناب زیدؓ کا انداز انصاف طلب تھا مگر اس کا جواب فرعونیت سے دیا گیا اور زیدؓ کے سخت جوابات پر ہشام نے آپ کو دوبار سے نکال دیا۔

صبر کا پیمانہ چھلک چکا تھا۔ جناب زیدؓ کو قہ واپس آئے اور آپ نے طے کر لیا کہ ظالموں کو سزا دیں گے یا سلیمان خزاعی کی طرح شہید ہو جائیں گے۔

کوفے کو حضرت عمرؓ نے آباد کیا تھا اور علیؓ نے مرکزیت کو دیکھ کر اسے اپنا مرکز حکومت بنایا تھا۔ یہ دونوں خواص اس شہر میں موجود تھے۔ یہیں سے حضرت علیؓ نے صفین کے لئے اپنا لشکر مرتب کیا تھا اور یہیں سے ابن زیاد نے قتل حسینؓ کے لئے فوجیں تیار کی تھیں۔ اسی شہر سے سلیمان بن مردخزاعی نے دس ہزار آدمی جمع کئے

تھے اور اسی شہر سے مختار ثقفی نے اپنی طاقت میں اضافہ کیا تھا۔

رنگ بدلتا اس بستی کا مزاج اور وعدہ خلافی اس کا طرہ امتیاز تھا۔ اور اب تو حالات پہلے سے زیادہ اتر ہو گئے تھے۔ پہلے تو شیعان علیؑ اور شیعان معاویہؓ زلے پائے جاتے تھے لیکن اب شیعان علیؑ تو ناپید ہو گئے تھے۔ شیعان معاویہؓ رہ گئے تھے چودہویں کا کردار ادا کرتے، کبھی شیعان علیؑ بن جاتے اور کبھی اپنی اصل کی طرف پلٹ جاتے۔ انہیں میں بعض وہ لوگ بھی تھے جو اولاد رسولؐ کو برحق سمجھتے مگر طمع دنیا نہیں اپنا راستہ بدلنے نہ دیتی۔ جیسے مولیٰ بن نصیر کہ جنگ صفین میں علیؑ کے خلاف تلوار اٹھانے سے انکار کر دیا لیکن رہے بنی امیہ کے ساتھ۔

جناب زیدؑ نے سن تو رکھا تھا مگر جب ان کی آواز پر جوق در جوق لوگ اگر بیت کرنے لگے اور انہیں کچھ خلص لوگ بھی مل گئے تو آپؐ نے علم اہل بیت بلند کر دیا۔ چالیس ہزار آدمی کہنے کو کم نہیں ہوتے بشرطیکہ ان میں ایک تنہائی بھی وفادار ہوں لیکن وہ سب کے سب ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہشام کا شکریہ گراں مقابلہ پر آیا، بدلی چھٹنے لگی۔ تین روز کی جنگ میں مخلص اصحاب و انصار مارے گئے صرف ۸۸۔ آدمی رہ گئے۔ ۳۳ عزیز و اقارب اور ۵۵ شیعان اہل بیت تھے۔

جنگ کا انجام سامنے تھا لیکن حسینؑ کا پوتا رزم گاہ کو پیٹھ کیونکر دکھاتا۔ جناب زیدؑ زخموں سے چور چور ہو چکے تھے کہ ایک تیر آپؐ کی پیشانی پر آکر لگا۔ آپؐ گھوڑے سے گر گئے۔ خادم میدان سے ہٹا لے گیا اور ایک مقام پر قبر کھود کر آپؐ کو دفن کر دیا۔ لیکن دشمن اہل بیت یوسف بن عمر نے پتہ لگا کر لاش نکال لی، سر کاٹ کر ہشام کے پاس بھیج دیا اور جسم سولی پر لٹکا دیا جو ہشام کی موت تک چار سال لٹکا رہا۔

حضرت عیسیٰ بن زیدؑ

جناب زیدؑ کی شہادت کے بعد عیسیٰ میدان جنگ سے مدائن اور مدائن سے نیشاپور چلے گئے۔ بنی امیہ کا دستہ فوج ڈوہ لگاتا ہوا دہاں پہنچا تو آپؑ سرخس آ گئے۔ اس مقام پر چھ ماہ یزید بن برمکی کے دہان رہے پھر حریش کے مکان میں منتقل ہو گئے۔

یوسف بن عمر کو معلوم ہوا تو اس نے نصر بن سیار کو آپ کی گرفتاری کے لئے لکھا نصر نے
میزبان کو پکڑ کر چھ سو کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ حریف کوڑے کھاتے رہے مگر سچی کے بارے
میں کچھ نہ بتایا مگر ان کے بیٹے نے سچی کو گرفتار کر دیا۔

اس عرصے میں ہشام مرچکا تھا اور ولید ثانی تخت پر متمکن تھا۔ اس نے کسی سفارش
پر سچی کو رہا کرنے کا حکم دے دیا مگر بنی امیہ نے سچی کو سرخس میں رہنے نہ دیا اور آپ
طوس چلے گئے۔ حاکم طوس ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا۔ سچی کو جب کسی مقام پر چین سے بیٹھنے
دیا گیا تو تنگ آمد بجنگ آمد۔ آپ صرف ستر آدمیوں کو لے کر مقابلے پر آ گئے۔

طوس کا سپہ سالار عمر بن زرارہ دس ہزار لشکر کے ساتھ مقابل ہوا مگر ستر بنی ہاشم
ننگی تلواریں لے کر بڑے ٹھوکر کاٹ کر رکھ دیا۔ اتنی بڑی فوج کو شکست ہوئی۔ عمر مارا گیا اور
باقی لوگ فرار ہو گئے۔ سچی یہاں سے ہرات آ گئے۔ وہاں بھی آپ پر حملہ کیا گیا اور
آپ جرجان کی طرف چل پڑے۔ اس مقام پر آپ کو ایک بڑے لشکر کا سامنا کرنا پڑا اور
آپ لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ابوالعجارم حنیفی اور خشناس ازوی نے بھی اس جنگ میں
شرف شہادت حاصل کیا۔

آپ کا سر کاٹ کر ولید ثانی کے پاس بھیج دیا گیا۔ ہاتھ پاؤں کاٹ کر پہلے جسم کو مٹی
پر لٹکایا گیا پھر جلا کر راکھ دریلے فرات میں بہادی گئی۔

ابوالفضل بن زید کی لاش بھی لٹکا دی گئی جس کو بنو عباس کے اقتدار میں ابوسلم
خواسانی نے اتردا کر دفن کیا۔

جناب علی بن ابی طالبؑ نے سجدہ گزار تھے کہ آپ کی پیشانی پر گھٹے کا
نشان چمکتا تھا۔ آپ تقیہ میں چلے گئے تھے اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر چھپتے
پھرتے تھے۔

کوئی آپ نے ایک سقے کی ملازمت کر لی اور ایک عورت سے شادی کر لی
جس سے ایک بچی پیدا ہوئی۔ جب وہ جوان ہوئی تو سقے نے اپنے لڑکے سے اس کا رشتہ
دیا علی شرم سے گڑ گئے کہ علی کی پوتی ایک سقے کے بیٹے سے بیاہی جائے۔ اپنی حقیقت

بیوی پر بھی کھولتے تو قتل ہو جاتے۔ رات نماز تہجد میں باری تعالیٰ سے دعا کی کہ اس لڑکی کو اٹھالے۔ دعا قبول ہوئی اور وہ مر گئی۔

آپ اس کی موت پر بہت روئے تو ایک دوست نے کہا کہ بہادر اس طرح تو نہیں روتے۔ آپ نے فرمایا۔

”اس لڑکی پر نہیں زور رہا ہوں، زور رہا ہوں اس پر کہ وہ مر گئی مگر اس کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ اس کا باپ کون ہے اور وہ کس خاندان سے ہے؟ یہ تھی بے چارگی جس سے عاجز اور مشتعل ہو کر آل رسول کے بعض افراد مرنے اور مارنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت

ہشام نے ہر تدبیر کڑی دالی تھی مگر نہ امام محمد باقر کی شخصیت کو مجروح کر سکا اور نہ آپ کو کسی موقع پر ذلیل کر سکا تو اس نے امام کو قتل کر دیے کا منصوبہ بنایا اور عامل مدینہ کے ذریعہ آپ کو ایک زہر آلود زین تنخفے میں بھیجی جس پر بیٹھنے سے آپ سدا سنال کی عمر میں مر دی کچھ سالہ کو انتقال فرما گئے۔

آپ کی چار بیویاں تھیں جن سے دو بیٹیاں اور پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔ بیٹیوں میں زینب دُائِم سلمہ اور بیٹوں میں امام جعفر صادق، عبداللہ، ابراہیم، عبید اللہ اور علی قاسم جعفر صادق آپ کے بعد مسندِ نبیین امامت ہوئے۔

چھٹے امام

امیر المومنین حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

مرذی الحج ۱۴۴۸ھ تا ۲۵ شوال ۱۴۸ھ

ولادت مسعود

آپ ۱۴ ربیع الاول ۳۸ھ کو دوشنبے کے دن مدینے میں پیدا ہوئے۔ دوسرے آئمہ کی طرح ناف بریدہ اور ختنہ شدہ تھے۔ عالم شہور میں آتے ہی کلمہ شہادتین زبان پر جاری فرمایا۔ امام محمد باقرؑ نے آپ کو دیکھ کر فرمایا۔

”میرا یہ بیٹا ان لوگوں میں ہے جن کا وجود بندوں پر پروردگار کا احسان ہے یہی میرا جانشین ہے“ پانچ مرذی الحج ۱۴۴۸ھ کو پدر عالمیتقام کے بعد آپ منہ مآ پر رونق افروز ہوئے اور رشد و ہدایت کا وہ دور شروع ہوا جس کے کسب فیض سے کئی سجادے بچھائے گئے۔

انام سے بنی ائمہ کے بدتر اور جابر حکمرانوں کا کئی بار سابقہ پڑا مگر کوئی کسی موقع پر آپ کی تذیل نہ کر سکا۔ آپ کے بچپن میں عبدالملک بن مروان کا عہد تھا، پھر ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک سربراہان سلطنت ہوئے، بحالت موجودہ ہشام کا دور تھا، اس کے بعد ولید بن یزید، یزید الناقص، ابراہیم بن ولید اور مروان الحمار بنی ائمہ کے تخت پر بیٹھے۔

یہ تمام بادشاہ آل محمد کے لئے سیرت معاویہ رکھتے تھے۔ امام جعفر صادق بار بار درباروں میں بلائے گئے۔ ان کی منزلت کو گھٹانے کے لئے علماء سے منظرے

کوائے گئے مگر پیغمبر کے جانشین سرخرو رہے۔ شاہانِ وقت نے کئی مرتبہ محدودوں اور ہر لو سے مباحثہ کر لیا لیکن عارف اسرارِ احادیث کو کون نیچا دکھا سکتا تھا۔ صادق آلِ محمد حق کا بول بالا کرتے رہے۔ بے شمار معجزات آپ سے ظاہر ہوئے جو عقیدے کی روشنی کو تیز سے تیز کرتے رہے مگر آپ کا اصل کام یہ کہ ہوئے انسانوں کی رہبری تھا جو بہر طور جاری رہا۔

ہشام کے کارنامے اور وفات

ہر اموی حکمران کی بنیادی کارگزاری خونِ سادات تھا۔ ہشام اس میں بازی تو نہیں لے جاسکا مگر کسی سے پیچھے بھی نہیں رہا۔ محمد جواد المغینہ الشیعہ والحق اکون تحریر فرماتے ہیں۔

”ہشام نے قدیم معمولات اور فاسد رواج کی اصلاح کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ وہ بھی اہلیت اور حجتانِ اہل بیت کی دشمنی، اموی غذا کے طور پر فرسوسم کرتا رہا۔ ظلم میں ظلم، تشدد میں تشدد کا اضافہ اس کا کام تھا۔ اپنے عمال کو اس نے تحریہ کیا کہ شیعوں پر سختی کریں، قید کریں، ان کے آثار و نشانات مٹا دیں اور انہیں عطایا سے محروم رکھیں۔ چنانچہ اس کے حکم پر یوسف بن عمر ثقفی نے مداح آلِ محمد شاعر کیت کے مکان کو منہدم کر دیا اور ان کی زبان کاٹ ڈالی۔“ ”خاب کیت“ تھمہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار اصحابِ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق میں سے ہوتا ہے آپ کا مشہور قصیدہ ”ہاشمیات“ آپ کے عقائد کا ترجمان ہے۔

”ہشام نے اپنے عاملِ مدینہ خالد بن عبد الملک کو تحریر کیا کہ بنی ہاشم کو مدینے سے باہر جانے نہ دے، کوئی جانے کی کوشش کرے تو اسے گرفتار کر لے۔ اس حکم کی تعمیل میں بنی ہاشم پر سختی بڑھ گئی۔“

جابر و ظالم ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں بڑی انتظامی صلاحیت بھی تھی۔ سب سے پہلے اس نے خارجیوں کا زور توڑا، پھر مختلف اوقات میں کئی اندرونی بغاوتوں کو فرو کیا بختل اور فرغانہ میں خالد کے بھائی اسد نے کئی لڑائیاں لڑیں اور

ترکانوں کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا۔ اسی دوران کاکیشیا، شمالی ایران اور آرمینیا میں فتنہ فساد ہوئے لگے۔ جن پر مردان بن محمد نے قابو پایا۔ افریقیہ اور اسپین میں بھی کئی فتوحات ہوئیں۔ جزیرہ سلی سمحر ہوا پھر مسلمان فرانس کی سرحدوں تک بڑھتے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ایک نیا فرقہ مرقش میں پیدا ہوا۔ جنگ اشراف واقع ہوئی اور عرب لڑتے لڑتے مارے گئے، پھر اسپین میں افریقیہ پھیل گئی۔ ہشام نے حنظلہ بن صفوان کو متعین کیا اور حنظلہ نے ایک سخت جنگ کے بعد عکاشہ کو شکست دی اس میں بدامنی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ السمع جب لالوز کی دیواروں تلے مارا گیا تو عبدالرحمن الغافقی نے فوجوں کی کمان سنبھال لی اور حالات پر قابو پایا۔

عبدالرحمن کو مسلسل بربروں اور غیسیائیوں سے جنگیں کرنا پڑیں مگر وہ ہر اس سے نہ ہوا اور چارلس شاہ فرانس سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس شکست سے مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی اور عقبہ بن ججاج اندلس کا حکمران بنایا گیا جس نے فرانس پر بھی حملے کئے اور اٹلی کا کچھ علاقہ فتح کیا مگر سابقہ رعب و دبدبہ واپس نہ لاسکا۔

حلیف القرآن ابو الحسین زید شہید کا واقعہ اسی دور کا ہے، عباسی تحریک فاطمی تحریک کے نام سے، اسی زمانے میں پھیلی رہی۔

۱۲۵ھ کو ہشام کا انتقال ہو گیا اور اس کا جھتیجا ولید ثانی تخت نشین ہوا۔ ہشام کی مدت حکومت ۲۰ سال تھی۔

ولید بن یزید بن عبد الملک

ولید ربیع الاول ۱۲۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ فاسق و فاجر، شرابی اور بے رحم تھا۔ لواطت میں بہت مشغور تھا۔ آل رسول کا دشمن تھا۔ حضرت یحییٰ اسی کے عہد میں شہید ہوئے۔ محرمات الہی کی ہتک کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ ایک مرتبہ اس سے قرآن سے فال نکالی۔ فال اس کے خلاف مزاج نکلی تو اس نے قرآن ٹکاکم تیروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ولید کو ایک وسیع سلطنت ملی تھی لیکن اس نے اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ

اتان شروع کر دیا جس سے بغاوتیں ہونے لگیں۔ ہسپانیہ میں بھی شیرازہ سلطنت منتشر ہونے لگا۔ لیکن عقبہ بن نافع کی نسل میں یوسف نامی سردار نے حالات کو سنبھال لیا۔ وہ ایک نا عاقبت اندیش اور بے تدبیر بادشاہ تھا۔ خالد بن عبداللہ قسری کو قتل کر کے اس نے یمنی قبائل کو اپنا مخالف بنالیا اور انہوں نے محل میں اسے گھیر کر قتل کر دیا۔

یزید بن ولید المعروف بہ یزید الناقص
یہ بادشاہ اوائل ۷۶ھ میں تخت نشین ہوا اور ذی الحجہ ۱۲۶ھ میں چھ ماہ حکومت کر کے مر گیا۔

اس کا مختصر دور قبائلی بغاوتوں اور بنی امیہ کی آپس کی جھپٹش کا شکار رہا۔
ابراہیم بن ولید

اس کا عہد حکومت دو ماہ ایک دن کا ہے اس کا اقتدار والخلافت اور اس کے اس پاس تک محدود رہا۔ پھر آپس کی جنگ میں مارا گیا۔

مروان بن محمد بن مروان المعروف بہ مروان الحمار

اموی حکومت کا آخری بادشاہ ۱۳۲ھ میں تخت نشین ہوا۔ آل محمد کی دشمنی اس کو بھی وراثت میں ملی تھی مگر اپنے پانچ سالہ عہد میں اس کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ تخت پر بیٹھے ہی سلیمان بن ہشام نے چڑھائی کر دی مروان نے بہادری سے مقابلہ کیا اور اس کو مار بھجوا دیا۔

عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار بھی دوسرے بنی ہاشم کی طرح ظلم و ستم سے عاجز ہو کر اٹھتے تھے اور ایک عرصے سے ساتھیوں کی تلامش میں سرگرداں تھے۔ اہستہ اہستہ انہوں نے ایک جمعیت فراہم کر لی مروان الحمار نے ان سے مقابلہ کیا مگر سپاہ کو سکا اور عبداللہ نے فارس و عراق کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا جہاں کے باشندے ان کے مطیع و فرمان بردار تھے۔

۱۳۸ھ میں سلیمان کی تحریک پر صفاک خارجی مروان کے مقابل آیا اور مروان نے

اس کو شکست دی۔ اسی زمانے میں مصافحات یمن میں ابو حمزہ نے علم بغاوت بلند کیا اور ان سب پر مستزاد بنی عباس کی طاقت تھی جو آہستہ آہستہ ادعائے حکومت میں مردان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

عباسی تحریک

سفیرانِ اہلبی کے موقف کا اعلان حضرت علی ابن ابی طالب رسالت مآب کی تجہیز تکفین سے فارغ ہونے کے بعد ہی کر چکے تھے کہ ان کی تلوار اگر بلند ہوگی تو صرف تبلیغِ اسلام کے لئے، شخصی اقتدار کے لئے تو یزیدی آپ کا منصب نہیں۔ وہی مسلک تمام ائمہ کا تھا۔ امام حسن اسی کے تحت اقتدار سے دست کش ہو گئے اور امام حسین نے تلوار اٹھائی تو صرف اس لئے کہ یزید سیفانی مذہب کو اسلام کا نام دے رہا تھا جس کے مقابلے پر صحیح اسلام کا پیش کرنا ضروری تھا تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ دشمن میں جس کو اسلام کہا جا رہا ہے وہ چادہ یزید ہے مسلک، اسلام نہیں ہے۔

امام زین العابدین پھر امام محمد باقر اور اب امام جعفر صادق، سب بے ظلم و ستم برداشت کرتے رہے مگر انہوں نے کبھی کسی کو تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس کے پس پشت بہر طور تسخیر ملک کا نظریہ ملتا تھا جس کے لئے وہ پیدا نہیں ہوئے تھے ان کا مقصد حیات تو صرف اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا تھا جو مساعدا اور نامساعد حالات میں وہ کہہ رہے تھے۔

یہی سبب تھا جو امام زین العابدین نے مختار کی سرپرستی قبول نہیں کی تھی اور جب زید شہید اُٹھے تو امام محمد باقر نے سکوت اختیار کر لیا۔ اب دیسا ہی ایک منصوبہ بنی عباس کی طرف سے بنایا گیا تب بھی امام جعفر صادق نے اپنے اقتضائے منصب کا اظہار فرمایا۔ عبداللہ ابن عباس قتل امام حسین کے بعد طائف میں اقامت پذیر ہو گئے تھے آپ کے بیٹے علی بن عبداللہ نے بھی اپنی زندگی اسی طرح گزار دی۔ علی کے بیٹے محمد کو شام میں ایسی زندگی سے اکتا کر بنی امیہ کے جور و ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے مدینہ کے قریب ابوا "میں عمائدین بنی ہاشم کو جمع کیا جن میں عبداللہ بن

ابن حسن مثنیٰ، ان کے دونوں بیٹے محمد و ابراہیم، ابوالعباس بن محمد، ابو جعفر بن محمد اور ابراہیم بن محمد (عبداللہ ابن عباس کے پوتے) اور ان کے چچا صالح بن علی اور محمد بن علی شامل تھے۔ صالح نے تقریر کی کہ اس طرح کی زندگی کب تک جاری جائے گی، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم سب کسی ایک کو منتخب کر کے اس کی بیعت کیں اور دھیرے دھیرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

عبداللہ محض نے اپنے بیٹے محمد "المعروف بنس ذکیہ کو تجویز کیا جو شجاعت و سخاوت کی حد تک حدیث و فقہ، دُور بینی اور دانش مندی میں مفرد تھے۔ جن کی دونوں تہلیلوں میں بیعت کے برابر نشان تھے۔ ابو جعفر نے اتفاق کیا اور پورے مجمع نے متفق ہو کر نفس ذکیہ کی بیعت کر لی۔

اس کے بعد امام جعفر صادق کو بلوایا گیا۔ آپ نے تمام واقعات سن کر عبداللہ محض سے فرمایا۔

”ابھی ہمدی آل محمد کا زمانہ بہت دُور ہے۔ تم لوگ مظالم سے تنگ آ کر فی سبیل اللہ خروج بالسیف کرنا ہی چاہتے ہو تو رئیس قوم اور بزرگ خاندان تم خود ہو، لوگ تمہارا زیادہ احترام کریں گے۔“

آپ اپنے ابن عم سے جلتے ہیں۔، عبداللہ محض نے کسی قدر ترش روئی سے کہا اور امام نے بڑی متانت سے ابوالعباس کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

”یہ خلیفہ ہوگا، اس کے بعد اس کا بھائی، پھر اولاد۔ تمہارے دونوں بیٹے قتل ہوں گے۔“

یہ کہہ کر وہاں سے چل پڑے۔ ابوالعباس اور ابو جعفر سمجھے آئے اور یقیناً کیا ”کیا آپ نے جو فرمایا ہے، وہ صحیح ہے؟“

”بالکل صحیح۔“ امام نے جواب دیا اور اُس دن سے حضرت عباس بن عبدالمطلب کا خاندان آل محمد سے کترانے لگا۔

سالہ میں محمد بن علی شام گئے تاکہ محمد حنفیہ کے پوتے ابوالثمام سے مدد حاصل

کریں جو سلیمان بن عبد الملک کے منہ پر پڑے تھے مگر اتفاق سے انہیں دلوں ابو ہاشم کو نہ ہر دے دیا گیا ابو ہاشم کے انتقال کے بعد محمد بن علی نے مشہور کر دیا کہ ابو ہاشم انہیں اپنا خلیفہ بنا گئے ہیں محمد حنفیہ جتھان اہل بیت میں حقوق آل محمد کے داعی مشہور تھے اس لئے دمشق اور دوسری جگہوں کے چھپے ہوئے شیعہ ابو ہاشم سے ایک ربط رکھتے تھے اور اس رشتے کے تحت بہت سے لوگوں نے خفیہ طور پر محمد بن علی کی بیعت کر لی۔

محمد بن علی نے ہوش مندی یہ کی کہ ابو عکرہ سرانچ کو دو آدمیوں کے ساتھ خراسان روانہ کر دیا اور تاکید کی کہ جس کسی سے بیعت لی جائے، وہ نصرت آل محمد کے لئے۔ یہ خفیہ کارروائی ستائیس میں ہشام کے وقت سے شروع کی گئی اور ستائیس میں زمانہ ولید تک بڑی احتیاط سے چلتی رہی، پھر محمد بن علی نے سلیمان ابن کثیر اور فحطہ ابن شیبہ کو ایران روانہ کیا اور ان سے بھی یہی کہا کہ حقوق اہل بیت حاصل کرنے کے لئے دعوت جہاد دی جائے۔ اسی زمانے میں محمد بن علی کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے ابراہیم نے باپ کا کام سنبھال لیا۔

جناب زید اور جناب یحییٰ کی شہادتوں نے لوگوں میں ایک فطری اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ لہذا ابراہیم کے داعی ابو سلمہ کو کوثر اور جرجان دونوں مقامات پر کامیابی ہوئی اور لوگ نبی کی عترت کے لئے ایک جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے۔

بنی عباس کا شمار ہر نہج و اعتبار سے بنی ہاشم میں ہوتا تھا اور مشن ستم بننے میں سب ایک سطح پر رہے تھے۔ اس سے قبل بنی عباس اور آل رسول کی کوئی تفریق بھی نہ تھی اور اب بھی بنی عباس کا کوئی جدا گانہ تصور کسی کے ذہن میں نہ تھا مگر عبداللہ ابن عباس کے پر پوتے شاید دوسرے انداز پر سوچ رہے تھے تاہم انہوں نے دلوں کا کھوٹ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا اور مدد کے لئے عبداللہ ابن جعفر کے پوتے عبداللہ کے پاس پہنچ گئے جنہوں نے عجم سے قوس تک اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔

عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار، حضرت عبداللہ بن عباس کی اولاد کو اپنے سے مختلف سمجھ بھی نہ سکتے۔ وہ سب کے سب جب ان کے پاس پہنچے تو جعفر طیار

کے پوتے نے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنے لشکر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا مگر ۱۱۹ھ میں جب ہشام کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو عبداللہ کا لشکر ہزیمت یاب ہوا اور آپ چند تھوڑے سا تھوڑے کے ساتھ ابومسلم خراسانی کی طرف چل پڑے جو رضائے آل محمد کے لئے اُس علاقے میں بیعت کی دعوت دے رہا تھا۔

ہرات میں ابومسلم کے ایک کارندے مالک بن ہیشم نے عبداللہ کو روکا اور ابومسلم کو اطلاع دی۔ ابومسلم نے کسی غلط فہمی یا جان بوجھ کر ان کے قتل کا حکم دے دیا اور مالک بن ہیشم نے اس کی تعمیل کر دی۔ ہرات میں ان شہیدوں کے مزار پر مقابر سادات کے نام سے آج تک پائے جاتے ہیں۔

اسی دوران مروان نے ابراہیم کو گرفتار کر لیا اور کچھ دنوں حراں میں قید رکھ کر سب کو قتل کر دیا لیکن اس سے ابومسلم کی پیش قدمی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ قحطیہ نے بے پرواہی سے قبضہ کر لیا اور حسن والوبعین نے امویوں اور خارجیوں کو مار بھگایا پھر نہادند میں شامیوں کا محاصرہ کر لیا۔ اسویوں کی ایک فوج عبداللہ کی سرکردگی میں بالائی عراق سے دوسری یزید والسرائے کی ماتحتی میں نہادند کی طرف بڑھ رہی تھی۔ الوبعین نے نہادند فتح ہوتے ہی عبداللہ کو روک لیا اور قحطیہ فرات عبور کر کے یزید کے سر پر جا پہنچا۔ دونوں فوجیں امام حسین کی شہادت گاہ کے قریب ایک دوسرے سے متصادم ہوئیں ایک خونریز جنگ کے بعد اموی شکست یاب ہوئے مگر خود قحطیہ بھی مارا گیا یا فرات میں ڈوب گیا اور حسن نے باپ کی جگہ لے لی۔ اس شکست نے مروان کو حواس باختہ کر دیا اور مشغول ہو کر وہ حماقتوں پر حماقتیں کرنے لگا۔

ابوجعفر، اسمعیل، ابوداؤد، صالح، عبدالصمد اور دیگر بنی عباس کو ذہین ابومسلم کے پاس پہنچ کر رد و پوشش ہو گئے تھے جس کا لشکر پہنچنے کے بعد وہ منظر عام پر آئے۔

بنی عباس کی اس کامیابی میں عمرت رسول کے نام کی کرامت تھی مگر خود اہل شام کے پیدا کردہ عوامل بھی اس میں دخل تھے اور حقیقت یہ ہے کہ:

”عباسیوں کے عروج کا راز اس طرز حکومت میں سرسبز ہے جس کی بنا حجاج نے ڈالی تھی اور جو عمر ثانی کی سخت کوشش اور جدوجہد کے باوجود شاہانِ اُمیہ سے ترک نہ ہو سکا تھا۔ حاکم، محکوم سے بالکل الگ تھلگ رہتے اور طرفہ یہ کہ دونوں کے درمیان کوئی ایسا واسطہ نہ تھا جو ایک کو دوسرے کا مدد نہائے رکھتا۔ قومی تقاضا پر ناناں ہو کر عرب مقامی باشندوں سے کچنے کچنے رہتے۔ اسلام کی تعلیم کے باوجود ان کو حقیقت سمجھنے، نتیجہ نہ نکالنا کہ درمیانی فصل بڑھتا رہا اور اسی کش مکش میں اخوت کا رشتہ ٹوٹ گیا۔“ (۱۰۴) پھر نفرت کی خلیج بتدریج گہری ہوتی چلی گئی۔

ایسے میں عباسیوں نے اپنی تحریک چلائی جو آلِ فاطمہ کے نام پر مقبول ہوتی چلی گئی۔ پھر ابوالعباس اور ابو جعفر نے کہنا شروع کر دیا کہ نبیؐ کی اولاد گوشتہ نشین ہو گئی ہے اس نے ہمیں پورے اختیارات دے دیتے ہیں۔ تسخیرِ کوفہ کے بعد آلِ رسول کا نام بالکل پیچھے پڑ گیا اور صرف بنی عباس سامنے رہ گئے جو کل خاندانِ رسالت کے ذیل میں تھے اور آج اپنے کو ادرلانے میں کوشاں تھے۔

اس تحریک کے دو فعال کردار تھے۔ ایک ابوسلم، دوسرا ابوسلمحہ۔ ابوسلم کو بنی عباس نے آلِ محمد کے نام پر شریک کار بنایا تھا۔ ابوسلمہ کو نے کا باشندہ تھا مگر اس کا صحیح پتہ نہیں چلتا کہ آلِ محمد کا داعی وہ کیونکر بنا؟ اس کی عالمانہ حیثیت تھی اور وہ عمرتِ اطہار کے سوا کسی کا نام بھی نہ لیتا تھا۔ اس لئے تسلط ہوتے ہی اس نے ایک قاصد مدینے روانہ کر دیا اور تین خط اس کے حوالے کئے۔ ایک امام جعفر صادق کے نام، دوسرا عبداللہ محض کو اور تیسرا عمر لاشراف ابن امام زین العابدین کے نام۔ قاصد کو اس نے ہدایت کی کہ اگر امام جعفر صادق قبول فرمائیں تو باقی دو خط نوح ڈالنا

قاصد نے پہلے ابوسلمہ کا خط امام جعفر صادق کی خدمت میں پیش کیا حضرت نے بغیر کھولے چراغ کی لو پر رکھ کر جلا دیا اور قاصد سے کہا۔
”اس کا جواب تمہیں کرنے پہنچ کر خود مل جائے گا۔“

قاصد نے وہاں سے نکل کر عبداللہ محض کا خط انہیں پہنچایا۔ عبداللہ اس خط کو لے کر امام کی خدمت میں آئے۔ امام نے نصیحت فرمائی کہ اس سازش میں نہ آئیں۔ قاصد نے تیسرا خط عمرالاشرف کو پہنچایا۔ آپ نے کہا کہ وہ لکھنے والے سے واقف ہی نہیں ہیں تو جواب کیا دیں۔

ابو سلمہ الخلال کی نیت کیا تھی اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن اگلے دن جب جامع مسجد میں اجتماع عام ہوا تو ابو سلمہ نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر کہا۔
 ”ابو سلمہ، محافظ اہل بیت کی رائے ہے کہ موجودہ لوگوں میں ابو العباس سے زیادہ عادل، منصف اور لائق آدمی کوئی دوسرا نہیں ہے لہذا انہیں مندرجہ ذیل پر بٹھا دیا جائے۔“

عام خیال تھا کہ مخالفت میں ادا زیں بلند ہوں گی کیونکہ پوری تحریک آل محمد کے نام پر چلائی گئی تھی لیکن اہل کونہ چڑھتے سورج کے پجاری تھے۔ انہوں نے نعرہ ہا تکبیر بلند کر دیئے! ابو العباس کسی مقام پر نیچے کا منتظر تھا۔ اس کو فوراً بلوایا گیا اور بیعت شروع ہو گئی۔ رسول کے منبر پر اہل ایمان کو کبھی بندر اچھلتے نظر آئے تھے تو ان کی جگہ اب ایک گرگ باراں دیدہ نے لے لی اور ایک خوفی باب بند ہونے سے قبل دوسرا خوفی باب کھل گیا۔

کونے والوں کی تلون مزاجی کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ شیعان علی تھے ہی کتنے لیکن تخریر خیز ہے ابو سلمہ کی عداوت کہ وہ داعی بن کر آیا تھا آل محمد کا گھر راتوں رات آتنا ہلاک روز و رشاں ہوتے ہی رسول کا نام لینے کے بجائے بنو عباس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ کوئی مخالفت آواز اٹھ جاتی تو وہ اس کی تاویل کرنے پر تیار ہو کر آیا تھا اور یوں بھی اس نے بندہ حق ابو سلمہ کے کا نہ بھے پڑا کہ داعی تھی، ساری عسکری قوت جس کی رہیں منت تھی۔

محققان فطوں میں اس تحریک کو چار چیزوں نے کامیاب کر لیا تھا۔ محمد بن علی کی سازش ابراہیم کے دماغ، ابو سلمہ کی زبان اور ابو سلمہ کی تلوار۔ ان میں ابو سلمہ کی تلوار سب سے حادی تھی مگر وہ کونے میں موجود نہ تھا۔ حسن بن قطیبہ اس کا نمائندہ تھا جس کو ابو العباس

نے پہلے ہی توڑ لیا تھا۔

ابوالعباس الفتح کے لقب سے سربراہانے خلافت ہوا لیکن اس کی خوشخواری کے سبب عوام میں السفاح کہہ کر پکارا گیا اور یہی اس کا لقب پڑ گیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے بعد یہ دوسری سازش تھی جو آلِ محمد کے خلاف کامیاب ہوئی۔ سقیفہ میں بھی آلِ محمد موجود نہ تھے اور کوفہ کی جامع مسجد میں بھی نہ وہ پارٹی بنے تھے اور نہ کسی نے ان کی نمائندگی کی اور بنی امیہ کے بعد نیابتِ رسول بنی عباس میں منتقل ہو گئی جو بنی امیہ کی طرح غاصب تھے اور قطعاً اس کے حقدار نہ تھے۔

بنی امیہ کی آخری جنگ

شمال میں صورتِ حال بسرعت بدل رہی تھی۔ ابو عیون، زاب کوچک کے مشرق مروان کے بیٹے پر حملہ آور ہوا اور اس کو زیر دست شکست دی۔

اس شکست نے مروان میں پہلی سی مستحدی پیدا کر دی۔ ایک لاکھ بیس ہزار جوانوں کے ساتھ اس نے دریائے دجلہ عبور کیا اور زاب کلاں کی طرف بڑھنے لگا اس اثنائے ابو عیون کو کوفہ سے کمک پہنچ گئی۔ ابوالعباس سفاح کا ایک چچا عبداللہ بن علی آنے والی فوج کا سربراہ تھا۔ وہ عباسی سپاہ کا سردار مقرر ہوا اور ابو عیون سردارِ اعلیٰ بنایا گیا۔

دریائے زاب کے بائیں کنارے پر بمقام قوشاف دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ مروان الحمار کو اپنی شجاعت پر بڑا اعتماد تھا۔ اس نے سرداروں کے منع کرنے کے باوجود دریائے دجلہ پر پل بنوایا اور پوری فوج کو دریا کے دوسری جانب اتار لایا جہاں دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔

عباسیوں نے شروع ہی سے ماتمی اداکاری کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اپنے پرچموں کا رنگ اور پوشش سیاہ رکھی تھی۔ اس آخری لڑائی میں گھوڑوں کی زینیں اذنٹوں کی پاکھریں اور جھولیں بھی سیاہ کر دیں۔ گویا وہ غمِ حشر میں مجسم سو گوار تھے اس ہولناک منظر سے اموی کچھ متوحش ہوئے اور انہوں نے اس کو بدشگونی قرار دیا،

لیکن مردان نے کسی بات کی پرواہ کئے بغیر ملہ بول دیا۔

یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ عباسیوں کے پاؤں ڈگمگائے۔ ابو عیون نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ گھوڑوں سے اتر کر تیز زین پر گاڑ دیں۔ عبدالرحمن بن علی نے تقریر کر کے شجاعانِ خراسان کو لٹکاد اور ان کی رگِ حمیت پر چوٹ لگائی۔ ادھر مردان نے امویوں کو اُسجا رلیکن عباسیوں کے زبردست حملے سے وہ لڑکھڑانے لگے۔

اس دوران مردان استنجے کے لئے ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے گھوڑے کو خالی دیکھ کر شامی دل ہار گئے اور بھاگنے لگے۔ ۱۱۰ ہجری الثانی ۳۲۰ھ کو عباسیوں نے شامیوں کی بدقسمتی پر مہر لگادی۔

مردان پہلے موصل کی طرف فرار ہوا، وہاں سے حران آیا پھر حمص ہوتا ہوا دمشق پہنچا مگر خطرہ پت چھڑکے سونکھے پتوں کی گھڑ گھڑا ہٹ کی طرح اس پر منڈلا رہا تھا۔ عبداللہ بن علی شکاردی کتنے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دمشق کو غیر محفوظ سمجھ کر مردان نے فلسطین کی راہ سے رومی علاقے کا رخ کیا کہ شاہِ روم سے مدد کی درخواست کرے مگر رفیقوں نے مصر کا مشورہ دیا اور وہ بالائی مصر کے شہر فیوم کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبداللہ بن علی نے اپنے بھائی ابو عیون کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ اسٹیل نیل کے مغربی کنارے پر بھینر ماحی گاؤں کے چھوٹے سے گرجا میں مردان کو جایا اور فیروزے کی نوکوں سے چھید کر رکھ دیا۔

مردان جا بردوں اور ظالموں کی اولاد میں آخری زندہ کدو تھا مگر لائق اور شجاع ترین بادشاہ۔ وہ اپنی بد نصیبی سے حکومتِ بنی امیہ کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر گیا اور سیاہ پوش خویوں کو اپنی جگہ بٹھا گیا۔ جنھوں نے معاویہ کی سیاست اور یزید کی جاثات سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اس کے بعد عبداللہ بن علی نے اتنی کینہ توڑی اور جفا شعار سی سے کام لیا جس کی نظیر تاریخ میں خال خال ملتی ہے۔ عباسیوں نے نہ صرف زندوں کو جو روستہ کا نشانہ بنایا بلکہ قبروں سے بوسیدہ ہڈیاں نکلا کر جلوائیں اور راکھ ہوا میں اڑادی منتقام

کے جوش نے ان کو اندھا کر دیا تھا کہ انسانیت کا لحاظ اور تہذیب کا پاس بھی باقی نہ رہا جہاں کہیں بنی امیہ کا کوئی فرد ملتا، وہیں ذبح کر دیا جاتا۔ دُور دراز علاقوں، دیرازوں غاروں اور کھنڈروں میں انہیں تلاش کیا جاتا اور ان کے خون سے تلواروں کی پیاس بجھائی جاتی تھی۔

صوبہ فلسطین میں دریائے ابو قطر کے کنارے عبداللہ بن علی نے مردان الحمار کے رشتہ داروں کو معافی کے وعدے پر جمع کیا اور ذرا سی دیر میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔

خوش نصیب تھے بنی امیہ کے چند افراد جو بچ کر نکل گئے۔ ان میں ہشام کا ایک پوتہ عبدالرحمن بھی تھا جو پہلے مراکش گیا پھر سپانیہ پہنچا وہاں اس کی منت نے یاد کی کی اور وہ عبدالرحمن الداخل کے نام سے اندلس کا حکمران بن گیا۔

اس طرح عباسیوں کے ہاتھوں بنی امیہ کی اکیانوے سال کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا آنا خون بہا جتنا انہوں نے بنی ہاشم کا نہ بہایا ہو گا لیکن نجس خون کا دریا بھی اولادِ رسول کے طاہر خون کے ایک قطرہ کا متبادل نہ ہو سکتا۔

بنی عباس کا یہ جذبہ انتقام اس لئے نہ تھا کہ بنی امیہ دشمنِ اہل بیت تھے بلکہ انہوں نے اپنے اقتدار کے لئے ملک امویوں سے خالی کر لیا تھا اور مظالم اس لئے ڈھائے تھے کہ عوام میں ان کا رعب و دبدبہ قائم ہو جائے۔ جہاں تک آل محمد کا تعلق ہے، آل عباس کے دلوں میں ان کے لئے ہمدردی کا کوئی امکان ہی نہ تھا کیونکہ جس طرح بنی امیہ غاصب تھے، اسی طرح وہ خود بھی تو تھے۔ اصل حقدار بنی امیہ کی آنکھوں میں بھی کھٹکتے رہے اور اب بنی امیہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بنی عباس کی نظرِ عزت پیغمبر کی طرف اٹھنا ہی چاہیے تھی، کیونکہ جھوٹی عزت اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتی جب تک حقیقی عزت دار پر کچی چڑ نہ اچھالی جائے اور انھیں ملمعون نہ کیا جائے کہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کا وقار محجور ہو جائے۔

میرے ایک مٹی دوست نے ایک بار مجھ سے کہا۔

”تم لوگ بنی امیہ پر لعنت بھیجتے ہو اور ان کے مظالم پر روتے ہو اور کہتے ہو کہ دشمن اہل بیت تھے مگر بنی عباس تو بالکل اپنے تھے انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“
 بات آتی سامنے کی تھی کہ دل پر چوٹ لگی مگر معترض نے واقعاتی صورت حال کو سامنے رکھ کر اعتراض کیا تھا لہذا میں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”غیر تو کوئی نہیں تھا، سب ہی اپنے تھے مسئلہ تھا اقتدار کا۔ ہر غاصب اصل حقدار کو کچل کر اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش میں لگا رہا کیونکہ حقدار جب تک زندہ رہتا، زبردستی اور مکر و فریب سے چھپنی ہوتی چیز کی واپسی کا مطالبہ نہ کرتا اس سلسلے میں بنی عباس، بنی امیہ اور اس سے پہلے کے لوگ، سب برابر ہیں۔“

بنی عباس نے آل رسول کے نام پر بنی امیہ کا استیصال کر کے حکومت حاصل کی۔ بنی امیہ نے امام حسن کی صداقت اور اسلام پسندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر خلافت پر قبضہ کیا اور اس کو شہنشاہیت میں بدل دیا اور نقطہ آغاز کو دیکھا جائے تو وضع حلیہ کے پھندوں میں تختِ خلافت کے پائے جکڑے ہوئے نظر آئیں گے۔

ان سے زیادہ اپنا تو کوئی نہیں تھا جو ہر وقت پیغمبر اسلام کے ارد گرد جمع ہتے تھے انہوں نے وقت سے فائدہ اٹھا کر بنی کی میت کو چھوڑ دیا اور آپ کے قبیلے کی عدم موجودگی میں آپ کی خلافت کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اگر یہ انتخاب تدفین کے بعد ہوتا تو پورا مدینہ اور ہر قبیلہ جمع ہو جاتا اور کسی کو من مانی کا موقع نہ ملتا۔

بظاہر اتنی جلدی کی کوئی وجہ نہیں تھی جو رسول کی خلافت کو تجہیز و تکفین سے زیادہ اہمیت دی گئی، بجز اس کے کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی کہ یہ سب کچھ منصوبے کے تحت کیا گیا کہ اصل حقدار آنے نہ پائے اور ایک دفعہ حقدار کو محروم کیا گیا تو دیکھا بھی معاویہ کی ہمت بھی پڑی اور پھر بنی عباس نے بھی وہی کیا جو سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا تھا حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اولیت کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
 مذہب عشق اختیار کیا

امام جعفر صادق کے مشاغل

امیر المؤمنین حضرت علیؑ اور آپ کے تمام جانشین اپنے وجود سے پیکرِ رشد و ہدایت تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ان کا کام ہی یہ تھا کہ انسان اور انسانیت کی خدمت کریں، خدا شناسی اور خود شناسی کے شعور کو بیدار کرتے رہیں اور لوگوں کو اسلام کے صحیح راستے پر لانے کی مساعی کریں۔

امام محمد باقرؑ کو کچھ اطمینان کا وقت مل گیا تھا لہذا آپ نے علوم الہیہ اور مسائل دینیہ کا کچھ زیادہ کام کیا اور درس گاہِ امامت کے فیوض و برکات کو زائد سے زائد لوگوں تک پہنچایا جن میں اُس دور کے بعض مشاہیر بھی تھے۔

انتشارِ سلطنت نے بنی اُمیہ کو ان کی طرف توجہ کرنے کا وقت نہ دیا اور آپ قدرے سکون سے فرائضِ امامت انجام دیتے رہے یہ بھی بنی عباس اور بنی امیہ کی نبرد آزمائی میں کچھ پرسکون رہا تھا لہذا امام جعفر صادقؑ نے تدریس و تعلیم کو عام کر دیا۔ آپ اپنی علمی بارگاہ میں فقیروں کی شان سے بیٹھے اور تلمیذ گانِ حُریت و فقہ کو سیراب کرتے رہتے۔

آپ کے تلمیذہ کے ایک طویل نہرست ہے جس میں چند ممتاز نام بھی شامل ہیں۔ جیسے امام ابو حنیفہ، یحییٰ بن سعید انصاری، ابن جریم، شعبہ، ابو عاصم امام مالک بن انس، امام سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ایوب سجستانی اور امام الکلبیہ جان بن حیان طرطوسی، آپ کا علم شش جہات تھا، لہذا شاگردوں کے فن کی نوعیتیں بھی مختلف ہوئیں۔ تاہم جو بھی آیا وہ اس بارگاہ سے اپنی صلاحیت کے بقدر دامنِ طلب کو علوم و فنون سے بھر کر نکلا۔ یہ الگ بات ہے کہ دامن بھر جانے کے بعد کسی نے اپنی تہی دامن کو یاد رکھا اور کوئی اپنی کوتاہ نظری کے سبب امام کے مقابلے پر آگیا پھر بھی استاد و شاگرد کا فرق ہمیشہ باقی رہا۔ حاملِ علم لدنی کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا تھا جس نے در در کی ٹھوکریں کھا کر اپنے کشکول کو بھرا ہوا درختِ کل کی چیزوں میں خالص اور غیر خالص کی تمیز بھی نہ کر سکتا ہو۔

فقہ و حدیث تراجم کے گھر کی باتیں تھیں ان کو لوگوں تک پہنچانا تو آپ کا پرانی
منصب تھا۔ علم القرآن بھی اسی ذیل میں آتا ہے لیکن دنیا کا کوئی علم ایسا نہیں تھا
جس میں آپ کو درجہ کمال تک دسترس حاصل نہ ہو۔ مادے کا تغیر و تبدل، ماہیت
انادیت اشیار، نظام قمری و شمسی طبیعیات و کیمیا، علم جفر، علم الافلاک و نجوم، کائنات
سے پہلے اور کائنات کے بعد کا حال، سب کچھ ادراک میں تھا جس سے لوگ استفادہ
کرتے اور باہر جا کر عوام کے دلوں پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھاتے۔

امام کے لئے یہ خوشی کی بات تھی کہ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کو فی عباسی دربار
میں امام اعظم بن گئے اور جابر بن حیان طرطوسی کو آپ سے فیض یاب ہونے کی بدلت
امام الکیما قرار دے دیا گیا۔ جہتے ہوئے دریا سے کوئی کتنا ہی پانی لے لے، اس میں
کوئی کمی نہیں آتی۔ دریا بہتا ہی اسی لئے بے کشتہ انسانوں اور پیاسی زمینوں کو
سیراب کرے۔ پھر امام تو اس خاوندے سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی رگ ہائے گلو کے
خون سے خجروں کی پیاس بجھاتا رہا۔ آپ بنی نوع انسان کو تشنہ کیونکر کھتے۔

کوئی فلسفی حاضر خدمت ہوا تو آپ نے فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی، منطق کی
منطق سے قائل کیا اور دہریہ سے الہیات اور مابعد الطبیعیات کی روشنی میں بحث
کی۔ اس سلسلے میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنی گفتگو کا خلاصہ آپ نے مفصل
بن عمر الجعفی کو لکھ کر دیا تھا جس کا ذکر بعض علماء نے کیا ہے۔

امام جعفر صادق: ایک گزرا العلوم

ایک اندازے کے مطابق عراق و شام، کابل، خراسان، ہندوستان اور روم
فرنگ کے ساڑھے چار ہزار اصحاب نے آپ سے استفادہ کیا اور اپنے اپنے مقامات
پر جا کر لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ان میں سے جو صاحب تصنیف ہیں، انہوں نے اپنی کتابوں
میں آپ کا تذکرہ کیا ہے۔

ان لوگوں میں راویان حدیث بھی ہیں اور ماہرین فنون بھی۔ احادیث میں
حدیثیں ہیں جو آپ نے امام محمد باقر اور باقر نے زین العابدین سے اور زین العابدین

نے امام حسن یا امام حسین اور ان دونوں میں سے کسی نے حضرت علیؑ سے اور حضرت علیؑ نے حضور سرور کائنات سے منیں۔ ہمارے نزدیک ایسی ہی حدیثیں معتبر ہیں، بشرطیکہ وہ شخص جس نے امام جعفر صادق کی زبان سے سنا، وہ بھی معتبر ہو، جس کا اسناد کتب رجال سے کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امامؑ نے ایک کتاب علم رمل و جفر پر بھی لکھی تھی۔ علم تشریح الاحکام اور افعال اعضاء کی صراحت تو آپؑ نے متعدد بار کی اور مفردات میں داؤں کے نام بھی بتائے، جس سے اصول فطرت پر آپؑ کی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ علم نجوم اور علم منطق الطیر سے واقفیت آپؑ کی آفاقیت کی دلیل ہے اور ایسی ہر صلاحیت کو خدا نے بخت بندہ کی دین کے سوا کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

غرضیکہ زندگی کا کوئی شعبہ آپؑ کی رسائی سے باہر نہ تھا اور معجزات اس پر مستزاد تھے جو عقیدے کی بساط پر آپؑ کے شخصی فیضان کو مستند کرتے ہیں۔ امامت کی یہ چھٹی منزل سچھلی تمام منزلوں کی ترجمان تھی۔ وقت ملا تو ان سب سے ایسی ہی برکتیں ظہور پذیر ہوتیں لیکن زمانے نے کسی کو مہلت ہی نہیں دی اور خلافت عباسیہ کا استقرار ہوتے ہی آپؑ کے لئے وہ دور شروع ہو گیا جس سے علیؑ کی اولاد اب تک دوچار رہی تھی۔

عباسی بساط سلطنت

بنی امیہ کے استیصال کلی کے بعد ابوالعباس، عبداللہ بن محمد المعروف بہ سفاح بنی عباس کا پہلا خلیفہ ہوا۔

اس نے اپنی نئی حکومت کا ڈھانچہ اس طرح کھڑا کیا کہ اپنے بھائی ابو جعفر منصور کو جزیرہ، آذربائیجان اور آرمینیہ کا والی بنایا، اپنے چچا داؤد کو مدینہ منورہ مکہ معظمہ، یمن اور یمامہ سپرد کیا اور اپنے ایک بھتیجے کو کوفہ بھیجا، اور دوسرے چچا کو شام دیا۔ مصر کی حکومت ابو عیون کے سپرد کی، خراسان کی باگ ڈور بدستور ابوسلم کے ہاتھ میں رہنے دی اور فارس کا امیر اپنے بھائی کو بنایا۔

وزارت کے عہدے پر ابوسلمہ، حفص بن سلیمان مقرر کیا گیا جو کوفہ کا ایک ذی علم عالی دماغ اور فیاض امیر تھا اور مشہور عباسی داعی بکیر بن ہامان کا داماد تھا۔ دعوت انقلاب میں ابوسلمہ نے آل محمد کا نعرہ لگایا تھا لیکن جب ابوالعباس کی خلافت کے لئے زور ڈالا گیا تو اس نے خاندان رسالت سے روگردانی کر لی۔ یہ اتنی بڑی خدمت تھی کہ ابوالعباس میں ذرا بھی شرافت ہوتی تو وہ ابوسلمہ کے پاؤں دھو کر پتیا لگے۔ اس کا ایک جرم بھی تھا کہ اس نے امام جعفر صادق کو دعوت خلافت دی تھی جس کو ابوالعباس معاف نہ کر سکتا۔

ابوسلمہ بھی ابوسلمہ کے وزیر ہو جانے سے جل کر کیاب ہو گیا تھا لہذا ابوالعباس نے اس سے سازش کی اور ایک رات، جب ابوسلمہ محل شاہی سے واپس آ رہا تھا تو ابوسلمہ کے آدمیوں نے اس کو قتل کر دیا اور ابوالعباس نے قتل کا الزام خارجیوں کے سر رکھ دیا۔ جس کی مثال حضرت معاویہ قائم کر چکے تھے۔

سفاح نے خلافت کی ابتداء تو کوفہ سے کی تھی لیکن ۳۳ھ میں انبار میں ایک شہر ہاشمیہ آباد کر کے اس کو دار الخلافہ بنالیا جو بعد میں مدینۃ المنصور کہلایا۔

نئی حکومت کو ابتداءً مسلسل بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن سفاح نے ان پر قابو پایا اور چار سال آٹھ ماہ حکومت کر کے ۳۵ھ میں ۲۶ سال انتقال کر گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر تخت نشین ہوا۔

ابو جعفر عبد اللہ بن محمد الملقب بہ منصور

بڑے بھائی کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق منصور بنی عباس کا پسر اور خلیفہ ہوا لیکن غنائ سلطنت ہاتھوں میں لیتے ہی اس کو اپنے چچا عبد اللہ بن علی کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ پیچھے رہے کہ عبد اللہ بن علی ان چند آدمیوں میں تھا جن کی محنت تدبیر اور شجاعت سے بنی اُمیہ کو شکست ہوئی تھی اور ابوالعباس نے اس سے وعدہ بھی کیا تھا کہ اس کے بعد عبد اللہ ہی تخت حکومت پر بیٹھے گا مگر اس نے وصیت کردی منصوبہ کے حق میں، لہذا عبد اللہ میدان میں آ گیا لیکن بھتیجا فراست میں چچا سے آگے تھا، اس

نے اپنے پوانے مہرے ابوسلم کو باطی سیاست پر دھردیا اور اس کے مشترک نصیبین کے مقام پر عبداللہ کو شکست دے دی، پھر قید میں ڈال دیا اور وہ قید ہی میں مر گیا۔ اس جنگ کے مال غنیمت کے سلسلے میں ابوسلم اور منصور کا اختلاف بڑھ گیا۔ اور ابوسلم خراسان میں آزاد حکومت کا منصوبہ بنانے لگا مگر منصور نے حکمت عملی سے رنجش کے غبار کو ابوسلم کے دل سے دھو دیا اور دربار میں اس کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔

ایک دن منصور نے قتل کا منصوبہ بنا کر ابوسلم کو بلا بھیجا، جب وہ آیا تو اس کی تلوار باہر رکھوا لی گئی۔ ابوسلم کچھ سمجھا مگر اس کو یقین نہ آیا کہ اتنی خدمات کے بعد منصور اس طرح کا سلوک اس سے کر سکتا ہے۔ اندر پہنچتے ہی منصور نے اس سے تلخ کلامی شروع کر دی، اندر چھپے ہوئے آدمی اچانک ابوسلم پر ٹوٹ پڑے اور اس کے کپڑے اڑا دیئے۔ ابوسلم کے قتل کی خبر جب باہر پہنچی اور اس کے ہمراہیوں کو معلوم ہوا تو اسنوں نے محل کو گھیر لیا۔ منصور نے بالا خانے پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا کہ ”وہ تو مارا جا چکا، اب تم اپنی جانیں کیوں دیتے ہو؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے سونے کی مہریں ان لوگوں میں پھینکوا دیں۔ یہ جادو چل گیا اور وہ لوگ مہریں لے کر وہاں سے چلے گئے۔

اب منصور کے راستے کا ہر کاٹھا صاف ہو گیا تھا مگر ایک بات اس کو ہر وقت کھٹکتی رہتی کہ اس نے تحریک شروع کرنے کے لئے محمد بن عبداللہ، نفس ذکیہ کی بیعت کی تھی۔ منصور کو ڈر لگا رہتا کہ کہیں عبداللہ محض اس کے مقابلے کے لئے اُٹھ نہ کھڑے ہوں مگر وہ فی الفور اس طرف توجہ نہ کر سکا، کیونکہ ابوسلم کے انجام کی خبر سن کر اس کے پیروں نے خراسان میں علم بغاوت بلند کر دیا تھا مگر وہ جلد ہی شکست یاب ہو کر تتر بتر ہو گئے۔

”ابوسلم کے مرید اسے امام وقت سمجھتے تھے جس کی موت پر وہ دو فرقوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک کہتا تھا، وہ زندہ ہے اور عنقریب دنیا میں ظاہر ہو کر عدل و انصاف کا دور قائم کرے گا اور دوسرے نے موت

کا قاتل ہو کر اس کی بیٹی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اسی زمانے میں راندیلوں نے جو خلفائے عباسیہ کو خدا کا اذنا سمجھتے تھے، ہاشمیہ میں بغادت کر دی اور منصور کی زندگی واقعی خطرے میں پڑ گئی۔ یہ بغادت فرو کی گئی، جاہل اور وہی لوگ شہر بدر کئے گئے، راندی منصور کو خدا اور

اس کے اردیوں کو بمنزلہ جبریل سمجھتے تھے۔“ (۱۰۵)

ان مشرکانہ عقائد میں منصور کی ہمت افزائی کو شامل تصور کیا گیا اور دین دار مسلمان منصور کے دشمن ہو گئے مگر وہ بہت زیرک حکمران تھا، اس نے صلح و دوستی سے اس آگ کو فرو کر دیا۔ ہوشیار اور چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بخیل اور دانہ ذو تھا، اس لئے بڑے بھائی سفاح کی طرح دوایتی کہلایا اور اسی خصوصیت کے ساتھ مشہور ہو گیا۔

اسی زمانے میں قیصر روم کا حملہ ہوا۔ منصور نے اس کو پناہ کے سات سال کے لئے صلح کر لی۔

پھر طبرستان کی پہاڑیوں میں کچھ سردار مسلم علاقوں پر حملہ آور ہوئے انہیں بھی شکست دی گئی اور بعض دوسرے علاقوں میں تسلط حاصل کیا گیا، ان تمام کاموں سے فراغت پا کر منصور نے مدینے کی طرف دیکھا۔

مدینہ کبھی ریگزار عرب میں سب سے بارونق شہر تھا۔ حضور ختمی مرتبت کے عہد میں تو عظمت و سطوت کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب کے انسان تو آتے ہی تھے، عرش سے فرشتے بھی نازل ہوتے۔ اس کے بعد تیسری مہمات شروع ہوئیں تو دوسرے ملکوں کی سفادتیں آنے لگیں، البتہ درمیانی چار پانچ سال تک اس شہر کی چہل پہل کچھ کم رہی۔ جب حضرت علیؑ نے امیر شام کا مقابلہ کرنے کے لئے کوفہ کو مرکز خلافت بنالیا تھا مگر اس کے بعد پھر سابقہ صورت حال پیدا ہو گئی۔

پھر مدینہ اس وقت سے اُجڑ گیا جب سے امام حسینؑ نے اس کو خیر باد کہا اور

فاطمہ زہرا کی اولاد عراق و شام میں بکھر گئی۔ مسلم بن عقبہ کی تلوار نے اس کو اس طرح تاراج کیا کہ اس کی دیرانی برسوں تک دُور نہ ہو سکی۔ وقت کے تھوڑے فصل سے حجاج بن یوسف کی شقاوت نے اہل مدینہ میں جینے کا حوصلہ بھی ختم کر دیا۔ اب وہ جہالت کے ریگزار میں علوم کا واحد نخلستان تھا، تقدس اس کے ذرے ذرے میں رچا بسا تھا مگر آج کی اصطلاح میں جس کو شہرت کہتے ہیں وہ مدینے میں پائی نہ جاتی۔

اب قویہ شہر صرف سطوتِ ماضی کی ایک یادگار رہ گیا تھا جس میں آخری نبی مرسل کی اولاد اپنی خاموش زندگیوں میں فریضہ ہدایت انجام دے رہی تھی۔ ابو بکر و عمر کے پوتے پر پوتے دنیا سے الگ تھلگ ایک طرح گوشہ نشینی میں بسر کر رہے تھے۔ انہیں میں ذہیری نسل کے باقیات بھی تھے اور دیگر اصحابِ رسول اور برگزیدہ بانیِ اہل بیت بھی۔ جن کو مدینے کے درو دیوار کی محبت نے جدی وطن کی طرف واپس نہ ہونے دیا تھا۔ ان لوگوں کا اقتدار سے کوئی واسطہ نہ تھا اور وہ کوئی سرکار رکھنا بھی نہ چاہتے مگر نہ جلنے کیا خطرات لاحق رہتے، حکومتوں کو ان عزالت گزینیوں سے کہ اموی دور میں بھی انہیں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور اب انہیں میں سے ایک خاندان نے آلِ رسول کے نام کے سہارے حکومت حاصل کر لی تھی تو وہ بھی ان سب کا دشمن بنا ہوا تھا۔

ظلم و جور کا ایک نیا دور

بنی عباس کے دوسرے حلیفہ دوانقی نے اس دشمنی کا باقاعدہ آغاز ۱۳۱ھ سے کیا اور عزمِ محکم کے ساتھ کے کی طرف روانہ ہوا۔ — زید شہید کی شہادت کے بعد اولادِ حسن شہر واسطہ میں آباد ہو گئی تھی، منصور نے دورانِ سفر ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے اور مختلف قسم کی تکالیف پہنچا پہنچا کر قتل کیا۔ بعض کو جلنے آگ میں ڈالوا دیا۔ بعض کو دریا میں ڈبو دیا اور اکثریت کو تہ تیغ کر دیا۔

پھر وہ کے ہوتا ہوا مدینے پہنچا اور اولادِ حسن کی اکثریت کو گرفتار کر لیا۔ عبداللہ محض کے دفنوں بیٹے روپوش ہو گئے وہ جانتے تھے کہ منصور انہیں کی نگرین ہے کیونکہ اس نے شروع میں نفسِ ذکیہ کی بیعت کی تھی۔

یہ لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپتے چھپاتے ساحل عرب پر پہنچے، عدن میں چند روز قیام کر کے ہندوستان کے عازم ہوئے مگر سندھ میں بھی اطمینان کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو خفیہ طریقے سے مدینے آگئے۔ اس سے قبل امام حسنؑ کی اولاد گرفتار ہو کر جا چکی تھی۔ بغداد کا محل تعمیر ہو رہا تھا کہ اسیروں کا قافلہ مدینے سے گزرا۔ اسی پچاس سال قبل ایک قافلہ کربلا سے کوٹہ لایا گیا تھا یہ دو مسافر قافلہ تھا جو اسی انداز پر سینے سے بغداد جا رہا تھا تمام قیدی رن بستہ، بعض طوق و زنجیر پہنے ہوئے، اونٹوں کی ننکی پیٹھوں پر سوار، باب جبریل سے گزرے تو امام جعفر صادقؑ نے ان کو دُور سے دیکھا اور فرمایا:-

”میں ان غریبوں کی نصرت ضرور کرتا لیکن قضا و قدر سے مجبور ہوں!“
 قافلے میں بوڑھے بھی تھے، جوان اور بچے بھی، ربذہ کے مقام پر منصور نے بوڑھے محمد دیاج کو طلب کیا جو ابراہیم کے خسر تھے اور ان سے پوچھا کہ ابراہیم کہاں ہے؟ مگر اسفین معلوم ہی نہیں تھا، بتاتے کیا؟ جس کے نتیجے میں ان پر اتنے کوڑے برسائے گئے کہ سر سے پیر تک لہلہاں ہو گئے اور ان کا خوبصورت چہرہ مہچا نہ جاسکتا۔
 شرافت و نجابت کے پیکر، فیصلت و کمال کے مجسمے، صورت و سیرت کے کشفیہ فرط شرم سے گردنیں جھکائے، منصور کے ذہنی قافلے کے گھیرے میں، بغداد کی سمت بڑے رہے۔ ایک دن نفسِ ذکیہ و ابراہیم بھیس بدل کر عبداللہ محض سے آکر ملے تو آپ نے بیٹوں کو آخری نصیحت کی۔

”عزت کی زندگی میسر نہیں آتی تو عزت کی موت سے تو تمہیں کوئی روک نہیں سکتا“
 دونوں بیٹے باپ کو آخری سلام کر کے چلے گئے اور پھر چار سال بعد مدینے آئے اور وہاں اپنی بیعت لینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بے دینی سے اُگائے ہوئے اہل مدینہ کب سے ظالموں کے حق میں بددعا کر رہے تھے انہوں نے بھی مقدس محمد بن عبداللہ کی حمایت کا اعلان کر دیا اور حریت کی ایک نئی لہر سوتے ہوئے مسلمانوں میں بیلار ہو گئی۔ اسیروں کا قافلہ ہاشمیہ کے تنگ و تاریک قید خانے میں پہنچا دیا گیا جہاں اُقتا

نماز کا بھی اندازہ نہ ہوتا لہذا قیدیوں نے ملاوت کے دورانہ کو پانچ ایسے حصوں میں تقسیم کر لیا تھا جس سے فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کا اندازہ ہو سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ قیدیوں کو منصور نے راکر دیا تھا، سلیمان و عبداللہ پسران داؤد بن حسن مثنیٰ، موسیٰ بن عبداللہ محض حسن بن جعفر باقی اسی زندان میں مر گئے۔ کسی پر چھت گر گئی، کوئی کنویں میں گر پڑا، کوئی باہر لا کر محل بغداد کی دیوار میں چن دیا گیا اور اکثر اس زہریلی لعن سے مر گئے جو غلاطت اور لاشوں کے مڑنے سے قید خانے میں پیدا ہوئی تھی۔

نفس ذکیہ

آخر محمد بن عبداللہ محض نفس ذکیہ نے مکے سے یمن تک اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور ابراہیم نے بصرہ پہنچ کر نعرہ جہاد بلند کیا تو ہزاروں آدمی ان کے علم کے نیچے جمع ہو گئے۔ نفس ذکیہ کا منصوبہ تھا کہ ابراہیم اپنے لشکر کے ساتھ آجائیں تو دونوں مل کر کوفہ کی طرف مراجعت کریں لیکن ابھی ابراہیم پہنچنے پہلے پہلے نفس ذکیہ کے لشکر مدینہ آ پہنچا۔ عیسیٰ بن موسیٰ سپہ سالار تھا۔ اس نے حملے سے پہلے نفس ذکیہ کے سرداروں سے سازش کی، انہیں لالچ دے کر توڑ لیا اور محمد کے ساتھ صرف تین سو آدمی رہ گئے۔

دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ محمد اپنے سرفروشنوں کو لے کر کسی طرح میدان سے نکل جاتے لیکن علیؑ کے پوتے نے پیٹھ دکھانا موجب ننگ سمجھا اور اس مختصر سی تعداد کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ دنیا نے ایک بار پھر اکثریت اور اقلیت کی ہولناک جنگ کا منظر دیکھا۔ اقلیت نے لاشوں کے انبار لگا دیئے مگر تاجکے؟ نفس ذکیہ کا ایک ایک ساتھی کم ہوتا چلا گیا اور آخر وہ خود بھی پشت پر حمید بن قحطبہ کے نیزے کے وار سے گر گئے اور ۴۵ رمضان ۴۵ھ کو ۲۵ سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

آپ کی لاش صلیب پر لٹکا دی گئی جس کو بعد میں مدینے کی ایک عورت نے عیسیٰ سے اجازت لے کر دفن کر دیا۔

عیسیٰ نے اولاد علی کی تمام جائیدادیں ضبط کر لیں۔ امام جعفر صادق اپنے علاتے فریج میں تھے وہ بھی اس ظلم سے نہ بچ سکے۔

پھر عیسیٰ نے سادات اور اصحاب رسولؐ کا قتل عام کیا اور جدھر سے گزرا، خون کی ایک لیکر کھینچتا چلا گیا۔

منصور کو جب نفس ذکیہ کا سر ملا تو اس نے قید خانے میں عبداللہ محض کے پاس بکھجوا دیا۔ عبداللہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس سے فارغ ہو کر آپ نے بیٹے کا سر اٹھا کر سینے سے لگایا اور کہا۔

”تقویٰ نے تم کو گناہوں سے محفوظ رکھا اور تلوار نے ذلت سے بچالیا۔“

اس کے ساتھ ہی عبداللہ نے ایک سردارہ کھینچی اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔
ابراہیم بن عبداللہ محض

بھائی کی قبل ازدقت شہادت سے ابراہیم کے ہاتھ کٹ گئے تاہم انہوں نے کئی بار منصور کی فوجوں کو شکست دی بلکہ اس حد تک عباسیوں کو ہراساں کر دیا کہ منصور نے کوفے کی طرف بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا، پھر بڑی مایوسی کے ساتھ اس نے عیسیٰ کو ثابت قدم رہنے کی تاکید کی۔

دربائے فرات کے کنارے ایک خونریز معرکے میں عباسی لشکر نقصان اٹھا کر پسپا ہو گیا مگر ابراہیم نے سیرت ثلث کے پیش نظر مفرورین کا بھاگنے میں قتل نہیں کیا جس کے نتیجے میں بھڑوسی دُور جا کر وہ پھر جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ زخموں کے میاں بن کر لیٹ رہے تھے، بھاگنے والے جب پلٹ کر آئے تو وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ایک مرتبہ پھر گھسان کی جنگ شروع ہو گئی۔

ابراہیم جیتی ہوئی جنگ پھر جیت لیتے مگر قضا و قدر پر کسی کا اختیار نہیں چلتا ایک تیر سنسا تا ہوا آیا اور ابراہیم کے رگہ۔ عین اسی وقت تلوار کا دار ہوا اور ابراہیم گر گئے جس کے بعد فوج تتر بتر ہو گئی۔

۲۵ ذی قعدہ ۱۴۵ھ کے بعد منصور نے بصرے کا بھی وہی حال کیا جو مدینے

کا کیا تھا بلکہ بصرے میں جانی اور مالی نقصانات کچھ زیادہ ہی ہوئے۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے نفس ذکیہ کے حق میں فتاوے دیئے تھے۔ انہیں کوڑے لگائے گئے پھر امام ابوحنیفہ سے منصور کا سمجھوتہ ہو گیا۔ انہیں علماء کی صف میں درجہ اول دیا گیا اور امام اعظم کے لقب سے نوازا گیا۔ یہ پہلا درجہ ہے جس میں فاطمہ زہرا کی اولاد کے علاوہ کسی نے اپنے کو امام کہا، اور پھر اسی زمانے میں تین امام ہو گئے۔ امام اعظم، امام مالک، امام سفیان ثوری۔ اس طرح منصور پہلا فرمانروا تھا جس نے لفظ امام کو وسیع المعنی بنا دیا۔

منصور کی ستم آفرینی

شیعان علی کے قتل کی شروعات یقیناً حضرت معاویہ کا نتیجہ فکر ہیں لیکن سادات کئی میں منصور نے ان کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صالح حسن کے بعد وہ تقیہ میں چلے گئے تھے اور بنی امیہ کو خبر نہ ہو سکتی کہ کون کہاں چھپا ہے مگر منصور خود بھی گھر کا بھیدی تھا، پھر بنی عباس ذاتی طور پر ایک ایک کو جانتے تھے لہذا ان کی گرفتاریوں میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی اور روز صبح پیر شام فاطمہ کے نوہال پکڑ پکڑ کر لائے جانے لگے اور قتل ہوتے رہے۔

ابراہیم کی جنگ میں منصور کو اپنی تباہی کا یقین ہو گیا تھا لہذا اس سے فارغ ہوتے ہی اس نے ہتھیہ کر لیا کہ اس نسل کا ایک متنفس بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔

قتل سادات کے لئے اس نے قصر الحمر کو مختص کر لیا۔ وہاں آٹھتھا۔ قیدی ایک ایک کر کے لائے جاتے اور وہ کسی کو صفائی کا موقع دیئے بغیر قتل کر دیتا۔ ان کا یہ قصور اس کے نزدیک کچھ کم تو نہ تھا کہ وہ علیؑ کی اولاد تھے!

منصور نے صرف سامنے کے لوگوں کو گرفتار کرانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ سادات کے لئے پورے ملک میں مجنوں کا جال بچھا دیا، جن کا کام ہی صرف مجاہد اہل بیت اور سادات کا سرخ لگانا تھا۔ کمسن بچوں کو عموماً بغداد کی دیواروں میں چنوا دیتا، جن اور بوڑھے قیدی صعوبتوں سے بچ جاتے تو انہیں قتل کر دیتا۔ مورخین نے اس

کی تلف حاصل تحریر کی ہیں جن میں صرف سنی سادات کی فہرست میگزٹوں میں ہے
 علی الشہید کو قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ اسی عالم میں انتقال ہوا۔
 محمد البطائی بحرین چلے گئے تھے، جاسوسوں نے وہیں جا کر قتل کیا۔

حمزہ اصغر طبرستان میں شہید کر دیئے گئے۔

علی بن عبدالرحمن رے میں تہ تیغ کئے گئے۔

حسن داعی صغیر اہل میں مارے گئے۔

زین بن عبداللہ مظالم سے پریشان ہو کر اہواز چلے گئے تھے، وہیں شہید ہوئے۔

محمد بن عبداللہ نیشاپور میں گرفتار کئے گئے، قید خانے میں وفات پائی۔

حسن بن اسحق ارضی مغرب میں قتل کئے گئے۔

جعفر کوکبی اور محمد بن جعفر مارہ زندان میں ابن لیث کے ہاتھوں مارے گئے۔

احمد بن محمد اہل و عیال سمیت بخارا چلے گئے تھے، وہاں گناہی کی سزا ہو گئی۔

ابوہیم بن حسن مثنی بغداد میں قتل ہوئے۔

حسن مثلث نے زندان ہاشمیین میں انتقال کیا۔

یحییٰ صاحب دیلم کو ہارون کے حکم سے زہر دیا گیا۔

عبداللہ شترکابل چلے گئے تھے۔ مجنوں نے وہیں قتل کیا۔

علی الزاہد فخر میں شہید کئے گئے۔

امیر عبداللہ کئی سال قید رہ کر انتقال کر گئے۔

علی بن حسن مثلث کا قید خانے میں انتقال ہوا۔

یحییٰ صاحب دیلم کے چار بیٹوں کو کال کوٹھری میں دھواں بھر کر مارا گیا۔

سیلمان بن عبداللہ محض بھی صاحب فخر کے ساتھ شہید کئے گئے۔

حسن بن اسمعیل دیاج بائیس سال قید میں رکھ کر قتل کئے گئے۔

بے شمار نام ہیں جن کا پتہ چل گیا ہے۔ ہزاروں سیدوں کی عمریں قید خانوں

میں کٹ گئیں، جن کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ ہزاروں مصر، افریقیہ، شام، ترکستان

ایران، افغانستان، ہند، سندھ اور دوسرے ملکوں میں ترک وطن کر گئے، جن کی بدولت
جا بجا پائی جاتی ہیں مگر خاندانوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کتنا بھینا تک نتیجہ
ہے دوزخی منصور کے اس ظلم و ستم کا کہ سادات جلاوطن ہو کر مر گئے تو مر گئے لیکن
ان کے پسماندگان کی نسلیں کن کن ناموں سے پکاری گئیں اور اکثر تو اپنے بچوں کو تبا بھی
نہ سکے کہ وہ فاطمہ کی اولاد میں ہیں۔

منصور کے دستِ ممت سے بچ کر نکل جانے والوں میں عبداللہ محض کے پوتے
ادریس بھی تھے جنھوں نے ملائیش میں ادریسی حکومت کی بنیاد رکھی مگر منصور کے جاسوسوں
نے انہیں زہر دے کر شہید کر دیا۔

شہید ہونے والوں میں بعض شہزادوں کے حالات اتنے دردناک ہیں کہ منصور
دوانیقی کے سامنے شہزادی الجوشن اور سرمد بن کاہل کی شقاوت ماند پڑ جاتی ہے
ان میں علی بن محمد بن حسن دیماج، عباس بن حسن کے واقعات ہیں۔ سندلیف بن میمون
شاعر اہلبیت کو زندہ دفن کر دیا گیا بغرض کہ مظالم کی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جس کو
عبداللہ ابن عباس کے پوتے منصور دوانیقی نے استعمال نہ کیا ہو۔ مقصد صرف اتنا
تھا کہ علی و فاطمہ کا نام لیوا روئے زمین پر باقی نہ رہے اور کوئی بنی عباس کو غاصب
خلافت نہ کہہ سکے۔

اس کوشش میں اسے کامیابی ہوئی۔ حجاز، عراق، شام اور دودر دودر تک کوئی
یہ کہنے والا نہ رہا کہ میں علی کا وارث ہوں، میں فاطمہ کی اولاد ہوں، خلافت میرا حق
ہے۔ کچھ لوگ جو بچے تھے وہ تقیہ میں گننام ہو گئے۔ ان میں سے اکثر شریکِ نسل کے
بعد دوسرے خاندان میں شامل ہو گئے۔ مدینے میں امام جعفر صادق اور چند نفوس
باقی تھے لیکن کربلا کا تصور منصور کے جسم میں کیسپی پیدا کر دیتا تھا، کیونکہ گئے گزرے
حالات میں بھی علی کے سجادہ زہد کا وارث عالم اسلام میں جانا پہچانا جاتا تھا لہذا
امام کے خلاف تلوار اٹھانے کی ہمت بزدل منصور میں نہ نکلتی۔ کسی اور طریقے سے وہ
چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر میں تھا جس کے راستے سوچتا رہتا تھا۔

ان واقعات کے بعد امام حسن کی کثرت ازدواج کا فلسفہ شاید مخالفین کی سمجھ میں بھی آجائے اور وہ ہمیں اس الزام سے بھی بری کر دیں کہ آلِ محمد کے متعلق جو حدیثیں ہیں، ان میں ہمارا بھی ہاتھ ہے، ہم تو کہیں ستمیہ ہی نہیں اور اپنے کو ظاہر ہی نہ کر سکتے تو زبان کھولنے کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے لیکن انصاف کی امید کس سے کریں، پہلے بھی ہمیں سیکڑوں برسوں تک بے گناہی کی سزا ملتی رہی اور آج بھی ہماری حق گوئی کو بھوٹ کہا جاتا ہے۔

امام ظالم کے دربار میں

”ابوجعفر مکی اور بدی کا عجیب مجموعہ تھا۔ سیاست داں، تدبیر اور بادشاہ ہونے کی حیثیت سے بے مثل و بے نظیر تھا۔ رعایا کی ہمدردی اور دُور اندیشی میں بھی وہ کسی سے کم نہ تھا۔ اپنے فرزندوں سے کمال محبت رکھتا تھا۔ باوجود ان اوصاف کے وہ سخت دُعا باز اور انسانی زندگی کی کچھ پرواہ نہ کرنے والا تھا۔ منہاج کے مظالم انتقام کے جوش میں مرزدہ ہوتے تھے مگر اس کے جانشین کے مظالم کمال غور و تامل اور جوڑ توڑ کا نتیجہ تھے۔ وہ گہی ایسے آدمی کو زندہ نہ چھوڑتا جس پر اسے خفیف سا بھی شک ہو جاتا۔ خلیفہ علیؑ کی اولاد سے اس کے سلوک نے عباسی تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر دیا ہے“ (۱۰۶)

جسٹس امیر علی نے منصور پر ایک مسلم حکمران کی حیثیت سے تبصرہ کیا ہے۔ وہ یہ بھول گئے کہ منصور نے جس کی نسل کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی، حکومت اسی کے نام سے حاصل کی تھی اور مسلمانوں نے صرف حضورؐ کی نسبت سے عباسیوں کا ساتھ دیا تھا۔ منصور صرف احسان فراموش ہی نہیں تھا، محسن کش بھی تھا اور اب وہ پیغمبرؐ کے راست جانشین کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

ایک مرتبہ اس نے ربذہ کے قیام میں امام جعفر صادقؑ کو طلب فرمایا تھا مگر قتل کر دینے کا حوصلہ نہ کر سکا، دوبارہ پھر طلب کیا لیکن ڈر گیا، تیسری بار ابو مسلم

کی طرح قتل کا منصوبہ بنایا مگر جیسے ہی امام پر نظر پڑی، تنظیم کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حاجب نے امام کے جانے کے بعد قتل نہ کرنے کا سبب پوچھا تو بولا: "امام کے عقب میں ایک اتر دھا اڑا ہوا تھا۔ میں قتل کرتا تو وہ مجھے کھا جاتا۔" چوستی طلبی پر امام کے آتے ہی قصر میں زلزلے کے آثار پیدا ہو گئے اور منصور سہم کر آپ سے کہنے لگا۔

"کوئی حاجت ہو تو بیان فرمائیے۔"

"مجھے بار بار بلایا نہ کرو۔" امام نے جواب دیا اور واپس ہو گئے۔ مگر منصور باز نہ آیا اور پھر بلا بھیجا۔ اب کی اس نے کہا کہ فلاں نے آپ کی شکایت کی تھی۔ امام نے اس شخص کو بلوایا اور اس نے امام کے جبر و آپ پر تہمت رکھ دی۔ امام نے اس کی طرف دیکھا اور وہ گر کر واصل جہنم ہو گیا۔

اب کی منصور نے چند فرضی خطوط امام کی طرف سے تیار کر کے رکھے اور جب آپ کو پکڑ لائے گئے تو خطوط آپ کے سامنے ڈال دیئے۔ امام نے فرمایا۔

"ہم نے بنی امیہ کے خلاف ایسا اقدام نہیں کیا تو اب کیا کرتے۔"

منصور نرم پڑ گیا اور آپ کے جانے کے بعد بتایا کہ رسول اللہ غضب کے عالم میں نظر آئے تھے، میں ان سے ڈر گیا۔

اس طرح سات مرتبہ اس نابکا نے امام جعفر صادق کو زحمت سفر دی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو زچ ہو کر اس نے آپ کے مکان میں آگ لگوا دی۔ منصور کے خوف سے اب لوگوں نے امام کی خدمت میں حاضری بہت کم کر دی تھی۔ تاہم آپ کا درس ہدایت جاری تھا۔ آگ لگنے پر اصحاب اٹھے۔ آگ بجھانے کی کوشش کی مگر شعلے بھڑکتے رہے۔ آخر آپ خود تشریف لائے۔ عبا کے دامن کو شعلوں کے رُخ پر کئی بار جھٹکا دیا، ایک دعا پڑھی اور شعلے بجھ گئے۔

پھر منصور نے کئی دوسری مشا طرانہ چالیں چلیں کہ کسی طرح آپ کو مایوس کر لیکن ہر وادہ خالی گیا۔

منصور کے لئے آپ کا تحرقہ علمی و علمی بھی قابلِ برداشت نہ تھا۔ اس لئے

مقابلے کے لئے علماء کی ایک جماعت پال رکھی تھی، حضرت ابوحنیفہ کو امام اعظم اور عالم دہر کا خطاب دیا تھا اور اپنی مملکت میں اعلان کر لیا تھا کہ جو امام جعفر صادق سے فتویٰ پوچھے گا، اسے ایک مہر طلائی جرمانہ ادا کرنا پڑے گا اور جو امام ابوحنیفہ سے رجوع کرے گا، اس کو ایک مہر انعام دیا جائے گا۔ نتیجے میں امام ابوحنیفہ کے دروازے پر ہجوم لگا رہتا تھا، امام کی درس گاہ مدینے میں سونی نہیں رہی مختلف جیلوں اور بہانوں سے لوگ آتے رہتے اور بار بار لوگوں نے جرمانے بھی ادا کئے۔

امام کی وفات

بے غیرت بادشاہ کا یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا تو جھلا کر اس نے معاویہ کا جبرپ نسخہ استعمال کر ڈالا اور آپ کو زہر دلوا دیا، جس سے ۱۵ اشوال ۲۸ھ کو ۶۵ سال کی عمر میں آپ کی شہادت واقع ہو گئی۔

پس ماندگان میں آپ نے مختلف بیویوں سے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں چھڑیں امام موسیٰ کاظم، عبداللہ، اسحق، محمد، عباس اور علی، اُم فروہ، اسماء اور فاطمہ آپ کے سب سے بڑے بیٹے جناب اسمعیل تھے مگر وہ امام جعفر صادق کے عین حیات انتقال فرما گئے تھے۔

جناب اسمعیل کے بیٹے محمد نے ادعائے امامت کیا۔ فاطمین مصر محمد بن اسمعیل کی اولاد میں ہیں۔ جنہوں نے عباسی خلافت کے زوال پر مصر میں خلافت قائم کی۔ ان کا سلسلہ امام جعفر صادق تک شیعوں سے ملتا ہے۔ اس کے بعد وہ امام موسیٰ کاظم کے بجائے محمد بن اسمعیل کی امامت کے قائل ہیں اور یہ سلسلہ عبداللہ الرضیٰ احمد الونٰی حسین النقی، عبید اللہ المہدی کو امام مانتے ہیں۔

ابو محمد عبید اللہ المہدی با اللہ فاطمی خلافت کے بانی ہوئے اور آپ کے بعد اتھاسم محمد نزار قائم بامر اللہ، ابوطاہر منصور با اللہ، ابومہم معز الدین اللہ ابو نزار عزیز باللہ، ابوعلی منصور بامر اللہ، ابوالحسن علی ظاہر لاغز از دین اللہ، ابوالکیم معد تنصر بامر اللہ، ابوالقاسم احمد متعلی باللہ، ابوعلی منصور بامر اللہ، عبدالمجید

میمن حافظ لدین اللہ، ابو منصور اسمعیل ظافر بامر اللہ، ابوالقاسم فائز تبصر اللہ
 ابو محمد عبداللہ حاضن لدین اللہ، بالتزئیب خلیفہ ہوئے جو فرقہ بواہیر کے پیشوا ہیں۔
 صلاح الدین الیوبی نے جب خلافتِ فاطمین کو ختم کیا تو سلجوقی دور میں حسن
 بن صباح ایک بزرگ نے اچار خلافت کی کوشش کی جن کو تاریخ نے شیخ الجبل
 کے نام سے یاد کیا ہے۔ ان کا مسلک شیعوں سے جدا ہے کیونکہ اس میں اسلام کے
 ساتھ عیسائیت اور مانی و مزدک کے فلسفے کی آمیزش کر دی گئی ہے۔ آغا خان
 حسن بن صباح کی اولاد میں ہیں اور آغا خانی خوجوں کے عقیدے میں حاضر امام
 ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ امام مہدی بھی اسی سلسلے میں پیدا ہوں گے۔

ساتویں امام

امیر المومنین حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

۱۵ شوال ۱۴۸ھ تا ۲۵ رجب ۱۸۳ھ

سند صیرور رضا

امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سجادہ امانت پر رونق افروز ہوئے، ہنگامہ پر احسان کرنے والے، غصے کو پی جانے والے، حلیم بردبار اور ظالم کو معاف کر دینے پر قادر تھے۔ ہمارے ساتویں امام، اسی لئے کاظم کہلائے اور یہ لفظ آپ کے نام کا جزو بن گیا۔

آپ کی ولادت ۱۲۸ھ کو ابوالفضل مدینہ میں ہوئی۔ شان پیدائش دیگر ائمہ کی طرح تھی، رُخ آسمان کی طرف، کلمہ شہادتیں زبان پر، انداز و اطوار سے منصوص من اللہ، مخنثون و ناث بریدہ متولد ہوئے۔

بنی امیہ کے اقتدار کا چراغ بجھ رہا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا جس کی روشنی نامانوس نہ تھی مگر جس کی شعاعوں سے خونِ سادات کی لڑییں ٹپک رہی تھیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے آنکھ کھول کر پدر عالی مقام کی بے چارگی کو دیکھا اور اس ماحول پر بھی نظر ڈالی جس پر یاس و ہراس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سب کچھ جانا بوجھا تھا تاہم جامہ بشری میں آپ اپنے کو بھیانک مستقبل کے لئے تیار کرتے رہے۔

ابوالعباس سفاح کے بعد منصور و واثق کا دور آیا اور بنی ہاشم پر عرصہ حیات

تنگ ہو گیا پھر کچھ ایسا ہوا کہ دُور دُور تک اَلِ رسول کا ہوا خواہ تقریباً پید ہو گیا۔ اور اپنے بزرگ، برادر کے ساتھی ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے، اکثر تو موت کی آغوش میں سو گئے، کچھ ترک وطن کر گئے اور جو بچے کچھ بچے تھے، وہ تقیہ کا نقاب منہ پر ڈال کر پردہ گناہی میں جا بیٹھے۔

امام موسیٰ کاظمؑ المرتبت پاپ کے دوش بدوش رشد و ہدایت کرتے رہے۔ بچپن سے جوانی تک کی شب زندہ داری نے جسم کو کمزور و ناتواں بنا دیا تھا کہ امام جعفر صادقؑ ذمہ داریوں کا بوجھ آپ پر ڈال کر دائمی منزل کی طرف چل بسے اور آپ خداداد امامت کا بار کاندھوں پر اٹھائے اس میدان میں ایستادہ ہو گئے جہاں آپ کی آواز سننے والے تھے تو مگر اکثریت نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں۔

خلافت عباسیہ کے نام نہاد علماء بچپن سے آپ کے علم لدنی کی آزمائش کرتے آئے تھے پھر بھی جب موقع ملا تو شرمندہ کرنے کی کوشش سے باز نہ آئے مگر انجام کار خود لا جواب ہو کر شرمندہ ہوئے۔

منصور دوانیقی اپنے اقتدار کے لئے ہر راستہ صاف کر چکا تھا۔ اس لئے شرع میں اس نے آپ کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور آپ نے کسی قدر اطمینان کے ساتھ وہ علمی تدریس جاری رکھی جس کی بنیاد آپ کے جدِ اعلیٰ علیؑ ابن ابی طالبؑ نے ڈالی تھی اور جس کو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے نشاۃ ثانیہ عطا کی تھی۔ اور آخر شہ ۱۱۵ھ میں ابو جعفر منصورؑ موت کی آغوش میں جاسویا اور مہدیؑ تخت نشین ہوا تو اس نے بھی بے خطر سمجھ کر امام کو نظر انداز کیا اور آپ یکسوئی کے ساتھ اسلام و انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔

محمد مہدی بن منصور

منصور کو شاید اپنی سفاکیوں اور بد اعمالیوں کا احساس تھا۔ اسی لئے جب اس کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو کئے کی سرزمین پر مرنے کے لئے روانہ ہو گیا

مگر یہ مقدس وادی ایسے ظالم کو قبول کرنے والی نہ تھی لہذا وہ مکے سے چند گھنٹوں کی مسافت پر میرمحونہ ہی میں مر گیا۔

خود اس نے بنی اُمیہ کی قبریں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکی تھیں، لہذا اُصیت کے مطابق اس کے لئے ایک سو قبریں کھودی گئیں جن میں سے ایک میں وہ دفن کیا گیا۔ پھر اس کا بیٹا مہدی باپ کا جانشین ہوا۔

”مہدی“ نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لے کر کئی کارخیر کئے۔ آلِ فاطمہؑ اور سرے لوگوں کی ضبط شدہ جائیدادیں واپس کر دیں، بعض قیدیوں کو چھوڑ دیا، قدیم کارگزاروں کے وظائف مقرر کئے اور بعض دوسرے رفاہی کام انجام دیئے۔ خلافت کے دغویاروں کی طرف سے اس کو کوئی اندیشہ نہ تھا لیکن ۱۶۴ھ میں جب وہ حج کے لئے آیا اور اس نے امام موسیٰ کاظمؑ کا قبول عام بچشمِ خود دیکھا تو آپ کو بغداد لے جا کر قید کر دیا مگر جلد ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ایک سال بعد اس نے امام کو رہا کر دیا۔

جشنِ عاشور جو بنی اُمیہ کے دور کی ایجاد تھا اور جس کو منصور دوانیقی نے جاری رکھا تھا، مہدی کے عہد میں بھی منایا جاتا رہا۔ ساداتِ کثی میں اب وہ شدت نہ رہی تھی کیونکہ ان کا جہاں کہیں وجود تھا، وہ چھپے ہوئے تھے، البتہ محرم میں کھل جاتے اور یادِ حسینؑ میں مجلسیں ضرور منعقد کرتے، لہذا محرم میں قسرا الحرام کے دروازے کھل جاتے اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

مولانا سعادت حسین مصائب الشیعہ جلد پنجم بحوالہ تاریخ الامم جلد ۹، ص ۳۲۰ تحریر فرماتے ہیں کہ منصور دوانیقی نے ریلطہ بنت العباس زوجہ مہدی کو ایک خزانے کی چابیاں دی تھیں کہ خزانہ اس کے مرنے کے بعد کھولا جائے، چنانچہ ریلطہ نے مہدی کے ساتھ اس کو کھولا تو:-

”اسے ایک بہت لانا کمرہ ملا جس میں اولادِ ابی طالب (رحمۃ اللہ) کے مقبرے لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے کانوں میں ایک ایک رقعہ لٹک رہا تھا جس میں ان کا نسب نامہ

تخریب تھا۔ ان مقتولین میں بہت بڑی تعداد میں بچے بھی تھے، جوان بھی تھے۔ مہدی اس دردناک منظر کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا اور حکم دیا کہ ایک گڑھا کھود کر ان کو دفن کر دیا جائے، چنانچہ وہ سب کے سب اسی میں دفن کر دیئے گئے اور اس پر مہدی نے ایک دکان بنوا دی۔“

یہ عمل مہدی کی رحمدلی پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ وہ منصور کے پائے کا سرفاک نہ تھا۔ محرم میں اس کے معمولات اپنے پیش رو کے سے تھے۔ اس کے مخبر کہیں مجلس ہوتے دیکھتے تو مسندوں کو کپڑے لٹاتے اور مہدی ان کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

اپنے وزیر یعقوب کو اس نے اولاد علیؑ کی دوستی میں معزول کیا اور زندان میں ڈال دیا جو بارون رشید کے زمانے میں نابینا ہو کر باہر نکلا۔
جشن عاشور میں صفیہ نامی خاتون نے بھرے دربار میں اس کو ملامت کی تو اس نے قتل کر دیا۔

علی بن عباس بن علی بن حسن مثلث کو ایک سفارش پر قید سے رہا کیا تو دیر نہ رہا دیا جس سے ان کا انتقال ہو گیا۔

حاضر عباسی بن زید کا سراغ لگا کر پہلے قید کیا پھر قتل کر ڈالا۔

دس سال کی مدت خلافت میں اس کا دامن صد ہا سادات کے خون سے آلودہ ہوا۔ ایک حکمران کی حیثیت سے کسی بغاوت میں فروکیں۔ نقاب پوش پیغمبر کے فتنے کو ختم کیا، ۶۳ھ میں رومیوں کے حملے کو پسپا کیا اور ۶۵ھ میں گھوڑے سے گر کر وفات پا گیا۔

ہادی بن مہدی

مہدی کے بعد عباد عصفائے رسول اور شاہی خاتم اس کے بیٹے ہادی کو دہشتہ میں ملی۔ اس کی مدت خلافت دو سال ہے۔ وہ ایک مستعد فیاض، علم و ادب کا دلدادہ مگر خود سرفاک اور بدمزاج حکمران تھا اور آل رسول کی دشمنی خونی درانت تھی۔

تیراندازی کی تفریح میں اس نے ایک فراس کے سینے میں تیر مار کر قتل کر دیا۔
 علی حوری کو اس جرم میں قید کر دیا کہ اس نے مہدی کی بیوہ سے عقد کر لیا تھا۔
 حاکم مدینہ نے اس کے ایمان پر امام حسن کی اولاد پر شراب کا جھوٹا الزام لگایا۔
 گلوں میں رسیاں بندھوا کر شہر کرایا پھر ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا۔ اس طرح
 ہر عہد خلافت اپنی مدت کے تناسب سے سادات کے سروں کے انبار لگاتا رہا اور
 ان کے خون سے محلات کے در و دیوار کو رنگین کرتا رہا۔
 پھر اس نے امام موسیٰ کاظمؑ کو بغداد بلا کر قید کر دیا اور کم و بیش ایک سال کے
 بعد رہا کیا۔

قاسم بن محمد بن عبداللہ الباہر سادات کبار میں سے تھے، ہادی نے سرور یار
 آپ کی تذلیل کرنے کی کوشش کی اور آپ نے خالص بنی ہاشم کے لب دلہجہ میں جواب
 دیا۔ انجام دہی ہوا کہ پہلے اعضاء سے گوشت جدا کیا گیا پھر جسم کے ٹکڑے کر دیئے
 گئے مگر آپ کے منہ سے ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ شاید آپ منہ سے آواز نکالنا اپنے صبر و
 شجاعت کی توہین سمجھتے تھے۔

رسول کی رحلت کے بعد خاندان نبوت پر مصائب کا جوتسل شروع ہوا تھا
 خلافت عباسیہ اس کا نقطہ عروج تھا۔ مجتبان اہل بیت تو لاکھوں کی تعداد میں قتل
 ہوئے ہی تھے۔ خود رسول کے جگر کے ٹکڑے ہزاروں میں تہ تیغ کئے گئے اور اس
 زمانے میں تو بیچارگی اپنی انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ اکا دکا لوگ ادھر ادھر باقی تھے جو
 اپنے کو چھپاتے تو ڈھونڈ کر پکڑ لئے جاتے، خاموش زندگیاں گزارتے تو چین سے
 بیٹھنے نہ دیا جاتا۔ اس لئے کبھی کبھی کوئی شیر بھر جاتا اور سوچتا کہ چپ قتل ہی ہونا
 ہے تو کر بلا کی ماسی کیوں نہ کی جائے؟ اسی طرح کا ایک واقعہ جو زبان میں بھی ہوا۔
 محمد بن قاسم نام کا ایک شہزادہ میدان میں آگیا اور سیکڑوں کو قتل کر کے گرفتار ہوا
 — اور ایک مدت قید میں گزار کر تہ تیغ کیا گیا۔

دوسرا اہم ترین واقعہ جنگ فح کے نام سے موسوم ہے۔ عبدالعزیز بن عبد اللہ

فاردتی، عامل مدینہ اسحق بن عیسیٰ کا جانشین تھا۔ اس نے حسین بن علی بن حسن مثلث کو حد درجہ پریشان کیا۔ آپ ضبط و تحمل سے کام لے کر مالتے رہے لیکن بات بڑاشت کے باہر ہو گئی تو آپ بھی مقابلے پر آ گئے۔ خاندان کے چھبیس آدمی آپ کے ساتھ تھے آپ مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام فح پر قیام فرما ہو گئے۔

پہلے مقابلے میں عباسی پیٹھ دکھا گئے۔ پھر سلیمان بن جعفر، عباس بن ابی محمد اور موسیٰ بن عیسیٰ، جو حج کے لئے بغداد سے آئے تھے وہ سب مبروک ترک، حاجب اور حسین بن یقطین سے مل گئے اور ایک جمعیت لے کر فح جا پہنچے۔

امام حسینؑ کے وارثوں نے کبھی کثرت کے زعم کا لہا نہیں مانا۔ وہ تھے صرف چند ہی مگر تلواریں سونت کر بڑھے تو بزدلوں کے سر اندھی کے آموں کی طرح گرنے لگے مگر محمد بن سلیمان ایک چکر کاٹ کر پشت پر آ نکلا اور اس نے اچانک حملہ کیا تو کئی سرفروشن بگڑ گئے، پھر یکے بعد دیگرے اکثر قتل ہو گئے جو باقی بچے وہ گرفتار ہو کر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور فح کی سرزمین نے تقریباً سو برس بعد کر بلا کا ایک منظر دہرایا۔

ہادی اپنے بھائی ہارون رشید کے قتل کی فکر میں تھا کہ خود اس کا وقت آگیا اور وہ اچانک مر گیا۔

ہارون رشید ابن مہدی

یہ مشہور آفاق بادشاہ سترہ سالہ میں تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت ایشیا میں عربوں کی حکومت کا سنہرا دور تھا۔ اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین سلاطین میں ہوتا ہے۔ ایک تربیت یافتہ سپاہی، صاحب جاہ چشم حکمراں، دانش مند اور بلند اقبال انسان، بیدردی اور رحمدلی کا مرکب تھا لیکن بے دردی غالب تھی جو اس کا موروثی حصہ تھی۔

اس کی سلطنت ایشیا سے افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی لیکن افریقہ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، البتہ عرب، عراق و شام کو اس نے مکمل طور پر قابو میں رکھا

جس نے سر اٹھایا، اس کو کچل دیا۔ رسول کی اولاد کے ساتھ اس کا سلوک بھی ظالمانہ رہا، حالانکہ اب ان میں برائے نام بھی کوئی دم خم نہ رہا تھا اور ان کے ماننے والے دُور دُور تکس پائے نہ جاتے تاہم کسی خلیفہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ علم و پارسائی کی نسبت سے ان کا کوئی امتیاز باقی رہے۔ اسی لئے ہارون رشید نے اپنے باپ دادا کی طرح جہاں لشکر پر شکر تیار کر لئے تھے وہاں ان پر گزیدگانِ خلق کے مقابلے میں عمار کے گروہ بھی مرتب کئے تھے۔

اس کے عہدِ حکومت میں فقیہوں کی جدوجہد سے، جن کا سرغنہ ابویوسف قاضی القضاۃ تھا، حنفی مذہب باضابطہ صورت اختیار کرنے لگا۔ اس مذہب کا نام، اگرچہ امام ابوحنیفہ کے نام پر حنفی ہے، مگر دراصل اس کا بانی رشید کا کافی اتقا ہے، ابویوسف فتوؤں کے معاملے میں کرنیمر جیسا نرم مزاج اور لچکدار اور مکیں کا سا کشادہ دل تھا۔ اس کے مذہبی سلسلے کی، یا تو اس سبب سے کہ وہ ابھی ابتدائی حالت میں تھا، یا اس وجہ سے کہ مخالف عناصر موجود نہ تھے، اس وقت بہت کم مخالفت کی گئی۔

”کسی مذہب کی ترویج پر زور دینے کا اثر ان عناصر کے تناسب سے پڑتا ہے، جن سے ان کا مقابلہ ہو۔ اس زمانے میں فقہ پر عام توجہ ہو جانے کے باعث یہ طریقہ نشوونما کے آثار ظاہر کرنے لگا۔ رشید فقیہوں کا ادب کرتا تھا اور قدر داں تھا جس کے سبب مذہب کی..... پذیرائی کا راستہ صاف ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے زور نے کمزور بادشاہوں کے عہد میں سستی اختیار کی پھر بھی سنی مذہب کی عمارت کی بالائی منزل کا آغاز ہو گیا جس کی بنیاد منصور کے وقت میں رکھی گئی تھی۔“ (۱۰۷)

اس بیان سے دو باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں، ایک یہ کہ منصور دو امتیازی اور اس کے جانشینوں نے ہمارے آئینہ پر سیف و قلم دونوں سے حملہ کیا۔ ایک طرف

اپنے تنخواہ دار عالموں سے ایک فقہ ترتیب دلوائی، جس کا نام فقہ حنفی یا فقہ اہل سنت والجماعت رکھا، دوسری طرف امام جعفر صادق کے فتاویٰ کو فقہ جعفریہ مشہور کرا دیا تاکہ اسلام کے دو الگ الگ مسلک ہو جائیں جس کے نتیجے میں دو گروہوں کے نام بھی وجود میں آ گئے یعنی شیعہ اور سنی ورنہ اب تک دو نام لئے گئے تھے۔ شیعیان علی اور شیعیان معاویہ۔ شیعیان معاویہ کا نام آہستہ آہستہ مٹ گیا تھا۔ صرف شیعہ اور غیر شیعہ باقی رہ گئے تھے۔ غیر شیعہ کو عباسی خلفاء نے حنفی مسلمانوں کا نام دے دیا۔ اس فقہ کا نفاذ اس طرح کرایا کہ ایک طرف ہر فتویٰ لینے کو ایک مہر طلافی انعام اور دوسری طرف فتویٰ لینے والے پر ایک مہر طلافی جرمانہ اور مقابلے کا فیصلہ ایک طرف کرنے کے لئے ایک پارٹی کے لوگوں کا قتل عام اور پارٹی کے روح پرانی کے لئے تنگ و تنار ایک قید خانہ — اس طرح یہ کہنا صحیح ہو یا غلط کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فقہ حنفی کا نفاذ بزورِ شمشیر کیا گیا اور اس کو اقتدار کی چھاؤں میں پروان چڑھایا گیا۔

شاید اسی بات کو محسوس کر کے امام ابن تیمیہ نے انکار کیا ہو گا کہ امام ابو حنیفہ نہ امام محمد باقرؑ کے شاگرد رہے اور نہ امام جعفر صادقؑ کے، کیونکہ شاگرد کو استاد کا مد مقابل کیونکر ٹھہرایا جاسکتا ہے!

خلفائے بنی عباس کا مقصد صرف خاندان رسالت کے نمائندوں کی قیمت گراناستھی جس کے لئے وہ ہر حربہ بروئے کار لاتے رہے۔ اتنے ظالم تھے وہ کہ اپنے نجات دہندہ کی نسل کی حالت زار پر کہنے کے لئے بھی کسی کو توس نہیں آیا۔ جی تو اس خاندان کی ہر فرد کا قول تھا کہ امیری ہماری میراث اور قتل ہونا ہماری عادت ہے ہارون صرف زندوں ہی کا دشمن نہ تھا، مُردوں سے بھی اس کو عداوت تھی محمد بن ابراہیم اشتر نے روضۃ سید الشہداء میں باب الحائز اور باب قیطہ وغیرہ تحریر کر لئے تھے ان کو اس نے منہدم کر دیا، باب السدرہ پر ایک درخت سدرہ لگا ہوا تھا، اس کو قطع کر دیا تاکہ ناریں کو قبر اقدس کا صحیح پتہ نہ چل سکے۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے شبِ روز

ہر امام کی راتیں عموماً عبادت میں گزرتی تھیں مگر امام زین العابدین کے بعد اس شغل میں امام موسیٰ کاظمؑ کو طرہ امتیاز حاصل رہا۔ گھر میں ہوئے یا قید خانے میں، رات کا بس ایک ہی شغل تھا عبادت۔ مدینے میں دن کا کچھ حصہ درس و تدریس میں گزر جاتا، زندان میں دن کی عبادت بھی معمولات میں داخل ہو جاتی۔ ہارون رشید نے اپنی خلافت کے ابتدائی دو سال تک آپ سے تعرض نہیں کیا مگر ۱۹۳ھ میں حج کے لئے گیا تو امامؑ کو اپنے ساتھ لیتا آیا اور قید خانے میں ڈال دیا۔ ہارون رشید اپنے اسلاف کے مقابلے میں زیادہ باتدبیر تھا۔ اس نے اپنے نفس کے لحاظ سے امامؑ کو پرکھا اور ایک حسین و جمیل کینز آپ کی خدمت کے بہانے قید خانے میں بھیج دی۔ کینز کو ہر جنسی وار کرنے کی ہدایت کی تھی۔ امامؑ نے انکار کیا، پھر بھی وہ تنہائی میں چھوڑ دی گئی۔ چند دنوں کے وقفے سے ہارون نے ایک آدمی کو پتہ لگانے کے لئے بھیجا تو وہ تحیر میں پڑ گیا، کینز سجدے میں پڑی سبوح قدوس کہہ رہی تھی۔ ہارون نے اُسے طلب کر کے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ”مجھ کو دیکھ کر امامؑ نے فرمایا یہ لوگ موجود ہیں، مجھے تیری کیا ضرورت ہے؟“ آپ کے اشارہ کرنے پر میں نے دیکھا تو حور و غلمان کا ایک گروہ تھا جو ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

ہارون رشید نے کینز کو ایک علیحدہ مقام پر بھیج دیا جہاں وہ باقی زندگی صرف عبادت ہی اور امامؑ کی شہادت سے چند دنوں قبل وفات پا گئی۔

لگ بھگ ایک سال امامؑ نے قید میں گزار دی، پھر رہا کر دیئے گئے۔ ۱۹۹ھ میں جب ہارون دوبارہ حج کے لئے گیا تو آپ کے قتل کا مصمم ارادہ لے کر روانہ ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ درباری سازشی امام کے خلاف اس کے کان بھرتے رہتے تھے، پھر امامؑ کے مرحوم برادر بزرگ سمیع کے بیٹے بھی ہارون کی طلبی پر بغداد گئے تھے۔ ہارون ان کو امامؑ کے مقابلے کے لئے اُٹھارنا چاہتا تھا۔ محمد اس قریب

میں آگئے۔ انہوں نے بھی امام کے بارے میں غلط باتیں کہیں، لہذا ہارون نے طے کر لیا کہ اس کانٹے کو راستے سے ہٹا ہی دیا جائے۔

اس کے بعد ہی اس نے گرفتاری کے لئے آدمی بھیج دیئے۔ آپ روضہ رسول پر مصروف نماز تھے۔ ۲۰ شوال ۱۷۹ھ کو اسی عالم میں پکڑ کر لائے گئے۔ ہارون نے بغاوت کے اندیشے سے دو محلیں تیار کرائی تھیں۔ ایک میں اس نے امام کو بصرہ روانہ کیا، دوسری خالی محل بغداد بھیج دی۔ ہارون کا چچرا بھائی عیسیٰ ابن جعفر بصرے کا عامل تھا۔ وہ جلد ہی امام کی ملکوئی سیرت اور روحانی عظمت سے متاثر ہو گیا۔ اس کی اطلاع پاتے ہی ہارون رشید نے آپ کو بغداد بلوایا اور فضل بن ربیع کی حراست میں دے دیا۔

فرشتوں کا کردار اگر انسان میں ہو تو جانور بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں پھر فضل تو آدمی تھا۔ ہارون نے اس سے بدگمان ہو کر امام کو بھیجی برمکی کے حوالے کیا اور اس کو بھی سخت گیر نہ پا کر ”سندی بن شاہک“ کی قید میں دے دیا جو امام کے مسئلے میں اس کے کام کا آدمی تھا۔

ایک شب امام ابویوسف اور محمد بن حسن قید خانے پہنچے تاکہ امام سے واجب سنت کے متعلق بعض مشکل سوالات کر کے آپ کو شرمندہ کریں اور ہارون رشید کی خوشنودی حاصل کریں۔ ابھی وہ جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ملازم ڈیوٹی ختم کر کے گھر جانے لگا تو اس نے آپ سے پوچھا۔

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو کل لیتا آؤں؟“

آپ نے نفی میں جواب دیا اور جب وہ چلا گیا تو ابویوسف سے فرمانے لگے۔ ”بے چارہ کہتا ہے کہ کل لیتا آؤں گا۔ اس کو کیا معلوم کہ رات اس پر کٹے گی ہی نہیں۔“

غیب کے اس اظہار پر ابویوسف کہتے ہیں کہ، پھر انہوں نے آپ سے کچھ نہیں پوچھا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ ملازم رات میں اچانک انتقال

کر گیا۔

ان واقعاتی کمالات کے علاوہ آپ نے بہت سے معجزات دکھائے جن کو یہ عقیدہ لوگ فی زمانہ مانتے پر تیار نہ ہوں گے مگر ہمارے عقیدے میں تو ان میں کی ہر فرد پر کبریا تھی۔ اور ان کا مسلک اتنا واضح اور روشن تھا کہ غیر جانبدار ہو کر اس کو دیکھا جائے تو ہر بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس مسلک میں ایسا نہیں ہے کہ کوئی بات عوام کو نہ بتائی جائے جب کہ دوسرے مسلک میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کی تاویل نہیں کی جا سکتی، عوام سنیں گے تو ان کا عقیدہ کمزور پڑ جائے گا، اسی لئے تاکید کی جاتی ہے کہ شیعوں سے زیادہ بات چیت نہ کی جائے۔ مجلسوں میں قطعاً نہ جائیں، اس سے بغض صحابہ پیدا ہوتا ہے۔ کیوں۔۔۔؟ اس کا جواب نہیں دیا جاتا۔

اس کی ابتداء بھی ہارون رشید نے کی تھی۔ قید خانے سے نکلنے کے بعد کنیز کو کسی سے ملنے نہ دیا۔ ابو یوسف کا واقعہ ہارون تک محدود رہا۔

جانتے سب تھے مگر مسئلہ تھا حقدارِ خلافت کا، لہذا الصاف کا خون بھی روا، انسان کا خون بھی مباح تھا۔

ہارون رشید کی سادات کشی

اس سلسلے میں ہارون کا دور منصور و ہانیقی سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ حمید بن محمد بن عامل ایران کا واقعہ بحوالہ منتخب التواریخ نمونے کے طور پر درج ہے کہ اس نے عبداللہ بن ابی شیبہ پوری سے بیان کیا:-

ہارون نے ایک رات طلب کیا اور پوچھا
”تو میرا کس حد تک مطیع ہے۔۔۔؟“

”جان و مال سے حاضر ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور اس نے مجھے رخصت کر دیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر بلا بھیجا اور پھر یہی سوال کیا۔ میرا جواب پہلے ہی جیسا تھا۔ ہارون مسکرایا اور پھر جانے کو کہہ دیا تیسری بار جب اس نے طلب کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں مرنے کے لئے تیار ہو کر پہنچا تو اس نے

سامنے رکھی ہوئی تلوار اٹھا کر مجھے دی اور کہا۔

”اس غلام کے ساتھ جا اور اس کے کہنے پر عمل کر۔“

”غلام مجھے ایک مکان میں لے گیا جس میں تین مقفل کمرے تھے۔ غلام نے ایک کمرہ کھولا۔ اس میں بچے بوڑھے اور جوان زنجیروں سے جکڑے ہوئے پڑے تھے جن کے گیسو شانوں تک آگئے تھے۔“

”غلام بولا۔ یہ سب تمہارے ہاتھوں قتل ہوں گے۔“

”غلام ایک ایک سید کو کنویں کے کنارے لانا گیا اور وہ قتل ہو کر کنویں میں گرتا رہا۔“

”پھر اس نے دوسرا کمرہ کھولا۔ اس میں بھی بیس سادات تھے، تیسرے میں بھی بیس ہی تھے۔ میں انیس کی گردنیں اڑا چکا تو بیسویں معذور مرد بزرگ نے کہا۔“

”ظالم۔ تو قیامت میں میرے جد کو کیا جواب دے گا۔“

”میں کانپنے لگا تو غلام نے مجھے ڈانٹا اور میں نے ضعیف پاکباز کی گردن بھی اڑادی۔“

ایسے ہی ان گنت واقعات ہیں جو ان خلفائے اسلام کے ہاتھوں پیش آئے ہزاروں ریشہ کے عہدیدانوں کی راتیں کتنی ہی رنگین رہی ہوں، علوم و فنون نے کیسا ہی عروج پایا ہو، مسلمانوں کی سطوت و شوکت کتنی ہی قابلِ ذکر قرار پائے لیکن وہ پیغمبر اسلام کی روح کو شب و روز دکھ پہنچاتا رہا اور اسلام میں تو اتنا رخصہ ڈال گیا کہ اس نے اُمیہ و عباسیہ کی طرح اسلام کا ایک توام بھائی پیدا کر دیا جس کو تلوار سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا۔

ادریس بن ادریس مراقب پہنچ گئے تھے تو اس کو اتنی پر خاش تھی کہ وہاں منبر بھیج کر نہر دلوادیا۔ یحییٰ بن عبداللہ محض نے دہلیم میں پناہ لی تھی تو فضل بن یحییٰ برکی کو ان کے قتل پر مامور کیا۔ فضل نے مکر سے کام لے کر یحییٰ کو تائف بھیجے اور

امان کا وعدہ کیا اور اس کے وعدے کے مطابق ہارون نے یحییٰ پر ظاہری نوازشیں بھی کیں لیکن گھات میں لگا رہا۔

پھر ایک دن فضل کا لکھا ہوا پروانہ امان یحییٰ کے گھر سے چڑایا اور انہیں گرفتار کر کے زندان بھیج دیا۔

دومرتبہ قید خانے سے ہوا کہ سر پر عصا سے ضربیں لگائیں اور تیسری بار زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ علی بن ہاشم، عبد ربیع بن علقمہ اور محول بن ابراہیم مہندی بھی آپ کے ساتھ ماخوذ ہوئے۔

یہ تھا الف لیلہ کا ہارون رشید، مورخین جس کے قصیدے پڑھتے ہیں جعفر برکی کے خون ناحق کا الزام ہر فلم کار اس پر لگاتا ہے لیکن محمد کے پوتوں اور کونین کے شہزادوں کو ذہر سے شہید کرنے کی بات کوئی نہیں کرتا۔ شاید دنیا دار جعفر برکی کی قیمت امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ کی روحانی بلندی سے زائد تھی۔
امام موسیٰ کاظمؑ کا انتقال پر ملال

سندی بن شاہک اپنے عہد کا مسلم بن عقبہ اور حجاج بن یوسف تھا مگر امام کی محویت عبادت کو دیکھ کر وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آخر خود ہارون رشید نے پچاس ساٹھ وحشی عربوں کا انتظام کیا اور انہیں امام کو قتل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ انہوں نے ایک نورانی سپر کو مسجدہ پاکر توقف کیا، پھر اس کے استغراق کو دیکھ کر نقش حیرت بن گئے۔ امام نے مسجد سے سر اٹھایا تو انہیں کی زبان میں پوچھا۔

”تم لوگ کیوں آئے ہو، کیا چاہتے ہو؟“

صحرائی عرب آپ کے قدموں پر گر پڑے اور ان کو چومنے لگے۔ امام نے سروں پر ہاتھ رکھ کر انہیں اٹھایا — اس اتناہ میں ہارون قید خانے میں داخل ہوا اور عربوں کی حالت دیکھ کر مایوس پلٹ گیا۔

ہارون کا خیال تھا کہ سندی کی قیدیں امام زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں گے

لیکن اس میں اس کو مایوسی ہوئی تو اس نے مسیب بن زہیر کو امام کا نگران بنا دیا مگر اس طرح بھی کامیابی نہ ہوئی تو زہیر بھرے انگور رسندی کو بھجوائے کہ وہ امام کو کھلا دے۔

امام علیہ السلام نے چند دانے نوش فرمائے اور ایک دانہ سامنے بیٹھے ہوئے کتے کے سامنے ڈال دیا۔ یہ کتا ہارون رشید کا تھا وہ اس دانے کو کھاتے ہی مر گیا جس کا ہارون کو بہت دکھ ہوا۔

امام علیہ السلام پر زہر کا اثر فوراً ہونے لگا تھا تاہم آپ دو روز زندہ تھے۔ تیسرے دن ۲۵ رجب ۳۸ھ کو کچھن سال کی عمر میں انتقال فرمایا مرنے کے بعد آپ کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کٹوائی گئیں جو چودہ سال بعد جسم سے اتاری تھیں۔

ہارون اس کام سے ناراض ہو کر رقبہ چلا گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ میت کی کوئی نماز نہ پڑھے اور اس کو یوں ہی رکھا رہنے دیا جائے لیکن انتقال کی خبر سن کر سلیمان بن ہادی سرور پابرمندہ آگیا۔ آپ کے بڑے بیٹے امام علی رضا علیہ السلام بھی باعجاز امامت مدینے سے آگئے اور آپ نے ہی اپنے ہاتھوں تجہیز و تکفین فرمائی۔

اولاد اطہار

۱۹ بیٹے اور ۸ بیٹیاں آپ نے سو گوار چھوڑیں۔ بیٹوں کے اسمائے گرامی تھے: حضرت امام علی رضا، ابراہیم، عباس، قاسم، اسمعیل، جعفر، ہارون، حسن، احمد، محمد، حمزہ، عبداللہ، زید، حسن، فضل، حسین، سلیمان۔ بیٹیوں کے نام تھے: اکبر، فاطمہ صغریٰ، رقیہ، علیہ، رقیہ صغریٰ، کلثوم، ام جعفر، لبابہ، زینب، خدیجہ، علیہ، آمنہ، حسنہ، بریہ، ام سلمہ، میمونہ، ام کلثوم، ام اسماء۔

یہ تمام بچے اور بچیاں کئی بیویوں سے تھیں۔

یہ لوگ پردیس میں امام کی شہادت کا جتنا بھی غم کرتے، کم تھا
 لیکن مدینہ کے عام رہنے والوں کو بھی بہت صدمہ تھا اور ہاؤن
 رشید کے ظلم پر ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے لیکن وہ
 کہہ ہی کیا سکتے تھے۔ ہر مجبور ایسے موقعوں پر آپس بھر کر رہ جاتا ہے۔

آٹھویں امام

امیر المؤمنین حضرت امام علی رضا علیہ السلام

۲۵ رجب ۸۳ھ تا ۲۰۳ھ

ابتدائی حالات

آپ ۱۱ ذی قعدہ ۵۳ھ کو مدینے میں پیدا ہوئے۔ نام علی بن موسیٰ اور کنیت ابو الحسن تھی، رضا لقب تو صیغی تھا۔ اس طرح آپ امام علی رضا کہلائے۔ آپ کی نشوونما والد محترم کے زیر سایہ ہوئی۔ امام موسیٰ کاظم عجب زندان مصیبت میں گرفتار ہوئے تو آپ جوان ہو چکے تھے۔ منصب امامت پر فائز ہونے کے وقت آپ کی عمر تیس سال تھی۔

آپ نے منصور دوانیقی، مہدی اور بادی کے زلمے دیکھے تھے اور ہارون رشید کے عہد کا بڑا حصہ گزار لائے تھے، جن حالات سے آپ کو دوچار ہوا تھا ان کا آپ کو اندازہ تھا اور امام وقت کی حیثیت سے آپ اس کے لئے تیار تھے لیکن امامت کی شروعات ایک بالکل غیر متوقع انداز سے ہوئی۔

امام موسیٰ کاظم کی امامت میں محمد بن اسمعیل مدعی ہوئے تھے۔ اس سے شیعوں میں ایک نئے فرقے کی بنیاد پڑ گئی پھر امام رضا کو درے مختلف صورتحال سے گزرنا پڑا اور ایک نیا فرقہ واقفہ پیدا ہو گیا۔

زکوٰۃ اور خمس کا روپیہ جو ائمہ طاہرین کے ذریعہ تحقیق پر تقسیم ہوتا تھا۔ وہ حضرت کی امیری کی وجہ سے تقسیم نہ ہو سکا بھتایہ حضرت کی طرف سے

علی بن حمزہ، عثمان بن عیسیٰ اور زید بن مروان کے پاس جمع تھا —
پہلے اور دوسرے کے پاس تیس تیس ہزار دینار — اور تیسرے کے
پاس ستر ہزار دینار۔

امام علیہ السلام کی وفات کے بعد ان لوگوں پر طبع غالب ہوئی اور انہوں
نے اس رقم کو ہضم کر لینے کا قصد کر لیا۔ ان میں سب سے پہلے جس نے اس
فاسد عقیدے کا اظہار کیا وہ علی بن حمزہ تھے پھر عثمان بن عیسیٰ اور زید بن مروان
”حضرت امام رضا علیہ السلام نے ان لوگوں سے، جب اس
مال کو مانگ کر محتاجوں پر تقسیم کرنا چاہا، تو انہوں نے صاف انکار
کر دیا۔ عثمان بن عیسیٰ نے تو کھلے لفظوں میں یہ جواب دیا کہ تمہارے
باپ ابھی زندہ ہیں، مرے نہیں، تم کو ان کی زندگی میں اس مال
کے طلب کرنے کا حق نہیں اور اگر بالفرض مر بھی گئے ہیں تو انہوں
نے مجھے اس کی وصیت نہیں کی کہ اس مال کو تم تک پہنچا دوں۔
ان بد بختوں نے اتنے ہی پرس نہیں کی بلکہ اس مال کے لئے دوسرے
کو بھی ہم خیال بنانا شروع کر دیا۔“ (۱۹)

ان کا عقیدہ تھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں وہ مہدی
موجود ہیں اور وقت آنے پر ظہور فرمائیں گے، چونکہ یہ لوگ بارہ اماموں کے
بجائے سات اماموں پر رک گئے تھے اور وقف کے معنی ٹھہرنے کے ہیں لہذا
انہیں واقفیت کہا گیا۔

امام موسیٰ کاظمؑ نے غالباً اسی کے پیش نظر امام علی رضاؑ کے حق میں ایک
وصیت نامہ لکھ دیا تھا اور خانہ شہادت میں بعض لوگوں کے دستخط بھی کرائیے
تھے مگر امام رضاؑ کے بعض بھائیوں نے اُسے بھی نہیں مانا۔

۱۸۷ھ میں ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات سے فائدہ اٹھا
کر اہل مدینہ سے اپنی بیعت لینے کی کوشش کی مگر مدینے والوں کی ایک تعداد

نے بیعت سے انکار کر دیا۔ اس پر ہارون نے عیسیٰ الجلودی کے ماتحت ایک فوج روانہ کی کہ محمد بن جعفر کو قتل کر دیا جائے جو امام رضا کے چچا تھے۔ محمد نے اپنے ساتھیوں کو لے کر مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور گرفتار ہو کر بغداد بھیج دیئے گئے۔

پھر عیسیٰ نے مدینے کو اس طرح ٹوٹا کر بلا کی ٹوٹ نظروں میں پھر گئی۔ عمام غارت گری سے فراغت پا کر عیسیٰ، امام رضا کے گھر پر پہنچا۔ آپ نے گھر کا تمام اثاثہ کپڑے اور زیور خود اس کو لاکر دے دیئے اور اس نے سارا سامان بغداد بھیج دیا۔ فرقہ واقفینہ اور بہکے ہوئے بھائیوں کو امام رضا نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مخالفت سے باز نہ آئے پھر بھی امام کا ردیہ ان سب کے لئے مشفقانہ بنا پھر آہستہ آہستہ ان کی تعداد گھٹنے لگی۔ امام محمد تقی کے عہد تک لگ بھگ یہ لوگ ناپید ہو چکے تھے۔

ہارون الرشید کا عہد آخر

”سنہ ۱۷۵ھ اس واقعہ کے لئے مشہور ہے جس نے رشید کی قیامت سلطنت کو نہ صرف داغدار کیا بلکہ اس کی آئندہ زندگی کو بھی تلخ کر دیا۔ سترہ سال تک براکھ نے نہایت وفاداری اور دیانت سے حکومت کی خدمت کی تھی۔ ان کے عہد میں لوگ شاد و خرم رہے، سلطنت ملالہ اور مضبوط ہوئی۔ قومی سرمائے میں اضافہ ہوا اور ہر جگہ تہذیب و ترقی نے نشوونما پائی مگر خود ان کی شان و شوکت، خیرات و فیاضی نے جس کی بدولت لوگ ان کو اپنا ملجا و مادی سمجھتے تھے، ان کے بہت سے دشمن پیدا کر دیئے جو تباہی و بربادی پرتل گئے۔“ (۱۱۰)

جعفر اور شہزادی عباسہ کی شادی کو بنی عباس کے طرفدار ایک افسانہ قرار دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کو استقرار حکومت کی خاطر کچھ بھی کرنے میں تامل نہ تھا جس کی نظیریں امام رضا اور امام محمد تقی کے رشتوں سے ملتی ہیں۔ یہ دونوں امام بھی داماد بنائے جانے کے بعد زہر سے شہید کئے گئے۔

جعفر برکی ہارون رشید کا بہنوئی تھا مگر کان کے کچے اور تلون مزاج بادشاہ نے بدگمانی میں مبتلا ہو کر مسرور کی تلوار سے اس کا سرا توڑ لیا پھر برکیوں کی تمام جائیدادیں ضبط کر لیں، بوڑھے کچی اور فضل برکی کو قید خانے میں مجبوس کر دیا جہاں کچی ۱۹۹ھ میں اور فضل ۱۹۳ھ میں مر گیا۔

۱۸۱ھ میں رومیوں سے جنگ ہوئی۔ تانس فورس سے رشید کا معرکہ بے جگہی اور دلیری کا ایک کارنامہ ہے۔ ہارون رشید کی سپاہ نے چالیس ہزار عیسائیوں کو کاٹ کر رکھ دیا مگر اس کے بعد رومیوں سے مسلسل اس کی ٹکر ہوتی ہی رہی۔ اس دوران مختلف مقامات پر کئی بغاوتیں ہوئیں جن کو فرو کیا گیا۔ اتنی بڑی سلطنت میں ایسے واقعات کوئی غیر معمولی نہ تھے۔ ان میں اسے مسلسل الجھا رہنا پڑا، پھر بھی اس کی ذات سے علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی۔

”وہ ظالم، جابر، دہم پرست، تیز طبیعت، مطلق الغنان اور خود مرکز مگر بہت باذوق، تدبیر اور زیرک حکمراں تھا۔ اس کا دربار شوکت و رونق کے اعتبار سے عظیم النظیر تھا۔ اس نے اپنے دربار میں باکمال لوگ جمع کر رکھے تھے۔ بے شمار بے گناہوں کے خون کے دھبے اس کے دامن پر نظر آتے ہیں۔ عدل و انصاف نے بارہا خالق و دو جہاں سے اس کی فریاد کی ہے اور اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی، پھر بھی اس نے آرٹ، سائنس اور علم الابدان کے ہر شعبے اور شاخ کی ترقی کے لئے شانہ بخود ذکر سے کام لیا۔ ہارون رشید پہلا شخص ہے جس نے راگ کو شریف پیشہ قرار دیا۔ سائنس اور لٹریچر کی طرح اس کی بھی ترقی اور اعزازی درجے مقرر کئے۔“ (۱۱۱)

عیسائیوں سے مسلسل جنگوں اور اندرونی بغاوتوں میں اس کی صحت خراب ہو گئی تھی اور وہ رقم میں آفات گزریں ہو گیا تھا مگر ۱۹۲ھ میں پھر سے یونانیوں سے مقابلے کے لئے نکلا پڑا۔ خراسان کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی

آخر طوس کے نواح میں قریہ تناء آباد میں ۴ جمادی الثانی ۱۹۳ھ کو ساڑھے تیس سال حکومت کر کے چل بسا۔

امین بن ہارون

امین باپ کے انتقال پر تخت خلافت پر بیٹھا۔ فضل بن ربیع، جعفر ربکی کے بعد سے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے مامون کے مقابلے پر رشید کی وصیت کے خلاف امین کا ساتھ دیا اور خزانہ و فوج لے کر اس سے آٹلا۔

رشید نے اپنی زندگی ہی میں مامون کا علاقہ رے علیحدہ کر دیا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس کی فلاح و ترقی میں لگا رہا۔ امین اس کے برعکس خلیفہ ہوتے ہی رنگ ریلوں میں پڑ گیا پھر فضل اور دوسرے امیروں کے بہکانے پر مامون کو بغاوت طلب کر لیا۔ مامون نے نہ جانے کا بہانہ کیا تو امین نے پچاس ہزار کاشک دے کر علی بن عیسیٰ کو اس کی سرزنش کے لئے روانہ کر دیا۔ جس کا مقابلہ مامون کی طرف سے طاہر بن حسین نے کیا اور اس کو شکست دے کر امین کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ اب دونوں بھائیوں میں حصول خلافت کی جنگ شروع ہو گئی اور طاہر بن حسین علاقوں پر علالتے فتح کرتا رہا۔ ادھر مامون نے امیر المومنین کا لقب اختیار کر کے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ بدقسمت امین شکستوں پر شکستیں کھاتا رہا۔ آخر اس نے اپنے کو مامون کے ایک سالار فوج ہرثمہ بن اعین کے حوالے کر دیئے کا فیصلہ کر لیا اور کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہی ہوا تھا کہ ایرانی سپاہیوں نے کمرہ ہلاک کر دیا۔

امین کی عمر ۲۶ سال اور مدت خلافت چار سال آٹھ ماہ تھی۔

مامون رشید بن ہارون رشید

۱۹۹ھ میں مامون بھائی کی جگہ تخت نشین خلافت ہوا۔ وہ ایک بہادر لائق عالم اور مدبر حکمراں تھا لیکن سیاسی سوجھ بوجھ میں اس کا جواب نہ تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ رزم سے زائد ہزم کے لئے موزوں تھا۔ اس نے نظم سلطنت اپنے وزیر فضل بن ربیع کے ہاتھ میں دے دیا اور خود اصلاحات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جس کے

نتیجے میں مختلف مقامات پر بد امنی کے آثار پیدا ہو گئے۔ آخر اس نے مردے بلفاد منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

امام رضا کے دس سال

دور ہارون رشید کے آخری چند برس اور اس کے بعد ۲۵۲ھ تک کا زمانہ امام علی رضا کو ایسا ملا کہ آپ نے رشد و ہدایت کی خدمت قدرے سکون سے انجام دی۔ آپ کے روز کے معمولات بھی تقریباً وہی تھے جو دوسرے ائمہ کے رہے تھے۔

محاسن اخلاق اور تواضع و انکساری میں آپ کا یہ عالم تھا کہ دسترخوان پر اپنے ساتھ سائیس اور دربان تک کو بٹھا لیتے اور سائل تو آپ کے در سے خالی جاتا ہی نہ تھا، وہ آپ کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتا اور آداب مندرخان خود بخود سیکھ جاتا تھا۔ راتوں کو آپ اکثر عبادت و ریاضت میں گزارتے۔ دن کو صبح سے شام تک روزہ رکھتے لیکن ہمیشہ ایسا نہ ہوتا، تاہم مہینے میں تین روزے ضرور رکھتے تھے آپ کا قول تھا کہ تین روزے رکھ لینا ایسا ہی ہے جیسے انسان ہمیشہ روزے رکھے۔ خیرات کا یہ عالم تھا کہ رات کے پردے میں مستحقین کے گھروں پر خود پہنچا دیا کرتے اور کبھی پانے والے کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ کون دے کر گیا ہے۔

لوگوں سے بات چیت کرنے میں لہجہ بہت نرم ہوتا اور مخاطب جب تک اپنی بات ختم نہ کر لیتا، اس وقت تک خاموش رہتے۔ جب وہ آپ کی بات سننے پر تیار ہوتا تب ہی بولتے تھے۔

کسی کے سامنے ٹیکہ کا سہارا لے کر یا پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے، خواہ آپ کہتے ہی تھکے کیوں نہ ہوں۔

تہقہہ لگا کر نہ ہنستے، عموماً مسکرا دیا کرتے تھے تاہم چہرے پر ہمہ وقت ایک شگفتگی پائی جاتی، دل پر کتنا ہی بوجھ ہو مگر آپ دوسروں کو اس سے متاثر نہ ہونے دیتے۔

آپ کا فرش بوریہ ہوتا جس پر بیٹھ کر وعظ کیا کرتے اور مسائل شرعیہ بیان کرتے یا فتاویٰ دے دیا کرتے تھے۔ موسم سرما میں بوریے کے بجائے کبیل پر بیٹھتے تھے، اور اسی پر آنے والوں کو بھی بٹھاتے تھے۔

مسائل کے بیان میں آپ عموماً اتنا طول دیتے کہ اس کا کوئی گوشہ نشین نہ رہنے پائے۔ نماز صبح اگر چہ طویل ہوتی مگر لوگوں کو پسند و ناصح فرمائے کا جو وقت معین تھا، اس میں کوئی کمی نہ کرتے۔ یہ بھی آپ کے نزدیک واجبات میں سے تھا۔ شب روز میں ایک ہزار رکعت نماز کی ادائی فرماتے، روزانہ ایک قرآن ختم کرتے اور سورتوں کی تلاوت کرتے کرتے سو جاتے تھے۔

مومن و منافق کی پہچان میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آدمی کے سامنے آتے ہی اس کے بشرے سے آپ کو معلوم ہو جاتا تھا کہ ایمان کے کس درجے پر ہے مگر منافق کے سامنے اس کا اظہار نہ کرتے۔

امام کو مجلس سید الشہداء میں بھی بڑا شغف تھا۔ محرم میں مسلسل مجلسیں منعقد کرتے۔ ایک مرتبہ یوم عاشورا کو دعل خزاعی پہنچ گئے تو ان سے مرثیہ پڑھوایا اور خواتین کو بھی سُنوایا۔ شور گریہ بلند ہوا تو آپ نے گریہ کا ثواب بیان کیا۔ علمائے اسلام مشکل مسائل میں آپ سے رجوع کرتے اور آپ فوراً ان کے جوابات دے دیتے تھے۔

بعض لوگ تحریری طور پر پوچھتے تھے، آپ جواب لکھ کر دے دیا کرتے۔ مدینے کے قیام میں ان کی تعداد اٹھارہ ہزار بتائی جاتی ہے۔

مختصراً آپ علوم الہی اور انوارِ مشیت کا گنجینہ تھے۔ علماء و فضلاء، محدثین و مفسرین، جنہوں نے آگے چل کر ہمہری بلکہ برتری کا دعویٰ کیا، اگر ضمیر کی شہادت کے ساتھ ان سے پوچھا جائے تو انہیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ انہوں نے امام رضا علیہ السلام سے بھی فیض حاصل کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ذاتی مفاد نے انہیں اخلائے حقیقت پر مجبور کر دیا۔

کمالات و معجزات اور غیب دانی کی توانائی مثالیں ہیں کہ بعقیدہ لوگوں کو بھی کسی وقت مانے بغیر چارہ نہ رہتا۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کو دینی خدمت کا جتنا وقت ملا تھا۔ امام رضا کو بھی اس سے کم وقت نہیں ملا اور آپ نے اس وقت میں اس خوبی سے فرائض امت انجام دیئے کہ ان کے نقوش مطلع مخالف پر کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔

سلطنت عباسیہ کا انتشار اور سادات علویہ

فطرت کا اصول ہے کہ درخت کی شاخیں جس قدر کاٹی جائیں، اس سے زائد نئی شاخیں اس میں نکلتی ہیں۔ یہی صورت حالوادہ نبوت میں بھی رونما ہوتی رہی ڈیڑھ سو سال سے زائد گزر رہے تھے کہ سادات کے ہاتھ پاؤں اور گردنیں قطع کی جا رہی تھیں لیکن ایک تلوار کی دھار پر سے گزرتا تو پانچ اپنے بعد چھوڑ جاتا، ان پانچ میں سے چار خون کے دریا میں ڈوب جاتے تو چودہ اس کے جانشین بن جاتے اور چودہ میں سے بارہ کٹ جاتے تو چالیس پروان چڑھنے کے لئے تفتیش میں چلے جاتے۔ اس طرح کوئی نہ کوئی تعداد دیرونیوں اور کھنڈروں میں پائی جاتی جو موقع پاتے ہی برآمد ہو جاتی اور خون کے دریا بہا کر اپنا خون بھی کر بلا دالوں میں شامل کر جاتی تھی۔

جناب زید شہید کی اولاد واسط میں پناہ گزین تھی جو کئی مرتبہ قتل کی گئی اور منتشر ہو کر پھر سمٹ آئی۔

مامون کے آغاز حکومت میں بنی امیہ کی ایک فرد نصر نے الحزبہ میں علم بغداد بلذکر کیا۔ جعفر طیار کی اولاد میں ابن طباطبائے بغداد کے افسر فوج ابو سراہ کی مدد سے اعلان حریت کیا۔ ابن طباطبائے اچانک مرجانے پر ابو سراہ نے حضرت زیدؑ کے ایک پوتے محمد بن زید کو تخت پر بٹھا کر عراق سے یمن تک اپنی حکومت قائم کر لی۔

کئے پر بھی سادات کا قبضہ تھا۔ آگے چل کر مستعصم کی فوج نے ان کو شکست دی۔ اس بار بھی حصول اقتدار میں سادات کا خون بہایا گیا۔

انقلاب کی یہ لہری خاص علائقے تک محدود نہ تھی، ہر طرف آل محمد کے حقوق کا آواز بلند ہو رہا تھا۔

الحسن البرقی نے ۱۹۷ھ میں دعوتِ رضا کے حق دی، ایک بڑی تعداد جمع کر لی۔ محرم ۱۹۹ھ میں عباسی فوج سے مقابلہ ہوا۔ اُن گنت عباسی مارے گئے مگر الحسن کو شکست ہوئی اور انہوں نے لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کیا۔ حسن بن ہذیل صاحبِ فنج کے ساتھیوں میں تھے۔ آپ کا یادگار جہز تذکروں میں محفوظ ہے۔

”جو شخص خون میں تربت ہو کر جامِ موت نہ پئے گا، اُسے بڑھاپے میں موت آئے گی۔ موت وہ پیالہ ہے جسے انسان کو بہر طور پینا ہی پڑتا ہے۔“ محمد بن الحسین یمن کے داعیوں میں تھے۔ یمنیوں نے جب عباسیوں سے جنگ کی تو شیرازہ حملے کرتے ہوئے مارے گئے۔

بے گنتی لوگ ہیں جن کے نام مسلکِ شہادت پر درخشاں ہیں۔ ان میں صرف سادات اور ان کے حلقہٴ بغوش ہی نہ تھے بلکہ ایک بڑی تعداد غیر جانبدار لوگوں کی بھی تھی جو بے اختیار مطلوبوں کے حمایتی بن گئے تھے مگر وہ سب علیحدہ علیحدہ اور چھوٹی چھوٹی جنگوں میں قتل کر دیئے گئے۔

مامون کے سپہ سالار حسن بن سہل نے مسلسل جنگوں کے بعد کھویا ہوا اقتدار پس لے لیا لیکن اب اس حقیقت میں کوئی شک نہ رہا کہ مسلم عوام کے دل ادلاروں کے ساتھ ہیں اور جب ان کی کوئی فردا نہیں آواز دیتی تو وہ حق کی حمایت میں جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر نکل آتے۔ خود ساداتِ تعداد میں زیادہ نہ سہی لیکن قتل ہوتے ہوتے عاجز ہو چکے تھے لہذا موقع ملے ہی سزوں کو کٹانے کے لئے نکل پڑتے کیونکہ یہ موت ان کے شایانِ شان ہوتی تھی۔

اسلاف کی پوری تاریخ مامون کے سامنے تھی۔ منصور و دانیق، مہدی ہادی اور ہارون رشید کے قید خانے شاہد تھے کہ وہ اکثر دہشتِ سادات ہی کے قہرِ قدم

سے آباد رہے اور جب دو چار سو نکال کر موت کے کنوؤں میں ڈالے گئے تو پانچ سو سونے ان کی جگہ لے لی۔ اس طرح ہزاروں آئے اور قتل ہوئے پھر ہزاروں رونق زنداں بن گئے۔ کتنی پیداوار تھی اولاد رسول کی کہ پرانا خون نکالا جاتا تھا تو نیا خون اسی قدر یا اس سے زائد آجاتا تھا۔ اب اگر ہمارے ائمہ اور خاندان رسالت کے اکابر درجنوں وارث چھوڑ کر نہ جاتے تو پیغمبر کی نسل تو رونے زمین پر باقی ہی نہ رہتی۔

مامون کا انداز فکر

کربلا کے بعد ستر تاریخ کے آفتاب پر ایک نظر ڈالی جائے تو صرف مشرق و مغرب میں نہیں، شمال و جنوب میں بھی خون شہیدان کی شفق پھولتی نظر آئے گی اور اس میں سے ایمان کے آفتاب طلوع ہوتے دکھائی دیں گے۔

مامون کی دور رس نگاہ ماضی کی فضا میں دیکھتی چلی گئی اور اس نے ایک فیصلہ کر لیا کہ حقدار کی صداقت تلوار اور تشدد سے دبائی نہیں جاسکتی مگر یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا کہ وہ حکومت سے دستبردار ہو جانا کیونکہ اس کو جو کچھ کرنا تھا، وہ بقائے حکومت کی خاطر ہی تو کرنا تھا۔ اس لئے اس نے طے کر لیا کہ تلوار نیام میں تو رکھ لی جائے مگر سیاست کے زہر میں بجھا کر۔

اہل رسول کو سپر بنا کر حکومت کرنے کی فکر کچھ نئی نہ تھی۔ اس سے قبل بنی امیہ اسی طریقے کو اپنانے کی کوشش کر چکے تھے۔ سب سے پہلے معاویہؓ نے حضرت عقیل کا دمشق میں خیر مقدم کیا تھا مگر آپ حضرت علیؓ پر تبرہ ہوتے دیکھ نہ سکے اور واپس چلے گئے، پھر ہر فرماں روا اس خاندان کی کسی نہ کسی فرد کو توڑنے کی سعی کرتا رہا۔ سلیمان بن عبد الملک نے محمد حنفیہ کے پوتے ابو ہاشم کو دربار میں ایک معزز جگہ دی تھی، نوح کے تمام محبان علیؓ ان کے حلقہ ارادت میں شامل تھے اور عباسی داعی محمد بن علی نے ان کی شخصیت سے فائدہ اٹھا کر اپنی تحریک پھیلانی تھی۔

مامون جانتا تھا کہ وقتی تسلط تو اس نے حاصل کر لیا ہے لیکن عرب و عراق اور

شام و ایران ہر علاقے میں آل نبی کی مظلومیت کے جھنڈے گڑ چکے ہیں۔ سلطنت ادیبیہ مراقش میں قائم ہو چکی ہے۔ خود عباسیوں کی طرح کوئی خفیہ تحریک چل گئی تو حشر بنی امیہ سے مختلف نہ ہو گا۔ یہ بات شاید اس کے علم میں نہ تھی کہ فاطمی تحریک ہارون رشید کے دور سے چل چکی ہے لہذا اس نے دشمنی کو دوستی میں اور غنا کو مروت میں بدل دینے کا عزم کر لیا اور امام رضا کی خدمت میں تشریف لانے کا ایک خط بھیج دیا۔

دربار خلافت سے طلبی ہر دور میں ہوتی رہی تھی مگر کبھی کوئی امام فوج کے گھیرے میں، کوئی رسن بستہ، کوئی زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب عباسی خلیفہ نے حکم کے بجائے استدعا کی تھی اور عزت و احترام کے ساتھ بلایا تھا۔ مامون کی مقصدی طلبی نگاہ امامت سے چھپی نہ تھی لیکن امام کو تو اپنے فرائض انجام دینا تھے، خواہ بوریے پر، یا تخت حکومت پر۔ پھر بھی آپ نے خط کا جواب نہ دیا۔ اس کے بعد کئی خط یکے بعد دیگرے آئے لیکن آپ جانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

مامون کو احساس تھا کہ امام اس چکر میں نہ پھنسیں گے مگر سادات کی مخالفت ختم کرنے کا اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہ تھا کہ امام کی پشت پناہی حاصل کر لی جائے اور سازش کے ہر خطرے اور بغاوت کے ہر اندیشے کو دور کر لیا جائے۔ آخر مامون نے اپنے ایک عزیز رجا بن ضحاک کو چند ارکان سلطنت کے ہمراہ روانہ کیا، خط پڑھ کر امام کی زبان سے نکلا۔

”انسان تقدیر الہی سے مجبور رہے۔“

حضرت علی کا دور خلافت امام رضا کا رہنما تھا۔ آپ نے حضور کے روئے پر حامزی دی، بلکہ بلک کر روئے کیونکہ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ آپ کو معلوم تھا۔ مدینے سے رخصت ہو کر آپ کعبہ معظمہ پہنچے۔ مقام ابراہیم کے پاس نماز ادا کی اور جب سنت ۲۰ میں مرو کی جانب روانہ ہو گئے۔

نے جانے والے آپ کو کوہِ قم کے راستے نہیں لے گئے کہ کہیں ان مقامات کے شیعہ آپ کو روک نہ لیں بلکہ بصرہ و اہواز کی راہ اختیار کی۔ آپ کی سواری جب نیشاپور کے قریب پہنچی تو علماء و فضلاء نے ایک منزل بڑھ کر استقبال کیا۔ لوگ ٹیڈیوں کی طرح اُبل پڑے اور آپ کو دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ آپ نے محلہ غزونی میں قیام فرمایا جہاں آپ کے قدموں کی برکت سے پانی کا ایک خشک چشمہ اُبل پڑا۔

خراسان میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیش آئی، پھر آپ طوس میں وارد ہوئے۔ طوس سے سنا باد آئے۔ یہاں قبۂ ہارون واقع تھا۔ آپ اس کے اندر تشریف لے گئے اور اس میں قبۂ رُوح ایک خط کھینچ کر فرمایا۔
”میں اس جگہ دفن کیا جاؤں گا۔“

مرو میں مامون نے بذاتِ خود خیر مقدم کیا اور تین روز بعد جب کسل سفر دُور ہو گیا تو مامون نے تنہائی میں آپ سے ولی عہدی قبول کرنے کی درخواست کی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ اسی طرح تین روز گزر گئے۔ وہ کہتا رہا اور آپ انکار کرتے رہے۔ آخر مامون سخت برہم ہو کر بولا۔

”اگر آپ قبول نہ کریں گے تو میں آپ کو قتل کر دوں گا۔“
”امام کو موت سے کیا ڈر ہوتا لیکن اتمامِ حجت کے لئے آپ نے فرمایا۔“
”انکار میں ہلاکت کا خدشہ ہے اس لئے قبول کرنا ہوں۔“ مگر ان شرائط کے ساتھ کہ کار و بارِ سلطنت سے میرا کوئی سروکار نہ ہوگا۔ نہ کسی کا تقرر کروں گا نہ برطرف اور نہ ملکی قانون میں کوئی ترمیم و ترمیم۔ ہاں کسی مسئلہ پر مجھ سے مشورہ کیا جائے گا تو خدا و رسول کے حکم کے مطابق مشورہ دے دوں گا۔“
مامون نے منظور کر لیا اور آپ اپنے مقام پر آکر گریہ و زاری کے ساتھ دعا فرماتے رہے۔

”خداوند! تو جانتا ہے کہ کس مجبوری سے میں نے اس امر کو قبول کیا ہے

مجھ سے مواخذہ نہ کرنا

یہ کم رمضان ۲۰ھ کو دربار عام کی تاریخ مقرر ہوئی اور حکم دیا گیا کہ لوگ کالے کپڑوں کے بجائے آلِ فاطمہ کا سبز لباس پہن کر آئیں۔

عباسیوں نے سخت مخالفت کی مگر مامون نہ مانا۔ ملکی مصلحتوں کو عام آدمی تو سمجھ نہ سکتے۔ مامون نے سب کو بھرپور دیا۔ بھرے دربار میں پہلے اس نے اپنے بیٹے عباس سے امام کی بیعت کرائی پھر اہل دربار نے بیعت کی۔ ایک شاندار تقریب میں امام نے خطبہ ارشاد فرمایا۔

بنی عباس ناخوش تھے اور مجتہد اہل بیت بہت خوش لیکن خوشی داناوشی کا انجام مامون کو معلوم تھا یا امام کے علمِ امامت میں تھا۔

مامون نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنی بیٹی ام حبیب کا عقد بھی اسی سال ۲۰ھ میں امام کے ساتھ کر دیا اور آپ کے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا تاکہ کسی کو اس کی نیت پر کوئی شک نہ رہے۔ مگر ام حبیب کی رخصتی نہیں کی، وہی اپنی بہن عباسہ والی ترکیب پھر جعفر کی طرح امام کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔

بغداد میں آپ کی ولی عہدی کی خبر سے ہل چل پڑ گئی اور عباسیوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ سلطنت عباسیوں سے نکل کر آلِ رسول میں پہنچ گئی۔ انہوں نے مل کر ابوالہیثم بن جہدی کو بغداد کے تخت پر بٹھا دیا اور مامون کی معزولی کا اعلان کر دیا۔

فضل بن سہیل نے اس انقلاب کی خبر مامون کو نہ ہونے دی لیکن امام نے ایک رات خود اس کے پاس جا کر خبردار کر دیا اور مامون فوراً بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔ شمس میں اس نے وزیر سلطنت فضل بن سہیل کو غدار کی بے جرمی میں ایک جہاد میں قتل کر دیا۔ اسی طرح مامون نے ہر شتمہ بن اعین کو بھی مر دیا تھا۔ مامون کے طرفدار ہر شتمہ کے قتل سے مامون کو بری الذمہ ٹھہراتے ہیں جس میں جس امیر علی بھی شامل ہیں لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ پھر ہر کس نے دلویا تھا حقیقت یہ

ہے کہ وہ مامون کے سیاسی ذہن تک پہنچ ہی نہ سکے۔ مامون سیاست میں دُور رس
تنباح کا قائل تھا، خواہ یہ تنباج کوئی لمبا راستہ اختیار کر کے ہی حاصل ہوں۔

وہ عباسی تھا اور عباسیوں کا سرغنہ بھی، اگر اس کو سلطنت بچانے کی فکر نہ ہوتی
تو امام کو ایسی پیشکش ہی کیوں کرتا۔۔۔ معاویہ بن یزید کی ایک نظیر اس سے قبل
تاریخ پیش کر چکی تھی۔ اس نے اُس تخت پر بیٹھنا گوارا نہیں کیا جس پر ایام
حسین کا سر رکھا گیا تھا اور مامون جس تخت پر بیٹھتا تھا، وہ تو مزادوں بارخون دا
میں ڈوب چکا تھا، اگر اس تخت سے مامون کو کراہت تھی تو اس کو حاصل کرنے کے
لئے بھائی کو قتل کیوں کر آیا؟ پہلے ہی دن حسین بن طاہر اور مرثمہ بن اعین سے
کہہ دیا کہ مجھے ایسی خونی حکومت کی ضرورت نہیں، مامون کو اس کا خیال اس وقت
کیوں آیا جب عباسی حکومت کو کسی انقلاب کے خطرات درپیش تھے۔

مامون حقیقتاً "حرف پیغمبر اسلام ہی کا دشمن نہ تھا بلکہ دین اسلام کا دشمن بھی
تھا جس کے خلاف آزاد خیال اور علوم کی سرپرستی کے بہانے اس کے دربار میں
سازش کی گئی۔۔۔ وہ صرف ایک فرماں روا تھا اور عباسی فرماں روا، ضرورت پڑے
پر اس نے اپنے پرچم کا رنگ سبز کر دیا اور وقت گزر جانے پر پھر سیاہ کر دیا۔ اپنے
مقصد کے لئے وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔

"بلاشبہ وہ اپنے بھائی امین الرشید کو قید خانے کی کوٹھڑی میں قتل کر سکتا
تھا اور یقیناً اس کے بھیجے ہوئے جلا دوں کی تلواروں میں یہ قدرت تھی کہ مسکین امین
کے تکیہ کی ڈھالوں پر غالب آجائیں لیکن اس کی پوری حکومت اور حکومت کی تمام
طاقتیں بھی اس سے عاجز تھیں کہ حاکمین شریعت اور علمائے حق کے استقامت
ثبات پر غالب آسکیں اور ان کو حق و ہدایت کی اُس راہ سے پھر ادیں جس پر ان کا
یقین اور نور ایمان انہیں چلا رہا تھا۔

تاہم فتنہ عظیم تھا اور اس کے قہارانہ نتائج نے وہ سب کچھ کیا
جو ایسے مواقع پر ہمیشہ ہوا ہے۔ بہت سے علمائے حق قید ہوئے بہت

سے جلا وطن کئے گئے، بعض خاک و خون میں بھی ٹرپے اور بہتوں کے

قدم جادہ ثبات سے ڈگمگا بھی گئے۔ (۱۱۲)

مولانا ابوالکلام آزاد نے تصویر کشی کی ہے ان فتنوں کی جو حریت فکر کے نام پر مامون کے دربار میں اٹھتے رہے۔

امام رضا علیہ السلام، ولی عہد سلطنت

بغداد میں امام سے عام نفرت تھی۔ عباسی اور ان کے ہواخواہ شب و روز آپ کا وقار مجروح کرنے کی فکر میں لگے رہتے۔ ایک دن جب آپ مامون سے ملنے گئے تو کسی حاجب نے اندر جانے کے لئے پردہ نہیں اٹھایا تاکہ آپ کی ذلت ہو مگر جیسے ہی آپ پردے کے قریب گئے، ہوا کا ایک جھونکا آیا اور پردہ خود بخود ایک طرف ہو گیا۔ دایسی میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب کئی روز یہ اتفاق پیش آیا تو تمام حاجب خود شرمزدہ ہوئے اور انہوں نے یہ حرکت چھوڑ دی۔

کچھ دنوں کے وقفے سے رمضان آگیا اور رمضان کے بعد عید۔ مامون نے آپ سے عید کی نماز پڑھانے کے لئے کہا۔ آپ نے غدر کیا کہ جس طرح خلیفہ یا کوئی اور پڑھاتا ہے، ویسے ہی پڑھائے مگر مامون بضد ہو گیا تو آپ نے فرمایا۔
”میں اسی طرح جاؤں گا، جس طرح میرے جد جایا کرتے تھے۔“

مامون نے اجازت دے دی اور آپ عید کے دن اس طرح باہر نکلے کہ ہاتھ میں عصا، پانچجامہ آدھی پنڈلی تک اٹھا ہوا، کپڑے سمیٹے ہوئے، ننگے پاؤں دو تین قدم چل کر آپ ٹھہرے اور منہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔
”اللہ اکبر، اللہ اکبر۔“

پیچھے چلنے والوں نے بھی تکبیر کہی، پھر تکبیر کی آواز بلند ہوتی رہی اور در دیوڑ سے آواز باز گشت سنائی دینے لگی، محسوس ہونے لگا کہ جیسے زمین و آسمان سب آپ کے ساتھ تکبیر کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔

بالا خانوں پر لوگ سواری کا منظر دیکھ رہے تھے۔ سب دوڑ پڑے، اسی

ہیت میں نعرہ ہائے تکبر لگانے لگے اور بعض لوگ توجہ بات میں پھوٹ پھوٹ کر پڑے۔
 ”جلوس کا انتظام خود رعایا کی طرف سے تھا، دعوت خاص نہ تھی بلکہ عام تھی
 کسی کے لئے روک ٹوک نہ تھی۔ امیر و غریب خورد و کلاں سب امام کی زیارت سے
 مشرف ہو رہے تھے۔ بوڑھے اور ضعیفوں کے قدموں نے جواب دے دیا ہو مگر ان
 کے دل شوق دید میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ عورتیں لب بام کھڑی تھیں، مائیں اپنے
 بچوں کو گود میں اٹھائے اور کانڈھوں پر چڑھائے ہوئے تھیں اور اشارے سے
 دنیا کے اس انقلاب پسند مساوات پرور اور امن آفرین خاندان کے اٹھو تین قائد
 کی نشان دہی کر رہی تھیں جس کا نام برسوں سے ان کی زبان پر تھا۔ بچے پوچھتے :-
 اماں یہ کس کا جلوس ہے، آج کون عید گاہ کی طرف جا رہے ہیں؟ مائیں کہتیں :- یہ
 ہمارے امام ہیں، ہم سب انہیں کے نانا کا کلمہ پڑھتے ہیں، قرآن انہیں کے گھر
 میں نازل ہوا تھا۔ یہ ہماری شہر بانو کے پوتے ہیں۔ دین اور دنیا دونوں کے بادشاہ
 ہیں۔ آج ابوسلمہ خراسانی کی روح شاداں ہوگی، وہ ایک مرتبہ خوشی کے مارے قبر
 میں اُچھل پڑا ہوگا۔“

”اگر امام مصطفیٰ تک پہنچ گئے تو منصور کی اولاد دیکھ لے گی کہ
 دوستوں سے دغا کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟ جس خاندان کے نام
 اور کام کی آڑ میں انھوں نے حکومت حاصل کی تھی، آج اس کا ثمرہ
 خود اہل خراسان کے سامنے جلوہ فرما تھا۔“ (۱۱۳)

مامون کو خبر ہوئی تو اس نے فوراً آدمی آپ کی طرف دوڑایا کہ مجھ سے
 غلطی ہوگئی۔ آپ کو بہت زحمت ہو رہی ہے، آپ پلٹ آئیں۔

امام اسی جگہ رک گئے، پھر پلٹ کر اپنی جگہ آ گئے۔ یہ واقعہ بھی مامون
 کی نیت کا عکاس ہے۔ وہ سنت رسول کی تصویق و برداشت نہ کر سکتا۔

مامون نے اپنے دربار میں مختلف مذاہب کے علماء کو جمع کیا تھا اور سیکڑوں

سال بعد پیدا ہونے والے اکبر عظیم کے لئے ایک راہ ہموار کی تھی۔ ایک دن مامون نے یہودی عالم راس الجالوت کو اشارہ کیا کہ امام سے بحث کرے۔ راس الجالوت بڑا متکبر اور مغرور عالم تھا۔ اس نے آپ سے کئی سوالات کئے اور آپ نے ان کے جوابات دے دیئے، پھر آپ نے پوچھا۔

توریت میں ہے ”آیا نور سینا سے اور روشن ہوا جبل ساعیر سے اور ظاہر ہوا کوہ فاران سے“۔

اس نے اقبال کیا کہ ”ہاں“ ہے تو آپ نے اس کا مطلب پوچھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ نے تشریح فرمائی۔

”نور سے مراد وحی ہے، سینا سے کوہ سینا، جبل ساعیر سے محل و مقام عیسیٰ کوہ فاران سے جبل کہ جو شہر سے ایک منزل پر واقع ہے۔“

پھر فرمایا۔ حضرت موسیٰ کی یہ وصیت دیکھی ہے تم نے کہ تمہارے پاس بنی اخوان سے ایک نبی آئے گا۔ اس کی بات ماننا اور اس کے قول کی تصدیق کرنا۔“

راس الجالوت نے کہا۔ ہاں دیکھی ہے مگر اس کا مطلب نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا۔ ”وہ اولاد اسمعیل ہیں، حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ حضرت اسحقؑ کے بھائی — اور حضرت اسمعیل کی نسل سے حضرت محمدؐ ہیں“

پھر آپ نے جبل فاران والی بشارت کی تشریح کی۔

”شیعہ نبی کا قول توریت میں مذکور ہے کہ میں نے دو سوار دیکھے جن کے پر توڑے دینار روشن ہو گئے۔ ان میں ایک گدھے پر سوار تھا اور ایک اونٹ پر۔“

”بتا سکتے ہو راس الجالوت کہ وہ سوار کون تھے؟“

اس نے انکار کیا تو آپ نے فرمایا۔

”راکب الحمار حضرت عیسیٰ اور راکب الجمل محمد مصطفیٰ ہیں۔“

اس سلسلے میں آپ توریت کی تشریح کرتے چلے گئے اور راس الجالوت سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔

ایسا ہی ایک مناظرہ نصرانی عالم جاثلیق سے بھی ہوا اور وہ لاجواب ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

ایک بار ایک مجوسی عالم سے زرتشت کے بارے میں مناظرہ ہوا۔ اس کو بھی آپ نے خاموش کر دیا۔

اسی زمانے میں معجزہ نمائی کا امتحان کرنے کے لئے مامون نے کہا۔
 ”یا بن رسول اللہ! بارش نہ ہونے سے قحط پڑ گیا ہے۔ دعا فرمائیے کہ بارش ہو جائے۔“

آپ نے کہا۔

”دوشنبہ کو طلبِ بارش کے لئے نکلوں گا۔“

لوگ وقت معین پر جوق در جوق جمع گئے۔ اٹام صحرا کی طرف بڑھے اور مصلیٰ بچھا کر دست بدمعہ ہو گئے۔ ابھی آپ کی دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ آبر اٹھا اور موسمِ لادھار پانی برسا۔ اس قدر پانی کہ جل تھل ہو گیا۔

بداعتقادوں میں سے ایک شخص حمید بن مہران نے کہا کہ بارش تو ہونا تھی، وہ ہوتی ہی معجزہ تو اُس وقت ہے کہ قالین پر بنا ہوا شیر اصلی ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: ”میں نے تو کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا لیکن خدا ہر بات پر قادر ہے۔“

پھر آپ نے شیر کی طرف دیکھا اور کہا:۔

”اس فاسق و فاجر کو چیر سچاڑ کر کھا جا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رہے!“
 یہ کہنا تھا کہ تصویر نے گزشتہ پوسٹ کا پیکر اختیار کیا، جسٹ لگا کر اُس مناظرے پر اُگڑا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا گیا۔ مامون دہشت میں بے ہوش ہو گیا۔ آپ نے اس کو ہوشیار کیا اور شیر سے کہا۔

”اپنی اصلی حالت پر آ جا۔“

شیر تصویر بن گیا، جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

اس طرح کے کتنے ہی معجزات آپ نے دکھائے مگر جن کے قلوب سیاہ ہو

ہرچکے تھے، ان میں روشنی کی کرن بھی نہ چھوٹی۔

مامون کے دربار کا ایک عرصہ تو یہ تھا دوسرا رُخ ایک اور بھی تھا جو اس کو دکھانے پر حاوی تھا۔ جس میں خلیفۃ المسلمین جامعہ تقدس و قبائے خلافت سمیت، علماء و محدثین کو جلو میں لئے وادعیش دیتا نظر آتا ہے، مغنیان نازک اقدام حسن و ثناب میں ڈوبی ہوئی، صدر محفل کے ساتھ فقہائے عصر کے ہونٹوں سے خود جام شراب لگاتی ہیں اور عالم بدستی میں کوئی کیا کر رہا ہے، اُسے خود ہوش نہیں ہوتا۔ اس کا نقشہ علامہ شبلی نعمانی نے المامون میں اپنے قلم سے کھینچا ہے اور اس کی کوئی تاویل وہ پیش نہیں کر سکے۔ اور اسی سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

”ماننا پڑتا ہے کہ شاہان بنی عباس میں سیاست و حکمت عملی میں مامون رشید کا جواب نہ تھا اور بنی امیہ میں بھی حضرت معاویہ کے علاوہ کسی کا نام بھی مامون کے ساتھ نہیں لیا جاسکتا۔ جانبداری سے کام نہ لیا جائے تو معاویہ کا بھی مان سے تقابل نہیں ہو سکتا۔ اس نے جس سوچ بوجھ سے دودھ کے اُبال کو ٹھنڈا کیا اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ امام رضا کو لاکر اس نے انہیں اس طرح اپنی پسر بنالیا کہ دودھ کا اُبال اُچھل کر اس کی طرف آئے تو چھینٹیں اس کے بجائے اُٹام پر پڑیں اور وہ بالکل بچا رہے۔“

اب حالات کا جوش و خروش ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس لئے امام رضا کے خطرے کو باقی رکھنا عقل کا کام نہ تھا۔ اس نے ایک ذہنی منصوبہ بنالیا اور بغداد سے طوس کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ امام بھی ساتھ ساتھ تھے۔ ایک دن اس نے امام رضا کو بلا بھیجا تو بہترین انگوروں کا ایک طبق اس کے قریب رکھا ہوا تھا۔ امام کو اس نے عزت کے ساتھ بٹھایا اور کہا۔

”بہت اچھے انگور ہیں نوش فرمائیے۔“

آپ نے جواب دیا۔

”جنت کے انگور اس سے اچھے ہوتے ہیں۔“

اس نے بہت اصرار کیا تو آپ نے تین دانے اٹھا کر کھالے جو زہر آلود تھے
پھر آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مامون نے پوچھا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ —؟“

”جہاں تو نے بھیجا ہے —“ امام نے جواب دیا اور آہستہ آہستہ
چلتے ہوئے اپنی جگہ آ گئے۔

تین روز تک آپ تڑپتے رہے۔ اس اثناء میں امام محمد تقیؑ با اعجاز امامت
مدینے سے آ گئے۔ آپ نے بیٹے کو اسرار امامت تعلیم فرمائے، پھر آپ کی روح
مبارک جو ارحمت میں جاسی۔ ۲۳ ذی قعدہ ۲۰۳ھ یوم جمعہ سرزمین طوس کے لئے
ہمیشہ غم کا ایک پیغام لاتی رہے گی۔

مامون نے دکھانے کے لئے آپ کی موت پر بہت رنج کا اظہار کیا مگر دل
ہی دل میں وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا کہ بنی عباس کے راستے کا سب سے بڑا
گٹنا نکل گیا اور اس تدبیر سے سادات کی تحریک کے خدشات بھی دور ہو گئے۔
ایک بیٹا اور ایک بیٹی آپ نے یادگار چھوڑی :- بیٹے کا نام محمد تقیؑ تھا،

بیٹی کا نام فاطمہ۔
معصومہ قلم

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی بیٹی جناب فاطمہؑ میں سبائی سے ملنے کے
لئے مدینے سے مرو کی طرف روانہ ہوئیں۔ مقام سادہ پر پہنچ کر آپ بیمار ہو گئیں
موسیٰ بن خورج اطلاع پا کر حاضر خدمت ہوئے اور آپ کو لے کر قم پہنچے، وہاں
امام رضاؑ کی شہادت کا حال معلوم ہوا۔ اس صدمے سے آپ کی علالت بڑھ گئی۔
اور ۱۴ روز بعد انتقال فرما گئیں۔ بابلان میں قبر کھودی گئی تو ایک سرداب برآمد
ہوا جو پہلے سے تیار تھا۔

آپ ابھی قبر میں اتاری نہ گئی تھیں کہ دونوں نقاب پوش صحرا کی طرف سے آئے
انہوں نے تدفین کی اور اسی طرح صحرا کی طرف چلے گئے۔ یہ کون تھے؟ معلوم نہ ہو سکا۔

امام رضا کے بعد

اولادِ فاطمہ کو مدینہ امام رضا کے بعد ویران و سستمان معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص آپ کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھا۔ معصومہ قم کے عقب میں بہت سے لوگ ملاقات کے لئے روانہ ہوئے جن میں بھائی، بھتیجے، دوست احباب اور عقیدت مند سب شامل تھے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد سات سو ہو گئی۔ یہ لوگ شیراز کے قریب پہنچے تو انہیں امام کی خبر شہادت ملی۔

محمد بن موسیٰ کاظم، شاہ چراغ، قائم اللیل اور صائم النہار، ان کے سرگروہ تھے وہ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ قلعہ شاہ حاکم شیراز نے انہیں آکر گھیر لیا۔ شاہ چراغ نے اس موقع پر فتاح کر بلا کو یاد کیا اور ساتھیوں سے کہا۔

”ہمیں پیٹھ نہیں دکھانا ہے، جس کو جانا ہو، وہ چلا جائے۔“

پتہ نہیں چلتا کہ کوئی کیا نہیں گیا لیکن طرفین میں ایک ہولناک جنگ ہوئی۔ تین روز کی لڑائی کے بعد حاکم شیراز ہزیمت یا پھر کہ قلعہ بند ہو گیا۔ اب اس نے ایک ترکیب کی کہ تھوڑے سے آدمیوں کو مقابلے میں بھیجا اور وہ تھوڑی دیر لڑ کر قلعہ میں بھاگنے لگے۔ سادات بھی تعاقب میں اندر آ گئے اور چاروں طرف سے گھیر لئے گئے۔ مقابلہ ایک سے کئی کا ہوا، اس لئے آہستہ آہستہ سادات کی تعداد گھٹنے لگی اور ایک ایک کر کے سب ختم ہو گئے۔

شاہ چراغ کے چھوٹے بھائی حسین جن کی عمر تیرہ سال تھی، زخمی ہو کر ایک چھاڑی میں پھپ گئے، وہ کسی طرح بچ کر نکل گئے۔ نہر پر دھوکہ دے ہوئے، باغیانہ نے انہیں سلیمہ مارا اور جسم کو پارہ پارہ کر دیا۔ وہ اسی مقام پر دفن کر دیئے گئے۔ اتنا کہ ان کی قبر پر گنبد بنوایا تھا جو گنبد باغ کے نام سے مشہور ہے۔

شاہ چراغ کے ایک بھائی علی بن حمزہ بھی زخمی ہو کر نکل گئے تھے۔ دامن کوہ میں جا کر بے ہوش ہو گئے۔ ایک درویش شیخ علی، بابائے کوہی اٹھا کر لے گیا۔ آپ کا علاج کیا۔ سات برس آپ اس کے پاس رہے۔

ایک دس شیخ نے تیل لانے کے لئے آپ کو شہر کی طرف بھیجا، واپسی پر چند منافقین نے دیکھ کر حملہ کر دیا اور شہید کر ڈالا، پھر سر علیحدہ کر کے حاکم شہر کے پاس لے جانے کی کوشش کی مگر سر کسی کے اٹھائے اٹھ نہ سکا۔ شیخ کو ہی تلاش کرتا ہوا آیا اور قریب پہنچا تو سر اٹھ چل کر جسم سے جلا ملا اور کچھ دُور چل کر ایک مقام پر جسم سے علیحدہ ہو گیا۔ شیخ نے اسی مقام پر دفن کر دیا۔ جہاں آگے چل کر حضرت الدولہ نے مقبرہ تعمیر کرادیا۔

قتل کا یہ سلسلہ اس مقام پر ختم نہیں ہوا بلکہ مسلسل آگے چلتا رہا جیسے سادات پیدا ہی اسی لئے ہوتے تھے کہ اپنا خون دے کر ہر دورِ امامت کی بنیادوں کو تلواریں کرتے رہیں۔

نویں امام

امیر المومنین حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

۲۰۳ تا ۲۲۰ھ

ولادت و تربیت

آپ ۱۰ رجب ۱۹۵ھ کو مدینے میں پیدا ہوئے۔ ولادت کے بعد پہلا معجزہ یہ ظہور میں آیا کہ آپ کو نہلانے کے لئے طشت میں لٹایا گیا تو چراغ خود بخود گل ہو گیا مگر روشنی بدستور قائم رہی — یہ دلیل تھی اس حقیقت کی کہ چراغ امامت سے جو روشنی پھیلتی ہے، وہ چراغ گل ہو جانے کے بعد اسی طرح پھیل اُمتی ہے۔ یہ امین بن ہارون کا دور تھا پھر مامون تخت خلافت پر بیٹھا — آپ کی عمر ابھی پانچ چھ سال کی ہوگی کہ بغداد سے امام رضا کی طلبی ہو گئی۔ آپ کو پوری طرح یاد تھا کہ امام رضا کس کرب کے ساتھ قبر رسول سے لپٹ کر گئے تھے۔ خود امام محمد تقی بہت چھوٹے تھے۔ جی نہ چاہتا تھا کہ پدر عالی مقام کو جانے دیں مگر آپ نے بھی مشیت کے سامنے سر جھکا دیا۔

کوئی امام کسی دنیاوی تربیت کا محتاج نہیں ہوتا لیکن ہر بچہ باپ کے سایہ عاطفت میں پلنا چاہتا ہے۔ اس حیثیت سے امام محمد تقیؑ کو پانچ سال ملے۔ اس مدت میں سادات پر ظلم و جور کی داستانیں آپ سنتے رہے اور خاندان رسالت کی دو سو سالہ تباہی کی سرگزشت بھی آپ کے کانوں میں پڑی لیکن آپ امام زادے تھے اور ہونے والے امام بھی، اس لئے بڑے تحمل سے سب کچھ سنا اور وہ بھی دیکھا

جس سے امام رضاؑ دو چار ہوئے تھے۔

مامون نے بڑی عزت کے ساتھ امام رضاؑ کو بلوایا تھا پھر بھی آپ نے اس طرح پدرگرمی کو دیکھا تھا گویا اب پھر کبھی نہ دیکھیں گے۔ وہی ہوا کہ دو ڈھائی سال بعد ایک دن غیب کی ایک آواز آپ کو سنائی دی اور پھر ایک فرشتہ آکر دو شہر ہوا پر آپ کو خراسان لے گیا۔ تنہیز و تحفین کر کے آپ واپس ہوئے تو آپ کی عمر آٹھ سال ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے خونِ سادات کی ارزانی پھر شروع ہو گئی اور امام محمد تقیؑ مہر کے گھونٹ پیٹے رہے۔

امام محمد تقیؑ: بغاوتیں

مامون نے اخفائے جرم کی ہر تدبیر پہلے سے کر لی تھی مگر امام رضاؑ کے بعد ایک سوال ہر شخص کے ذہن میں پیدا ہوا کہ زہر کس نے دیا؟ آپ نے جن لوگوں کو پہلے یا بعد میں بتایا تھا، ان کے بیان کو تسلیم نہ کیا جاتا تب بھی زہر دینے والا کوئی تھا ہی اور وہ مامون ہی ہو سکتا، کیونکہ تھوڑی دیر پہلے آپ اچھے خاصے گئے تھے اور واپس آئے تو حالت غیر تھی۔ اس طرح ہر ایک نے سمجھ لیا کہ مامون ہی نے آپ کی شہادت کے اسباب فراہم کئے۔

مامون کا مقصد بظاہر لوہا ہو چکا تھا پھر بھی شہادت کے مابعد اثرات ظاہر ہو رہے تھے اور مختلف جگہوں پر بغاوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

امام رضاؑ کو نظر کے سامنے رکھنے سے مامون کے کئی مقاصد تھے جو کچھ تو لوہے ہوئے تھے اور کچھ نہیں۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے کو بری الذمہ ثابت نہ کر سکا۔

لوگ اس کو قتلِ اٹام پر مطعون بھی کرنے لگے، لہذا اس نے سوچا کہ اٹام کے بیٹے امام محمد تقیؑ کو بلوا کر بغداد میں رکھے۔ عام لوگ اس کو تلافی مافات سمجھیں گے لیکن

بغداد کا مرکز اس کے ہاتھ میں رہے گا پھر ایک امکان یہ بھی تھا کہ امام محمد تقیؑ کی پرورش امیرانہ ماحول میں ہوگی تو وہ اجداد کی روش چھوڑ کر اس رنگ میں رنگ جائیں گے۔

کافی غور و خوض کے بعد اس نے ایک منصوبہ بنایا اور امام محمد تقیؑ کو اسی

انداز پر بغداد طلب کر لیا، جس انداز پر امام رضا کو لایا گیا تھا

امام محققؑ اگرچہ ابھی بلوغت کے دائرے میں داخل ہی ہوئے تھے مگر امام تھے آپ کے بشرے پر علم لدنی کا کمال اور چہرے سے اسلاف کا جاہ و جلال ٹپکتا تھا۔ بغداد میں آپ کو آرام و آسائش کا ہر سامان فراہم کر دیا گیا لیکن آپ نے اپنی ذات خاص کے لئے وہی بورید اور کبیل رکھا اور محل سے الگ مکان لے کر رہنے لگے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ امام رضا ولی عہدی کے زمانے میں ذرق برق کپڑوں میں ملبوس نظر آتے تھے مگر اندر آپ کے جسم پر وہی کھاروے کا لباس تھا۔ جو اس سال محمد تقیؑ کی بھی یہی صورت تھی — ایک دن آپ سہراہ چند نوجوانوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے کہ مامون کی سواری اُدھر سے گزری، سب بھاگ گئے مگر آپ کھڑے رہے۔ مامون نے پوچھا۔

”صاحب زادے، تم کیوں نہیں بھاگے؟“

”میرے چلے جانے سے راستے کی کشادگی بڑھ تو نہ جاتی — پھر میں نے کوئی خطا بھی تو نہیں کی تھی اور بے خط کو آپ سزا کیوں دینے لگے!“

آپ کے جواب میں ایک طنز چھپا ہوا تھا جس کو مامون سمجھ نہ سکا اور اس نے آپ کی بات کو پسند کیا — وہ اپنے بازو لے کر شکار کے لئے جا رہا تھا۔ ایک باز چھوڑا گیا تو وہ واپسی پر ایک چھوٹی سی مچھلی کو منہ میں دبا کر لایا۔ مامون نے اس مچھلی کو مٹھی میں لے لیا واپسی پر امام کو اسی جگہ پایا، تو ان سے پوچھنے لگا۔

”بتائیے میری مٹھی میں کیا ہے؟“

”اُپر دریاؤں سے بخارات لے کر بلند ہوتا ہے کبھی کبھی کوئی بہت چھوٹی مچھلی بھی اُپر میں چلی جاتی ہے جس کو کسی بادشاہ کا باز پکڑ لاتا ہے اور بادشاہ اس کو مٹھی میں چھپا کر خاندان رسالت کا امتحان لیتا ہے۔“

مامون آپ کے جواب پر حیران رہ گیا اور بولا

”بے شک تم امام رضا کے بیٹے ہو —“

لوگ کم سنی کے سبب آپ کو خاطر میں نہ لاتے لیکن جب آپ کی طرف سے علم و روان
کاملاً ظاہر ہوتا تو حیرت کا ٹھکانہ نہ رہتا۔ یہی صورت مامون کی بھی ہوئی اور وہ دل
ہی دل میں سوچتا رہا۔ پچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے!

اس دن کے بعد سے وہ آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کرنے لگا۔ روز آپ کو بلا کر
تخت پر بٹھاتا اور آپ کی باتوں سے استفادہ کرتا تھا۔
خون سادات

کچھ عجیب پالیسی ستمی مامون کی بھی، ایک طرف یہ سیاسی کھیل ہو رہا تھا، دوسری
طرف وہی خوریزی۔

تبریز میں دختران خاوندہ رسالت سلیمہ، حکیمہ، سکینہ اور رحیمہ قتل کر دی گئیں
پھر فاطمہ، سکینہ، شریفہ اور صفیہ نبات عبداللہ بن ہادی شیراز میں شہید ہو گئیں
جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرد تو مرد عورتیں بھی قابل معافی نہ تھیں۔
محمد بن ابراہیم کے صاحب زادگان ہمدان میں پناہ گزین ہوئے تھے جن کو
محسن قتل ہو گئے، باقی پنج کر سلطانہ چلے گئے لیکن وہاں بھی محفوظ نہ رہے انھیں
موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

رے میں یحییٰ، موسیٰ، مسیب، مختار، عباس و ہارون پسران عبداللہ بن جعفر
شہید ہو گئے۔

۲۰۵ھ کا ایک واقعہ ان تمام ختمین داستانوں کو ماند کرتا ہے۔ دغا بازی کے
امام رضا کی شہادت نے بنی ہاشم میں اتنا اشتعال پیدا کر دیا تھا کہ لوگ خود اپنے
قابلوں میں نہیں رہے تھے۔ چنانچہ ۳، ۴۔ افراد کا ایک قافلہ جو شوش انتقام میں ڈوبا ہوا
مدینے سے نکلا اور خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس قافلے نے علاقہ شہر یار کے موضع سار و قمش میں قیام کیا۔ شہر یار کے حاکم
نے مامون کو لکھا۔ اس نے حسن سمنانی اور سیاہ پوش سمنانی کو متعین کیا کہ ان میں
سے کوئی بچ کر جانے نہ پائے۔ چالیس ہزار فوج نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ مقامی باشندے

سادات کے ساتھ تھے وہ انہیں سرد پہنچاتے رہے لیکن تابہ کئے۔ آخر امام زادے شمشیر کف میدان میں آگئے اور شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ چھ ہزار موزیلوں کو فی النار کر دیا مگر سادات کی ایک تعداد بھی شہید ہو گئی۔

اس عرصے میں مزید شکر لک کے لئے آگیا پھر بھی سادات نے مقابلہ کیا لیکن انہیں شکست ہوئی اور ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی، یا ترقی بھاگ نکلے۔
علی جعفر اور ابراہیم نے شہر یار میں پناہ لی جہاں منصور دمشقی کے ہاتھوں مارے گئے۔

علی بن امام موسیٰ کاظمؑ کو اسکمنان میں حادثہ نے قتل کیا۔
امام موسیٰ کاظمؑ کے بیٹے اور پوتے ہارون اور احمد اپنے متعلقین کے ساتھ کوہ الیاس پر چلے گئے تھے۔ دشمنوں نے تعاقب کر کے سب کو تہ تیغ کر دیا، صرف احمد جان بچا کر شام پہنچ سکے۔

جعفر، محمد اور حسین پسران محمد باقرؑ کو موضع جردان میں الیاس دمشقی نے شہید کیا ابراہیم، سلیمان اور ان کی بہن کو سیاہ پوش سنمانی نے۔ علی بن امام زین العابدینؑ اپنی دو بہنوں سمیت زرک کے چشمے پر وضو کر رہے تھے کہ وہاں کاریس گھلام پہنچ گیا۔ اس نے سب کو قتل کر دیا۔

زید و حسن پسران قاسم بن امام محمد باقرؑ کو قلعہ یامان میں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

موسیٰ و اطہر اولاد موسیٰ کاظمؑ میں سے تھے دونوں مع اپنی بہن کے قریرہ کو گولندہ میں قتل کئے گئے۔

سار و قش میں کئی امام زادوں کے سر اتارے گئے اور ان کے سروں کو مامون کے پاس بھیجا گیا لیکن راستے میں ناصر آباد کے قریب ابوذر غفاریؓ کی نسل کی ایک مومنہ رابعہؓ نے اپنے اقربا کے ذریعہ ان سروں کو چھین لیا اور سیاہ پوش کو قتل کر دیا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کے بیٹے عون نے بھی اسی جنگ میں شہادت پائی۔

امام موسیٰ کاظمؑ کی اولاد سے محمد، یعقوب، زکریا، ابوطالب، طاہر، عبداللہ، ناصر، عمار، عبدالملک، ہاشم، منظر، خضر اور الیاس کندر کی طرف چلے گئے لیکن مامون کے عمال نے پیچھا کر کے ان سب کو تہ تیغ کر دیا۔

صالح برادر محمد فاضل و کامل بزرگ تھے مامون نے انہیں زہر دے کر مار ڈالا محمد بن ابی حمیرا ذوی جلیل القدر عالم اور یگانہ عصر تھے۔ سو سے زائد کتب کے مصنف۔ امام رضاؑ کی شہادت کے بعد مامون نے شیعوں کے نام نہ بتانے کے جرم میں انہیں قید کر دیا اور سوتا زیا نے گواہی دی۔

یہ تھوڑے سے نام مصائبِ لابرار اور دوسرے تذکروں سے ماخوذ کئے گئے ہیں ورنہ مکمل فہرست کوئی بنا سکے تو ان کا شمار مشکل ہوگا۔ تنہا مامون رشید کے کشتگان ہزاروں سے تجاوز کر جائیں گے۔

تاریخ اس کو مامون اعظم کہے یا کچھ اور مگر ہماری نظر میں وہ چنگیز خان اعظم کا نقشِ اول تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چنگیز صحرا سے اٹھا تھا صحرا ہی میں رہا اور مامون کے اجلاوتھے کچھ صحرائی لیکن پیغمبرِ عرب کے قدموں کے صدقے میں متمدن بن گئے اور اب مامون بغداد کے پرشکوہ دارالامارہ میں بصد جاہ و جلال تختِ سلطنت پر ٹھکانے تھا مگر اسی پیغمبرِ عرب کی اولاد کا خون اس کی باجھوں سے بہہ رہا تھا جس کو وہ بار بار ایک نئے رومان سے پونچھ لیتا تھا۔

مشرق کا عظیم دربار

کچھ دنوں قبل دنیا نے اسی دربار میں رسولِ اسلام کے آٹھویں جانشین کو دیکھا تھا جس نے مذاہبِ عالم کے نمائندوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ آج اس کی جگہ ایک طفلِ دہ سال کو منصور اعظم نے لایٹھایا تھا۔ اس دربار میں ایک طرف نصرتِ صیہونیت، مجوسیت اور دہریت کے علم بردار، اس سے کچھ فاصلے پر مسلکِ اعتزال کے علماء و فزوکش تھے جس کے بانی واصل بن عطاء، امام جعفر صادق کے شاگرد بھی تھے اور جنہوں نے حسن بصری سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ ابوخلیفہ واصل بن عطاء الغزل

۳۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۳۱۳ھ میں فوت ہوئے۔ خاندان رسالت سے ان کی آبائی وابستگی تھی لیکن دماغ فلسفیانہ پایا تھا۔ آزاد خیالی پہلے انہیں حسن بصری کے طے سے میں لے گئی، پھر اسناد سے اختلاف کے سبب انہوں نے خود اپنا مدرستہ کھول لیا اور افکار و عقائد کی ایک نئی شاہراہ بنا کر ۴۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ان کے شاگردوں میں کچھ بالکمال لوگ گزرے ہیں جنہوں نے مامون کے درباری علماء کے ناطقہ بند کر دیئے تھے تاہم وہ اتنے محتاط رہے کہ ہمارے ائمہ برحق سے متصادم نہیں ہوئے۔ دوسری طرف امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید ابو یوسف اور ان کے ساتھ بڑے بڑے فقہار و محدثین۔ پھر درمیانی فہل میں موسیقی اور دیگر فنون کے بالکمال جن کا سرپرست نام نہاد امیر المومنین مامون رشید تھا۔

امام علی رضا کا دس سال کا بیٹا ان کہن سال لوگوں کے سامنے بظاہر کیا حقیقت رکھتا مگر وہ اس طرح فروکش تھا، جیسے اس کے سامنے کسی کی کوئی قیمت ہی نہ ہو۔ منصور نے اس دن کچھ لئے تمام عیادین سلطنت کو دعوت دی تھی۔ وہ سب بچہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نو سو گریباں صرف علماء و فضلاء کے لئے مختص کی گئی تھیں منصور نے ایک بار دربار پر اچھٹی نگاہ ڈالی اور قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم سے کہا۔

”تم ان سے کچھ پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو۔“

مجمع ایک تئیر میں دیکھنے لگا۔ کہاں گرگ باراں دیدہ بچی، کہاں یہ نوخیز جوان بلکہ جیسے مگر بچہ کس کا تھا اور اس کی حیثیت کیا تھی، وہ گہوارے میں بھی ہوتا تو بھی امام تھا۔ یحییٰ نے خاندان رسالت کے احترام کو ملحوظ رکھ کر امام سے مخاطب ہو کر کہا۔

”پوچھ سکتا ہوں کچھ۔۔۔؟“

”بسم اللہ۔۔۔“ امام نے فرمایا اور یحییٰ نے سوال کیا۔

”حالت احرام میں کوئی شکار کرے تو کیا حکم ہے اس کے لئے؟“

”سوال مبہم ہے۔ آپ نے فرمایا۔“ اس میں کئی باتیں صراحت طلب ہیں، شکار

حل میں تھا یا حرم میں، شکاری مسئلے سے واقف تھا یا نہیں، اس نے عہدِ جانور کو مار ڈالا یا دھوکے سے قتل ہو گیا، شکاری آزاد تھا یا غلام، گسن تھا یا بالغ، پہلی دفعہ ایسا کیا تھا یا اس سے قبل بھی کر چکا تھا۔ شکار پرندہ تھا یا کوئی اور جانور، شکاری کو اپنے فعل پر پشیمانی ہے یا نہیں، شکار رات میں چھپ کر کیا یا دن دھاڑے، احرام عمرے کا تھا یا حج کا؟

ان سوالات سے یحییٰ کے چہرے پر شکستگی کے آثار پیدا ہو گئے جس کو محسوس کر کے مامون نے اُمّام سے کہا۔

”آپ ان شقوں کے احکام بیان فرمائیے۔“

اُمّام نے ایک ایک شق کی تصریح کی پھر حکم بیان کیا۔ حاضرین دربار اور یحییٰ بن اکثم سب متحیر رہ گئے اور مامون نے اُمّام سے کہا۔

”آپ چاہیں تو قاضی سے سوال کر سکتے ہیں۔“

اُمّام نے یحییٰ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ، جس پر صبح ایک عورت حرام تھی، دن چڑھے حلال ہو گئی، ظہر کے وقت حرام تھی، عصر کے وقت پھر حلال ہو گئی، آدھی رات کو حرام تھی، صبح کو پھر حلال ہو گئی۔“

قاضی یحییٰ آٹا گھرا گیا کہ اس کے منہ سے آواز نکلنا مشکل ہو گئی۔ وہ نہایت

عاجزی سے بولا۔

”فرزندِ رسول۔ آپ ہی وضاحت فرمائیے۔“

آپ نے فرمایا۔

”وہ عورت کسی کی لونڈی تھی۔ صبح کو ایک اجنبی نے اس پر نظر ڈالی تو وہ حرام

تھی۔ دن چڑھے اس نے اس لونڈی کو خرید لیا تو حلال ہو گئی۔ ظہر کے وقت اس کو آزاد کر دیا تو حرام ہو گئی۔ عصر کے وقت اس نے اس سے نکاح کر لیا تو حلال ہو گئی۔ مغرب کے وقت اس سے ظہار کیا تو پھر حرام ہو گئی۔ غشاء کے وقت ظہار کا کفارہ دے دیا تو

تو حلال ہو گئی۔ آدھی رات کو طلاق رجعی دے دی تو حرام ہو گئی۔ صبح کو اس طلاق سے رجوع کر لیا تو پھر حلال ہو گئی۔“

مجمع اچھل پڑا اور مامون نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اُس وقت واقعی اس کی نیت خالص معلوم ہو رہی تھی۔

مورخین مامون کے سلسلے میں رطب اللسان ہیں لیکن یہ تعریف اگر کسی غیر مسلم حکمران کی حیثیت سے ہوتی تو جبر و ستم کی تمام داستانیں بھی گوارا ہو جاتیں لیکن غضب تو یہ تھا کہ وہ اپنے کو امیر المومنین کہتا اور رسول اللہ کی مسند خلافت پر بیٹھا ہوا تھا۔

مامون کے ہاتھوں اسلام کو جتنا نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہارون رشید نے اہل سنت والجماعت کا ایک حلقہ محنت کیا تھا مگر اس کو باقاعدہ شکل مامون نے دی اور امام ابو یوسف سے اپنے استاد ابو حنیفہ کے فتاویٰ مدون کرا کے اس کو فقہ حنیفہ کا نام دیا۔ اس کے علاوہ جو فقہ تھے، اس کا نام فقہ جعفر رکھ دیا۔ جب کہ یہی فقہ حضرت علیؑ کے دور سے چلی آ رہی تھی اور اس کا نام فقہ اسلام تھا، امام جعفر صادق سے منسوب کرنے کا محل ہی کیا تھا۔

ہر شخص کو اس نے اظہار خیال کی اتنی آزادی دی کہ اسلام پر بلا روک ٹوک حملے ہوئے اور فقہار سے ان کے جوابات بن نہ پڑے۔ انجام کار دہریت فروغ پانے لگی۔

مسلمانوں میں مسئلہ خلق قرآن پیدا کر کے اتنی الجھنیں پیدا کر دیں کہ آپس میں خون چمیر کی نوبت آ گئی۔

داصل بن عطا کا مذہب اعتزال اسلام اور مختلف النظریات عقائد کا امیر تھا جس میں مزوک و مانی کے بعض فلسفیانہ اصول بھی شامل تھے۔ مامون نے خود بھی اس کو قبول کیا اور سارے ملک میں اس کی اشاعت کے احکام جاری کئے۔ اکبر اعظم کا دین الہی شاید اسی کی بگڑی ہوئی شکل تھا مگر اکبر کے گریبان میں ہاتھ اس لئے ڈالا نہیں جاسکتا کہ اسلام کی مسند خلافت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا

وہ تو مادی دنیا کا ایک حکمراں تھا۔

اور ان سب پرستراذہ صرف بقائے حکومت کی خاطر اولاد رسول کا مسلسل قتل عام کسی طرح قابل معافی نہیں ہو سکتا۔

مأمون کی پالیسی پر ایک انتفاوی نظر ڈالی جائے تو اس کی حکومت کے راستے میں دو چیزیں حامل تھیں: اولاد رسول اور اسلام۔ اولاد رسول کو تو ہر فرمانروا نے تختہ مشق بنایا تھا۔ اسی طرح اس نے بھی بنایا لیکن اس کے وقت میں سادات عوام کو لے کر کرپلا کی تاسی پر اتر آئے تھے لہذا اس نے بیٹھی دینے کے بہانے اٹام وقت کو اپنی مشرقیانہ حراست میں لے لیا اور سادات کے قتل کا جو سلسلہ پہلے سے جاری تھا، اس کو اسی طرح جاری رکھا۔

رہ گیا اسلام، تو اس کو کمزور کرنے کے لئے حریت فکر کے نام پر اس نے کئی محاذ بنائے۔

پہلا محاذ واصل بن عطاء کے مسلک اعتزال کا تھا جس میں شیعی عقائد و فہم نظریات میں شامل کر کے، شیعی عقائد کی شکل بگاڑ دی تاکہ علوی انکار کے لوگ آزاد خیالی کے نام پر ادھر متوجہ ہو سکیں۔ مأمون خود اس مسلک کا سرپرست تھا۔ یہی کئی ادوار تک سرکاری مسلک رہا۔ اس کی براہ راست ضرب اس عقیدے پر پڑتی تھی جس کے علم بردار علی کے جانشین تھے۔

لیکن اس میں اس کو کامیابی کا پورا یقین نہ تھا لہذا اس نے اہل سنت والجماعت کے اس حلقے کو مضبوط کیا جس کا نام معاویہ نے تجویز کیا تھا مگر جس کی داغ بیل آگے چل کر منصور دوانیقی نے ڈالی تھی۔

امامت شیعوں کے اصول دین میں ہے اور ان کے عقیدے میں ہر نائب رسول امام ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ اس لئے منصور نے جب امام جعفر صادق کے خلاف علماء اور فقہاء کا محاذ بنایا تو ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کو امام اعظم اور عالم دہر کے خطایات دے کر اس شیعہ کا حاکم مقرر کیا اور امام

کا تقرر خدا کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح اس لفظ کی تخصیص خاندان رسالت سے ختم کرنے کی کوشش کی جس کے بعد امام مالک اور دوسرے امام ہو گئے اور زہری کے نام کے ساتھ بھی امام کا اضافہ ہو گیا۔

ان اماموں کی تقسیم کی جائے تو پہلی قسم وہ ہے جو محمدی ہے، دوسری قسم حکومت وقت کی — حکومت کے یہ امام اُس مسلک کے سربراہ تھے جس کا نام منصور نے رسمی طور پر اہل سنت والجماعت رکھا تھا۔ ہارون رشید نے جس کی پشت پناہی کی اور مامون اعظم نے امام ابو یوسف کی سربراہی میں جس کا باقاعدہ حکم بنا دیا۔ پھر خدا ساز اور انسان ساز اماموں کے دو مستقل حلقے قائم ہو گئے۔

آنحضرتؐ نے اسلام کا جو آئین حیات اور دستور العمل پیش کیا تھا اس کا مرکز محور اہل بیت تھے لیکن نیرنگ زمانہ سے انصام حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں آ پڑا، اُن میں سے کوئی اس پر تجربہ نہ رکھتا۔ اس لئے شروع میں تو خاندان رسالت اور موقر صحابہ کرام سے پوچھ گچھ کر کام چلا لیا گیا اور کہیں کہیں پر اپنے قیاس کو دخل دے کر احکام شرعی نافذ کر دیئے گئے لیکن یہ ضرورت اول دن سے محسوس کی گئی کہ اہل بیت کی محتاجی ختم ہونا چاہیئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر یہ تقاضا بڑھتا رہا مگر جب معاویہ بن ابی سفیان ترمیم شدہ مسلمان کی حیثیت سے خلیفہ وقت کے مقابل آکھڑے ہوئے تو انہوں نے اسلام میں بھی تسبیح و تہنیت کر دیا کیونکہ اب اصحاب نبیؐ کی اکثریت ختم ہو چکی تھی اور جو باقی تھے ان کی آنکھیں تلواریں کی چمک سے چکا چوند ہو رہی تھیں۔

حضرت معاویہ باضابطہ طور پر تو اسلام کو رسول کے گھر سے اپنے گھر نہ لا سکے مگر بنی عباس نے ان کے اس خواب کو پورا کر دکھایا اور نہ صرف اسلام کو بیت نبیؐ کی اجارہ داری سے باہر نکال لائے بلکہ خدا کے بخشے ہوئے منصب امامت کے سامنے اپنے بنائے ہوئے امام بھی لا کھڑے کئے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ امام دو تھے ایک محمدی، دوسرے حکومتی یا عوامی

حکومتی امام فقہ حنفیہ کا مبلغ تھا لہذا محمدی امام کی فقہ کا نام بھی کچھ ہونا ہی چاہیئے تھا۔ یہ مشکل بھی مامون نے حل کر دی اور اس کو امام جعفر صادق سے منسوب کر کے اس کا نام فقہ جعفری رکھ دیا۔

اسلام اور آل رسول پر یہ بڑی کاری ضرب تھی — حضرت معاویہ نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی کہ مسلمانوں کے دو مستقل دھڑے بنادیں مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سہرا بنی عباس بلکہ مامون اعظم کے سر پر بندھا اور اس کے بعد سے آج تک امامت کے دو گروہ اور فقہ اسلام کی دو شاخیں پائی جاتی ہیں۔ ایک امامیہ، دوسری اہل سنت والجماعت، پھر دوسری شاخ میں بہت سی شاخیں پیدا ہو گئیں۔ متوکل اور اس کے بعد سے فقہ حنفی سلاطین کی سرپرستی میں پھلتی پھولتی رہی اور عوامی امامت کے ذیل میں ناموں کا اضافہ ہوتا رہا۔ امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ، امام حافظ بن قیم، امام غزالی، امام فخر الدین رازی اور دوسرے ائمہ گزرتے رہے۔

فقہ اسلامی سے ایک فقہ منصور دوانیقی نے درآمد کی تھی تو بعد کے بعض ائمہ نے نظریاتی اختلافات کے تحت اپنی اپنی الگ فقہیں نکال لیں اور ان کے علیحدہ علیحدہ نام رکھ لئے، جیسے فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی۔ پھر ایک مسک محمد بن عبد الوہاب نجدی نے پیدا کیا جو دہابی کہلاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی ایک مستقل فقہ ہے جس پر امام ابن تیمیہ اور امام احمد بن حنبل کی چھاپ ہے۔ حنفی فقہ کو کسی ذہن کی پیداوار قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ وہ روایات کے اُس انبار سے نکالی گئی ہے جس کا ذخیرہ رحلت رسول کے بعد سے ہونے لگا تھا۔ اونی دور میں اس کی حیثیت اس خزانے کی ہو گئی تھی جس میں اصلی اور جعلی دونوں سے سمٹت سے بھرے ہوئے ہوں اور جعلی سے اس خوبصورتی سے ڈھالے گئے ہوں کہ اصلی سکوں سے ان کا امتیاز مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہو جائے۔

اس پر راہیوں کی بہتات کہ ثقہ اور غیر ثقہ کی تمیز آسان نہ رہی۔ پھر ستم

بالائے ستم یہ کہ روایتوں کا انتخاب کرانے والا اہل بیت کا کٹر دشمن تھا۔ نتیجے میں جو کچھ مرتب ہوا وہ بیشتر ایسا، جو تعلیمات علیؑ کے خلاف تھا۔ بعد کے لوگوں نے اسی سطح پر کھڑے ہو کر دیکھا اور وہ اس کو برحق سمجھتے رہے اور آج بھی برحق سمجھتے ہیں۔

یہ تو صرف وہ حالات تھے جن میں مقصدی طور پر تند دین فقہ ہوئی۔ ہمارا جہاں تک تعلق ہے، ہمیں تو کبھی چین سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ آئمہ کے دور تک اور اس کے بعد ایک طویل عرصے تک تو اکثر و بیشتر ترقیہ میں رہے۔ ۱۵ شعبان ۱۳۲۹ھ کو باب امامت قرب قیامت تک کے لئے بند ہو گیا، تب بھی یہ جرم باقی رہا کہ ہمارے دلوں میں علیؑ کی محبت ہے اور اس جرم میں ہم پر ظلم و ستم اسی طرح روا رکھا گیا جس طرح پہلے ہوتا رہا تھا۔

اب کوئی منصوص من اللہ امام بظاہر روئے زمین پر نہ تھا مگر جس طرح آئمہ کی تعلیمات باقی تھیں، اسی طرح آئمہ کی عداوت بھی۔ یہ عداوت اب کیوں تھی؟ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر وقت کے تدریجی ارتقا کے ساتھ علیؑ کی عداوت مجاہد علیؑ کی عداوت میں منتقل ہو گئی۔ تبرا اب بھی کیا جاتا مگر اب اس میں علیؑ اور اولاد علیؑ کی بجائے مجاہد علیؑ کے نام لئے جاتے۔ بغداد کے دربار خلافت اور غزنی کے درو دیوار جس کے گواہ ہیں۔ ہم پر مسلم سلاطین کے دور میں بھی لعنت کی گئی۔ صلاح الدین ایوبی اور اردبگ زریب عالمگیر کے زمانے جس کی شہادت دیں گے۔ ایسے میں ہمارے لئے اس ذخیرہ احادیث کا محفوظ رکھنا آسان نہ تھا جو علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کے برگزیدہ اصحاب ہمارے لئے چھوڑ گئے تھے۔

ہم ہر زمانے میں تلوار کی زد پر رہے، ہمارے گھروں کو نذر آتش کیا گیا اور بار بار اس روایتی مواد کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا جو ہمارے اسلاف جمع کرتے آئے تھے۔ پھر بھی خدا رحمت کرے ان صاحبان ایمان پر جو شمشیروں کی چھاؤں میں جہادِ تعلیم کرتے رہے اور ہماری دہری کے لئے ایک دینی سرمایہ چھوڑ گئے جو کلامِ الہی کے بعد

ماموں ستم زدگان کے ذہنی انقلاب کو سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ نبی کی مسندِ امامت پر جو بھی فائز ہو، وہ اس کے قابو میں رہے لہذا اس نے امام محمد تقیؑ کے ساتھ اپنی بیٹی شہزادی اُم الفضل کی شادی تجویز کر دی جو عیسا کی مرضی کے خلاف تھی مگر اس کی افادیت کو ماموں خوب جانتا تھا لہذا اس نے کبھی مخالفت کی پرواہ کئے بغیر عقد بھی کر دیا اور رخصتی بھی۔

عباسہ اور اُم حبیب تو نام کی دو دلہنیں تھیں لیکن اُم الفضل عملی طور پر امام کی رفیقہٴ حیات بن گئی۔ بغداد کا دارالامارہ جس کے ایک حصے میں قصر الحمر واقع تھا، اسی میں اُم الفضل کی پرورش ہوئی تھی اور اب وہ ایک بورئیشین سے بیاہ دی گئی تھی۔ یہ شادی کامیاب ہوئی یا نہیں؟ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ وہ محور ماموں کی دسترس سے دُور نہیں رہا جس کے گرو سادات کی بغاوت گردش کر سکتی تھی۔

یہ تدبیر کھلی دھمکتی عملیوں کی طرح تحصیل حاصل ثابت ہوئی کیونکہ امام نے گھردامادین کر رہنا قبول نہیں فرمایا، بغداد میں بھی علیحدہ مکان لے کر رہے پھر کچھ دنوں بعد مدینہ پہلے گئے۔ ایک دوسرا پہلو جس کے کامیاب ہونے کا پورا یقین تھا، اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ امام شہزادی کی زلف گرہ گیر کے اسیر بھی نہیں ہوئے۔ اس کا سبب شہزادی کی بد مزاجی کے علاوہ خود امام کے فرائض امامت بھی تھے، آپ کے عدل سے ایک قدم ہٹنے کا امکان ہی نہ تھا۔

شہزادی اُم الفضل کو بغداد کی ازدواجی زندگی میں کوئی شکایت نہیں ہوئی کیونکہ جب اس نے سراٹھایا، امام نے بڑی نرمی اور شفقت سے اس کو جھکایا مگر ایک سال بعد، جب امام محمد تقیؑ ماموں کی مرضی سے مدینہ گئے تو اُم الفضل وہ کر برا فروختہ ہوتی رہی مگر سادات محمدی کے علم بردار کی روش میں کوئی فرق نہ آیا۔ مدینہ کے قیام میں امام نے حضرت عمار یا سر کی نسل کی ایک لڑکی سے عقد فرمایا جو امام علی نقیؑ کی ماں ہوئیں۔ اس کی شکایت اُم الفضل نے ماموں کو لکھی مگر

مامون نے اپنی بے چادگی کا احساس کر کے اُم الفضل کو سمجھایا کہ اس کی خاطر حلال کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مامون کی اس وسیع النظری میں یہ راز بھی چھپا ہوا تھا کہ ملکی حالات سے وہ مطمئن نہ تھا اور یہ خطرہ بھی تھا کہ امام محمد تقیؑ سے بیٹی کا رشتہ کرنے کے بعد سادت کی طرف سے جو اطمینان ہوا تھا، وہ چھن نہ جائے، اس لئے وہ ایک باپ کی حیثیت سے اُم الفضل کو نصیحتیں کرتا رہا۔ — عمر کے اس حصے میں بناؤ توں کا تواتر بھی اس کے لئے فکر کا موجب تھا۔

مصر عبود کی بغاوت سے دوچار تھا۔ ۲۱۲ھ میں مامون نے خود جا کر اس کو سزا دی اور روم کی طرف پیش قدمی کی کیونکہ قیصر کی فوج نے شام و فلسطین کے علاقوں کو تہہ و بالا کر رکھا تھا۔ رومی لشکر نے اس سے شکستوں پر شکستیں کھائیں اور اسے چار قلعے فتح کر لئے۔

اسی دوران طرطوس کے قیام میں اس پر سردی کا اثر ہو گیا۔ چھوٹا بھائی اور دلی عہد معتمد اس کے ہمرکاب تھا۔ علاج معالجہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی مگر وقت آچکا تھا۔ پہلی رجب ۲۱۵ھ کو رقیہ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ۸۴ سال کی عمر میں بیس برس پانچ ماہ تیرہ دن حکومت کر کے وہ اپنے انجام کو پہنچا۔

ایک کامیاب و باجبروت حکمران، خیر و شر کا مجموعہ، عقل و دانش کا پیکر، تدبیر و سیاست کا دیوتا، جس کا نظریہ حکومت، مسک حکومت اور مذہب حکومت تھا۔ اس نے اس حکومت کو اتنا آراستہ و پیراستہ کر دیا تھا کہ خود اس کی کمزوریاں حکومت کی آب و تاب نے چھپا لی تھیں اور آج دور سے دیکھنے والوں کو اس کی ذات میں صرف افادیت اور اس کی شخصیت میں صرف دمک دکھائی دیتی ہے۔

مدینے میں امام محمد تقیؑ کے معمولات

آپ کی امامت کا دائرہ صرف شہر رسول تک محدود نہ تھا۔ زمین و آسمان، بری کائنات اس کے گھیرے میں تھی۔ اطراف و اکناف عالم کی ہدایت آپ کا منصب تھا

آپ اس کو انجام دیتے لیکن لوگوں کی مادی آنکھیں نہ دیکھ سکتیں۔ آپ جہاں چاہتے چشمِ زدن میں پہنچ جاتے۔ فضائے بسیط سمٹ کر آپ کے قدموں کو بوسہ دیتی یا زمین کی طنائیں کپنچ کر منزل کو آپ کے سامنے لے آتیں۔

اس سلسلے میں بہت سے معجزات ظہور پذیر ہوئے، جن کا ذخیرہ مختلف تذکرہ میں موجود ہے۔ ایک مرد مومن حماد بن عیسیٰ امیہ بن علی کے ساتھ کسی سفر پر جا رہے تھے۔ رخصت کے لئے خدمتِ امام میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ آج نہ جائیں۔ مگر وہ لوگ اپنا سامان تک اونٹوں پر بار کر چکے تھے، انہوں نے عذر کیا اور چلے گئے ایک وادی میں قیام کیا۔ وہاں رات میں ایک عظیم سیلاب آیا اور حماد کو بہا لے گیا۔ مدینے میں آپ کا رہن بہن وہی تھا جو اجداد کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔ شہنشاہِ وقت کی بیٹی گھر میں تھی مگر ڈیوڑھی پر نہ کوئی دربان، نہ آئینہ و روند پر کوئی روک ٹوک، نہ ترک و احتشام، نہ ملاقات کے لئے تعینِ اوقات، نہ ملنے والوں کے ساتھ برتاؤ میں کوئی تفریق۔ زیادہ تر نشست مسجد نبوی میں رہتی، جہاں عوام و غلط و ناصح سے استفادہ کرتے۔ طالبانِ علم زانوئے ادب تہہ کرتے، حدیثِ فقہ کے دلدادہ دو زانو بیٹھ کر مسائل پوچھتے اور طلبِ علم کا دامن بھر کر واپس ہوتے۔ مسدک پند و ہدایں کم عمری کے باوجود آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ امیر المومنین حضرت علیؑ کے بعد آپ کے اقوال کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔

جو کسی کو بڑا سمجھتا ہے، اس سے ڈرتا ہے۔

جس کی خواہشات زیادہ ہوں گی، اس کا جسم موٹا ہوگا۔

کتابِ حیاتِ مسلم کا سرِ پایہ حسنِ خلق ہے۔

انسان کی تمام خوبیوں کا مرکز زبان ہے۔

جو خدا کے بھروسے پر لوگوں سے بے نیاز ہو جائے، لوگ اس کے محتاج ہو گئے

ان اقوال کی تعداد کئی ہزار بتائی جاتی ہے اور محجزے بھی سیکڑوں کی

گنتی میں ہیں۔

معتصم باللہ بن ہارون رشید

معتصم نے مامون کے انتقال کے بعد رمضان ۲۱۸ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ ایرانی نظام حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ بات شروع ہی سے معتصم کو پسند نہ تھی۔ اس لئے معتصم نے ان کا دور توڑنے کے لئے ترکوں کو آگے بڑھایا جن کا اقتدار آہستہ آہستہ اتنا بڑھا کہ آگے چل کر حکومت کے لئے وبال بن گیا۔ معتصم کو زمام حکومت سنبھالتے ہی کئی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کو اُس نے با آسانی فرو کر دیا، پھر اس نے بابک خرمی پر توجہ کی، جس نے عہد مامون میں خودمختار کی تھی معتصم نے ترک جنرل افشین بن حیدر کو اس کے مقابلے کے لئے روانہ کیا، افشین نے کئی جنگوں کے بعد صلح کے بہانے اس کو گرفتار کر لیا اور وہ بغداد پہنچے پر قتل کر دیا گیا۔

طبرستان آرمینیہ اور دوسرے مقامات کی بغاوتیں بھی نے اسی طرح ختم کیں امام زین العابدین کی اولاد میں ایک بزرگ محمد بن قاسم تھے، نقیبہ و متقی عابد و زاہد، عموماً مسجد نبوی میں مصروف عبادت رہتے تھے۔ خراسان کے لوگ اپنی ہدایت کے لئے آپ کو مدینے سے لے آئے جو زجان میں آپ کے ارادتمندوں کا ایک بڑا حلقہ ہو گیا۔ عبداللہ بن طاہر نے بغاوت کے شبہ پر حملہ کر دیا۔ حامیان اہل بڑی جو انہر دی سے لڑے، پھر طالقان کی پہاڑیوں میں عباسیوں کا مقابلہ کیا۔

ان کی تعداد کم نہ تھی مگر سب غیر تربیت یافتہ اور رموز جنگ سے ناواقف، انہیں شکست ہوئی اور محمد بن قاسم قید کر کے بغداد بھیج دیئے گئے جہاں معتصم نے زندان میں ڈال دیا لیکن وہ ایک دن فرار ہو گئے۔ آپ ۲۱۹ھ سے متوکل کے زمانے تک روپوش رہے، پھر قید کر لئے گئے اور قید ہی میں انتقال کیا۔

اسی طرح کے ایک بزرگ جعفر طیار کی اولاد میں جناب عبداللہ تھے، آپ نے عباسی حکومت کا سیاہ لباس پہننے سے انکار کر دیا تھا لہذا قید کر لئے گئے اور زندان ہی میں مر گئے۔

امام کی گرفتاری اور شہادت

مدینے میں ساڑھے سات سال کے قیام میں آپ بڑی یکسوئی سے فیضانِ عام کرتے رہے، عراق، یمن، حضرموت، الجزائر، شام اور مصر تک سے لوگ آتے، علم و فضل کے خزانے لے کر جاتے اور اپنے قبائل کو ستیفین کرتے، دھیرے دھیرے آنے والوں کی تعداد بڑھ گئی اور حج کے زلمے میں تو اتنا اضافہ ہوا تا کہ بعض دن مسجد نبویؐ بھر جاتی۔

یہ عہد ماموں کی بہت مصروفیات کا تھا، بالخصوص عمر کے آخری کئی سال تو اس نے بغداد کے باہری کاٹے، ام الفضل اس زلمے میں بھی امّام کی شکایتیں لکھ کر باپ کو بھیجتی رہی مگر وہ کوئی توجہ نہ کر سکا۔ شاید اس کا منتظر ہو کہ سکون سے بغداد جا کر بیٹھے تو امّام کو بلا کر ان سے بات چیت کرے مگر اس کو موت نے مہلت ہی نہ دی اور اس کے انتقال پر بد نصیب ام الفضل چچا کو لکھنے لگی۔

مقتسم شروع ہی سے بھائی کی اس پالیسی کا مخالف تھا پھر بھی اس نے اچانک امام محمد تقیؑ کو گرفتار نہیں کرایا بلکہ عاملِ مدینہ کو زور ڈال کر بغداد بھیجنے کی تاکید کی۔ امام رضاؑ بھی اسی طرح بلائے گئے تھے۔ امام محمد تقیؑ نے پانچ چھ سال کے بیٹے امام محمد تقیؑ کو اپنا وصی اور خلیفہ مقرر کیا، انہیں علومِ الہی تعلیم فرمائے آثارِ رسالت پناہی حوالے کئے۔ ام الفضل کو لے کر مدینے سے روانہ ہوئے اور عمر ۲۲ھ کو بغداد پہنچ گئے۔

مقتسم کی مخالفت کے اسباب میں اس کا ذاتی غنا و اور ام الفضل کی لگائی بھائی دونوں شامل تھیں۔ یہ بد نہاد عورت خالص دنیاوی مرد کی فریفتگی چاہتی تھی لیکن حضرت علیؑ کے سجادہٴ ولایت کا وارث عدلِ محمدی کا پابند تھا۔ اور خانہ داری اور ازدواجی زندگی میں، بزرگوں نے اپنی بیویوں کو جن حدود میں رکھا تھا، ام الفضل بھی وہیں رکھی گئی، جس کو اس کے شانہٴ عز و ر نے اپنی توہین قرار دیا اور وہ محبت

کرنے کے بجائے آپ کی دشمن ہو گئی۔

قیام بغداد میں مقتسم نے آپ سے کوئی ظاہری بد اخلاقی نہیں کی اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ قید کر کے تکلیفیں پہنچائیں پھر رہا کر دیا۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن جب مقتسم نے زہر آلود مشربت آپ کو پینے کے لئے بھیجا تو مقتسم سے آپ کے تعلقات خوشگوار تھے۔ آپ نے غلام سے فرمایا کہ شب میں پی لوں گا مگر وہ مہر ہو گیا کہ مجھے اپنے سامنے پلا دینے کی تاکید کی ہے۔ آپ نے پی لیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس سازش میں ام الفضل بھی شریک تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے خود مقتسم کے کہنے سے زہر ملا یا سٹھا۔

بہر طور زہر آلود مشربت آپ نے نوش فرمایا اور اس سے ۲۹ ذی قعدہ ۲۲۵ھ کو ۲۵ سال، ۳ ماہ ۱۲ دن کی عمر میں آپ کی موت واقع ہوئی۔

امام علی نقیؑ کو علم غیب سے اس کی خبر ہو گئی تھی۔ آپ اعجازِ امامت سے تشریف لائے، اپنے ہاتھوں سے غسل و کفن دیا اور امام موسیٰ کاظمؑ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا۔ — کاظمین کا موجودہ روضہ شاہ اسمعیل صفوی نے تعمیر کرایا، اور محمد شاہ قاجار نے اس کو مزین کیا۔

ام الفضل مقتسم کے پاس چلی گئی۔ اس کے اندرونی حصے میں ناسور ہو گیا تھا اور انجام کار وہ دیوانی ہو کر لاؤ لد فوت ہوئی۔

دولط کے اور دولٹکیاں امام نے یادگار چھوڑیں حضرت امام محمد تقیؑ، جناب موسیٰ مہر ق، جناب قاسم، جناب امامہ یا حکیمہ

دسویں امام

امیر المومنین حضرت امام علی نقی علیہ السلام

۲۹ ذی قعدہ ۲۲۲ھ تا ۵ رجب ۲۵۴ھ

مولد و مکن

آپ کا مولد بھی مدینہ تھا۔ آپ ۵ رجب ۲۱۴ھ کو پیدا ہوئے معجز نمائی کا سلسلہ دوسرے ائمہ کی طرح بطن مادر سے شروع ہو گیا تھا۔ اندازِ ولادت بھی وہی تھا اور آدل دن سے آپ ولی اللہ کے پوتے اور رسول کے مندرشتین معلوم ہوتے تھے۔

امام محمد تقیؑ کی بغداد روانگی کے وقت آپ کی عمر صرف ساڑھے پانچ سال تھی اور طرزِ روانگی مستقیل کو آئینہ کر رہا تھا مگر آپ نے تحمل کو ہاتھ سے نہ دیا اور سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی پدر گرامی کو اس طرح رخصت کر دیا جیسے آپ دوش طفلی پر ہر بوجھ اٹھانے کو تیار ہوں۔

دس گیارہ مہینے کے بعد ساڑھے چھ سات سال کی عمر میں آپ کی امامت کا آغاز ہوا، آپ جسمانی طور پر بالغ بھی نہ ہوئے ہوں گے لیکن منصبِ روحانی میں انسانوں کے ساتھ جن و ملک بھی آپ کے تابع تھے۔

حکومت نے کم سنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عبداللہ جنیدی کو آپ کی تعلیم پر مامور کر دیا، صرف یہ دکھانے کے لئے کہ امام کو علم لدنی نہیں ہوتا، امام کو جبریہ تعلیم کے لئے قصر صبار میں منتقل کر دیا گیا، دن کو کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ رات میں

قصر کا دروازہ بند کر دیا جاتا مگر یہ ساری کوششیں بیکار گئیں۔ دشمن آل محمد حنفیہ نے خود کہہ دیا کہ وہ اس کم سنی میں مجھ سے زائد علم رکھتے ہیں۔ میں کچھ بتانا چاہتا ہوں تو میرے بولنے سے قبل خود بیان کرنے لگتے ہیں۔ وہ حافظاتِ ران ہی نہیں دلیلِ تنزیل کو بھی جانتے ہیں۔ سفارتِ الہیہ کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا درکار تھا۔ مگر دل کے اندھے اس کے بعد بھی منصوص من اللہ ماننے پر تیار نہیں۔

مامون رشید کے عہد میں آپ کی ولادت ہوئی تھی، مقتضی کے دور میں امت پائی، پھر واثق کا زمانہ اصل خیر سے گزر گیا اور آپ سے کوئی تعرض نہ ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خلفاء خود اپنی الجھنوں میں مبتلا رہے۔

مقتضی کا جنگی دور حکومت

مقتضی نے اپنی حکومت میں جہاں ترکوں کو دخیل کیا تھا وہاں بغداد کے بجائے مرو کو دار الخلافہ بنالیا تھا۔ اسی مقام پر اس نے ڈھائی لاکھ فوجیوں کے لئے بیرکیں بھی بنوائی تھیں۔

وہ ابھی بابک خرمی کے قصبے سے فارغ ہوا تھا کہ رومی ملحقِ اسلامی علاقوں میں درائے اور دہاں انہوں نے بے پناہ مظالم ڈھائے۔ مقتضی بذاتِ خود مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے ہراول نے قیصر تھیفونیس کو غیرتِ ناک شکست دی۔ اس کی جائے پیدائش اموریہ کو ایک طویل محاصرے کے بعد فتح کیا اور شہر کو مسمار کر دیا۔ اسی دوران عباس بن ہارون نے اس کے خلاف سازش کی اور مقتضی نے سامرہ واپس آگیا اس کا قلع قمع کیا۔

۲۲۲ھ میں طبرستان کے ایک مجوسی شہزادے فریاد نے بغاوت کی جس میں افشین کی سازش پائی گئی، فریاد قتل ہوا اور افشین قید کر دیا گیا جو قید خانے ہی میں جاں بحق ہو گیا۔

اس کے بعد مقتضی خود ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۹ ربیعِ اولال ۲۲۴ھ کو انتقال کر گیا۔

وَالْتَقَىٰ بِاللَّهِ بْنِ مِقْصَمٍ

والتق ۳۲۴ھ میں باپ کے مرنے پر تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی ترکوں کو عزت
اور ایرانیوں پر ترجیح دی۔ عقیدے کے لحاظ سے مامون و مقتصم کی طرح وہ بھی معتزلی
تھا اور واصل بن عطا کا پیرو۔ اس نے بھی اپنے دونوں پیش روؤں کی طرح
معتزلی مسلک کی ترویج کے لئے کوشش کی، رؤسہ خلق قرآن اور نظریہ رویت
باری کو اہمیت دی۔

علماء پہلے کی طرح اب بھی سامنے آکر کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے مگر درپردہ
خلیفہ کی مذمت کرتے تھے جو عوامی ذہن کے لئے تباہی بخش تھا۔

”اس نے بھی سائنس، لٹریچر، صنعت و حرفت اور تجارت کو
فروغ دیا۔ علمی چاشنی کے سبب وہ راگ میں دستگاہ کامل رکھتا
تھا۔ اس نے ایک سو راگ اور ارگنیاں ترتیب دی ہیں۔ اس کی
خیرات کی کوئی حد نہ تھی۔ اس کے عہد معدت گستر میں سلطنت میں
ایک بھی بھیگ منگنا نہ تھا۔ اس نے یونانیوں سے ایک بڑے چیلنے

پر قیدیوں کا تبادلہ کیا“ (۱۱۳)

۳۴ ذی الحجہ ۳۳۲ھ کو سامرہ میں والتق کا انتقال ہو گیا۔ حکومت
کی گرفت اس کے دور سے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس نے سادات یا کسی اور پر کوئی تشدد
نہیں کیا۔

مَنْوُكُلُ بْنُ مِقْصَمٍ

اراکین سلطنت کا خیال تھا کہ والتق کے بعد اس کے خرو سال بیٹے کو تخت
پر بٹھایا جائے لیکن ترکوں نے مخالفت کی اور والتق کے بھائی جعفر کو المتوکل باللہ
کا خطاب دے کر خلیفہ بنا دیا۔ اس نے سلطنت عباسیہ کی تاریخ کا آخری باب
سادات کے خون سے قلم بند کیا اور غیر مسلموں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔
متوکل کو شراب و شباب سے خاص دلچسپی تھی۔ رات کا بیشتر حصہ وہ

انھیں مشاغل میں گزارتا اور دن معترلیوں کی سرکوبی میں بسر کرتا۔ مسک اعترال سے اس کو اذلی دشمنی تھی اور حنفی فقہ کا سخت حمایتی۔ اس فقہ کی بنیاد کا سہرا منھو دو انیقی، ہارون رشید اور مامون رشید کے سر بند تھا ہے لیکن اس کا نفاذ پہلے پہل متوکل ہی نے کرایا۔

اعترال کو اس نے غیر قانونی قرار دیا۔ معترلیوں کو سرکاری عہدوں سے برطرف کر دیا۔ سائنس اور فلسفے کی تقریروں پر پابندی لگا دی اور بڑے بڑے معترلیوں کو قید خانے میں ڈال دیا۔ غیر مسلم بھی اسی تعریف میں تھے۔
 واثق کے وزیر ابن الزیات کو اس نے قتل کرادیا، کیونکہ متوکل جب بادشاہ نہیں تھا تو ابن الزیات نے اس کی تعظیم نہیں کی تھی۔ آل زہرا کا باغ فدک اس نے پھر ضبط کر لیا اور سادات کئی کے کھلے احکام ممالک محروسہ کو بھیج دیئے۔

امام علی نقیؑ: ایک معجز نما اور عالم غیب

ایک دن امام علی نقیؑ، علی بن حصیب کے ساتھ چل رہے تھے۔ ابن حصیب نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا کہ ذرا تیز قدم اٹھائیے۔ امام نے فرمایا۔
 ”آگے بڑھو، تمہیں پہلے جانا ہے۔“

اس واقعہ کے چار روز بعد ابن حصیب چل بسے۔

یہی بن زکریا کا بیان ہے کہ میں نے امام علی نقیؑ کو لکھا۔

”میری بیوی حاملہ ہے، دعا فرمائی کہ لڑکا پیدا ہو۔“

”و بعض لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ہوتی ہیں۔“ امام نے جواب دیا اور

یہی کے گھر میں لڑکی ہی پیدا ہوئی۔

۳۳۲ھ میں ایک دن ترکوں کی فوج قریب سے گزر رہی تھی۔ امام علی نقیؑ

ابو ہشام کے ساتھ انہیں دیکھنے تشریف لے گئے اور قریب سے گزرتے ہوئے

غلام ترکی سے اس کی زبان میں کچھ کہا۔ وہ رک گیا اور دیر تک باتیں کرتا رہا، پھر

قدم چومنے کے لئے جھک گیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کس بات نے تجھے امام کا گرویدہ بنالیا؟ وہ بولا۔
 ”آپ نے مجھے اس نام سے مخاطب کیا جس کا جاننے والا میرے باپ کے
 سوا کوئی نہیں تھا۔“

امام دنیا کی ہرزبان سے واقف تھے۔ ایک دن ابو ہاشم سے ٹھٹھ ہندی میں
 بات کی تو وہ حیرت سے آپ کا منہ دیکھنے لگے۔

امام نے پتھر کی ایک کنکری اٹھا کر پہلے اپنے منہ میں رکھی، پھر ابو ہاشم کے
 منہ میں دے دی جس کے بعد ابو ہاشم تھتر زبانوں کے عالم بن گئے۔

ایک دن ابو ہاشم کی تنگ دستی دور کرنے کے لئے ایک مٹھی ریت اٹھا کر
 ابو ہاشم کے دامن میں ڈال دی، انھوں نے نظر جھکا کر دیکھا تو ریت کے بجائے
 خالص سونا تھا جو بازار میں اچھے داموں فروخت ہو گیا۔

والثق کا ایک منہ چڑھا رفیق اسباطی عراق سے مدینے پہنچا تو امام علی
 نقیؑ کے سلام کو حاضر ہوا۔ آپ نے والثق کا حال دریافت کیا تو اس نے کہا۔
 ”بخربت چھوڑ کر آیا ہوں“

”لوگ کہتے ہیں کہ وہ فوت ہو گیا۔“ امام نے فرمایا پھر لوچھا۔

”اور ابن الزیات —؟“

”اچھا ہے —“ اسباطی نے بتایا اور امام نے فرمایا۔

”حکم خدا کو کوئی مال نہیں سکتا۔ والثق کا انتقال ہو گیا۔ متوکل خلیفہ
 ہو گیا۔ اس نے ابن الزیات کو قتل کر دیا۔“

کچھ دنوں بعد متوکل کا قاصد مدینے آیا تو ان واقعات کی تصدیق ہو گئی۔
 بحیثیت مجموعی آپ تیم نواز، عزیز پرور، صابر و متحمل، زاہد و متقی، سخی و
 حلیم اور ایک پیکرِ رشد و ہدایت تھے۔ غیب جن کی نظروں میں شہود اور اسرار
 کائنات مثل موجود تھے۔ جلالت یہ سخی کہ جابر فرماں روا آپ کے قتل پر تیار ہوتا
 مگر جب آپ پہنچتے تو اٹھ کر تعظیم کرتا تھا۔

آپ کے اقوال اسلام کا گراں مایہ ذخیرہ ہیں اور بعض فرمودات تو آپ سے مختص ہیں۔ آپ نے سال کے چار روزوں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ پہلا روزہ یوم ولادت پیغمبرؐ، اربع الاول، دوسرا یوم بعثت و معراج، ۲۷ رجب، تیسرا ۲۵ ذی قعد جس دن کہنے کے نیچے زمین بچھائی گئی اور سفینہ نوح کوہِ جودی پر ٹھہرا، چوتھا یوم غدیر ۱۸ ذی الحج۔

متوکل کے کارنامے

مامون اعظم کی وسیع سلطنت سامرہ کی طرف سمتی آرہی تھی۔ طاہر بن عبداللہ خراسان میں حکومت طاہریہ کی بنیاد ڈال چکا تھا۔ سجستان پر یعقوب بن لیث کا قبضہ ہو چکا اور ولسی حکومت کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتیں رونما ہو رہی تھیں خود متوکل جاہل ترکوں کی مدد سے برسرِ اقتدار آیا تھا لہذا وہ ان کے ہاتھوں میں کھڑپتی تھا پھر بھی صبح کا ناشتہ بے گناہوں کے خون سے کرتا اور راتِ رقصِ سہل کا تماشا دیکھ کر سوتا تھا — سوتا نہیں تھا بلکہ غرقِ مے ناب ہو جاتا تھا۔

حکومت کے ابتدائی چار پانچ برسوں میں اس نے مخالفین کی قبریں زمین کے برابر کرادیں۔ غیر مسلموں کے لئے حکم جاری کیا کہ زنا، باندھ کر گھروں سے باہر نکلیں تاکہ مسلمانوں سے ان کا امتیاز ہو سکے۔ عورتیں بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ پھر اولادِ رسول کا صفایا شروع کیا اور سارے ملک میں اچانک منصور کے دور کا اعادہ ہونے لگا۔

امام علی نقیؑ مدینے میں ایک اگلی تھلک زندگی گزار رہے تھے لیکن اس نے آپ کو بھی معاف نہیں کیا اور یحییٰ بن ہرثمہ کو ایک دستہ فوج کے ساتھ مدینے بھیج دیا جو آپ کو مسجد میں اپنی نگرانی میں مدینے سے سامرہ لے آیا اور آپ شہر کے غلیظ ترین علاقے میں ٹھہرا دیئے گئے۔ جہاں چار پانچ سال کے امام حسن عسکریؑ کو بھی آپ کے ساتھ رہنا پڑا۔

متوکل نے تین روز بعد اپنے مہمان کو روحی النسل سردار فوج زراقی کے سپرد کر دیا جو اس کا معتمد اور انتہائی ظالم و بد مزاج آدمی تھا مگر آپ رحمت الہی کے نمائندے اور محاسن اخلاق کے پیکر تھے۔ زراقی نے شب و روز آپ کی عبادت کا منظر دیکھا تو شقاوتِ قلب کمزور پڑ گئی۔

متوکل کو جب آپ کے ساتھ نرم برتاؤ کی اطلاع ملی تو اس نے آپ کو سعید کی حراست میں دے دیا جو قسبی القلب اور بے رحمی میں خشک لکڑی کی طرح تھا جس پر بارانِ رحمت کیا، موسلا دھار بارش کا اثر بھی نہ ہو سکتا۔ اس نے آپ کے ساتھ ہر ظلم روا رکھا اور متوکل کی ہدایات پر پورا عمل کرتا رہا۔

متوکل کا عہد سادات کے لئے پچھلے تمام ادوار سے زیادہ سخت تھا۔ اس کے زمانے میں تو کسی پر محب اہل بیت ہونے کا ثبوت بھی ہو جاتا تو اس کی گردن اڑا دی جاتی تھی مگر اس پر بھی لوگ امام کی خدمت میں حاضری دیتے اور سزا یاب ہونے کو سعادتِ دارین تصور کرتے۔

متوکل کا وزیر فتح ابن خاقان چھپا ہوا شیعہ علی تھا۔ اس نے متوکل کو مشورہ دیا کہ نواحِ شہر کی خالی زمینیں مشرفار کے ہاتھ فروخت کر دی جائیں تاکہ وہ ان پر مکانات تعمیر کرالیں۔ اس سے حکومت کو مالی فائدہ بھی ہو گا اور شہر کی رونق بھی بڑھ جائے گی۔ متوکل کی سمجھ میں آگیا، پھر خاقان نے زمین کا ایک ٹکڑا امام کو بھی دے دیا، جس پر آپ نے مکان بنوایا۔ فتح نے غیر جانبدار رہ کر امام کو اس میں رہنے کی اجازت دلوادی تاہم سعید کی نگرانی جاری رہی۔

امام کے مکان کے متصل ایک دشمن آلِ رسول عمر بن الحنفیہ کی زمین تھی جو آئے دن آپ کو پریشان کرتا رہتا تھا اور مکان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور کرتا تھا۔ ایک دزدہ گھر میں گھس کر آپ کو نکال دینے پر آمادہ ہو گیا تو آپ نے بڑی نرمی کے ساتھ اس سے فرمایا:-

”دو روزہ زندگی میں ایک غریب ہمسائے کو کیوں ستاتے ہو۔۔۔“

اس نے تکرار کی اور آپ نے زور دیتے ہوئے فرمایا۔

”ہاں — دو روزہ!“

وہی ہوا کہ دو دن بعد وہ خراجِ شام کے غبن میں پکڑا گیا، شکبے میں کس کر جلتی زمین پر ڈال دیا گیا اور اسی حالت میں مر گیا۔

متوکل چاہتا تھا کہ راہ کا یہ کاٹنا اس کی راست مداخلت کے بغیر نکل جائے اسی لئے اس نے سعید کو آپ کے پیچھے لگا دیا تھا اور خود بظاہر ایسا سلوک کرتا، گویا اس کو امام سے کوئی خاص پر خاش ہی نہ ہو۔ وہ اکثر آپ کو بلواتا تھا اور تھوڑی دیر بٹھا کر رخصت کر دیتا تھا۔

محل کے صحن میں ایک طرف بطخیں پللی ہوئی تھیں، کوئی نیا آدمی جب آتا تو وہ چیخنے لگتی تھیں لیکن جب امام تشریف لے گئے تو کوئی آواز نکالنے کے بجائے سرنگول ہو گئیں۔ جتنی دیر آپ وہاں رہے، وہ بالکل خاموش رہیں۔ اس کے بعد پھر معمول پر آگئیں۔

احمد بن عیسیٰ نے ایک خواب میں دیکھا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے ایک مٹھی میں پچیس خرے اٹھا کر دیئے۔ امامؑ کے سامرہ پہنچنے پر وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ کے سامنے ایک طشت میں خرے رکھے ہوئے تھے آپؐ نے ایک مٹھی خرے اس کو غایت فرمائے۔ اس نے گئے تو پچیس تھے۔ احمد بن عیسیٰ نے کہا۔

”مولیٰ۔ کچھ خرے اور بھی مل سکتے ہیں؟“

”میرے جد نے اس سے زیادہ دیئے ہوتے تو میں بھی دے دیتا“ آپؐ نے مسکرا کر فرمایا اور احمد حیرت میں پڑ گیا کہ امامؑ کو خواب تک کا حال معلوم ہوتا ہے۔

متوکل کا اسلامی دربار

یوں تو ہر عباسی خلیفہ عزت رسولؐ کا جانی دشمن بالیکن دو کو خصوصیت حاصل ہے۔ پہلا ابو جعفر منصور، دوسرا متوکل۔ اس کو امیر المومنین حضرت علیؑ سے اتنی عداوت

تھی کہ دربار میں جگہ انہیں کو دیتا جو آلِ فاطمہ کے خون کے پیاسے ہوں۔ ان لوگوں میں شاعر ابو جہم، عمر بن فرج، ابو الخط، ابن اترجہ، ابو الجبر بہت ممتاز لوگ تھے جو کریلے کی بیل کو نیم پر چڑھاتے رہتے اور متوکل سے کہتے رہتے کہ سادات میں سے جب تک ایک بھی باقی ہے، سلطنت عباسیہ محفوظ نہیں۔

انجام کار، متوکل کو لہو و لعیب سے جو وقت ملا، وہ اولادِ رسول کو ملیا۔ مسٹ کرنے میں صرف کر دیتا۔ اس کو سلاطین ماسبق کی طرح موسیقی میں بھی کچھ دخل تھا۔ لہذا دربار میں رقص و سرود کا وظیفہ جاری رہتا۔

۲۳ء میں ایک دن مدہوشی میں اس نے اُس مغینہ کا نام لیا جو اس کو بہت پسند تھی مغینہ بعض درباریوں سے اجازت لے کر گئی تھی۔ انہوں نے متوکل کو بہلانے کی کوشش کی اور دوسری مغینہ بھالی مگر متوکل نہ مانا۔ اتنے میں وہ مغینہ آگئی اور متوکل نے اس سے سوال کر دیا۔

”کہاں گئی تھی —؟“

”جج کرنے گئی تھی —“ اس نے جواب دیا۔

”ماہِ شعبان میں جج —؟“ رند خرد مند چونکتے ہوئے بولا، اور مغینہ نے سچی بات کہہ ڈالی۔

”قبرا ماتم حسین کی زیارت کرنے گئی تھی —“

متوکل نے غضب ناک ہو کر اس کو قید کر دیا اور اس کا سارا مال و متاع ضبط کر لیا پھر خنادی کرائی کہ جو کربلا کی زیارت کو جائے گا، وہ گرفتار کر لیا جائے گا — جابر خلیفہ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک سردار قاسم بن احمد کو بلا کر حکم دیا۔

”کچھ لوگوں کو لے جا کر قبر حسین کا نشان مٹا دو اور زمین کو ہل چلو اگر برابر کر دو“

قاسم صرف حکم کا بندہ تھا۔ وہ فوراً کربلا پہنچ گیا مگر مسلمانوں نے اس کام

کے لئے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً اس نے یہودیوں سے مدد لی۔
 کہا جاتا ہے کہ جانور جوہل میں جوتے گئے تھے وہ تھوڑی دُور تو چلتے مگر قبر
 کے قریب پہنچ کر رک جاتے۔ سردار نے ان پر منظرِ بر سوائے تو جانور قبر کی سمت
 جانے کے بجائے دوسری طرف نکل گئے۔ اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد متوکل
 شقی کا کارندہ سوچتا رہا اور دریا سے پانی کی مالی بنوا کر قبر کی طرف لے آیا لیکن
 پانی قریب پہنچ کر رک گیا اور ادھر ادھر کھٹ کر بہنے لگا۔
 اس آثار میں اس کی خبر نواح میں پھیل گئی اور چاروں طرف کے مسلمان
 کربلا میں جمع ہو گئے۔

متوکل کا یہ حکم بھی تھا کہ آئندہ کوئی قبر حُثین کی زیارت نہ کرے۔ عقیقت
 مندوں نے اس حکم کو نہ مانا اور متوکل کے امیر لشکر سے کہا کہ وہ ایک ایک آدمی
 کو قتل بھی کر دے گا تب بھی زیارت کا سلسلہ بند نہ ہوگا۔ اس نے سارا واقعہ متوکل
 سے جا کر بیان کر دیا اور وقتی طور پر وہ غصے کو پی گیا مگر دل ہی دل میں عزم کر لیا کہ
 پہلے اس عقیقت کے زور کو گھٹائے گا تب اپنے منصوبے پر عمل کرے گا۔

بعض روایات کے مطابق یہ واقعہ امام علیؑ کے سامرہ پہنچنے سے قبل کا
 ہے پھر بھی امام اپنے علم لدنی کے ذریعہ اس سے باخبر تھے بلکہ متوکل ان کے بارے
 میں جو کچھ سوچتا تھا وہ بھی آپ سے چھپا نہ تھا تاہم آپ پابندِ مشیت تھے، آپ کو
 بہر حال مرضی الہی پر چلنا تھا۔

سابقہ درباروں کی طرح فقہاء و متوکل کے دربار کی بھی زینت تھے مگر اب
 فقیہوں کی ایک خاص قسم ہی اس کے گرد جمع رہتی جن کو وہ حنفی کہتا تھا اور وہی
 اس کے ہر عمل کے فتوے دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے متوکل کو زہر دے دیا۔
 اس نے منت مانی کہ اگر بچ گیا تو مالِ کثیر خیرات کرے گا۔ اتفاق سے وہ بچ گیا
 اور اس نے علماء سے دریافت کیا کہ مالِ کثیر کتنا ہوتا ہے؟

کسی نے ایک ہزار، کسی نے دس ہزار، کسی نے ایک لاکھ درہم بتائے اور متوکل

محضے میں پڑ گیا کہ واقعی مال کثیر کتنا ہوتا ہے؟ حسن نامی ایک دربان نے اس کو پریشان دیکھ کر کہا کہ اس کو اجازت ہو تو صبح جواب لا دے۔ متوکل نے کہا کہ جواب تشفی بخش ہو تو دس ہزار درہم دے گا ورنہ سو کوڑے لگوائے گا۔ غلام کے دل پر امام علی نقیؑ کی عظمت کا سنگ بٹھا ہوا تھا۔ اس نے متوکل کی شرط منظور کر لی اور دوڑ کر امام کی خدمت میں پہنچ گیا۔ امام اس کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”مال کثیر کی تفصیل پوچھنے آیا ہے، جا، متوکل سے کہہ دے مال کثیر اتنی درہم ہوتا ہے“
اس نے متوکل کو بتایا تو متوکل نے دلیل طلب کی۔ وہ پھر پلٹ کر آیا تو امام نے فرمایا۔

”قرآن مجید میں کہا گیا ہے۔ رسول! اللہ نے تمہاری مدد موطن کثیرہ پر کی ہے اور یہ موطن کثیرہ کتنی میں اتنی ہوتے ہیں، لہذا کثیرہ کا اطلاق اتنی پر ہوتا ہے، وہ جہاں جہاں بھی استعمال ہو“
متوکل مطمئن ہو گیا۔ اس نے اتنی درہم خیرات کر دیئے اور دس ہزار درہم دربان کو عطا کر دیئے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ دربار میں بھی پیش آیا۔ ایک نصرانی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کرتا ہوا پکڑا گیا۔ حد سے بچنے کے لئے اس نے اتنے ہی اسلام قبول کر لیا اور قاضی یحییٰ بن اکثم نے چھوڑ دیئے کا فتویٰ دے دیا۔ دوسرے فقیہ نے حد جاری کرنے کا حکم لگایا۔ فقہاء میں اختلاف ہوا تو متوکل نے امام سے رجوع کیا۔ آپ نے جواباً لکھ کر دیا۔

”اتنا مازنا چاہیئے کہ وہ مرجائے۔“

یحییٰ بن اکثم اور دوسرے فقیہوں نے کہا۔

”ایسا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے۔“

بات امام تک پہنچی تو آپ نے آیت تحریر فرمائی۔

”جب کافروں نے ہماری سختی دیکھی تو کہا، ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اپنے کفر سے توبہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ان کے لئے مفید نہ ہوا اور نہ ایمان لانا کام آیا۔“

اس آیت نے علماء کا بھی منہ بند کر دیا اور متوکل نے نصرانی کے لئے وہی عمل کیا جو امام نے لکھا تھا اور ایسے کاموں سے تو اس کے ذوق کی تسکین بھی ہوتی تھی۔

متوکل وقتاً فوقتاً امام کو ذلیل کرنے کے لئے دربار میں بلواتا تھا مگر اس کو کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک بار اس نے اپنے درباری شاعر ابن سکیت سے بعض سوالات کرائے جن کے جوابات امام علی نقیؑ نے دے دیئے۔ اس پر یحییٰ بن اکثم نے ایک پرچہ امام کے ہاتھ میں دے دیا۔ جس پر وہ گھر سے کئی سوال لکھ لایا تھا۔ امام نے ہر سوال کے نیچے اس کا جواب لکھ دیا۔

ایک سوال تھا: ”قرآن میں سبعة البحار (سات دریاؤں) اور کلمات اللہ سے کیا مراد ہے؟“
آپ نے تحریر فرمایا۔ عین الکبریت، عین الیمین، عین البرہوت، عین الطبریۃ عین السیدان، عین الافریقہ اور عین الیا حوران۔ کلمات اللہ سے ہم محمد و آل محمد مراد ہیں۔“

یحییٰ نے یہ جوابات متوکل کو دکھا کر چھپا لئے۔

ایک بار ایسے ہی موقع پر آپ نے مسئلہ قضا و قدر کی صراحت بھی فرمائی کیونکہ مسک حنفی کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ آپ نے فرمایا:-

”انسان نہ بالکل مجبور ہے، نہ بالکل آزاد بلکہ دونوں حالتوں کے بین ہیں۔“
مولانا نجم الحسن کرار وی اس کی صراحت فرماتے ہیں کہ انسان اسباب علی میں آزاد ہے اور نتیجہ کی برآمدگی میں خدا کا محتاج۔

ابن سکیت شاعر دربار بھی تھے اور متوکل کے بچوں کے تالیق بھی۔ وہ عموماً متوکل کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے مگر ایک دن نہ جانے کیا متوکل کے جی میں آئی کہ اس نے ابن سکیت سے سوال کر دیا۔

”تمہاری نظر میں میرے بیٹے معز اور موید بہتر ہیں یا علی کے بیٹے حسن اور حسین؟“
بڑا سخت وقت اُڑا تھا ابن سکیت پر کہ دنیا کے لئے دین کے سودے پر آخری مہر لگ رہی تھی۔ انہوں نے مٹانے کی بہت کوشش کی کہ اس تقابل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مگر متوکل بھند ہو گیا اور بعض دشمنانِ اہل بیت درباریوں نے بھی آواز بلند کر دی۔

”ہاں اس کا فیصلہ کر ہی دیا جائے“

آخر ابن سکیت نے اعلائے حق کا فیصلہ کر لیا اور بلند آواز میں کہہ گزرے
”آپ کے بیٹوں کا حسین سے مقابلہ کیا وہ تو ان کے غلام فیر کی ہمسری بھی نہیں کر سکتے؟“

دربار میں سناٹا مچا گیا۔ متوکل غصے سے کانپنے لگا۔ جلاد اس کے اشارے پر ابن سکیت کی طرف بڑھے جو اس کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے حسین کی برتری کا اعلان کیا تھا تو یہ سمجھ کر کہ سران کے ناموں پر قربان کر دیں گے۔ وہی ہوا کہ سرِ بابا ان کی زبان گدسی سے کھینچ لی گئی۔

متوکل امام کو قتل کرنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں اس نے آپ پر بغاوت کا بہتان بھی رکھ دیا، گھر کی تلاشی لی گئی کہ کوئی بڑی چھری بھی برآمد ہو جائے تو باغی قرار دے دیا جائے مگر وہاں جائے نماز اور بورجے کے سوا ملتا کیا۔ کئی بار اس نے دربار میں قتل کے ارادے سے طلب کیا مگر آپ کی معجزہ نمائی سے ڈر گیا۔

ایک بار اس نے بھرے دربار میں آپ کو بلا کر ایک عورت کی طرف اشارہ کیا کہ دیکھئے یہ کیا کہتی ہے؟ جو ان اور خوبصورت عورت بولی۔

”میں زینب بنت علی ہوں۔ آنحضرتؐ نے مجھے وعادی تھی کہ ہر چالیس چاس سال بعد جوان ہو جاؤں گی!“

آپؐ نے اس کو جھوٹا قرار دیا مگر وہ بھند رہی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔
 ”میرے جد کا ارشاد ہے کہ درندوں پر آپؐ کی اولاد کا گوشت حرام ہے
 اگر یہ سچی ہے تو کوئی درندہ اس کی طرف رخ بھی نہ کرے گا۔“
 اہل دربار نے آپؐ میں اشارہ کیا اور ایک بولا۔

”پہلے آپؐ اپنی ذات سے اس قول کو سچا ثابت کر دیں۔“
 اُمّام نے بلاتامل حامی بھر لی اور اپنے قدموں سے چل کر خود شیر کے پنجرے
 میں داخل ہو گئے۔ متوکل بالا خانے پر چڑھ گیا اور دُور سے تماشا دیکھنے لگا۔
 پنجرے کا دروازہ کھلنے پر شیر آپؐ کی طرف بڑھے۔ درباری منتظر تھے کہ اب
 شیر آپؐ پر حملہ آور ہوں گے لیکن سب بُت بن کر رہ گئے۔ درباریوں نے دیکھا کہ
 شیر آپؐ کے قدموں کو چوم کر گرد پھرنے لگے، پھر گھٹنے ٹیک کر سامنے بیٹھ گئے۔ آپؐ
 نے باری باری ہر ایک کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل آئے۔

زینب کذابہ نے یہ حال دیکھا تو ڈر کے مارے اپنی غلط بیانی کا اعتراف کر لیا
 شاید اس کو کسی نے بھرٹکا کر بھیجا تھا۔

اس طرح متوکل کی طرف سے امتحان پر امتحان اور سازشوں پر سازشیں
 ہوتی رہیں پھر بھی توکل متوکل کے بجائے اُمّام ہی طرف رہا۔ ایک بار متوکل کی بڑھ
 کی ہڈی کے نیچے پھوٹا نکل آیا۔ سخت تکلیف تھی، کوئی دوا فائدہ نہ کرتی تھی فتح
 بن خاقان نے متوکل کی ماں کی اجازت سے امام علی نقیؑ سے دوا پوچھی۔ آپؑ
 نے فرمایا کہ بکری کی میٹگنیاں گلاب کے عرق میں حل کر کے لگا دی جائیں۔

درباریوں نے دوا کا مذاق بھی اڑایا مگر ابن خاقان معتقد تھا۔ اس نے
 لپ لگا دیا۔ پھوٹا پھوٹ گیا اور وہ تین روز میں صحت یاب ہو گیا۔
 متوکل کی ماں نے شکرانے کے طور پر دس ہزار اشرفی سرسبز ہر کر کے اُمّام

کی خدمت میں مذہبی جو آپ نے رکھ لی۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد متوکل نے بغاوت کے شبہ پر آپ کے گھر چھاپہ مارنے کا حکم دیا تو وہی اشرفیوں کی تھیلی اور ایک تلوار برآمد ہوئی، مگر بے در زمانہ اس پر بھی باز نہ آیا اور آپ کو ستانے کا سلسلہ جاری رہا۔

متوکل کو اپنی مساعی میں جتنی ناکامی ہوتی، اس کا عناد اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ حضرت معاویہؓ نے تبرے کی جس رسم کا اجرا کیا تھا وہ پہلے حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی تک محدود رہی، پھر اس میں اولاد کو شامل کر لیا گیا۔ منصور دینوی نے سچی اس کا اتباع کیا لیکن بے دین متوکل نے تو اس میں سیدہ کونین کو بھی شامل کر لیا۔ اب صرف حضورؐ کا وجود اقدس باقی تھا، بنی عباس کی سلطنت باقی رہتی تو یہ کسہر بھی پوری ہو جاتی مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور پھر کوئی منصور یا دوسرا متوکل پیدا نہیں ہوا۔

”ابن حشیش کہتا ہے ابو الفضل نے بیان کیا کہ ایک دن منقصر

نے اپنے باپ کو جناب فاطمہؓ پر سب و شتم کرتے سنا۔ اس نے اس کا ذکر کسی شخص سے کیا تو اس نے جواب دیا کہ ایسے باپ کا قتل واجب ہے لیکن جو اپنے باپ کو قتل کرتا ہے، اس کی عمر طولانی نہیں ہوتی۔ منقصر نے کہا کہ جب میں باپ کو قتل کر کے اللہ کی اطاعت اور فرماں

برداری کر دوں گا تو اس کی پرداہ نہیں کرنا کہ میری عمر کم ہو“ (۱۱۵)

بیٹے کے منہ سے باپ کے اس گناہِ عظیم کی تصدیق کے بعد بنی عباس کے طرف دار روایت کو کمزور قرار دینے کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتے اور یہ جواب ہمارے ہر دعوے کے خلاف ملتا رہا ہے اور ملتا رہے گا۔

غاصبوں اور ظالموں کی سرپرستی کا ایک فیصلہ پہلے سے موجود ہے تو اپنی داستانِ غم ہم کسی کو کیوں سنائیں۔ صرف اپنوں کو بتانا ہے کہ ہمارے آئمہ پر کیا گوری اور ہم کس قدر سخت جانی سے مظالم کے طوفانوں سے گزر رہے ہوئے یہاں تک پہنچا

دوسرے اماموں کی طرح ہمارے دسویں امام بھی بڑے صبر و شکر کے ساتھ
نظر بندی کی میعاد پوری کرتے رہے۔

شیعوں پر یہ دور پچھلے تمام ادوار سے زیادہ سخت تھا۔ اس زمانے میں تو
صرف شبہ پر تہ تیغ کر دیا جاتا تھا۔ انجام کار عاجز ہو کر کئی سید مختلف مقامات
پر جانوں سے کھیل گئے۔

سولیکہ میں ابو عبد اللہ محمد بن صالح میدان میں آگے پھر اپنے چچا موسیٰ
بن عبد اللہ کے سمجھانے سے ہتھیار رکھ دیئے اور سامرہ میں تین سال قیدہ کر کے باہر
رہے ہیں محمد بن جعفر نے تحریک چلائی لیکن عبد اللہ بن طاہر کے ہاتھوں گرفتار
ہو گئے اور قید خانے میں انتقال کیا۔

قاسم بن عبد اللہ اولاد رسول ہونے کے جسم میں پکڑے گئے، متوکل
نے اپنے طبیب کے ذریعہ زہر دلوادیا۔

احمد بن عیسیٰ قید خانے سے فرار ہو گئے تھے، عمر بھر روپوش رہے۔ متوکل
کے زمانے میں انتقال کیا۔

عبد اللہ بن موسیٰ مامون کے دور میں چھپ گئے تھے، آپ نے بھی متوکل
کے عہد میں وفات پائی۔

ستم بالائے ستم یہ تھا کہ ایک دوسرے کا حال سنتا بھی تو کوئی مدد نہ کر سکتا
اور مدد کے لئے نکلتا تو خود بھی گرفتار ہو جاتا یا قتل کر دیا جاتا، اس لئے عالم تقیہ
میں کوئی کسی سے مل لیتا تو ملاقات ہو جاتی ورنہ عموماً اپنے ہی گھر گرفت سے بچائے
رکھنے کی کوشش کی جاتی۔

عباسی سلطنت ہچکولے کھا رہی تھی۔ مصر و میوں کی یلغار سے تباہ ہو چکا
تھا۔ ایران و عراق کے کئی علاقے نکل چکے تھے پھر بھی اہل بیت کی دشمنی میں متوکل
اسی طرح سرگرم تھا۔

بخف اشرف اور کربلا کی تباہی

ایک خاص طبقہ کی آل محمد سے اتنی دشمنی کے اسباب کسی طرح سمجھ میں نہیں آتے زندہ افراد کی مخالفت کی تو کچھ تاویل ہو سکتی ہے لیکن مرنے والے تو اُسٹھ کو دعویٰ حکومت نہ کر سکتے، ان سے اتنی عداوت کیوں تھی متوکل کو، کہ ایک بار ۲۳ھ میں قبر حسین کو کھدوا ڈالنے کی کوشش کی۔ اس میں ناکام ہو کر مسلسل پیچ و تاب کھاتا رہا اور وقت کا منتظر رہا۔ حد ہوتی ہے بد باطنی کی کہ ایک طرف زندہ امام کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کی فکر میں تھا، دوسری طرف مرنے والے امام کا نشان مٹا دینے کی کد کر رہا تھا۔ شاید وہ بھی ہماری طرح انہیں زندہ ہی سمجھتا تھا اور اس علامت کو ختم کر دینا چاہتا تھا جو ان کی زندگی کا اشاریہ تھی۔

کچھ دنوں بعد اس نے پیچھے پڑی ہوئی اس مہم کا آغاز کیا کہ بخف و کربلا کے ہر علاقے کو مٹا دیا جائے۔ اس کام کے لئے اس نے حاکم کوفہ موسیٰ بن ہارون کو متعین کیا جس نے ہزاروں زائرین قتل کر دیئے، نتیجے میں اُسے والوں کی تعداد کچھ کم ہو گئی لیکن ہر طرف ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔

ابو بکر عیاشی اور یحییٰ بن عبد الحمید عمائدین کوفہ میں سے تھے، انہوں نے جاکر موسیٰ کو روکنے کی سعی کی، اس پر موسیٰ نے دونوں کو پٹوایا اور درجہ مشکل صحیح و سلامت گھر پہنچ سکے۔ پھر بھی مزاروں کے انہدام میں موسیٰ کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے اس مقصد کے لئے جن لوگوں کو بھیجا تھا، وہ بعض کرامات دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے اور اسی طرح واپس پلٹ آئے۔

اب کی متوکل نے ایک معتدبراہم دیرج کو ایک دستہ فوج کے ساتھ کوفہ کے قاضی جعفر بن محمد کے پاس روانہ کیا کہ اس کی نگرانی میں انہدام کیا جائے۔ ابراہیم نے دوسری بار بھی وہی سب کچھ کیا جو پہلی مرتبہ کر چکا تھا لیکن انجام پہلے جیسا ہوا، آخر اس نے سارا ماجرا متوکل سے جا کر کہہ سنایا اور گھر پہنچے ہی بیمار پڑ گیا۔ متوکل اس پر بھی شفا دے باندہ آیا اور اپنے ایک اور ملازم ہارون مصلیٰ

کو مامور کیا۔ اس کو خواب میں ختم المرسلین نظر آئے، جنہوں نے اس بدعت سے منع کیا مگر ہارون نے سچی مسلسل کی۔ نشانِ قبر کو تو وہ بیٹا نہ سکا مگر خود اس کا یہ حال ہو گیا کہ چہرہ سیاہ پڑ گیا، ہاتھ پاؤں ایسے ہو گئے کہ دیکھنے سے گھن آتی تھی اور منہ کے چھالوں سے ہر وقت پیپ بہتا رہتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ موسیٰ بن ہارون نے ایک شیعہ سے قبر کی مٹی منگا کر اس کا منہ پر کیا تھا اور خاکِ شفا کو مقامِ بول و براز پر رکھا تھا اور لگاتے ہی آگ آگ چلنے لگا تھا۔ لوگ پانی پلاتے تو اسٹفرغ ہوتا اور اندر کے حصّہ کٹ کٹ کر نکلنے لگتے اس طرح وہ جہنمِ داخل ہوا۔

ابراہیم دیرج جب کربلا میں ظلم ڈھارہا تھا تو اس کے آدمیوں نے ایک گروہ کو دیکھا جو اُن پر تیر چلا رہے تھے۔ آدمیوں نے بھی ابراہیم کے حکم پر انہیں تیر مارے مگر جو تیر ان کی کانوں سے نکلے وہ اُلٹ کر انہیں کے سینوں پر آ گئے۔ ابراہیم یہ دیکھ کر اتنا ڈر گیا کہ اسی وقت باقی آدمی لے کر سامرہ آ گیا۔ متوکل کو اگر وہ یہ واقعہ سُنا تو متوکل اس کو بزدلی پر قتل کر دیتا لہذا اس نے اس سے صرف بیویں اور پانی کا قصّہ بیان کیا، خود ڈرا سہما گھر آ گیا اور آتے ہی بخارا میں مبتلا ہوا تو پھر ملنگ سے اُسٹھ نہ سکا اور قتل متوکل کے دوسرے دن مر گیا۔

مسئل ناما کیوں کے باوجود متوکل نے اپنی ناصبیت نہیں چھوڑی۔ کربلا میں ہر طرف پہرے بٹھا دیئے کہ کوئی زیارت کے لئے قبر تک پہنچنے نہ پائے، لیکن جانے والے جاتے ہی رہے۔ اس سلسلے میں بے شمار واقعات بیان کئے جاتے ہیں کہ کس طرح نازنین نے مال و دولت اور اولاد کی قربانیاں دیں اور زیارت کا شرف حاصل کیا۔

متوکل کو اس روک تھام میں اتنی دلچسپی تھی کہ کبھی کبھی خود دیکھنے کو نکلتا تھا کہ کوئی کربلا کی طرف جاتا نہیں رہا ہے۔ ایک روز وہ بغداد کے پُل پر خیمہ زن تھا کہ ایک سید زادی اپنے سات سالہ بچے کے ساتھ جاتی نظر آئی۔ متوکل نے اس کو اپنے

سامنے طلب کیا اور کہا۔

”کیا رکھا ہے حسین کی زیارت میں؟“

”خدا و رسول کی خوشنودی حاصل ہوگی۔“ اس نے بڑبڑتے جواب دیا۔ متوکل بولا۔

”حسین اس قابل تھے کہ ان کے ذریعہ معرفت خدا اور رسول ہو!“

اس پر سیدانی کی گرج نضائیں بلند ہو گئی۔

”حسین سے معرفت حاصل ہوگی۔ تو کیا تجھ جیسے فاسق و فاجر سے ہوگی!“

سیدانی نے چیخا تا ہوا خنجر نکال لیا مگر وہ وار نہ کر سکی۔ سپاہیوں نے دوڑ کر دوڑ کر

طرف سے اس کو پکڑ لیا اور متوکل نے حکم دے دیا۔

”بچے کو اس کی گود میں ذبح کر دو۔“

سیدانی نے فرط محبت میں بچے کو اٹھایا تھا۔ سپاہیوں نے دونوں کو گرا کر بچے

کی گردن کاٹ دی اور ماں بچے کے خون میں لت پت ہو گئی۔

پھر وہ اس کی لاش اٹھا کر عازم کر بلا ہو گئی۔ روہنے پر کچھ زائر موجود تھے۔ وہ

ان سے آگے پہنچ گئی اور چلا کر بولی۔

”فرزند رسول! غریب و نادار ہوں۔ اور تو کچھ نہیں تھا، یہ تحفہ لائی

ہوں۔“

بچے کا منہ اس نے مزار کی طرف کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ قبر حسین کا نپ

گئی۔ ایک نور ہر طرف پھیل گیا اور آواز آئی۔

”مومنہ! تیری زیارت قبول ہوئی۔ دیکھ تیرا بچہ حسین کی گود میں ہے۔“

سیدانی نے کچھ دیکھا یا نہیں دیکھا؟ مگر وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ یہ روزا بچے کے

لئے نہیں تھا۔ غم حسین میں تھا۔

مظالم کی یہ داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بنی عباس کے بھٹیروں نے ایسی کتنی

ہی جانیں لیں۔ ہزاروں سلام ان صاحبان ایمان پر جو خاک و خون میں تڑپتے رہے

گھروں کو تباہ و برباد کر دیا، اپنے بچوں کی لاشیں خود اپنے ہاتھوں پر اٹھائیں مگر

مزار سید الشہداء کی زیارات کا ارادہ ترک نہیں کیا۔

متوکل کی یہ خونیں دہستانیں ہول کے دوش پر ممالکِ محروسہ میں پھیل رہی تھیں
مصر میں زید مجنون نے بھی سنا اور پاپیادہ چل پڑے۔ مدت کے بعد عراق پہنچے تو بازار
کوفہ میں عارف آل محمد بھول دانا سے ملاقات ہوئی۔ بھول گئی کوچوں میں، شاہراہوں
پر، غریبوں کے جھونپڑوں اور امیروں کے محلوں تک خونِ سادات کی مٹریوں کو
پھیلا رہے تھے۔

حضرت عمار یا عمر اور حضرت ابوذر غفاری نے عراق و شام کے در و دیوار
پر مدح آل محمد کے نقوش بنائے تھے۔ بھول دانا اپنے آنسوؤں سے مظلومیت
کی داستانیں سنا رہے تھے مگر وہ اپنے ہوش میں ہوتے تو کوئی انہیں گرفتار کرتا
زید مجنون سے ملاقات ہو گئی تو دو دیوانگانِ خردمند کیجا ہو گئے اور دونوں کربلا
کی طرف چل پڑے۔

انھیں دنوں متوکل کی ایک کینز حبشیہ مر گئی تھی جو اس کو بہت عزیز تھی اس
کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا دیا گیا جھنڈے کھلے ہوئے، عورتیں سر برہنہ، مرد گریباں
چاک، پیچھے پیچھے رونے والوں کا ہجوم، اس کی قبر اطرافِ کربلا میں تیار کی گئی تھی
زید مجنون کربلا پہنچے تو دور سے یہ منظر دیکھا۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زنِ حبشیہ
کی میت ہے۔

اب زید کو تابِ ضبط کہاں؟ چیخ کر روئے، گریباں پھاڑ ڈالا، خاک سر پر
ڈالی اور ایک فی البدیہہ مرثیہ پڑھنا شروع کر دیا۔

”عبرت کا مقام ہے کہ ایک زنِ زانیہ کی قبر اس طرح آباد کی جائے اور حسین
کی قبر کو کھیت بنانے کے لئے ہل چلایا جائے۔“

ان اشعار کی گونج متوکل کے کانوں میں پڑی تو وہ بہت غضبناک

ہوا۔ زید کو دربار میں پکڑ لیا اور پوچھا۔

”ابو تراب کون تھے؟“

”جو ان کے مدارج و شرف کو نہیں جانتا، وہ جھوٹا اور کافر ہے۔“
 پھر زیدؓ نے فضائل امیر المومنین بیان کرنا شروع کر دیئے متوکل نے آتش غیظ و غضب
 سے مغلوب ہو کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈلوادیا۔ لیکن وہ سونے
 کے لئے لیٹا تو ایک آواز کان میں گونجی۔

”زیدؓ کو ابھی رہا کر دے ورنہ تجھ کو ہلاک کر ڈالوں گا۔“

ظالم جتنا بڑا ہو، اتنا ہی بزدل بھی ہوتا ہے۔ متوکل نے صبح اُٹھ کر پہلا کام یہی
 کیا کہ زیدؓ کو چھوڑ دیا اور وہ کرپلا ہوتے ہوئے کسی طرف چلے گئے۔ بہلول دانا بھی ان کے
 ساتھ تھے مگر وہ کسی طرف کو چل نکلے۔ ممکن ہے، ان کی ملاقاتیں اسی سرزمین پر ہوتی
 رہی ہوں کیونکہ دونوں کے درمیان یہی مشترک رشتہ تھا۔

امام علیؓ نقلیٰ ان حالات سے بے خبر نہ تھے مگر وہ کرتے بھی کیا، حسینؓ مظلوم کے
 وارث ہی تو تھے، آپ رضائے رب میں راضی اور ہر حال میں صابر و شاکر۔
 ایک روز متوکل نے حکم دیا کہ سارے اُمراء، علماء و فضلاء اس کی سواری کے ساتھ
 پایادہ چلیں، ان میں امام علیہ السلام بھی تھے۔

سواری تیز چلتی تو آپ کو بھی دوڑنا پڑتا۔ تیز دھوپ میں آپ پسینے پسینے
 ہو گئے۔ سانس پھولنے لگی۔ متوکل کے کاتب زراقہ کو آپ پر بہت ترس آیا، وہ
 کہنے لگا۔

”بہت تکلیف ہو رہی ہے آپ کو۔“

”کیا کروں، متوکل نے یہ سب مجھے ذلیل کرنے کے لئے کیا ہے مگر میری منزلت
 ناقہ صالح سے کم نہیں ہے۔ متوکل بھی تین دن زندہ رہے گا۔“ آپ نے فرمایا اور
 پھر دوڑنے لگے۔

دہی ہوا کہ تیسرے دن ۱۲ شوال ۴۰ھ کو منتصر کے آدمیوں نے مدہوشی میں
 متوکل کو قتل کر دیا اور زمین ایک ناپاک کا وجود ختم ہونے سے پاک ہو گئی۔
 متوکل کے ساتھ اس کا وزیر فتح ابن خاقان بھی تہ تیغ کر دیا گیا۔

عباسی دورِ خلافت کا اس کے اٹھان سے انحطاط تک ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اس میں پانچ چیزیں مابہ الامتیاز نظر آئیں گی۔ ابوسلم کی تلوار منصور بن ہاشم کا استقلال، ہارون رشید کا ذوقِ تعیش، مامون کا تدبیر و سیاست اور متوکل کی سفاکی۔ اس سفاکی کے ساتھ مسلکِ حنفیہ کی ترویج بھی اس کی انفرادیت ہے جس کو اب اعتزال کے بجائے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

اسلام کے عقائد و نظریات کے لحاظ سے ادوار کا تعین ذرا مشکل ہے مگر تاریخ پر اچھٹی نظر ڈالی جائے تو اصول کی صراحت میں زاویہ ہائے نگاہ کے اختلاف سے تبدیلی ک کوئی نہ کوئی تفریق رونما ہوتے نظر آتی ہے۔

”پیغمبر اسلام نے جو قانونی احکام یا فیصلے صادر کئے وہ ایک نیم متمدن اور پرانی وضع کے معاشرے پر مبنی تھے۔ آپ کے بعد حضرت علیؓ نے دین اسلام کے حقائق کی توضیح کی۔ قرآن میں تشریحی احکام بہت کم تھے اور جتنے تھے، وہ بھی ایسے تھے کہ ان کی تعیل حالات کے مطابق کی جاسکتی تھی۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں ان کی توضیح و تشریح زیادہ تر حضرت علیؓ اور ان کے شاگرد حضرت ابن عباسؓ کی۔ آگے چل کر ”روایتوں کا انبار لگ گیا لیکن دبستانِ مدینہ کے سوا کہیں بھی کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ آنحضرت کے ابتدائی جانشین ایک معین اصول کے پابند تھے انہیں عہدِ نبویؐ یا خلافتِ علوی کی کوئی نظیر مل جاتی، جس کی تصدیق اہل بیتؑ نے کی ہوتی تو اسے فیصلے کی بنیاد بناتے ورنہ ذاتی اجتہاد پر اعتماد کرتے۔“

”خلفائے بنی امیہ کے زمانے میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ صوبوں کے عمال اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور بزورِ شمشیر انہیں مواتے تھے۔“

”جب عباسی مسندِ نشین ہوئے تو اس وقت امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں دو ایسے شخص تحصیلِ علم کر رہے تھے جن کا شمار بعد میں مثنیٰ مذہب کے ائمہ مجتہدین میں ہوا۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک بن انسؒ۔“

امام ابو حنیفہؒ "ایک قیاسی مقنن تھے۔ ان کے خیالات کو ان کے دوشاگردوں نے منضبط کیا: ابو یوسف اور محمد الشیبانی۔"

"امام مالک کا طریقہ کار جُدا تھا۔۔۔ ان کا مسلک جادہ پامال (ظلم) کی راہ نور دی تھا۔" انہوں نے احادیث سے زائد قرآن پر اعتماد کیا۔

"امام مالک کے کچھ عرصہ بعد امام شافعی آئے۔ وہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک کی بہ نسبت دنیا کے معاملات سے زیادہ واقفیت بھی رکھتے تھے۔"

"یہ حالات تھے جن میں امام احمد ابن حنبل منظر عام پر آئے وہ انتہائی بچے کے متشرع تھے اور کسی قسم کے اختلاف رائے کے متحمل نہ ہوتے" آپ نے حنفی

فقہ پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ان کا مسلک تمام وکمال احادیث پر مبنی ہے "معتصم اور واثق نے سختی سے ان مذہبی دیوانوں کے تشدد کی روک تھام

کی۔ امام احمد بن حنبل کو قید خانے میں ڈال دیا گیا جہاں ان کی وفات ہوئی۔" (اسپرٹ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۶۳)

تیسری صدی ہجری کے اختتام پر ابو موسیٰ اشعری کی اولاد میں امام ابو الحسن الاشعری نے مسلک الاشاعریہ کا اعلان کیا اور اسلام کے قیاسی عقائد اور عقلی نظریات کا وہ تصادم شروع ہوا جس میں پھر کمی نہیں آئی۔

فی الوقت حدود سلطنت عباسیہ پر امام ابو حنیفہ کا پرچم لہرا رہا تھا اور مذہب علویہ کہیں کہیں گوشوں میں اپنے کو عوام کی نظروں سے بچائے ہوئے ہوئے رہا تھا۔

اس موقع پر ارباب فکر کے لئے ایک دعوتِ عام ہے کہ توحید، قرآن اور رسالت کے علیحدہ علیحدہ عقائد کے ذیل میں پہلے ہمارے اصول، پھر حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اشعری، بغدادی کی ہوائی بنیم، فخر الدین رازی اور غزالی وغیرہ کی توصیحات اور نیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہونے والا دہائی مسلک، ان سب کے نظریات الگ الگ خانوں میں کیجا گئے جائیں تو اندازہ ہوگا کہ توحید مشکل اور مجسم ہوگئی۔ قرآن

مخلوق نہیں رہا تو کیا خالق بن گیا؟ اگر قرآن خالق ہو گیا تو خلاق مطلق کہاں گیا؟
نوبت پہنچی رسول تک تو خلقت، سیرت و کردار، بشر اور رسول کی حیثیتیں
سب مشتبہ۔ آپ کا کون سا قول قابل تقلید اور کون قابل تقلید نہیں؟ یہ ہمارے
فیصلے کی بات قرار پائی اور اس کی تصدیق قرآن سے ہونا ناممکن تھی اور رہے گی۔

ہمارے نظریات رسول کی حیات سے آج تک ہر سہ اصول کے بارے میں منفرد
اور مسلم ہیں اور رہیں گے۔ ان کی ہم آہنگی نظریات احناف سے (بریلوی مسلک) بڑی
حد تک ہوتی ہے۔ صرف اختلاف خلافت کا ہے تو ہم ان کے احترام میں کوئی تنقید
نہیں کرتے کیونکہ ہمارا امام منصوص من اللہ ہوتا ہے لیکن اور کسی مسلک سے ہمارے
نظریات کی مطابقت نہیں ہوتی، اور صرف ہمارا ہی نظریہ دوسروں سے مختلف نہیں
ہے بلکہ مسلک حنفی کی بھی وہی صورت ہے جو ہماری ہے۔ البتہ ہاتھ کھول کر
نماز پڑھنے کی حد تک امام مالک کا اجتہاد ہم سے مطابقت رکھتا ہے اور بعض بڑی
باتیں بھی ملتی جلتی ہیں۔

اگر ایک بار ہماری استدعا پر توحید، قرآن اور رسالت کے بارے میں سائے
نظریے نیچے اوپر کچھ کر تقابل و توازن کر لیا جائے اور ہمارا قول غلط ثابت ہو تو
ہم ایک بڑی جماعت کے ساتھ نظریاتی حلقہ بگوشی پر تیار ہیں۔ کاش کوئی وسیع النظر
ہماری اس درخواست پر توجہ کر سکے لیکن خلوص نیت اور اصول دیانت شرط اولیں
ہے۔ — ورنہ ہمارا کیا ہے، ہم تو اب طالب اور خدیجۃ الکبریٰ کے غلام ہیں۔
اسلام کی حقانیت اور ہادی اسلام کی سیرت کا تحفظ ہمارا کام ہے۔ کوئی منصور
آئے یا کوئی متوکل جائے ہم ظلم و ستم کی دسترس سے دور اور دسترس میں رہ کر خون
تازہ پیدا کریں گے اور جوان نسلوں کی رگ ہائے گلوں میں بھر کر اسلامی درندوں کے
سامنے پیش کرتے رہیں گے۔

متوکل کی موت ہمارے لئے وقتی اطمینان کا ایک پیغام تھی لیکن ڈھائی تین سو
سال کے تجربات نے ہمیں بتایا تھا کہ فضا کا ہر سنا آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا
ہے لہذا ہم اس کے لئے تیار تھے اور جو موقع مل گیا تھا، اس کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔

منتصر باللہ بن متوکل

منتصر باللہ ایک منصف مزاج، بڑبار، فیاض، دانشمند اور رعایا کا بھی خواہ
حکمران تھا

”اس نے حضرت علیؑ اور امام حسین کے مزارات پھر سے بنوائے
اور ان کی جائیداد جو متوکل نے ضبط کر لی تھی، واپس کر دی۔ ان
سخت قیود و شرائط کو مٹا دیا جو اس کے باپ نے غیر مسلموں پر لگا رکھی
تھیں، مگر افسوس یہ عالی تنہا بادشاہ صرف چھ ماہ حکومت کرنے
پایا تھا کہ موت کا پیغام آپہنچا“ (۱۱۶)

سہرام ہو جانے سے مر گیا۔ ترکوں نے اس کے بعد مستحسین بن مقتدر کو تخت نشین کیا
مستحسین باللہ بن مقتصر

۲۴۸ھ میں وہ تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کا دور اقتدار برائے نام تھا کبھی
صوبے خود مختار ہو گئے۔ نیشاپور میں طاہر یہ حکومت قائم ہو گئی۔

”۲۵۰ھ میں یحییٰ بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید علوی نے کوفہ میں خروج
کیا۔ مستحسین باللہ کی فوج نے مقابلہ کر کے ان کو شکست دے دی اور گرفتاری کے
بعد قتل کیا۔ ان کے بعد حسین بن زید نے جن کا لقب ”داعی الحق“ تھا علاقہ طبرستان
اور اس کے حدود میں اپنا پورا قبضہ جما لیا۔ انیس برس کامل ان کی حکومت ہی
ان کے مرجانے کے بعد ان کے بھائی محمد بن حسن نے اس علاقے میں اٹھارہ برس تک
سلطنت کی۔ آخر میں اسمعیل سامانی کے اشارے سے محمد بن ہارون نے ان کو قتل کر لیا

”امام علی نقی علیہ السلام کو یحییٰ اور داعی الحق وغیرہ کے معاملہ
سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگرچہ سادات کرام نے بہت چاہا کہ امام ان
کے شریک حال ہو جائیں لیکن حضرت نے دنیوی بکھیردوں میں پڑنے
سے قطعاً انکار کر دیا۔ آپ کو بحجز عبادتِ خدا اور تلقین و ارشادِ مطلق

”جو ان کے مدارج و شرف کو نہیں جانتا، وہ جھوٹا اور کافر ہے۔“
 پھر زیدؒ نے فضائل امیر المومنین بیان کرنا شروع کر دیئے متوکل نے آتش غیظ و غضب
 سے مغلوب ہو کر ایک تنگ ذماریک کو ٹھہری میں ڈر لودیا۔ لیکن وہ سونے
 کے لئے لیٹا تو ایک آواز کان میں گونجی۔

”زیدؒ کو ابھی رہا کر دے ورنہ تجھ کو ہلاک کر ڈالوں گا۔“

ظالم جتنا بڑا ہو، اتنا ہی بڑا دل بھی ہوتا ہے۔ متوکل نے صبح اُٹھ کر پہلا کام یہی
 کیا کہ زیدؒ کو چھوڑ دیا اور وہ کربلا ہوتے ہوئے کسی طرف چلے گئے۔ بہلول دانا بھی ان کے
 ساتھ تھے مگر وہ کسی طرف کو چل نکلے۔ ممکن ہے، ان کی ملاقاتیں اسی سرزمین پر ہوتی
 رہی ہوں کیونکہ دونوں کے درمیان یہی مشترک رشتہ تھا۔

امام علیؑ نے ان حالات سے بے خبر نہ تھے مگر وہ کرتے بھی کیا، حسینؑ مظلوم کے
 وارث ہی تو تھے، آپ رضائے رب میں راضی اور ہر حال میں صابر و شاکر۔
 ایک روز متوکل نے حکم دیا کہ سارے امرار، علماء و فضلاء اس کی سواری کے ساتھ
 پایادہ چلیں، ان میں امام علیہ السلام بھی تھے۔

سواری تیز چلتی تو آپ کو بھی دوڑنا پڑتا۔ تیز دھوپ میں آپ پسینے پسینے
 ہو گئے۔ سانس پھولنے لگی۔ متوکل کے کاتب زراقہ کو آپ پر بہت ترس آیا، وہ
 کہنے لگا۔

”بہت تکلیف ہو رہی ہے آپ کو۔“

”کیا کروں، متوکل نے یہ سب مجھے ذلیل کرنے کے لئے کیا ہے مگر میری منزلت
 ناقصہ صالِح سے کم نہیں ہے۔ متوکل بھی تین دن زندہ رہے گا۔“ آپ نے فرمایا اور
 پھر دوڑنے لگے۔

وہی ہوا کہ تیسرے دن ۱۲ شوال ۴۰ھ کو منتصر کے آدمیوں نے مدہوشی میں
 متوکل کو قتل کر دیا اور زمین ایک ناپاک کا وجود ختم ہونے سے پاک ہو گئی۔
 متوکل کے ساتھ اس کا وزیر فتح ابن خاقان بھی تہ تیغ کر دیا گیا۔

عباسی دورِ خلافت کا اس کے اٹھان سے انحطاط تک ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اس میں پانچ چیزیں مابہ الامتیناز نظر آئیں گی۔ ابوسلم کی تلوار، منصور بن ہاشم کا استقلال، ہارون رشید کا ذوقِ تعیش، مامون کا تدبیر و سیاست اور متوکل کی سفاکی۔ اس سفاکی کے ساتھ مسلکِ حنفیہ کی ترویج بھی اس کی انفرادیت ہے جس کو اب اعتزال کے بجائے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

اسلام کے عقائد و نظریات کے لحاظ سے ادوار کا تعین ذرا مشکل ہے مگر تاریخ پر اچھٹی نظر ڈالی جائے تو اصول کی صراحت میں زاویہ ہائے نگاہ کے اختلاف سے تدبیر ک کوئی نہ کوئی تفریق رونما ہوتے نظر آتی ہے۔

”پیغمبر اسلام نے جو قانونی احکام یا فیصلے صادر کئے وہ ایک نیم تمدن اور پرانی وضع کے معاشرے پر مبنی تھے۔ آپ کے بعد حضرت علیؑ نے دینِ اسلام کے حقائق کی توضیح کی، قرآن میں تشریحی احکام بہت کم تھے اور جتنے تھے، وہ بھی ایسے تھے کہ ان کی تمجیل حالات کے مطابق کی جاسکتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ان کی توضیح و تشریح زیادہ تر حضرت علیؑ اور ان کے شاگرد حضرت ابن عباسؓ کی۔ آگے چل کر روایتوں کا انبار لگ گیا لیکن دبستانِ مدینہ کے سوا کہیں کچھ نئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ آنحضرت کے ابتدائی جانشین ایک معینِ اصول کے پابند تھے انہیں عہدِ نبویؐ یا خلافتِ علویؑ کی کوئی نظیر مل جاتی جس کی تصدیق اہل بیتؑ نے کی ہوتی تو اسے فیصلے کی بنیاد بناتے ورنہ ذاتی اجتہاد پر اعتماد کرتے“

”خلفائے بنی امیہ کے زمانے میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ صوبوں کے عمال اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور بزورِ شمشیر انہیں مواتے تھے“

”جب عباسی سندنشین ہوئے تو اس وقت امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں دو ایسے شخص تحصیلِ علم کر رہے تھے جن کا شمار بعد میں مثنیٰ مذہب کے ائمہ مجتہدین میں ہوا۔ یعنی امام ابوحنیفہؒ اور امام مالک بن انسؒ“

امام ابو حنیفہؒ ایک قیاسی مقنن تھے۔ ان کے خیالات کو ان کے دوشاگردوں نے منضبط کیا: ابو یوسف اور محمد الشیبانیؒ۔

”امام مالک کا طریقہ کار جُدا تھا۔۔۔ ان کا مسلک جادہ پامال (مطلوبہ) کی راہ نور دی تھا۔“ انہوں نے احادیث سے زائد قرآن پر اعتماد کیا۔

”امام مالک کے کچھ عرصہ بعد امام شافعی آئے۔ وہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی بہ نسبت دنیا کے معاملات سے زیادہ واقفیت بھی رکھتے تھے۔“

”یہ حالات تھے جن میں امام احمد ابن حنبل منظر عام پر آئے وہ انتہائی دہجے کے متشرع تھے اور کسی قسم کے اختلاف رائے کے متحمل نہ ہوتے“ آپ نے حنفی فقہ پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ان کا مسلک تمام و کمال احادیث پر مبنی ہے۔“

”معتصم اور واثق نے سختی سے ان مذہبی دیوانوں کے تشدد کی روک تھام کی۔ امام احمد بن حنبل کو قید خانے میں ڈال دیا گیا جہاں ان کی وفات ہوئی۔“

(اسپرٹ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۶۳)

تیسری صدی ہجری کے اختتام پر ابو موسیٰ اشعری کی اولاد میں امام الحسن الاشعری نے مسلک الاشاعره کا اعلان کیا اور اسلام کے قیاسی عقائد اور عقلی نظریات کا وہ تصادم شروع ہوا جس میں پھر کمی نہیں آئی۔

فی الوقت حدود سلطنت عباسیہ پر امام ابو حنیفہ کا پرچم لہا رہا تھا اور مذہب علویہ کہیں کہیں گوشوں میں اپنے کو عوام کی نظروں سے بچائے ملکی ملکی سانسیں لے رہا تھا۔

اس موقع پر ارباب فکر کے لئے ایک دعوتِ عام ہے کہ توحید، قرآن اور رسالت کے علیحدہ علیحدہ عمداؤں کے ذیل میں پہلے ہمارے اصول، پھر حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اشعری، بدیدی کی ہوئی ابن تیمیہ، فخر الدین رازی اور غزالی وغیرہ کی توصیحات اور انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہونے والا دہائی مسلک، ان سب کے نظریات الگ الگ خانوں میں یکجا کئے جائیں تو اندازہ ہوگا کہ توحید مشکل اور مجسم ہوگئی۔ قرآن

مخلوق نہیں رہا تو کیا خالق بن گیا؟ اگر قرآن خالق ہو گیا تو خلاق مطلق کہاں گیا؟
نوبت پہنچی رسول تک تو خلقت، سیرت و کردار، بشر اور رسول کی حیثیتیں
سب مشتبہ۔ آپ کا کون سا قول قابل تقلید اور کون قابل تقلید نہیں؟ یہ ہمارے
فیصلے کی بات قرار پائی اور اس کی تصدیق قرآن سے ہونا ناممکن تھی اور رہے گی۔

ہمارے نظریات رسول کی حیات سے آج تک ہر سہ اصول کے بارے میں منفرد
اور مسلم ہیں اور رہیں گے۔ ان کی ہم آہنگی نظریات اخلاف سے (بریلوی مسلک) بڑی
حد تک ہوتی ہے۔ صرف اختلاف خلافت کا ہے تو ہم ان کے احترام میں کوئی تنقید
نہیں کرتے کیونکہ ہمارا امام منصوص من اللہ ہوتا ہے لیکن اور کسی مسلک سے ہمارے
نظریات کی مطابقت نہیں ہوتی، اور صرف ہمارا ہی نظریہ دوسروں سے مختلف نہیں
ہے بلکہ مسلک حنفی کی بھی وہی صورت ہے جو ہماری ہے۔ البتہ ہاتھ کھول کر
نماز پڑھنے کی حد تک امام مالک کا اجتہاد ہم سے مطابقت رکھتا ہے اور بعض ہرمی
باتیں بھی ملتی جلتی ہیں۔

اگر ایک بار ہماری استدعا پر توحید، قرآن اور رسالت کے بارے میں سارے
نظریے نیچے اوپر لکھ کر مقابل و توازن کر لیا جائے اور ہمارا قول غلط ثابت ہو تو
ہم ایک بڑی جماعت کے ساتھ نظریاتی حلقہ بگوشی پر تیار ہیں۔ کاش کوئی وسیع النظر
ہماری اس درخواست پر توجہ کر سکے لیکن خلوص نیت اور اصول دینیت شرط اولیں
ہے۔ — درنہ ہمارا کیا ہے، ہم تو ابوطالب اور خدیجۃ الکبریٰ کے غلام ہیں۔
اسلام کی حقانیت اور ہادی اسلام کی سیرت کا تحفظ ہمارا کام ہے۔ کوئی منظور
آئے یا کوئی متوکل جائے۔ ہم ظلم و ستم کی دسترس سے دور اور دسترس میں رہ کر خون
تازہ پیدا کریں گے اور جوان نسلوں کی رنگ ہائے گلوں میں بھر کر اسلامی درندوں کے
سامنے پیش کرتے رہیں گے۔

متوکل کی موت ہمارے لئے وقتی اطمینان کا ایک پیغام تھی لیکن ڈھائی تین سو
سال کے تجربات نے ہمیں بتایا تھا کہ فضا کا ہر سناٹا آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا
ہے لہذا ہم اس کے لئے تیار تھے اور جو موقع مل گیا تھا، اس کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔

منتصر باللہ بن متوکل

منتصر باللہ ایک منصف مزاج، بڑبار، فیاض، دانشمند اور رعایا کا بہی خواہ حکمران تھا

”اس نے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کے مزارات پھر سے بنوائے اور ان کی جائیداد جو متوکل نے ضبط کر لی تھی، واپس کر دی۔ ان سخت قیود و شرائط کو ہٹا دیا جو اس کے باپ نے غیر مسلموں پر لگا رکھی تھیں، مگر افسوس یہ عالی تنہا بادشاہ صرف چھ ماہ حکومت کرنے

پایا تھا کہ موت کا پیغام آپہنچا“ (۱۱۶)

سرسام ہو جانے سے مر گیا۔ ترکوں نے اس کے بعد مستعین بن معتد کو تخت نشین کیا

مستعین باللہ بن معتصم

۲۴۸ھ میں وہ تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کا دور اقتدار برائے نام تھا کبھی صوبے خود مختار ہو گئے۔ نیشاپور میں طاہریہ حکومت قائم ہو گئی۔

”۲۵۵ھ میں یحییٰ بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید علوی نے کوفہ میں خروج کیا۔ مستعین باللہ کی فوج نے مقابلہ کر کے ان کو شکست دے دی اور گرفتاری کے بعد قتل کیا۔ ان کے بعد حسین بن زید نے جن کا لقب ”داعی الحق“ تھا علاقہ طبرستان اور اس کے حدود میں اپنا پورا قبضہ جما لیا۔ انیس برس کامل ان کی حکومت ہی۔ ان کے مرجانے کے بعد ان کے بھائی محمد بن حسن نے اس علاقے میں اٹھارہ برس تک سلطنت کی۔ آخر میں اسمعیل سامانی کے اشارے سے محمد بن ہارون نے ان کو قتل کر لیا

”امام علی نقی علیہ السلام کو یحییٰ اور داعی الحق وغیرہ کے مقابلہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگرچہ سادات کرام نے بہت چاہا کہ امام ان کے شریک حال ہو جائیں لیکن حضرت نے دنیوی بکھیروں میں پڑنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ آپ کو بحر عبادتِ خدا اور یقین و ارشادِ مطلق

کسی دوسرے کام کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ (۱۱۷)
 مستعین باللہ کا چار سالہ دور لڑتے جھگڑتے گزر گیا۔ آخر اس نے ترکوں کی
 بالادستی سے تنگ آکر بغداد میں پناہ لے لی۔ ترکوں نے اس کے جاتے ہی معتر بن
 متوکل کو تخت پر بٹھا دیا۔ نتیجے میں مستعین اور معتر میں کئی لڑائیاں ہوئیں، پھر
 مستعین تخت سے دستبردار ہو گیا اور ابن طولون کی نظر بندی میں مر گیا۔
معتر باللہ بن متوکل

معتر کے دور حکومت کا آغاز ۳۵۲ھ میں ہوا۔ اس کا پورا دور انتشار کا
 شکار رہا لیکن اہل بیت کرام کے لئے وہ متوکل کا بیٹا ہی ثابت ہوا، اور امام علی
 نقی علیہ السلام کی طرف سے غافل نہ رہا۔
امام علی نقی علیہ السلام کی شہادت

متوکل کی ہلاکت کے بعد سے، اگرچہ آپ کو پورا الطینان نہ تھا۔ پھر بھی پریشان
 بہت کچھ کم ضرور ہو گئی تھیں۔ عقیدت مند سہولت آپ تک پہنچ جاتے اور حسب
 دل خواہ آپ سے فیض حاصل کرتے تھے۔ سامرہ کی سترہ سالہ نظر بندی کے یہ چھ
 سات سال ایسے تھے جن میں آپ نے آزادی کے ساتھ فرائض امامت انجام
 دیئے اور شیعیان علی پر اتنی زیادہ سختیاں نہیں ہوئیں کہ وہ امام کا نام لیتے تو قید
 کر دیئے جاتے۔ اس کا سبب خود حکمرانوں کی مملکتی الجھنیں تھیں۔ انہیں اتنا موقع ہی
 نہ ملا کہ اولاد رسول پر ظلم کر کے دل کے پھپھو لے پھوڑ سکیں۔

متوکل کے بیٹے معتر کو اگرچہ پورا سکون میسر نہ تھا، تاہم اس نے باپ کی میرٹ
 کو فراموش نہ کیا، اور ایک دن ایک آدمی کو بہانے سے بھیج کر کھانے کی کسی چیز
 میں ذہر ملا دیا۔ جس کے کھاتے ہی ۳ رجب ۳۵۴ھ کو آپ کی شہادت واقع ہو
 گئی۔ آپ کی عمر اس وقت ساڑھے اکتالیس سال تھی۔

امام حسن عسکریؑ موجود تھے۔ آپ نے تجہیز و تکفین کی اور گھر کے اندر ہی قبر
 کھود کر دفن کر دیا۔

اولاد اطہار

مختلف بیویوں سے چار بیٹے اور ایک بیٹی یادگار تھی: امام حسن عسکری، حسین بن علی، محمد بن علی، جعفر بن علی اور عقبہ یا عائشہ بنت علی۔

جعفر امام حسن عسکری کے بعد طالب امامت ہوئے تھے لیکن حضرت حجت کی بزرگی میں ان کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا گیا، لہذا جعفر کذاب مشہور ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اذعانے امامت نہیں کیا، اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت حجت کی امامت تسلیم کر لی تھی۔ لہذا ان کی اولاد انہیں جعفر تو آپ کہتی ہے۔ سادات امروہ ان ہی کی نسل سے ہیں اور اپنے کو نقوی کہتے ہیں۔

امام محمد تقی علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت امام علی نقی، دوسرے موسیٰ مہر قح۔ امام علی نقی کی اولاد نقوی کہلاتی ہے تو نقوی عموماً اپنے کو جدِ علی امام علی رضا علیہ السلام سے نسبت دے کر ”رضوی“ کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ مہر قح ۲۵۵ھ میں بعمر ۳۸ سال کوفہ پہنچے، کوفہ سے تم گئے۔ تم میں ایک عرصہ قیام کے بعد کاشان تشریف لے گئے مگر اہل قم پھر آپ کو واپس لے آئے اور پھر آپ کی نسل قم میں آباد ہو گئی۔ (۱۱۸)

گیارہویں امام

امیر المومنین حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

۳ رجب ۲۵۴ھ تا ۸ ربیع الاول ۳۲۶ھ

ولادت و طفولیت

۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ کو آپ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ایک امام کی طرح پہلے ہی دن سے معجزہ نمائی کی ادھر جس نے دیکھا، اس نے سمجھ لیا کہ امام علی نقی کا جانشین متولد ہوا ہے۔ دوسرے آئمہ کی طرح آپ کے القاب بھی بے شمار تھے۔ آپ کا قیام ایک طویل مدت تک سرمن رائے کے محلہ عسکر میں رہا تھا۔ اس لئے عسکری کہلائے۔ بچپن میں آپ گھر کے کنویں میں گر گئے تو عورتیں چینی لگیں، امام علی نقیؑ مقصود نماز تھے۔ نماز ختم کر کے آپ اُٹھے تو دیکھا کہ امام حسن عسکری پانی کی سطح پر پھرے ہوئے، پانی سے کھیل رہے ہیں۔

ایک روز آپ ایک مقام پر کھڑے کچھ بچوں کو کھیلے دیکھ رہے تھے کہ اُدھر سے بہلول دانا کاگز رہا۔ انہوں نے کہا:

”تم اس لئے رو رہے ہو کہ تمہارے پاس وہ کھلونے نہیں ہیں جو ان بچوں کے پاس ہیں۔ میں ابھی لاتا ہوں تمہارے لئے بھی!“

آپ نے فوراً انہیں روکا۔

”ہم علم و عبادت کے لئے پیدا ہوئے ہیں، کھیلنے کے لئے نہیں۔“
تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا؟“ بہلول نے پوچھا اور آپ نے جواب دیا۔

”قرآن مجید سے تم نے پڑھا تو ہو گا — کیا تم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو عیث پیدا کیا ہے اور کیا تم ہماری طرف پلٹ کر نہ آؤ گے؟“
 بہلول تجرہ گئے۔ آپ نے پوچھا
 ”بیٹے تم رد کیوں رہے تھے۔ اتنے کم سن ہو کہ گناہ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا؟“
 آپ نے فرمایا۔

”کم سن سے کیا ہوتا ہے میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے کہ بڑی لکڑیاں جلانے کے لئے پہلے چھوٹی لکڑیاں جلاتی ہیں — میں سوچ رہا تھا کہ کہیں جہنم کے بڑے ایندھن کے لئے چھوٹے بچے استعمال نہ کئے جائیں؟“
 فکر کی یہ بلندی غلطی کے سلسلہء امامت کے ہر بچے بڑھے میں یکساں تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ دلی کے گھر ولی پیدا ہوتا ہے اور شیر کے گھر شیر کا بچہ۔
بہلول دانا

آپ ایک مجنون نما بزرگ تھے۔ جان بوجھ کر آپ نے اپنی یہ حالت بنا رکھی تھی۔ تاکہ ظالم بادشاہوں کے دستِ ظلم سے محفوظ رہیں اور جو کچھ کہنا ہو بے دھڑک کہہ جائیں مگر تھے دیوانہ بیکار خویش ہوشیار۔ عرفان الیٰ محمد آپ کے دور میں آپ سے زائد بہت کم لوگوں کو تھا۔ آپ نے امام جعفر صادق سے لے کر امام حسن عسکری تک کی زیارت کی اور سات عباسی خلفاء کا زمانہ دیکھا۔ عجیب و غریب خرد افروز کہانیاں آپ سے منسوب ہیں۔

ایک بار ایک مجمع میں کوئی کہہ رہا تھا شیعوں کی تین باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ خدا دیکھنے کی چیز نہیں، بندہ اپنے فعل میں مختار ہے۔ شیطان آگ میں جلیا ہائے گا۔ جب کہ وہ آگ ہی سے بنا ہے۔ بہلول سن رہے تھے۔ انہوں نے ایک مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر اس کے سر پر مار دیا۔ لوگوں نے بہلول کو پکڑ لیا اور قاضی کے پاس لے گئے۔ قاضی نے پوچھا۔

”تم نے اس کو ڈھیلا کیوں مارا؟“

”میں نے تو نہیں مارا، خدا نے مارا ہے۔۔۔ بندہ اپنے فعل میں مجبور ہے جو کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے۔۔۔ پھر اس فعل سے اس کا نقصان ہی کیا ہوا؟“
 ”ہوایکوں نہیں۔۔۔“ اس شخص نے کہا۔ ”اب تک سر میں درد ہو رہا ہے۔“
 بہلول اس کے قریب گئے اور سر کیڑ کر دیکھنے لگے۔ ”کہاں ہے درد؟“
 ”درد بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے؟“ وہ بگڑ کر بولا اور بہلول نے نرمی سے کہا
 ”موجود ہے تو دکھائی ضرور دے گا۔۔۔ تم تو ابھی کہہ رہے کہ خدا ہے
 تو نظر ضرور آئے گا۔“

اب بہلول کا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا۔ آپ نے کہا۔
 ”ڈھیلا مٹی کا تھا، تم بھی مٹی کے بنے ہو۔ مٹی کو مٹی سے چوٹ کیونکر لگی۔۔۔؟“
 اور اگر یہ سچ ہے تو آگ کا بنا ہوا شیطان جہنم کی آگ سے جل سکتا ہے۔۔۔!“
 مستغیث ہکا بکارہ گیا۔ قاضی نے بہلول کو بری کر دیا اور وہ دیوانگی میں
 ہاتھ ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

ایک بار بہلول ایک ٹوٹی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھتے تھے کسی نے کہا۔
 ”اس دیر لانے میں کیا کر رہے ہو بہلول، شہر جاؤ۔“

”شہر والے تو یہاں آ رہے ہیں میں شہر جا کر کیا کروں!“ بہلول نے جواب
 دیا۔ کہنے والے پر نظریں جما کر کہا۔ ”شہریوں میں بیٹھنے والا نہیں ہے میں تو ان لوگوں
 میں بیٹھا ہوں جو نہ کسی کی غیبت کرتے ہیں، نہ کسی کا مال چھینتے ہیں، نہ آپس میں
 لڑتے ہیں۔۔۔ ہمسائے کو ستانے نہیں، گھر آئے ہوئے کو بھگاتے نہیں، دوست
 آئے دشمن آئے، سب کے لئے ان کے دروازے کھلے ہیں۔ نہ تاج و تخت کی ہوس
 نہ جاہ و منصب کا خیال۔ نہ کسی کے آنے کی فکر نہ جانے کا غم۔“

بہلول دیوانگی میں کارا نبیاء انجام دیتے رہتے اور ان کی ہر زبان اس جگہ
 آکر ٹوٹی تھی جو منزل تھی تعلیمات امیر المؤمنین کی۔ کہا جاتا ہے کہ ہارون رشید نے
 ان کی خردمندی سے متاثر ہو کر وزارت کی پیش کش کی تھی مگر انھوں نے ٹھکرا دی،
 اور فقری کے بھیس میں ظلم و مظلومیت دونوں کی انتہا کا جائزہ لیتے رہے۔

محاسن و کمالات

ہمارے آئمہ، انبیاء کی طرح خلقی طور پر پیکرِ علم و ہدیٰ تھے۔ الفاظ میں ان کا بیان ممکن نہیں۔ اشاروں کے طور پر اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ ایک عالمِ جہتِ فقیہہ باکمال اور مفسرِ باعمل تھے۔ دوسرے اماموں کی طرح آپ کو بھی نشر و تبلیغ کا موقع نہیں ملتا تھا مگر جب بھی وقت نے مہلت دی، آپ نے علم کے دریا بہا دیئے اور پانے والوں نے بقدرِ ظرف حاصل کر لیا۔

عبادت و تقویٰ آپ کا مزاج بشری تھا جس کے نمونے پچھلے دس امام پیش کر چکے تھے۔

تواضع اور جود و سخا کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ علی وفاطمہ کے پوتے تھے۔ علی بن ابراہیم بن جعفر کا بیان ہے کہ ایک دن وہ افلاس سے تنگ آکر امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ راستے میں سوچا کہ اگر پانچ سو درہم مل گئے تو دو سو کے کپڑے بنوا لیں گے۔ خدمتِ امام میں پہنچ کر زبان کو کچھ کہنے کا یارا نہ ہو سکا، بلا کچھ کہے رخصت ہو گئے۔ دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ عقب سے آپ کا غلام ایک تھیلی لے کر آیا۔ اس نے تھیلی ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ فرمایا ہے کہ اس میں سے دو سو درہم کے کپڑے بنوا لیجئے گا۔

پھر اس نے کہا: حضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوہستان کی طرف نہ جلیئے گا بلکہ فلاں موضع میں چلے جایئے۔ یہ لوگ اس موضع میں گئے تو وہاں ان کی ملاقات ایک دولت مند عقیفہ عورت سے ہوئی، جس سے علی بن ابراہیم نے عقد کر لیا اور اس کی جائیداد سے انہیں چار ہزار سالانہ کی آمدنی ہو گئی۔

عظمت و جلالت آپ کی خاندانی دجاہت میں شامل تھی۔ دشمن آپ کی عدم موجودگی میں عقیفہ ناک ہوتا لیکن آپ کے سامنے پڑتے ہی مرعوب ہو کر موم پڑ جاتا۔ اس طرح کے کتنے ہی واقعات اسلاف کی طرح آپ کے ساتھ بھی

پیش آئے کہ خلیفہ قتل کے لئے سنگی تلوار لے کر بیٹھا ہے اور جب آپ تشریف لائے تو اس نے تلوار دونوں ہاتھوں پر رکھ کر پیش کر دی۔

علم کے لئے یہ کہنا غلط ہو گا کہ گھٹی میں پڑا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نسلی طور پر خلقت میں رجحان تھا۔

عرب کے مشہور فلسفی اسحق کندی نے ایک مرتبہ قرآن مجید کے متضاد منہاجیم کی آیات جمع کیں اور قرآن کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کا ایک شاگرد امام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس سے کہا۔

”تم اپنے استاد کو اس فضول کام سے کیوں نہیں روکتے؟“

دہمیری کیا مجال ہے۔ وہ مجھ سے علم و فضل اتنے بڑے ہیں کہ میں ان کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتا۔“ اس نے عذر کیا اور آپ نے فرمایا۔

”اس سے کہو تم جس آیت کے جو معنی لیتے ہو، اس کے معنی وہ نہیں ہیں بلکہ کچھ اور ہیں، جو تمہیں خدا بتا سکتا ہے، یا وہ شخص جس کو خدا نے بتایا ہو۔ اگر خدا یا اس کا فرستادہ تمہیں آکر بتائے تب تو مان لو گے؟“

شاگرد نے اسحق کندی سے آکر دیا ہی کہا اور عظیم فلسفی سمجھ گیا کہ یہ جواب امام کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا اور اس نے وہ سارے اوراق جلا ڈالے جو اب تک لکھے تھے۔

آپ دوسرے آئمہ کی طرح السنۃ عالم کے عالم بھی تھے اور آنے والے انصاف کی پیشین گوئیاں تو اس طرح کرتے جیسے آپ بچشم خود انہیں دیکھ رہے ہوں۔ آپ نے ربیع الاول کو حضور اور امیر المؤمنین کے عید منانے کی تصدیق فرمائی اور شیعوں کے لئے اس کو مستند قرار دیا۔ اس کو زیادہ اہمیت اس لئے بھی ہے کہ حضرت حجت کا آغاز امامت اسی تاریخ سے ہوا۔

آپ نے مختلف اوقات میں اپنے ہم جلسوں کو نصیحتیں بھی کیں جو آپ کے گراں قدر اقوال میں شامل ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

جاہل کی صحبت سے بچو، خواہ وہ نامح ہی کیوں نہ ہو۔ عاقل سے دوری اختیار نہ کرو، اگرچہ وہ دشمن ہی ہو کیونکہ جاہل سے تمہیں ایسی جگہ نقصان پہنچے گا جہاں نفع کی امید ہوگی۔ عقلمند کی مروت عداوت پیدا ہونے کے اسباب کو روکتی ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، اگر حق کو چھوڑ دے گا، ذلیل ہو جائے گا بہترین عبادت یہ ہے کہ آدمی اپنے فرائض کو ادا کرتے رہے۔ ہر بلا و مصیبت کے پیچھے رحمت و نعمت ہوتی ہے۔

ادوار خلافت

امام حسن عسکریؑ کی ولادت دائق کے عہد میں ہوئی تھی۔ پھر آپ نے متوکل کا خویش دور حکومت مشاہدہ کیا بلکہ جھیل ۲۲۶ھ میں منتقل اور ۲۲۸ھ میں مستعین تخت نشین ہوا اور اس کے بعد معتز نے باپ کا سایہ سر سے چھین لیا۔ امام علی نقیؑ کی زندگی میں ایک بار مستعین نے آپ کو طلب فرما کر منہ زور گھوڑا آپ کے حوالے کیا۔ کہ یہ گھوڑا کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ آپ کی جوانی کا زمانہ تھا مگر آپ دو دمان حدیث و فقہ کے پروردہ تھے۔ تربیت فرس سے بظاہر آپ کا کیا تعلق ہو سکتا۔ آپ نے عذر کیا مگر مستعین بضد ہو گیا۔ یہ گھوڑا کئی آدمیوں کو گرا چکا تھا۔ مستعین نے سوچا تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے ساتھ ایسا ہی کچھ پیش آیا تو امام علی نقیؑ کا گھر بے چراغ ہو جائے گا اور مستقبل کے خطرات ختم ہو جائیں گے امام حسن عسکریؑ نے جب دیکھا کہ وہ ماننا ہی نہیں تو آپ گھوڑے کے قریب تشریف لے گئے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا پھر مستعین کی خواہش کے مطابق اس پر سواری کر کے بھی دیکھا دی۔

اب معتز کا زمانہ تھا جو امام علی نقیؑ کا قاتل تھا اور سادات دشمنی میں متوکل کا قائم مقام۔ اس نے امام حسن عسکریؑ کو علی بن یارش کی حراست میں نظر بند کر دیا لیکن آپ کی شب زندہ داری اور تقویٰ اس کو متاثر کرے بغیر نہ رہا۔ اس نے اپنی گستاخوں کی معافی مانگی اور آپ کو خود جا کر دولت سرانگ چھوڑ آیا۔

اس زمانے میں بھی بعض سادات بڑی بے رحمی سے مارے گئے جسین کے بیٹے جعفر محمود، باقر اور زین العابدین سامرہ سے لار چلے گئے تھے، وہاں سازش سے قتل کر دیئے گئے۔

محمد کے بیٹے رحمت اللہ، لطیف اللہ، غایت اللہ، ہدایت اللہ اور نعمت اللہ کربان میں تہہ تیغ کئے گئے۔

پچاس سے زائد آدمیوں کا ایک قافلہ امام رضا کے بھائی سید جلال اشرف کی سرکردگی میں بغداد سے طارم جا رہا تھا کہ زنکان کے قریب شمر ذی الجوشن کے پوتے ابوالفضل نے تین ہزار فوج کے ساتھ انہیں گھیر لیا۔ مقامی لوگوں نے امام زادوں کی مدد کی اور دشمن کو شکست ہوئی۔ مگر یہ لوگ جب سید جلال الدین کے انتقال کے بعد وہاں سے رے منتقل ہوئے تو سوتے میں خار جیوں نے حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا۔

احمد ابن طولون نے معتز کے زمانے میں سادات پر بڑے مظالم ڈھائے بعض تذکروں میں ان کی تعداد اٹھارہ ہزار بتائی جاتی ہے جن میں علی بن ابراہیم حسینی عبداللہ بن علی زیدی، محمد بن احمد علوی، حمزہ بن حسین، حمزہ بن عیسیٰ زیدی، محمد و ابراہیم پسران حسن علوی، حسن بن محمد زیدی، اسمعیل بن عبداللہ، محمد بن حسین زیدی اور محمد بن عبداللہ زیدی وغیرہ شامل ہیں۔

اسی دور میں ترکوں سے معتز کی مخالفت بڑھ گئی۔ وہ اس کو محل سے کہنچ کر باہر لے آئے اور نوک شمشیر سینے پر رکھ کر تاج و تخت سے دستبردار کر لیا، پھر قید کر دیا اور قید خانے ہی میں اس کا کام تمام کر دیا۔

مہتدی باللہ بن دائق

معتز کے بعد دائق کا بیٹا مہتدی ترکوں کی حمایت سے بادشاہ بنا۔ ذاتی طور پر وہ باصلاحیت حکمران تھا مگر اہل بیت کی دشمنی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس نے امام حسن عسکریؑ کو اپنے وزیر صالح بن دھیف کی حراست میں دے دیا۔ اس ظالم نے

امام کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا، حتیٰ کہ پانی تک کی تکلف دی اور امام کو تیمم سے نماز ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر بھی آپ اپنے دطائف میں مصروف رہے، نگرانی پر متغین غلام اس سے بہت متاثر ہوئے اور آپ کی اعانت کا دم بھرنے لگے۔ صالح نے غلاموں کی یہ حالت دیکھی تو اس کو خطرہ پیدا ہوا کہ اس یہ غلام شیعہ نہ ہو جائیں لہذا اس نے آپ کو روکا کر دیا۔

اس عرصے میں ترک مہمدی کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ترکوں کا مقابلہ کیا مگر ہریت یا ب ہو کر گرفتار ہوا اور تھوڑے ہی عرصے بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

معتمد علی اللہ بن متوکل

معتمد ۵۲۶ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ اس نے مرو کے بجائے بغداد کو دار الخلافہ بنالیا۔

اس کے عہد میں مختلف علاقوں میں کئی آزاد حکومتیں بن گئیں۔ مصر پر احمد بن طولون پہلے ہی قابض تھا۔ طبرستان میں حضرت علی کی اولاد میں حسن بن نید نے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ یعقوب بن لیث نے سہستان اور ایران پر قبضہ کر لیا۔ ماوراء النہر میں سامانی حکومت مستحکم ہو گئی۔ مختلف مقامات پر جو بغاوتیں ہوئیں انہیں معتمد کے سہجائی موفق نے کچل دیا۔

معتمد کی کچی کچھی سلطنت اگرچہ ابھی کافی وسیع تھی مگر اس میں ہر طرف بد امنی کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں بھی معتمد نے امام حسن عسکریؑ پر نظر رکھی۔ حضورؑ کا ارشاد گرامی اس کے پیش نظر تھا کہ میرے بارہ جانشین ہوں گے اور بارہواں تمام دنیا کا نجات دہندہ ہوگا۔ معتمد گیا رہوئیں امام کو قتل کر کے بارہویں کا امکان ہی ختم کر دینے کی فکر میں تھا۔ شاید حضرت حجت کی ولادت اب تک اس کے علم میں نہیں آئی تھی۔

اس مقصد کے لئے معتمد نے اپنے ناصبی غلام نحریر کو امام کو گرفتار کر لینے کا

حکم دیا اور اس نے آپ کو گھر میں نظر بند کر دیا۔ وہ آپ کو اتنا پریشان کرتا تھا کہ خود اس کی بیوی مانع ہوئی تو اس نے غصے میں معتد سے کہہ کر آپ کو درندوں کے پنجے میں ڈلوادیا لیکن دوسرے آئمہ کی طرح درندے آپ کے سامنے بھی سرنگوں ہو گئے۔ درندوں سے بھی گئے گزرے تھے وہ انسان جو امام کے حضور درندوں کی اطاعت دیکھ کر بھی مطیع نہیں ہوئے بلکہ ان کا بغض اور زیادہ ہو گیا اور معتد نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آپ کو اپنی نگرانی میں قید رکھے گا۔

محل شہی میں خلوت گاہ کے قریب ایک تہہ خانہ تھا۔ معتد نے امام کو اسی میں قید کر دیا۔ جس میں خود اس کے علاوہ کسی شخص کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بنی امیہ کے نقطہ آغاز سے ہر حکمران اس فکر میں لگا رہا کہ آل محمد کی براہ راست نسل منقطع کر دے، پھر بنی عباس تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے۔ چنانچہ مامون کے دور سے حالات کا ایک جائزہ لیا جائے تو امام رضا کی عمر بغداد میں گٹ گئی۔ امام محمد تقیؑ آپ کی واحد یادگار ہے۔ پھر امام محمد تقیؑ کو مدینے میں رہنے کا کچھ موقع میسر آیا تو آپ نے پانچ بچے چھوڑے۔ منوکل کے دماغ میں بھی یہی دوسوہ تھا، اس نے امام علی نقیؑ کو مدت العمر قید میں رکھا کہ بیوی سے ملنے نہ پائیں اور استقرارِ حمل کا امکاں ہی پیدا نہ ہو۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ امام حسن عسکری کی ولادت مدینے میں ہو چکی ہے۔ اب امام حسن عسکریؑ نے بعد خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا لہذا اس نے آپ کو عزیز و اقارب اور بیوی سب سے علیحدہ کرادیا لیکن ہر ممکن روک تھام کے باوجود اپنے کو موٹلی سے بچانہ سکا۔ معتد نے امام حسن عسکریؑ کو اس وقت جس دوام میں رکھا، جب قرعون کا موٹلی عالم شہود میں آچکا تھا۔

یہ تہہ خانہ بالکل تیرہ و تار تھا۔ روشنی کا کوئی سوراخ بھی اس میں نہ تھا صرف ایک دروازہ تھا جو صبح و شام کھلتا تھا اور صرف کھانے پینے کی کوئی چیز اندر پہنچا دی جاتی تھی۔ معتد نے آپ کو قتل اس لئے نہیں کرایا کہ وہ پہلے ہی سے مختلف بغاوتوں سے دوچار تھا۔ ڈرتا تھا کہ اس نے ایسا کوئی قدم اٹھایا

تو ایک گروہ جانوں پر کھیل جائے گا پھر اس کو اپنے وفاداروں پر بھی اعتماد نہ تھا۔
اس کا مقصد یوں بھی پورا ہو رہا تھا۔ دو سال کی مسلسل قید نے
چوبیس سال کے امام کو ستر برس کا بوڑھا بنا دیا تھا۔

اسی زمانے میں قحط پڑا اور ایک بوڑھے راہب نے مٹھی میں کسی بٹی کی ہڈی
کا ٹکڑا زیر آسمان بلند کر کے اس کا حوالہ دے کر دعا کی تو بارش ہونے لگی اس
کرامت پر لوگ دین عیسوی کی طرف مائل ہونے لگے اور معتمد کو مجبوراً اسلام
کے اصلی محافظ سے رجوع کرنا پڑا۔ آپ نے حقیقتِ حال سمجھ کر ہڈی اس سے
لے لی اور راہب کو بھرے مجمع میں شرمندہ ہونا پڑا۔ پھر اپنے مصلیٰ بچھا کر دو گوت
نماز ادا کی اور دعا فرمائی تو موسلا دھار بارش ہوئی اور ساری خلقت کے
ساتھ معتمد کا سر بھی آپ کے سامنے خم ہو گیا مگر دل اب بھی نہیں جھکا اور قلبی
عناد اپنی جگہ پر رہا۔

اس واقعہ کے بعد معتمد نے امام کو گھر میں رہنے کی اجازت دے دی مگر
نگرانی کے لئے آدمی مقرر کر دیئے۔

خمس کی وصولیابی کے لئے آپ نے پہلے ہی اپنی طرف سے ابو جعفر محمد
عمری کو اپنا وکیل مقرر کر دیا تھا جو خمس کی رقم یکجا کرتے تھے اور آپ سے حکم حاصل
کر کے تقسیم کر دیتے تھے۔ آنے جانے والوں پر اب بھی روک ٹوک تھی مگر ابو جعفر
کسی نہ کسی بہانے حاضر ہو جاتے معتمد نے اس پر بھی پابندی لگائی لیکن کامیاب
نہ ہو سکا۔

ابو جعفر کے علاوہ کچھ لوگ اور بھی آپ کے معتمد تھے جو اطراف سے رقوم
خمس بھی وصول کرتے اور دوسری خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ علی ابن جعفر قیم
ابو ہاشم داؤد بن القسم المجعفری، داؤد بن یزید نیشاپوری، محمد بن علی بن ہلالی
عبداللہ بن جعفر الحمیری ممتی، ابو عمر عثمان بن سعید عمری، اسحاق بن ربیع کوئی ابوالقاسم
جابر بن یزید فارسی، ابراہیم بن دعبل نیشاپوری۔

ان میں ابو ہاشم داؤد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بھی بہلول
دانا کی طرح پانچ اماموں کی زیارت کی تھی۔

امام کی وفات

حضرت معاویہ کے عہد سے اس وقت تک سلاطین کا کامیاب ترین حربہ
زہر ہا تھا جس سے وہ دشمن کو راستے سے ہٹا بھی دیتے اور خود الگ تھلک بھی
رہتے۔ پھر وقت کا مورخ اسلام کے نام پر انھیں بے داغ ثابت کرنے میں لگ جاتا
معمد نے بھی یہی حربہ استعمال کیا۔ اظہار عقیدت کے لئے غلام کے ہاتھ
زہر آلود کھانا بھجوا دیا اور آپ نے اس کو نوش فرمایا۔

ماموں اعظم کے خوشہ ہائے انگور معمد کی نظروں میں تھے۔ اس نے بھی یہ
کھانا خاص طور سے امام کے لئے تیار کرایا تھا اور کھلایا بھی اس طرح کہ غلام
بیٹھا رہا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اتنا لذیذ کھانا آپ کو پسند بھی آیا یا نہیں؟
جب زہر کا اثر ہونے لگا تو معمد نے اپنے خاص طبیب عبداللہ کو علاج
کے لئے بھی بھیج دیا تاکہ کوئی دوسرا معالجہ تریاق دینے نہ پائے۔

تین دن اور تین راتیں حضرت نے کرب و بے چینی میں گزاریں، پھر صبح
ہوتے پانچ سال کے ایک صاحبزادے کو بلا کر ان کو سینے سے لگایا۔ دیر تک کانوں
میں کچھ کہتے رہے اور ۸ ربیع الاول ۶۶۰ھ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

معمد کا جنازہ

غسل و کفن گھر کے اندر ہوا اور انھیں صغیر بن صاحب زادے نے سب
کچھ کیا جنہیں امام نے آخر وقت سینے سے لگایا تھا۔ پھر میت نماز جنازہ کے
لئے رکھی گئی اور امام حسن عسکری کے بھائی جعفر نماز پڑھانے کے لئے کھڑے
ہو گئے لیکن عین وقت پر وہی صاحب زادے اندر سے نکل کر جنازے کے
قرب آگئے اور قدم بلند آواز سے فرمایا۔

”چچا! آپ ہٹیں، نماز میرے سوا کوئی پڑھا نہیں سکتا۔“

یہی ہمارے بارہویں امام حضرت حجّت تھے۔ اس کم سنی میں رسول کی نیابتِ مطلق کے فرائض آپ نے انجام دیئے اور پھر اندرونی حجرے میں چلے گئے۔ معتمد نے بھی مامون کی طرح امام حسن عسکریؑ کے مرنے پر صدمے کا اظہار کیا۔ عمائدین سلطنت نے بھی جنازے میں شرکت کی، باہر معتمد کے بھائی عیسیٰ نے نماز پڑھائی۔ اناطولیہ میں اس سے قبل کسی موت پر اکٹھا نہ ہوا تھا۔ قبر امام رضاؑ کے مزار کے قریب تیار تھی جہاں وہ صاحبزادے پہلے سے موجود تھے۔

اسٹیں چند لوگوں کے سوا کوئی پہنچا نہ تھا۔ انھوں نے میت قبر میں اتاری اور تدفین کر کے فوراً چلے گئے پھر امامت کا وہ باب بند ہو گیا جس کے بعد کا سلسلہ دامنِ قیامت سے جا کر مل جائے گا۔ (۱۱۹)

بارہویں امام

امیر المومنین حضرت امام مہدی آخر الزماں علیہ السلام

۹۔ ربیع الاول ۲۶۰ھ تا فترتِ قیامت

حسب و نسب

۱۵۔ شعبان ۲۵۵ھ کو صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی محمد بن الحسن ہے، معروف القاب مہدی آخر الزماں، صاحبِ امر، قائم آل محمد، حضرت حجت۔ صاحب العصر، امام غائب اور المنتظر ہیں۔ پدر بلند مرتبت امام حسن عسکری علیہ السلام اور مادر علیہ منزلت زرخشاں خاتون ہیں، جن کا اصل نام ملیکہ تھا اور جو حسن ریحانہ کے القاب سے بھی موسوم ہوئیں۔

حضرت زرخشاں خاتون

آپ قبصرِ روم کی پوتی تھیں، باپ کا نام ایشوعا تھا، ماں حضرت عیسیٰ کے وصی شمعون الصفا کی نسل سے تھیں۔

آپ کے جوان ہونے پر قیصر نے اپنے بھتیجے سے آپ کا رشتہ کر دیا مگر پادری جب رسم شادی ادا کرنے کے لئے بیٹھے تو تمام بیت اور صلیبیں اُوندھے منہ زمین پر گر پڑیں تخت کے پائے ٹوٹ گئے۔ دو لہا زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا، پادری کانپنے لگے۔ ان حالات کو فال بد سے تعبیر کیا گیا۔ نتیجے میں شادی ملتوی ہو گئی۔

دوسری بار دوسرے شہزادے سے نسبت ہوئی اور شادی کے لئے ہر ممکن احتیاط کی گئی لیکن وہی صورتِ حال پیش آئی۔

اسی رات آپ کو خواب میں جناب عیسیٰ نظر آئے، جن کے جلو میں شمعوں بھی تھے انہوں نے تخت کی جگہ ایک منبر نصب کر لیا پھر کچھ بزرگ اور شریف لائے جو حضرت محمد مصطفیٰ، حضرت علی مرتضیٰ اور ائمہ طاہرین تھے۔ حضرت عیسیٰ نے بصد عظیم آنحضرت کو منبر پر بٹھایا اور آپ نے حضرت عیسیٰ سے فرمایا۔

”میں اپنے بیٹے حسن عسکری کے لئے آپ کی بیٹی میکہ کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔“
حضرت عیسیٰ نے استغناء میں انداز میں شمعوں کی طرف دیکھا۔ شمعوں نے شہزادی میکہ سے پوچھا اور آپ نے فوراً حامی بھر لی۔

”یہ میرے نصیب کی بات ہوگی۔“

پھر آنحضرت نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ نے آپ کا عقد امام حسن عسکری سے پڑھ دیا۔

اب آپ سیدہ کوئین کی بہو تھیں۔ صبح کو آپ ڈری ڈری سی ایک اسجانی مسرت میں ڈوبی ہوئی بیدار ہوئیں مگر خواب کے اس واقعہ کا اظہار کسی سے نہ کیا۔ خوشی کی ایک لہر گدگدے میں دوڑ رہی تھی اور امام کی محبت میں کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ بس ہوتا تو پیر کا خدمت امام میں پہنچ جاتیں، کیونکہ اب وہ آپ کے لئے غیر تو نہیں رہے تھے۔ اس وقت سے آپ اپنے کو امام کی امانت سمجھنے لگی تھیں۔

اس ذہنی کش مکش میں آپ بیمار پڑ گئیں لیکن طبیعوں کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ دادا آپ کی حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ انہوں نے آپ سے پوچھا کہ کوئی خواہش ہو تو بیان کریں۔ آپ نے فرمایا۔

”سارے مسلمان قیدیوں کو چھوڑ دیں۔ شاید ان کی دعا سے میں اچھی ہو جاؤں۔“

دادا نے ایسا ہی کیا، پھر آپ نے اپنے کو سنبھال لیا۔

چار روز بعد آپ نے جناب فاطمہ زہرا اور جناب مریم کو خواب میں دیکھا۔ جناب مریم نے تعارف کرایا۔

”یہ امام حسن عسکری کی دادی ہیں۔“

آپ فاطمہ زہرا کا دامن پکڑ کر رونے لگیں اور بولیں

”امام مجھے دیکھنے نہیں آئے۔“

”کیسے آتے، تو نے ابھی اظہار ایمان تو کیا نہیں؟“ سیدہ عالمیان نے فرمایا
پھر آپ کو حکمہ طیبہ تعلیم فرمایا اور جب آپ نے کلمہ پڑھ لیا تو آپ کو سینے سے لگایا اور
سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”اب میرا بیٹا تجھ سے ملنے آئے گا“

اگلی ہی رات خواب میں امام تشریف لائے۔ آپ نے ان سے بہت شکایت
کی۔ انہوں نے کہا۔

”اب تم دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی ہو، میں آتا رہوں گا۔“

پھر آپ عالم رویا میں ہر شب زیارت سے مشغول ہوتی رہیں۔

ایک رات امام نے آپ سے فرمایا۔

”تمہارے دادا چند روز میں مسلمانوں سے لڑنے کے لئے ایک لشکر بھیجیں گے
پھر عقب میں خود جائیں گے۔ تم بھییں بدل کر کینزوں میں بل جانا اور دادا کے
پیچھے روانہ ہو جانا۔“

آپ نے ایسا ہی کیا اور مسلمان مجنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئیں۔

دادا نے آپ کو بہت پڑھایا لکھایا تھا، آپ کئی زبانیں جانتی تھیں۔ اس موقع
پر یہ زبان دانی کام آئی کینزوں کی تقسیم میں آپ جس شخص کے حصے میں پڑیں اس
سے عربی میں گفتگو کی، اس لئے آپ کے ساتھ اس کا برتاؤ کچھ نرم رہا۔ آپ نے اس
کو اپنا نام ملکہ کے بجائے زحس بنا دیا جو کینزوں کا سانام تھا۔ اس طرح بغیر سوچے
سمجھے آپ نے تقیہ اختیار کر لیا۔

امام علی نقی کا دور تھا۔ ایک دن امام نے بشیر بن سلیمان بردہ فروش کو بلایا

اور فرمایا۔

”میں ایک خاص کینز کی خریداری کے لئے تمہیں بھیجا چاہتا ہوں“

بشیر دودمان رسالت کا حلقہ بگوش تھا وہ ہمہ تن تیار ہو گیا۔ امام نے رومی زبان میں لکھا ہوا ایک خط سربہر کر کے اس کو دیا اور ایک سو بیس دینار کی ایک تھیلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بغداد میں فراڈ جل کے گھاٹ پر صبح کے وقت اسیروں کی چند کشتیاں آئیں گی ان میں بہت سی کینز ہوں گی، جن کے مختلف مالک ہوں گے۔ عمر بن زید نام کا بڑا فروش ریشمی کپڑوں میں لبوس ایک کینز کو پیش کرے گا مگر وہ کسی کو اپنا جسم چھونے بھی نہ دے گی۔ رومی زبان بولتی ہوگی۔ تم کو وہی کینز خریدنا ہے۔ پھر امام نے مزید تفصیل بتائی۔

”ایک خریدار اس کی قیمت تین سو دینار لگائے گا اور کہے گا کہ وہ اس کی پک دامن پر زیادہ راعب ہو گیا ہے۔ کینز جواب دے گی۔

”تو سلیمان بن داؤد کے جاہ و چشم کے ساتھ آئے تب بھی مجھے قبول نہیں۔“ کینز کا مالک کینز کو تنبیہ کرے گا۔

”مجھے تیرا سودا کرنا ہے اور تو کسی کو پسند نہیں کرتی۔“ کینز کہے گی۔

”جلدی نہ کر، میرا خریدار آنے ہی والا ہے۔“

امام علیہ السلام نے بشیر سے فرمایا۔

”اس وقت تم آگے بڑھنا اور کینز کے مالک عمر بن زید سے اجازت لے کر میرا خط کینز کو دے دینا۔“

بشیر نے امام کے ارشاد پر حرف بحرف عمل کیا اور ویسا ہی پیش آیا، جیسا امام نے کہا تھا پھر بشیر نے وہ خط کینز کو دے دیا اور کینز نے اپنے مالک سے کہہ دیا۔

”میں اس شخص کے ہاتھ بکنے کو تیار ہوں۔“

عمر بروہ فردوش نے کینز کے راضی ہو جانے پر منہ پھیلا دیا اور زیادہ رقم مانگنے لگا

مگر بشیر بھی اسی تجارتی برادری کا آدمی تھا۔ دونوں میں بڑی رد و قدح ہوتی رہی۔
آخر ایک سو بیس دینار پر سودا ہو گیا اور بشیر کنیز کو لے کر بغداد میں اپنی قیام گاہ
پر آ گیا۔

یہاں پہنچتے ہی کنیز نے خط کو نکالا، آنکھوں سے لگایا اور آنکھوں کو پونچھے
لگی جن میں آنسو بھر آئے تھے۔ بشیر نے متعجب ہو کر کہا۔
”آپ اس خط کو چوم رہی ہیں جس کے لکھنے والے سے آشنا تک نہیں۔“
کنیز نے کہا۔

”نہیں بشیر، تم کو معلوم نہیں کہ میں ان کی بہو ہوں۔“
پھر آپ نے تمام حالات بشیر سے کہہ سنائے اور اُس وقت سے بشیر کا رویہ
آپ کے لئے مودبانہ ہو گیا، پھر وہ آپ کو لے کر سامرہ کی طرف چل پڑا۔
ردم کی شہزادی جب امام علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس کے بشرے
سے کسی ملک کے جلال کے بجائے دوشیزگی کی جیا ٹپک رہی تھی۔ وہ بڑے احترام
کے ساتھ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی اور امام نے بڑھ کر اس کے سر کو سینے سے لگا لیا۔
پھر امام نے آپ کو اپنی بہن جلیسہ خاتون کے حوالے کیا، جنھوں نے آپ
کو ارکان دین اور تہذیب اسلام کی تعلیم دی۔

تختِ خیز ہے ان خواتین کی سیرت جنہوں نے محلوں میں آنکھ کھولی، کنیزوں
اور ماماؤں کے جھڑپ میں ناز و نعم سے بلیں بڑھیں، پھر خانوادہ امامت میں
آکر مصائب سے دوچار ہوتی رہیں مگر کسی کی زبان سے اُف تک نہیں نکلی، جن میں
جانبِ شہر بانواد حضرت نوحس خاتون کی عظمتوں کے سامنے تو سر جھیک جاتے ہیں
اور جب ان کا موازنہ اُم الفضل بنت مامون سے کیا جائے تو ان کی خاک کو
پکوں سے اٹھالینے کو جی چاہتا ہے۔

امام حسن عسکریؑ نے ازدواجی زندگی کا زیادہ وقت نہ گزارا تھا کہ باپ کی
شفقت سے محروم ہو گئے پھر کچھ دنوں بعد ہی مبتلائے زندان ہو گئے مگر ردم کی

شہزادی نے سوچا بھی نہیں کہ آپ نے قیصر کے پرشکوہ دارالامارہ میں پرورش پائی تھی بلکہ اس کے برعکس آپ سجادہ امامت سے وابستگی پر اپنے کو عرش نشین سمجھتی رہیں اور امام کے سامنے اس طرح سرطاعت خم کئے رہیں، جیسے واقعی آپ ان کی کنیز ہی ہوں۔

اور بیٹے کو پیدا ہوتے ہی کلمہ شہادت پڑھتے دیکھا تو فخر سے آپ کا سر بلند ہو گیا اور کیوں نہ ہوتا، آپ اس بچے کی ماں تھیں جس کے دم سے محمد منتهی ہونے والے تھے اور جس کے ظہور سے آپ کی خاتمت کا آخری باب لکھا جانے والا تھا۔

نورانیہ امام کے داہنے ہاتھ پر جبار الحق وزہق الباطل
کندہ تھا اور پشت پر مہر نبوت ثبت تھی (۱۲۰)

پرورش

یوں تو ہر امام معجز نما پیدا ہوا لیکن حضرت جغت کی ولادت میں لوازمہ منیت نے ایک نیاموڑ لیا اور بروایت شیخ صدوق چند مرفان سفید آسمان سے نازل ہوئے امام حسن عسکری نے اپنے گہر نایاب کو ان میں سے ایک مرع کے حوالے کیا جو ہر چالیس روز کے بعد آپ کو لے کر آتا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس لے جاتا۔

صورت شکل میں آپ حضور سے بہت مشابہ تھے، میانہ قد، گندم کوں رنگ بڑی آنکھیں، بلند اور پتلی ناک، چوڑی پیشانی، داہنے رخسار پر تل، چمکدار دانت کشادہ سینہ، دندانوں شانوں پر بڑی ہوائی زلفیں، صوفیائے کرام کے تصور کی طرح کمال پوش پیغمبر کا سراپا تھے۔ دو برس کے سن میں آپ پیروں چلنے لگے اور پانچ برس کے ہوئے تو آپ جوان معلوم ہوتے تھے۔

روح القدس کی آغوش آپ کا گہوارہ اور عرش الہی پالنا رہا تھا، پھر بھی آپ اپنے گھر سے ماناؤں نہ تھے، ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور باپ کے دل کی روشنی تھی۔ امام حسن عسکری نے آپ کی پیدائش کو دشمنوں کے ڈر سے چھپایا تھا۔ تاہم پانچ برس کی عمر میں کچھ لوگوں سے ملوایا تاکہ وہ آپ کے وجود پر

شاہد بن سکیس مکیں آپ کے حقیقی چچا جعفر کو بتایا نہیں گیا کیونکہ امام ان کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔

جعفر کو اس وقت علم ہوا جب آپ نمازِ جنازہ کے لئے اندر سے نکل کر آئے اور آپ کی آواز پر جعفر غروب ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

خونخوار بھیڑیے اور آہوئے سالت

امام مہدی کے وجود کی خبر پھیلی اور معتد تک پہنچی تو وہ سناٹے میں رہ گیا۔ امام حسن عسکریؑ کو شہید کر کے وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اب بارہواں امام پیدا ہی نہ ہوگا تو دشمنوں کا استیصال کیا کرے گا لیکن جب امام کے موجود ہونے کا سراغ لگتا تو اس کے حکم پر امام حسن عسکریؑ کے گھر پر چھاپہ مارا گیا۔ امام مہدیؑ پہلے سے کہیں منتقل ہو گئے تھے۔ گھر کا چہ چہ دیکھ ڈالا گیا اور ناکامی ہونے پر خواتین کرام کو گرفتار کر لیا گیا۔ کربلا کے بعد دوسری بار امام زادیاں دربار میں پیش ہوئیں۔ ان میں جناب زہراؑ خاتون بھی تھیں۔ عام حالات میں آپ اس چھوٹے سے دربار میں کھڑے ہو کر قیصر روم کو آواز دیتیں اور قسطنطنیہ میں ایک زلزلہ آجاتا مگر آپ کی منزلت کھلی حیثیت سے بہت زائد تھی۔ آپ ایک امام کی مقدس رفیقہ حیات اور قائم الامتہ کی برگزیدہ ماں تھیں۔ کوئی دنیاوی بادشاہ آپ کی نظر میں کیا سماتا آپ نے سرسراہ کی طرف اٹھایا اور بغیر کچھ کہے شہنشاہ کون دمکھان سے سب کچھ کہہ دیا۔

معتد کو خیال ہوا کہ شاید امام پیدا نہ ہوئے ہوں لہذا اس نے عورتوں کی نظر سے اطمینان کر لیا کہ ان میں سے کوئی حاملہ تو نہیں ہے؟ لیکن ایسی کوئی علامت کسی عورت میں پائی نہیں گئی تو انہیں چھوڑ دیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد امام مع اپنی والدہ گرامی سامرہ سے حلقہ چلے گئے اور ظالموں سے بچنے کے لئے چھپے رہے۔

معتد باللہ بن طلحہ

۲۹ھ میں معتد مر گیا اور منوکل کا پوتا اور معتد کا بھتیجا تخت نشین ہوا۔ اس

کا سارا وقت خانہ جنگیوں اور قرامطہ کے فتنوں میں گزرتا تھا پھر بھی اس نے حضرت حجت کی تلاش جاری رکھی۔

ایک بار معتضد کو پتہ چلا کہ امام ایک مکان میں قیام فرمائیں۔ اس نے اپنے ایک معتبر دوست اشیق کو چند سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ نصف شب کے قریب یہ لوگ اس جگہ پہنچے، دربان باہر موجود تھا۔ اشیق نے اس سے پوچھا۔

”کون رہتا ہے اس مکان میں؟“

”مالک مکان“ دربان نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ یہ لوگ مکان میں داخل ہو گئے اور دربان نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

اسخوں نے اندر جا کر دیکھا: کشادہ اور عالیشان مکان کے اندر تھوڑے فاصلے سے ایک خوشنما مکان تھا، جس کے متصل دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کی سطح پر ایک بزرگ چٹائی بچھائے مصروف عبادت تھے۔ اشیق کے ایک آدمی نے پانی میں اتر کر ان کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ آگے بڑھتے ہی ڈوبنے لگا۔ اشیق نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا پھر دوسرے آدمی نے ایسی ہی غلطی کی، وہ بڑی مشکل سے بچ تو گیا مگر بے ہوش ہو گیا۔

پھر ان سب نے بزرگ کی بہت منت سماجت کی لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور اسی محویت سے مصروف عبادت رہے۔

دوسری بار معتضد نے ایک اور کوشش کی۔ مکان میں ایک بزرگ خوش الحانی سے تلاوتِ کلام پاک کرتے پائے گئے پھر فریاد کے بیچ سے نکلے چلے گئے کسی کو ان کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ بالکل اسی طرح جس طرح رسول شبِ ہجرت نکل کر گئے تھے۔ (۱۲۱)

حضرت حجت کے نائب

غیبتِ صغریٰ کا آغاز ۹ ربیع الاول ۲۶۰ھ یعنی امامت کے پہلے دن

سے ہو گیا تھا۔ امام حسن عسکریؑ زندگی کے آخری دنوں میں اس کی ہدایت لے گئے تھے۔ عثمان بن سعید عمری قبیلہ بنی اسد کے بزرگ تھے۔ امام حسن عسکریؑ کے زمانے میں روغن فروشی کیا کرتے تھے اور روغن کی مشک میں رکھ کر مال خمس حضرت کو پہنچا یا کرتے تھے۔ حضرت حجت کی نیابت میں بھی ان کا یہی انداز کار رہا۔ خمس کے علاوہ لوگوں کی درخواستیں لے کر بھی خدمتِ امام میں پہنچاتے اور لوگوں کو ان کے جوابات لاکر دیتے رہے۔ بغداد میں ان کا مزار دروازہ جملہ کے قریب واقع ہے۔

پھر عثمان کے بیٹے ابو جعفر محمد بن عثمان نے اس منصب کا شرف حاصل کیا۔ یہ بھی اپنے عظیم المرتبت باپ کی طرح بڑی وفاداری اور دیانت سے خدمات انجام دیتے رہے اور دشمن کو امام کی ہوا تک نہ لگی۔ ۳۲۴ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی قبر دروازہ کوفہ میں سربراہ واقع ہے۔

حسین بن روح ابو جعفر محمد کے مقربین میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار تھے ان کی زندگی میں بھی ایسی خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ ابو جعفر محمد کے مرتے وقت حسین بن روح پائنتی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے حسین کو اس اعزاز کی مبارکباد دی اور خود ان کے پائیں بیٹھنے کی کوشش کی مگر حسین نے بیٹھنے نہ دیا۔

حسین بن روح سنی اور شیعہ دونوں میں ثقہ آدمی مانے جاتے۔ آپ نے بڑی محنت سے تقیہ میں رہ کر خدمتِ انجام دی۔ شعبان ۳۲۶ھ میں انتقال فرمایا اور بغداد کے محلہ نوبخت میں دفن ہوئے۔

ابوالحسن علی بن محمد سمیری ان کے قائم مقام ہوئے اور ان کے ذریعہ امام سے ان کو رابطہ قائم رہا لیکن ۱۵ شعبان ۳۲۹ھ کو آپ کی وفات سے قبل امام کا فرمان صادر ہو گیا۔

و علی بن محمد سمیری! خدا تیرے بھائیوں کو تیری مصیبت میں صبر عظیم عطا فرمائے تو چھ دن کے اندر اندر مرنے والا ہے۔ پس تیار ہو جا اور کسی کو اب وصیت نہ کر کہ وہ تیرا قائم مقام ہو کیونکہ غیبتِ کبریٰ

واقع ہو گئی ہے۔ اب میں ظاہر ہوں گا مگر بعد اذنِ خدا، اور یہ ایک طولانی مدت کے بعد ہو گا۔ جب کہ لوگ قسماً القلوب ہو جائیں گے۔ زمین جو رے سے بھر جائے گی۔ عنقریب بعض شیعہ مشاہدے کا دعویٰ کریں گے مگر جو خروجِ سفیانی اور صحیفۂ آسمانی سے پہلے مشاہدے کا داعی ہو وہ جھوٹا اور مفتری ہے۔“ (۱۲۳) (بابِ بیہوشی از مولانا میر ظفر حسن ص ۲۲)

اس کے جواب میں علی بن محمد سمری نے ایک عرضداشت کے ذریعہ دریافت کیا کہ دینی مسائل کی طرح حل ہوں گے؟ اس کا جواب یہ آیا کہ ہماری احادیث کے راویوں سے رجوع کیا جائے اور ان کے بیان کو حجت قرار دیا جائے اور ان کی مخالفت کو کفر سمجھا جائے۔

اب چار ناہمین کے علاوہ اہام کے بعض سفراء اور بھی تھے۔ ربط بھی عموماً ان ناہموں کے ذریعہ ہی قائم ہوتا تھا پھر بھی کوئی دُور سے کبھی کبھی ایک جھلک دیکھ لیتا تھا۔

بغداد سے عاجز، بلالی، عطارد، کوفہ سے عاصمی، اہواز سے محمد بن ابراہیم ہمدان سے محمد بن صالح۔ رے سے بسامی و اسدی۔ آذربائیجان سے قسم بن علاء نیشاپور سے محمد بن شاذان۔ قسم سے احمد بن اسلمی۔ لیکن اب ہر ایک کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور اہام قیامت تک کے لئے نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔

۹ ربیع الاول ۲۶۰ھ سے اہام کن کن جگہوں پر رہے اور کب غار میں داخل ہوئے؟ اس کا تعین ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی وہ غار میں داخل ہو کر برآمد نہیں ہوئے جسٹس امیر علی لکھتے ہیں۔

”حسن کا کم سن بچہ، جس کی عمر کل پانچ برس تھی، باپ کی جدائی سے گھبرا کر ایک غار میں، جو گھر کے نزدیک ہی تھا، داخل ہوا۔ اس غار سے وہ بچہ پھر واپس نہ آیا۔ اس جاگمگاز مصیبت نے پیروانِ حسین کو بڑی بڑی امیدوں سے لرز کر رکھا،

ان کا خیال ہے کہ یہ بچہ اس گناہگار اور غمزہ دُنیاکو گناہوں اور ظلموں کے بوجھ سے
نجات دینے واپس آئے گا۔“

”چودھویں صدی مسیحی تک، جب کہ ابن خلدون اپنی مہتمم بائبل
کتاب حوالہ قلم کر رہا تھا تو یہ دستور تھا کہ شیعہ لوگ شام کے
وقت اس غار کے منہ پر جمع ہوتے اور بمقت و سماجت اس بچے
سے واپس آنے کی درخواست کرتے، پھر بہت دیر تک انتظار کر کے
دل شکستہ و مایوس اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔“ (۱۲۳)

سامرہ کو حضرت سام بن نوحؑ نے آباد کیا تھا۔ خلیفہ معتمد نے اس کو فوجی
چھاونی بنایا اور اس کا نام ”سمرن رار“ رکھا یعنی جو دیکھے، وہ خوش ہو جائے
جو کثرت استعمال میں ”سمرن رائے“ ہو گیا۔ یہیں حضرت حجت کے غائب ہونے
کا سرداب، ایک مسجد کے قریب واقع ہے اور امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ
کے مزاروں سے قریب ہے۔ یہ سرداب ایک غار کے اندر ہے جس کو کچھ لوگ
اس زمانے میں بھی جانتے تھے اور اب تو دُور دور تک کے لوگ واقف ہیں۔
امام جب اس غار کی طرف چلے ہوں گے تو کچھ لوگ رخصت کرنے ضرور آئے
ہوں گے۔ ان میں علیہ منزلت نرجس خاتون بھی ہوں گی اور جناب حکیمہ خاتون
بھی۔ کس قدر جذبات آفریں ہو گا وہ منظر، جب امام ہمیشہ کو غائب ہونے کے لئے
غار کی طرف جا رہے ہوں گے اور پروانہ وار فدا ہونے والے انہیں جاتے دیکھ
رہے ہوں گے۔

امام نے تو صبر کی سب سے بڑی بات کی ہو گی کیونکہ وہ امام تھے لیکن ماں اور
بچہ بھی نے کن آنکھوں سے آخری بار دیکھا ہو گا؟ اس کا اندازہ صرف محسوسات
سے لگایا جاسکتا ہے تاہم بعض روایات کی رو سے ان لوگوں کو اور بعض دوسرے
عقیدت مندوں کو کبھی کبھی زیارت کا شرف حاصل ہوا جن میں بغداد، ہمدان
وغیرہ کے لوگ شامل ہیں۔

بغداد والوں میں ابو القاسم بن رئیس، ابو عبد اللہ بن فردغ، مسرور الطباخ
احمد و محمد پسران حسن، اسحاق کاتب، صاحب الغراء، صاحب الصقرۃ المختومۃ، ابو القاسم
بن ابی جلیس، ابو عبد اللہ الکندی، ابو عبد اللہ الجندی، ہارون الغراز اور النیسلی
ہمدان کے رہنے والوں میں محمد بن کثمد، جعفر بن ہمدان۔

دینور کے باشندوں میں حسن بن ہروان، احمد بن ہروان
اصفہان سے ابن باز شام، ضیمر سے زیدان۔ قم سے جن بن نصر، محمد بن محمد بن علی بن محمد
ابن اسحاق، محمد بن اسحاق، حسن بن یعقوب۔ رے سے قسم بن موسیٰ، فرزند قسم، ابن محمد
بن ہارون، صاحب الحماقہ، علی بن محمد، محمد بن یعقوب کلینی، ابو جعفر الرقار
قرزین سے مرداس، علی بن احمد، فارس سے الجروج، شہرور سے ابن الجبال
مرو سے صاحب الالف دینار، صاحب المال والرفۃ البیضا ابوثابت قدس سے جروح
نیشاپور سے محمد بن شعیب، یمن سے فضل بن یزید، حسن بن فضل، جعفری
ابن الاعرجی، شمشاطی۔

مصر سے صاحب المولودین، صاحب المال، البرجاء۔ نصیبین سے ابو محمد
بن الوجنا، ابو از سے الحصبی۔

لیکن ۱۵ شعبان ۲۶۹ھ کے بعد پھر کسی نے امام کو نہیں دیکھا؟ آپ کہاں
چلے گئے؟ اس کو خدا ہی جانتا ہے۔ بعض روایات سے جزیرۃ خضرا میں آپ کے
قیام کا پتہ چلتا ہے اور جزیرۃ خضرا کا مقام بھی متعین کیا جاتا ہے لیکن یہ سب
قیاس کا کوشش ہے۔ اس سے صرف عالم الغیب واقف ہے کہ اس نے امام کو
کہاں رکھا ہے؟

غیبتِ صغریٰ میں امام مہدی کا بیشتر کام تو یہی تھا کہ فقہی سوالات
کے جوابات دے کر لوگوں کو تشفی کرتے اور مشیتِ الہی پر شاکر رہنے کی تلقین
فرماتے، پھر بھی بعض خطوط کے جوابات بھی آپ نے دیئے ہیں جن میں ایک
خط شیخ صدوق کے نام ہے۔ آپ نے غیبتِ صغریٰ میں ہوش سنبھالا اور امام

کی خدمت میں عرضداشت روانہ کیں۔ امام نے ان کا جواب غایت فرمایا اور زمانے کو دیکھتے ہوئے تقیہ میں رہ کر تبلیغ دین کی تلقین کی۔ ایک خط شیخ مفید کے نام بھی جو غیبت کبریٰ کا معلوم ہوتا ہے۔

اسلحی بن یعقوب کے خط میں آپ نے محمد بن یعقوب کلینی کے استفسارات کے جوابات دیئے ہیں۔

”جو ہمارا منکر ہے، وہ ہم میں سے نہیں۔ میرے عزیزوں میں سے جو مخالفت کرتے ہیں، ان کی مثال پسر نوح اور برادران یوسف کی ہے۔ جو کی شراب حرام ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ امام حسین قتل نہیں ہوئے، وہ کافر جھوٹے اور گمراہ ہیں گانے والی کی اجرت و قیمت حرام ہے جس ہمارے سادات شیعہ کے لئے حلال ہے۔ زیارتِ ناحیہ بھی غیبتِ صغریٰ ہی میں امام سے حاصل ہوئی جس سے شہداء کربلا کے اسمائے مقدس کا تعین ہو جاتا ہے۔

غیبتِ کبریٰ میں بہت سے معجزات آپ سے منسوب ہیں۔ ان میں ایک حجرِ اسود کی تنصیب بھی ہے۔ قرامطہ نے جب حجرِ اسود کو نکال کر دوبارہ نصب کرنے کی کوشش کی تو وہ صحیح جگہ پر نصب ہی نہ ہوتا تھا کہ اتنے میں ایک خبر و جوان، ایک طرف سے آیا۔ اس نے حجرِ اسود کو صحیح جگہ نصب کیا اور جدھر سے آیا تھا ادھر ہی چلا گیا۔ کسی کو نہیں معلوم یہ نوجوان کون تھا۔

وقتِ ظہور

امام کی طولِ عمر ایک بحثِ طلبِ مسئلہ ہے اور وقتِ ظہور بھی مقرر نہیں کیا جا سکا۔ تاہم ابھی حضرت سام کے پوتے کی عمر حضرت نوح کے برابر نہیں پہنچی ہے جو لوگ حیاتِ الیاس و خضر کے قائل ہیں انہیں تو آپ کے بقید حیات ہونے کا اعتراف کر ہی لینا چاہیے۔ رہ گئی ظہور کے وقت کی بات تو وہ حکمِ الہی کا پابند ہے، جب اشارہ ہوگا تو سقفِ کعبہ سے اذان کی آواز بلند ہو جائے گی۔

علاماتِ ظہور میں چند نمایاں باتیں بیان کی گئی ہیں۔ علمِ دنیا سے اٹھ

جائے گا۔ عمل کم ہو جائے گا۔ قاتل زیادہ ہو جائیں گے، اور ہادی و فقہاء کم۔ عالم خیا و گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔ شعراء بڑھ جائیں گے۔ قبرستان مسجدوں میں بدل جائیں گے۔ قرآن و مساجد کی زیب و زین زیادہ ہوگی۔ خلوص نیت ناپید، افعال قبیحہ غالب ہوں گے۔ ظلم و فساد بڑھ جائے گا۔ لوگ ایک دوسرے کو بُرے کاموں پر اکسائیں گے اور نیک کاموں سے روکیں گے۔ مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے حاجت پوری کریں گی۔ امراء کا فراد علماء فاجسہ ہو جائیں گے۔ اہل الرائے کی سوچ کج ہو جائے گی اور غبی الذہن کا مشورہ قابل قبول ٹھہرے گا۔ زمین تین مرتبہ دھسنے لگی۔ مشرق و مغرب اور جزیرہ نما عرب میں دجال سجتان میں پیدا ہوگا اور سفیانی حشر دج کرے گا۔

اس طرح کی اور بھی علامات ہیں جب وہ سب ظاہر ہوں گی تو امام علیہ السلام کا ظہور ہوگا۔

شانِ ظہور

آپ تشریف لائیں گے تو بڑی سطوت و جبروت کے ساتھ تاہم نہایت خاموشی سے کئے میں ظہور فرمائیں گے۔ سر پر زرد رنگ کا عمامہ، دوش پر عساکر تہاب کی چادر، پاؤں میں حضور کی نعلین، آگے آگے چند بھیڑیں چلتی ہوئی تاکہ کوئی پہچان نہ سکے، یکہ و تنہا بغیر کسی رفیق کے داخل کعبہ ہوں گے۔

ملائکہ رات کی تاریکی میں صف بصف عرش سے اتر کر آئیں گے۔ حضرت جبریل اور حضرت میکائیل حاضر خدمت ہو کر نوید ظہور پہنچائیں گے اور آپ کن حجر اسود اور منقار ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر آواز دیں گے۔

”آجاؤ، میرے فلا کار و باظہور کا وقت آگیا۔“

اور تین سو تیرہ آدمی ہوا کے دوش پر دنیا کے مختلف حصوں سے سمٹ کر آجائیں گے۔

کتنا نظر افروز ہوگا ظہور کا یہ منظر۔ ایک ابر سفید سر پہ سیاہ ننگ

ہوگا۔ سرور کائنات کی زرہ جسم پر اور آپ کی تلوار پہلو میں ٹنگ ہی ہوگی۔ جبرائیل داہنی طرف، میکائیل بائیں جانب ایستادہ ہوں گے اور تین سوتیرہ نقیب آپ کو گھیرے میں لئے ہوئے جدارِ کعبہ سے ٹیک لگا کر آپ کھڑے ہوں گے۔ جبرائیل کی آواز فضا میں گونجے گی اور مہربان پہنچ جائے گی۔ (۱۲۴)

عیسیٰ عرش سے اتر کر آئیں گے۔ سقفِ کعبہ پر آپ خود اذان دیں گے، پھر امامتِ نماز آپ فرمائیں گے۔ عیسیٰ آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور دنیا کو بتائیں گے کہ اب کوئی مذہب نہیں سجزِ دینِ اسلام کے۔

اور پھر واقعی توحید کا بول بالا ہوگا اور صرتِ محمد اور آلِ محمد کا دور دورہ ہوگا۔ ہماری نسلوں پر نسلیں ایک امید پر گزرتی چلی جا رہی ہیں مگر وہ دن آئے گا ضرور جب خونِ سادات کا انتقام لیا جائے گا اور ظالموں کو ان کے کئے کی سزا ملے گی۔ خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو اس روزِ سعید کو دیکھیں گے!

آئیں گے وہ تو آئیں گے اس کو دفر کے ساتھ
دامن سے ان کے دامنِ محشر متبہا ہوا

آخذ

- ۱ کنت کنز الخفياً اجبت ان اعرف فخلقناک یا محمد!
- ۲ اول ما خلق الله آدمی - مدارج النبوة حصہ دوم ص ۱ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی - مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء
- ۳ کنت نبیاً و آدم بین الماء والطين - مدارج النبوة حصہ دوم ص ۲ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی - مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء
- ۴ مدارج النبوة حصہ دوم ص ۳ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۵ خلقت انا و علی من نور واحد - غبقات الانوار، حدیث نور ص ۱۰۸ مطبع مشرق الانوار لکھنؤ ۱۳۰۳ھ بحوالہ بیحیۃ المجالس از مصطفیٰ بن عبداللہ قسطنطینی (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۶ مدارج النبوة حصہ دوم ص ۳ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۷ مدارج النبوة حصہ دوم ص ۱ از علامہ محمدت دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۸ "مضمون قرآن مجید کی برکتیں" از علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی مشمولہ نزول قرآن مجید - شمارہ خاص "خاتون پاکستان" کراچی ۱۳۸۷ھ، ص ۵۳
- ۹ "مضمون فرقان، تنزیل قرآن" از مولانا محمد عبدالباری فرنکی محلی مشمولہ نزول قرآن مجید شمارہ خاص "خاتون پاکستان کراچی" ۱۳۸۸ھ، ص ۸۷ (دوہ)
- ۱۰ اسپرٹ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۹۲ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

۱۹۷۳ء بحوالہ لکچر پروفیسر فکرم (مؤلف)

- ۱۱ اسپرٹ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۹۵ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۳ء
- ۱۲ "مضمون فرقان، تنزیل قرآن" از مولانا محمد عبد الباقی فرنگی محلی مشمولہ نزول قرآن مجید شمارہ خاص خاتون پاکستان "کراچی ۱۳۸۷ھ، ص ۹۷
- ۱۳ مدارج النبوة حصہ دوم ص ۶ از شیخ علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۱۴ مدارج النبوة حصہ دوم ص ۷ از شیخ علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۱۵ مدارج النبوة حصہ دوم ص ۳۲ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۱۶ اسوۂ علی از رئیس احمد جعفری ندوی ص ۲۶ مطبوعہ آفتاب اکیڈمی کراچی ۱۹۷۳ء
- ۱۷ مدارج النبوة حصہ دوم ص ۳۸ از علامہ محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۱۸ تاریخ احمدی ص ۱۵ بحوالہ الخصائص محدث نسائی، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۵۲ء (مؤلف)
- ۱۹ الاستیعاب جلد ۲ از علامہ عبد البر قرطبی ص ۲۲۵ مطبوعہ محمد آباد رکن (مکتبہ العلوم کراچی)
- ۲۰ اسپرٹ آف اسلام از حبش امیر علی رازو ترجمہ ص ۹۸ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۳ء (مؤلف)
- ۲۱ صحیح البخاری جلد ۳ ص ۱۹۲ اور ص ۲۳۲ مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر ۱۳۵۵ھ (مکتبہ العلوم کراچی)
- ۲۱ تاریخ ملت عربی ترجمہ ہاشمی فرید آبادی مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۱۷۵

- ۲۲ اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۱۹۷۲ء، ص ۱۳۳ (مؤلف)
- ۲۳ مدارج النبوة حصہ دوم از شاہ عبدالحق محدث دہلوی ص ۹۲ مطبوعہ
مدینہ پیشنگ کمپنی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۲۴ مدارج النبوة حصہ دوم از شاہ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۴ مطبوعہ
مدینہ پیشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۲۵ الفاروق از مولانا شبلی نعمانی ص ۶۴ مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور (مؤلف)
- ۲۶ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۴۵ مطبوعہ دار المصنفین اعظم (مؤلف)
- ۲۷ الحیوۃ الحیوان جلد ۱ ص ۲۷ مطبع المعاهد بجوار قسم الحیالید
بالقاهرہ، مطبع حجازی قاهرہ (مکتبہ العلوم کراچی)
- ۲۸ مدارج النبوة حصہ دوم ص ۲۹۷ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ
مدینہ پیشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۲۹ المجموع البحرین ص ۱۸ مطبوعہ تہران ایران ۱۳۱۴ھ
(مکتبہ العلوم کراچی)
- ۳۰ الدر المنثور جلد ۶ ص ۷۷ مطبوعہ مہمند مصر ۱۳۱۴ھ
(مکتبہ العلوم کراچی)
- ۳۱ ماخوذ از مدارج النبوة مطبوعہ مدینہ پیشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء
ص ۱۱۱، ص ۱۱۲ (مؤلف)
- ۳۲ روضۃ الصفا جلد ۲ ص ۱۵۸ مطبع نو کشور لکھنؤ ۱۹۱۴ء (مکتبہ العلوم کراچی)
- ۳۳ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دار المصنفین اعظم
ہندوستان، ص ۶۸ (مؤلف)
- ۳۵ مدارج النبوة از شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پیشنگ کمپنی کراچی
۱۹۷۵ء، ص ۲۸ (مؤلف)

- ۳۶ مدارج النبوه از شاه عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی
۱۹۵۵ء، ص ۵۱۳ (مؤلف)
- ۳۷ مدارج النبوه از شاه عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی
۱۹۵۵ء، ص ۵۲۳ (مؤلف)
- ۳۸ السيرة الحلیہ، جلد ۲، ۲۳۳ مطبوعہ مصطفیٰ البابی
الحلی مصر ۱۳۴۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۳۹ مدارج النبوه از شاه عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی
کراچی ۱۹۵۵ء، ص ۵۳۰ (مؤلف)
- ۴۰ مدارج النبوه از شاه عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی
۱۹۵۵ء، ص ۵۸۶ (مؤلف)
- ۴۱ المسند احمد ابن حنبل جلد ۳، ۲۸۳ مطبع میمنہ مصر ۱۳۱۳ھ
(مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۴۲ مدارج النبوه از علامہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ پبلشنگ کمپنی
کراچی ۱۹۵۵ء، ص ۶۴۹ (مؤلف)
- صحیح المسلم جلد ۴، باب فضائل علی ص ۱۱۰، ۱۰۹ مطبع مصطفیٰ
البابی الحلی مصر ۱۳۴۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۴۳ ذخائر العقبیٰ از محب الدین احمد بن عبد اللہ طبری
مکتبۃ القدسی قاہرہ ۱۳۵۶ھ، ص ۲۵ (مکتبۃ العلوم کراچی)
- قرآن مجید تفسیر مابہ، مولانا اشرف علی تھانوی، بر حاشیہ۔
- ۴۴ مدارج النبوه از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔
۱۹۵۵ء، ص ۶۹۳ (مؤلف)
- ۴۵ صحیح البخاری جلد ۱، ص ۲۵ جلد ۲، ص ۱۳۱، جلد ۳، ص ۱۶۵، جلد
۵، ص ۱۹۲ مطبع مصطفیٰ البابی الحلی مصر ۱۳۴۹ھ

(مکتبۃ العلوم کراچی)

تاریخ ابن خلدون اردو ترجمہ حصہ اول ص ۲۰۸ مطبوعہ نفیس اکیڈمی
کراچی ۱۹۷۶ء (مکتبۃ العلوم کراچی)

۴۶ روضۃ الصفا جلد ۲، ص ۲۰۸ سطر ۱۶ مطبع نکلشور لکھنؤ ۱۹۱۲ء (مکتبۃ العلوم کراچی)

۴۷ غیاث اللغات ص ۲۷ مطبوعہ نکلشور پریس لکھنؤ (مؤلف)

۴۸ صحیح البخاری جلد ۲ باب تزویج المبنی ص ۲۱۶، جلد ۳ ص ۱۸۹

مطبع المصطفیٰ البابی الحلبي مصر ۱۳۲۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۴۹ تاریخ احمدی ص ۱۰۷ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۵۲ھ بحوالہ

سیرۃ الحلبيہ (مؤلف)

۵۰ تاریخ احمدی ص ۱۰۵ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۵۲ھ بحوالہ

جذب القلوب (مؤلف)

۵۱ خلافت و ملکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۳۰۹ مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن

لاہور ۱۳۸۸ھ (مؤلف)

۵۲ صحابیات از علامہ نیاز فتحپوری ص ۵۸ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۶ء (مؤلف)

۵۳ صحیح البخاری جلد ۱ باب الخسل بالصاع مطبع المصطفیٰ البابی

مصر ۱۳۲۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۵۴ صحیح المسام جلد ۳، ص ۱۲۳ مطبع المصطفیٰ البابی الحلبي مصر

۱۳۲۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۵۵ المستند امام احمد بن حنبل الجزء الثاني ص ۲۶ مطبع المیمینہ

مصر ۱۳۱۳ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۵۶ الملل والنحل از امام ابوالفتح محمد بن عبد الکریم شہرستانی

ص ۲۵، ص ۲۶ مطبع حیدری جمعی ۱۳۱۲ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۵۷ الفاروق از شبلی نعمانی ص ۸۳ مکتبۃ رحمانہ لاہور (مؤلف)

- یحقوبی جلد ۲، ۹۳ مطبوعه دارالفکر بیروت ۱۳۷۸ هـ
(تاریخ یعقوبی) (مکتبۃ العلم کراچی)
- ۵۸ الملل والنحل از شهرستانی مطبع حیدری بمبئی ۱۳۱۲ هـ
(مکتبۃ العلم کراچی)
- ۵۹ مدارج النبوه از شاه عبدالغنی محمدت دہلوی ۶۹۸ مطبوعه مدینہ
پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۶۰ صحابیات از علامہ نیاز فتحپوری ۲۹ مطبوعه نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء
بحوالہ استیعاب (مؤلف)
- ۶۱ مدارج النبوه از علامہ عبدالغنی محمدت دہلوی ۷۰۹ مطبوعه مدینہ پبلشنگ
کمپنی ۱۹۷۵ء (مؤلف)
- ۶۲ المعارف از ابن قتیبہ دینوری ۷۶ مطبع رحمانیہ مصر
۱۳۵۳ هـ (مکتبۃ العلم کراچی)
- ۶۳ البدایہ والنہایہ جلد ۶، ۳۲۳ از علامہ ابن کثیر مطبوعه
السعادتہ مصر ۱۳۵۸ هـ (مکتبۃ العلم کراچی)
- ۶۴ تاریخ اہتم کوفی اردو ترجمہ مکتبۃ تعمیر ادب لاہور، ۱۳۷۲ (مؤلف)
- ۶۵ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعه دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۹۵۲ء (مؤلف) ۱۳۸
- ۶۶ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعه دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۹۵۲ء، ۲۲۸ (مؤلف)
- ۶۷ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعه دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۹۵۲ء، ۲۵۸ (مؤلف)
- ۶۸ خلافت و ملوکیت از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ۱۱ مطبوعه ترجمان القرآن
لاہور ۱۹۸۸ء (مؤلف)

- ۶۹ الاستیعاب جلد ۱ ص ۶۰ مطبع دائرة المعارف النظامیه حیدرآباد
دکن ۱۳۳۶ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۷۰ تاریخ الطبیبی جلد ۵ ص ۱۷۲ مطبع حسینیه مصر (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۷۱ تاریخ اسلام از شاه معین الدین ندوی ص ۳۳۲ مطبوعہ دار المصنفین اعظم
گڑھ ۱۹۵۲ء (مؤلف)
- ۷۲ ہسٹری آف میراسنز اردو ترجمہ ص ۸۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی
۱۹۷۹ء (مؤلف)
- ۷۳ خلافت و ملکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۳۸ مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن
لاہور ۱۹۸۸ء (مؤلف)
- ۷۴ تاریخ التواریخ کتاب الصغیر ص ۳۱۵ مطبع آقا میر باقر تبریزی ۱۳۱۳ھ
(مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۷۵ تاریخ سندھ از مولانا ابو ظفر ندوی ص ۳۳۳ مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ
۱۹۷۷ء (مؤلف)
- ۷۶ تاریخ اسلام از ذاکر حسین جلد ۳ ص ۲۲۲ مطبوعہ دہلی ۱۳۳۱ھ (مؤلف)
- ۷۷ تاریخ فرشتہ مطبوعہ لوک شور لکھنؤ ص ۹ (مؤلف)
- ۷۸ تاریخ اسلام از شاه معین الدین ندوی ص ۳۵۲ مطبوعہ دار المصنفین
اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مؤلف)
- ۷۹ تاریخ اسلام از شاه معین الدین ندوی ص ۲۸۹ مطبوعہ دار المصنفین
اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مؤلف)
- ۸۰ تاریخ ابوالفدا جلد ۱ باب ذکر تسلیم المحسن ص ۹۷ مطبوعہ
دار الطباعة العربیة بیروت (لبنان) مکتبۃ العلوم کراچی
- ۸۱ صحیح البخاری جلد ۱ باب قبلہ ص ۷۱ مطبوعہ المصطفیٰ الیابی
الحلبی مصر ۱۳۵۵ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

- ۸۱ صحیح البخاری باب سہو ۱۵۱ مطبوعہ (المصطفیٰ البیاضی)
الحلی مصر ۱۳۵۵ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۸۲ خلافت و طوکیۃ از سید ابوالاعلیٰ امجد دی ۱۶۶ مطبوعہ ادارۃ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۸۸ء (مؤلف)
- ۸۳ عقد الفرید جلد ۲ ۳۳۳ مطبوعۃ المجالیۃ مصر ۱۳۳۱ھ
(مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۸۴ نیایع المودۃ از شیخ سلیمان قندوزی ۹۷ مطبوعہ
اختر اسلامبول ۱۳۱۵ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۸۵ حبیب السیر جلد جزو سوم ۸۵ مطبوعہ ممبئی
(مدرسۃ اللو اعظمین لکھنؤ)
- ۸۶ صواعق المحرقہ ۱۳۱ مطبع عینیہ مصر ۱۳۱۱ھ
(مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۸۷ شہادت حسین از مولانا ابوالکلام آزاد ۸۷ مطبوعہ اربستان لاہور
۱۹۶۶ء (مؤلف)
- ۸۸ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین نوری ۵۴ مطبوعہ دار المصنفین
اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مؤلف)
- ۸۹ شہادت حسین از مولانا ابوالکلام آزاد ۸۷ مطبوعہ اربستان لاہور ۱۹۶۶ء (مؤلف)
- ۹۰ جلاء العینین فی سیرۃ علی ابن الحسین ۵ مطبع اثناعشری
دہلی ۱۳۳۹ء (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۹۱ المعارف ابن قتیبہ دینوری ۹۵ مطبع رحمانیہ مصر
۱۳۵۳ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
- ۹۲ سر الشہادتین از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ۱۶۱۵۱۱۵ مطبع پبلیکیشن لاہور
۱۹۶۶ء شہادت حسین از مولانا ابوالکلام آزاد ۵۰۴ مطبوعہ اربستان لاہور ۱۹۶۶ء

واقعات مندرجہ ذیل کتب سے ماخذ ہیں۔ ۹۸

تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دار المصنفین اعظم
کراٹھ ۱۹۵۲ء

سرة الشهداء تین از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی مطبوعہ امامیہ پبلیکیشنز لاہور
شہادت حسین از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ ادبستان لاہور ۱۹۶۵ء
الحسین از مولانا آغا مہدی آل غفران ماب مطبوعہ جمعیت خدام عزرا کراچی
چودہ شمارے از مولانا سید نجم الحسن کراچی مطبوعہ رضا پبلیکیشنز لاہور
امت اور اہل بیت مولفہ سید بشارت علی مطبوعہ کاظمی پریس چیمبر آباد
دکن ۱۹۴۴ء

امام زین العابدین کی سیاسی زندگی از سید محمد باقر شمس مطبوعہ دارالتصنیف
رضویہ کالونی کراچی

بحار الانوار از علامہ مجلس اردو ترجمہ مطبوعہ رضویہ بک ایجنسی کراچی ۱۹۸۰ء

۹۶ شہادت حسین از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ ادبستان لاہور ۱۹۶۶ء (مؤلف)

۹۷ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دارالتصنیف اعظم کراٹھ
۱۹۵۲ء (مؤلف)

۹۸ ہسٹری آف ایران از جسٹس امیر علی اردو ترجمہ ۹۱ مطبوعہ اردو اکیڈمی
سندھ ۱۹۶۵ء (مؤلف)

۹۹ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ۹۱ مطبوعہ دار المصنفین
اعظم کراٹھ ۱۹۵۲ء (مؤلف)

۱۰۰ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ۸۵ مطبوعہ دار المصنفین
اعظم کراٹھ ۱۹۵۲ء (مؤلف)

۱۰۱ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ۹۰ مطبوعہ دار المصنفین

اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)

- ۱۰۲ المساب الاشراف از احمد بن یحییٰ جابر بلاذری جلد ۵
۲۷۴ (شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)
- ۱۰۳ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ دوم ۱۸۷ مطبوعہ المصنفین
اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)
- ۱۰۴ ہسٹری آف سیراسنر از حبش امیر علی، اردو ترجمہ ۱۶۴ مطبوعہ اردو
ایڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)
- ۱۰۵ ہسٹری آف سیراسنر از حبش امیر علی، اردو ترجمہ ۲۰۵ مطبوعہ اردو
ایڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)
- ۱۰۶ ہسٹری آف سیراسنر از حبش امیر علی اردو ترجمہ ۲۰۲ مطبوعہ اردو
ایڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)
- ۱۰۷ ہسٹری آف سیراسنر از حبش امیر علی اردو ترجمہ ۲۳۵ مطبوعہ اردو
ایڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)
- ۱۰۸ واقعات مندرجہ ذیل کتب سے اخذ کئے گئے۔
مصائب الشیعہ پنجم دہشتم از مولانا سعادت حسین خان مطبوعہ ادارہ
ناصر العلوم لکھنؤ ۱۹۷۸ء۔
- امّت اور اہل بیت مولفہ محمد بشارت علی مطبع کاظمی جید آباد دکن ۱۹۷۸ء
چودہ تھارے از مولانا نجم الحسن گزاردی مطبوعہ الرضا پبلیکیشنز لاہور
چھٹے امام از مولانا ظفر حسن مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ
- ۱۰۹ آٹھویں امام از مولانا ظفر حسن مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۱۶
۱۱۰ ہسٹری آف سیراسنر از حبش امیر علی اردو ترجمہ ۲۲۸، ۲۳۵
مطبوعہ اردو ایڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)
- ۱۱۲ دعوت حق از مولانا ابوالکلام آزاد ۲۰۷ مطبوعہ کتاب خانہ لاہور

۱۱۳ عہد مامون اور امام رضاؑ مولف سید ابن حسن جارجوری مطبوعہ
انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک پبلیجرائز ریسرچ کراچی۔ (مولف)

۱۱۴ ہسٹری آف سیراسن از حبش امیر علی اردو ترجمہ ۲۶۵ مطبوعہ اردو
ایڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۱۵ مصائب الشیعہ جلد ششم از مولانا سادات حسین ۱۷۳ مطبوعہ ناصر العلوم
لکھنؤ ۱۹۷۸ء، بحوالہ بحار الانوار (مولف)

۱۱۶ ہسٹری آف سیراسن از حبش امیر علی اردو ترجمہ ۲۶۸ مطبوعہ
اردو ایڈمی سندھ ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۱۷ دسویں امام از مولانا ظفر حسن ۵۹ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ (مولف)
۱۱۸-۱۱۹ واقعات مندرجہ ذیل کتب سے ماخوذ ہیں۔

دسویں امام از مولانا سید ظفر حسن مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ
ہسٹری آف سیراسن از حبش امیر علی اردو ترجمہ مطبوعہ اردو ایڈمی
سندھ کراچی ۱۹۶۵ء

چودہ ستارے از سید نجم الحسن کراوی مطبوعہ الرضا
پبلیکیشنز لاہور
امت اور اہل بیت از محمد بشارت علی مطبع کاظمی حیدر آباد
دکن ۱۴۰۲ھ

۱۲۰-۱۲۱ بارہویں امام از مولانا سید ظفر حسن مطبوعہ
نظامی پریس لکھنؤ

ہسٹری آف سیراسن از حبش امیر علی اردو ترجمہ مطبوعہ اردو ایڈمی
سندھ کراچی ۱۹۶۵ء

چودہ ستارے از سید نجم الحسن کراوی مطبوعہ الرضا
پبلیکیشنز لاہور۔

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان



۷۸۶

۹۲۱۱۰

یا صاحب الزماں اور کئی



لبیک یا حسینؑ

نذر عباس
خصوصی تعاون: رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری -

SABEEL-E-SAKINA

Unit#8,

Latifabad Hyderabad

Sindh, Pakistan.

www.sabeelesakina.co.cc

sabeelesakina@gmail.com

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL USE